تاریخ اسلام کی چار سو

باکمال خواتین

طالب ہاشمی

فہرست مضامین

نویں صدی ہجری

فہرست اسماء بلحاظ حروف تہجی

ب

ز

س

فہرست اہم حواشی

انتساب

ان
خواتین
کے نام

جنہوں نے

- علم کی تحصیل اور اشاعت میں اپنی زندگیاں کھپادیں۔
- حسنِ سیرت و کردار کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔
- ایثار و وفا، شجاعت و ہمت اور عزم و استقلال کی درخشاں مثالیں قائم کیں۔
- بچوں کی تعلیم و تربیت ایسی عمدگی سے کی کہ وہ قوم کے بہترین فرزند بنے۔
- تبلیغ حق اور استخلاصِ وطن کے لیے بے مثال قربانیاں دیں۔
- اپنے آپ کو ہمہ تن مخلوقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف کردیا، یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی سرپرستی کی، اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھا اور اسے نیکی کے کاموں پر بے دریغ صرف کیا۔
- اپنی دانش و حکمت اور ذہانت و طبّاعی کا سِکّہ بٹھادیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

آج سے چند سال پہلے دو سو پچاس سے زائد صحابیاتؓ رسولؐ کے تذکروں پر مشتمل میری تالیف "تذکارِ صحابیاتؓ" شائع ہوئی تو اہلِ علم نے جس ذوق و شوق سے اس کی پذیرائی کی اس نے مجھے ولولۂ تازہ عطا کیا اور میں ان باکمال خواتین کے حالات مرتب کرنے میں مشغول ہو گیا جنہوں نے صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن سے کسب فیض کیا یا جو ان کے بعد گزشتہ چودہ صدیوں میں گزریں۔ الحمد للہ کہ کئی سال کی محنتِ شاقہ کے بعد یہ کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اس میں دنیائے اسلام کی چار سو سے کچھ زائد باکمال خواتین کے تذکرے ہیں۔ سب سے پہلے میں فاضلِ یگانہ علامہ ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب مدظلہٗ (ایم اے عربی ایم اے اسلامیات پی ایچ ڈی) کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ازراہِ ذرہ نوازی اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل سے نوازے —— یہ چند سطور کچھ باتوں کی وضاحت کے لیے تحریر کی جا رہی ہیں:-

۱۔ بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے (بالخصوص مستشرقین اور ان کی تحریروں سے متاثر لوگوں میں) کہ سرورِ کائنات رحمتِ عالم جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے بانی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سبھی انبیاء و مرسلین اسلام ہی کے پیغام بر تھے۔ "تاریخِ اسلام" محض ایک اصطلاح ہے جس کا آغاز عام طور پر سنِ ہجری سے کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں "تاریخِ اسلام"

کے الفاظ انہی اصطلاحی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔

۲۔ کتاب میں بعض خواتین کے تذکرے محض تین چار سطروں تک محدود ہیں گویا یہ تذکرے "برائے نام" ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان خواتین کے مزید حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ اس کمی کی تلافی کے لیے چار سو سے کچھ زائد خواتین کے تذکرے کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

۳۔ بعض ایسی خواتین کے تذکرے بھی کتاب میں آ گئے ہیں جو جمہور مسلمین کے نزدیک اُمّتِ مسلمہ میں شامل نہیں کی جا سکتیں، مثلاً جہنیزہ (خارجیہ) غزالہ (خارجیہ) لیلیٰ بنتِ طریف (خارجیہ) قرۃ العین طاہرہ (بابیہ) وغیرہ۔ ان خواتین کو صرف اس لیے کتاب میں شامل کیا گیا ہے کہ وہ بہرحال دنیائے اسلام ہی میں گزری ہیں اور قریب قریب سبھی مسلم مؤرخین نے اُن کا ذکر کیا ہے۔ ان کے تذکرے صرف تاریخی نقطۂ نگاہ سے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

۴۔ "کمال" کے لغوی معنی ہیں، گُن، لیاقت، قابلیت، ہنر، مہارت، خوبی، عمدگی، عجیب کام، انوکھی بات، اچنبھا، استادی، ازحد، نہایت، ازبس، صنعت، کاریگری، کامل، سارا، سب —— جن خواتین کے تذکرے اس کتاب میں شامل ہیں اُن میں کمال کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا تھا۔ کوئی علم و فضل کے لحاظ سے باکمال تھی تو کوئی زہد و عبادت اور عرفان و سلوک کے اعتبار سے، کوئی شجاعت اور بے باکی کے لحاظ سے باکمال تھی تو کوئی ایثار و وفا اور عزم و ہمت کے اعتبار سے، کوئی ذہانت و طبّاعی کے لحاظ سے باکمال تھی تو کوئی سخن سنجی اور سخن فہمی کے اعتبار سے، کوئی ہنر اور فن کے نقطۂ نگاہ سے یگانۂ روزگار تھی تو کوئی دانش و حکمت اور تدبیر و سیاست کے لحاظ سے۔ کسی میں بچوں کی تربیت کا بے مثال ملکہ تھا تو کسی میں استخلاصِ وطن اور تبلیغِ اسلام کا بے پناہ جذبہ تھا۔ کسی کو درسگاہیں قائم کرنے اور مساجد تعمیر کرانے کا شوق تھا تو کسی کو درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کا، کسی کو خدمتِ خلق کی دُھن تھی تو کسی کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے غیر معمولی شغف تھا، کسی کا دستِ سخاوت

بے حد کشادہ تھا تو کوئی یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کی سرپرستی میں یکتائے زمانہ تھی وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

۵ - ہر ہجری صدی کی خواتین کے تذکرے الگ الگ ابواب میں مرتب کیے گئے ہیں۔ آغاز کی عمومی فہرست کے علاوہ ہر باب کے شروع میں متعلقہ صدی کی باکمال خواتین کی فہرست دے دی گئی ہے اور ہر ایک کے نام کے سامنے اس کے خصوصی کمال کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

۶ - باکمال خواتین کے تذکروں کے علاوہ کتاب کے حواشی میں بھی بہت سی نامور شخصیتوں کے مختصر تذکرے آ گئے ہیں۔ امید ہے ان سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور ان کو محسوس ہوگا کہ ان حواشی سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

۷ - یہ کتاب خالص علمی، تاریخی، تحقیقی اور سوانحی نقطۂ نگاہ سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ بھی اسی نقطۂ نگاہ سے کرنا مناسب ہوگا۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ کتاب کے آغاز میں ایک مقالہ شامل کر دیا جائے جس میں تفصیل کے ساتھ بتایا جائے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کیا ہیں اور ان کا دائرۂ کار کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں یہ موضوع سیر حاصل بحث کا متقاضی تھا اور اس قسم کا مقالہ شامل کرنے سے کتاب کی ضخامت میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا تھا۔ چونکہ اختصار سے کام لینے کے باوجود کتاب کی ضخامت اندازے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے اس لیے ایسا مقالہ شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اجمالاً یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویؐ میں مرد اور عورت کے حقوق و فرائض اور دائرۂ کار کے بارے میں اتنے واضح احکام موجود ہیں کہ اس سلسلے میں موشگافیاں کرنا یا ان احکام سے سیاسی یا ذاتی اغراض کے تحت اپنی مرضی کے معنی اخذ کرنا اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے کے مترادف ہے اور دوسروں کو بھی۔

۸ - اس کتاب میں جن خواتین کے تذکرے شامل ہیں ان کے علاوہ بھی ماضی بعید اور ماضی قریب میں بے شمار باکمال خواتین گزری ہیں۔ اللہ نے توفیق دی تو ایک اور

جلد میں مزید خواتین کے حالات پیش کیے جائیں گے۔

زمانۂ حاضر میں بھی باکمال خواتین کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ان کے مقام اور مرتبہ کا تعین مستقبل کا مؤرخ ہی کر سکتا ہے اس لیے اس کتاب کو ان کے ذکر سے خالی رکھنا ہی مناسب سمجھا گیا ہے۔

قارئینِ کرام سے مؤدبانہ استدعا ہے کہ وہ اس کتاب میں جو اسقام دیکھیں، ازراہِ کرم ان سے مؤلف یا ناشر کو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں یہ اسقام دور کر دیے جائیں گے۔

دخترانِ اسلام کے لیے اس فقیر کا یہی پیغام ہے کہ ؎

وہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل
جہاں ہیں فاطمہؓ و عائشہؓ کے نقشِ قدم

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

راجیِ غفران و شفاعت

طالب الہاشمی

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ / ۱۷ نومبر ۱۹۸۹ء

۱۱۸۔ ڈی / رضوان بلاک / اعوان ٹاؤن
ملتان روڈ۔ لاہور

کچھ دوسرے ایڈیشن کے بارے میں

الحمدللہ کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دو سال کے عرصے میں ختم ہو گیا۔ اب دوسرا ایڈیشن کچھ ترامیم اور اضافوں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس میں ان چار خواتین کے حالات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بلجام (ص ۹۷) حبّہ خاتون (ص ۴۰۰) حافظہ حمیدہ بیگم (ص ۷۰۰) بنت الاسلام (ص ۷۰۹)۔

قارئینِ کرام سے استدعا ہے کہ وہ فہرست میں مناسب جگہوں میں ان ناموں کا اضافہ کر لیں اور نمبر شمار کی بھی تصحیح کر لیں

ناچیز **طالب الہاشمی**
۱۴ مارچ ۱۹۹۲ء

پیش لفظ

از علامہ ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب ایم اے (عربی) ایم اے (اسلامیات) پی ایچ ڈی

زیرِ نظر کتاب "تاریخ اسلام کی چار سَو باکمال خواتین" کے مصنف محترم طالب الہاشمی صاحب وہ باکمال بزرگ ہیں جو چالیس سے زائد ضخیم کتابیں اور بیسیوں کتابچے تصنیف کر چکے ہیں اور علمی و ادبی حلقوں میں ان کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔

کتاب لکھنا ایک فن ہے اور اس فن کی مشکلات کا صحیح اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اس دشوار گھاٹی سے گزرا ہو لیکن ہمارے محترم فاضل دوست ہاشمی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ عمیم سے تصنیف و تالیف میں خصوصی دسترس اور مہارت عطا فرما رکھی ہے۔ آسان، سلیس اور قابلِ فہم زبان، دلنشین اسلوب، علمی نکات، ادبی چٹخارے، شعر و سخن کا ذوق، تلفظ کی احتیاط، نادر کتب کے حوالے، اصل مآخذ سے مواد کی فراہمی کے لیے سعیٔ بلیغ ——— یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کی تصانیف میں جوہرِ آبدار کی طرح تاباں و درخشاں نظر آتی ہیں۔ ہاشمی صاحب اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ وہ کام جو ایک علمی بورڈ انجام دیتا انہوں نے تنِ تنہا کر دکھایا، سیرت پر ان کی ایک کتاب پر انہیں صدرِ مملکت کی طرف سے ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ لیکن ان کے ایک وصف جس نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ ان کی نام و نمود اور

خود ستائی سے دور رہ کر "گمنام" مردِ درویش کی طرح علم و ادب کی ٹھوس خدمت ہے۔ وہ "تقریبِ رونمائی" کے رسیا نہیں بلکہ انہیں اپنے کام سے شغف ہے اور لگن سے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔

انسانیت کے سب سے بڑے محسن اور معلم حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ظہورِ قدسی کے وقت عرب میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کس قدر محدود تھی! لیکن یہ فیضان ہے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا جنھوں نے ہر مسلمان مرد اور عورت کو تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی اور یوں انہوں نے نہ صرف یہ کہ علم و فن میں کمال پیدا کیا بلکہ صدیوں تک اس وقت کی دنیا کے معلم ہونے کا خوشگوار فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ ان میں جہاں بے شمار باکمال مردوں کے نام آتے ہیں وہاں باکمال عورتوں کے کارنامے بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کو میں نے جستہ جستہ دیکھا۔ کہتے ہیں حُسن پہلی نظر میں ہی نگاہوں کو خیرہ کرتا اور اپنی عظمت منوالیتا ہے۔ چنانچہ میرا تاثر یہی ہے کہ ہاشمی صاحب نے اس کے مواد کی فراہمی کے لیے خاصی تگ و دو سے کام لیا ہے۔ اصل ماخذ تک رسائی کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب کو اصل مراجع مثلاً تہذیب التہذیب، الاصابہ، الاستیعاب، اُسدُ الغابہ، عقد الفرید، طبقات ابن سعد وغیرہا نادر کتب کے حوالوں سے مزین کیا ہے۔ بعض جگہ متن میں مذکور مختلف شخصیتوں کے تعارف کو حواشی میں بیان کیا ہے اور یوں ضمنی طور پر معلومات افزا تذکروں سے کتاب کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ ایک اور مفید بات جس کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے خواتین کے تذکروں میں زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے جسے قارئین یقیناً بنظرِ استحسان دیکھیں گے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات کی جامع فہرست دی گئی ہے تاکہ تشنگانِ علم، اساتذہ اور طلبہ مزید سیرابی کے لیے اصل مراجع سے براہِ راست استفادہ کر سکیں۔ بعض خواتین کے تذکرے بہت مختصر ہیں لیکن اس کی اصل وجہ ان پر مواد کی عدم فراہمی

ہے۔ کتاب لکھتے وقت جو مقصد ان کے سامنے تھا اس کا بیان خود فاضل مصنف کی تحریر کے حوالے سے پیشِ خدمت ہے:

"جن خواتین کے تذکرے اس کتاب میں شامل ہیں ان میں کمال کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا تھا۔ کوئی علم وفضل کے لحاظ سے باکمال تھی تو کوئی زہد وعبادت اور عرفان وسلوک کے اعتبار سے، کوئی شجاعت اور بے باکی کے لحاظ سے باکمال تھی تو کوئی ایثار ووفا اور عزم وہمت کے اعتبار سے، کوئی ذہانت وطبّاعی کے لحاظ سے باکمال تھی تو کوئی سخن سنجی اور سخن فہمی کے اعتبار سے، کوئی ہنر اور فن کے نقطۂ نگاہ سے یگانۂ روزگار تھی تو کوئی دانش وحکمت اور تدبیر وسیاست کے لحاظ سے، کسی میں بچوں کی تربیت کا بے مثال ملکہ تھا تو کسی میں استخلاصِ وطن اور تبلیغ اسلام کا بے پناہ جذبہ تھا، کسی کو درسگاہیں قائم کرنے اور مساجد تعمیر کرانے کا شوق تھا تو کسی کو درس وتدریس اور تعلیم وتعلّم کا، کسی کو خدمتِ خلق کی دُھن تھی تو کسی کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے غیر معمولی شغف تھا، کسی کا دستِ سخاوت بے حد کشادہ تھا تو کوئی یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کی سرپرستی میں یکتائے زمانہ تھی۔"

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہاشمی صاحب کو کتابوں کی سنچری بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

احقر العباد بشیر احمد صدیقی عفی عنہ
یکم دسمبر ۱۹۸۹ء

پہلی صدی ہجری

۱۔ حضرت اُم الدرداءؓ صغریٰ (تابعیہ)
۲۔ حضرت اُم بجرۃ (تابعیہ)
۳۔ حضرت ذفرہؒ (تابعیہ)
۴۔ حضرت ام کلثومؓ بنتِ حضرت ابو بکر صدیقؓ (تابعیہ)
۵۔ حضرت کلثم بنت عمرو القرشیہ (تابعیہ)
۶۔ ام محمد القرظیؒ (تابعیہ)
۷۔ حضرت صفیہ بنت شیبہ (تابعیہ)
۸۔ بی بی عائشہؒ بنت سعد (تابعیہ)
۹۔ حضرت عائشہ بنت طلحہؒ (تابعیہ)
۱۰۔ بی بی صفیہ بنت الحارث (تابعیہ)
۱۱۔ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن (تابعیہ)
۱۲۔ حضرت فاطمہؒ بنتِ حسینؓ (تابعیہ)
۱۳۔ حضرت عالیہؒ بنت ایفع (تابعیہ)
۱۴۔ بی بی قمیرؒ بنت عمرو (میر) الکوفیہ (تابعیہ)
۱۵۔ حضرت عائشہؒ بنت قدامہؒ (تابعیہ)
۱۶۔ حضرت سمیۃؒ البصریہ (تابعیہ)
۱۷۔ حضرت کبشہؒ بنت کعب (تابعیہ)
۱۸۔ حضرت تملک کوفیہؒ (تابعیہ)
۱۹۔ حضرت حفصہؒ بنت عبدالرحمٰنؓ (تابعیہ)
۲۰۔ حضرت اسماءؓ بنت عبدالرحمٰن (تابعیہ)
۲۱۔ حضرت کریمہؒ بنتِ ہمامؒ (تابعیہ)
۲۲۔ حضرت ہند بنت حارث (فراسیہ) (تابعیہ)
۲۳۔ حضرت فاطمہؒ بنت منذر بن زبیر (تابعیہ)
۲۴۔ حضرت عمرہؒ بنت قیس عدویہ بصریہ (تابعیہ)
۲۵۔ بی بی صفیہ ام محمد (تابعیہ)
۲۶۔ بی بی حفصہؒ بنتِ سیرینؒ (تابعیہ)
۲۷۔ حضرت خیرہؒ (تابعیہ)
۲۸۔ بی بی صفیہؒ بنت ابی عبید ثقفی (تابعیہ)
۲۹۔ حضرت ام محمد بنت قیس (تابعیہ)
۳۰۔ حضرت میّہؒ بنت محرز (تابعیہ)
۳۱۔ بی بی ملیکہؒ بنتِ منکدر (تابعیہ)
۳۲۔ حضرت مغیرہؒ بنت حسان (تابعیہ)
۳۳۔ حضرت بنانہ مولاۃ عبدالرحمٰنؓ (تابعیہ)
۳۴۔ حضرت زینبؒ بنت مہاجر احمسیہ (تابعیہ)

۳۵۔ حضرت ام عثمانؒ (تابعیہ)
۳۶۔ حضرت ام محمد تیمیہؒ (تابعیہ)
۳۷۔ حضرت ام عمروؒ بنت خوآتؓ (تابعیہ)
۳۸۔ حضرت حسناؒ بنت معاویہؓ (تابعیہ)
۳۹۔ حضرت معاذہ عدویہؒ (تابعیہ)
۴۰۔ حضرت سکینہؒ بنت حسینؓ (تابعیہ)
۴۱۔ حضرت غدیرہؒ بنت اہبان (تابعیہ)
۴۲۔ بی بی عفیرہ عابدہ (تابعیہ)
۴۳۔ بی بی خنساء بنت خدامؒ (تابعیہ)
۴۴۔ بی بی ام الخیرؒ بنت حریش (تابعیہ)
۴۵۔ بی بی زرقاءؒ (تابعیہ)
۴۶۔ بی بی دارمیہ الحجونیہؒ (تابعیہ)
۴۷۔ بی بی بکارہ ہلالیہ (تابعیہ)
۴۸۔ حضرت جمرہؒ بنت دجاجہ عامری (تابعیہ)
۴۹۔ اُمِ عاصمؒ (مومنہ صالحہ)
۵۰۔ حضرت امّ عبداللہ فاطمہ
بنت حسنؓ (تابعیہ، عارفہ)
۵۱۔ فاطمہؒ بنت عبدالملک (مومنہ صالحہ)
۵۲۔ ام ربیعہؒ (مومنہ، صالحہ)
۵۳۔ ام حکیم بنت قارظ (قارض) (تابعیہ، شاعرہ)
۵۴۔ لیلیٰ الاخیلیہ (شاعرہ)
۵۵۔ عقیلہ بنت ضحاک (شاعرہ)
۵۶۔ حضرت ام علقمہؒ
مولاۃ عائشہ صدیقہؓ (تابعیہ)
۵۷۔ بلجاء خارجیہ (خارجیہ، بیباک نڈر)
۵۸۔ اُم علقمہ (خارجیہ، بیباک نڈر)
۵۹۔ جہیرہ (خارجیہ، بہادر نڈر)
۶۰۔ غزالہ (خارجیہ، بہادر نڈر)

حضرت اُمّ الدّرداءؓ صغریٰ

جلیل القدر صحابی حضرت ابوالدّرداءؓ انصاری کی اہلیہ تھیں۔ حضرت ابوالدّرداءؓ نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا نام خیرۃ بنت ابی حدرد اسلمیؓ تھا۔ دوسری کا نام ہیجمہ بنت حیّی وصابیہ تھا۔ دونوں بیویوں کی کنیت ام الدّرداء تھی۔ البتہ تخصیص کے لیے پہلی بیوی کو اُمّ الدرداء کبریٰؓ ——— اور دوسری کو اُمّ الدّرداء صغریٰ کہا جاتا ہے۔ حضرت اُمّ الدّرداء کبریٰ کو شرفِ صحابیت حاصل تھا۔ حضرت اُمّ الدّرداء صُغریٰ صحابیہ نہیں تھیں البتہ ان کا شمار جلیل القدر تابعیات میں ہوتا ہے۔ وہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد تھیں۔ وہ اپنے عظیم المرتبت شوہر کی وفات (۳۲ھ ہجری) کے بعد عرصہ تک حیات رہیں۔ فنِ قراءت میں یگانۂ روزگار تھیں۔ یہ فن انہوں نے اپنے شوہر سے سیکھا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے اُن کو نکاحِ ثانی کا پیغام دیا تھا لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئیں۔ اولاد میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں ان کے نام یہ ہیں ——— بلالؒ، یزیدؒ، دردائؒ، نسیبہؒ۔

ان میں سے بلال اور درداء بہت مشہور ہیں۔ بلالؒ کی کنیت ابو محمّد تھی وہ عرصہ تک دمشق کے قاضی رہے۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے عہدِ حکومت میں انہیں اس عہدے سے سبکدوش کردیا۔ ۹۲ھ ہجری میں وفات پائی۔

دردائؒ مشہور تابعی حضرت صفوانؒ بن عبداللہ (بن صفوانؓ بن امیۃ بن خلف جُمحیؓ) سے منسوب تھیں۔ یہی درداء ہیں جن کے نام پر حضرت عمیرؓ بن زید (والد) نے اپنی کنیت ابوالدّرداء رکھی تھی اور حقیقی اور سوتیلی دونوں ماؤں نے بھی اپنی کنیت اُمّ الدّرداء رکھی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے شوہر حضرت ابوالدّرداءؓ سے عمر میں بہت چھوٹی تھیں۔

صغر سنی میں یتیم ہوگئی تھیں اور حضرت ابوالدرداءؓ ہی نے ان کی پرورش کی بچپن میں ہر وقت حضرت ابوالدرداءؓ کے ساتھ رہتی تھیں اور ان کے ساتھ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں، ان ہی کی تربیت کا فیض تھا کہ وہ تابعین کے دوسرے طبقہ میں شمار کی جاتی ہیں - انہوں نے حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت فضالہؓ بن عبید کے علاوہ حضرت اُمّ الدرداء کبریٰؓ صحابیہ سے بھی بکثرت روایات بیان کی ہیں۔

ان سے روایت کرنے والوں میں تقریباً بیس تابعین ہیں جن میں مکحول الشامیؒ، مرزوق التیمیؒ، زید بن اسلمؒ اور عون بن عبید اللہؒ جیسے بزرگ بھی شامل ہیں۔

(تہذیب التہذیب۔ طبقات ابن سعد وغیرہ)

حضرت اُمِّ مجبّہؒ

انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مسائل پوچھے اور حدیثیں سنیں۔ ان سے حضرت ابواسحٰق سبیعیؒ روایت کرتے ہیں۔ اُمِ مجبّہ ایک دفعہ حضرت عالیہؒ بنت ایفع کے ساتھ حج کے لیے مکہ معظمہ گئیں اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے مسائل پوچھے اور حدیثیں سنیں۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت ذفرہؒ

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شاگرد تھیں۔ علمائے حدیث نے ان کو ثقہ تسلیم کیا ہے۔ نامور تابعی حضرت محمدؒ بن سیرینؒ نے ان سے حدیث روایت کی ہے۔ صحیح نسائی میں بھی ایک حدیث ان سے منسوب ہے۔

(الاصابہ - سیرۃ عائشہؓ)

حضرت اُمِّ کلثومؓ بنتِ حضرت ابو بکر صدیقؓ

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی تھیں ـــــ والدہ کا نام حبیبہؓ بنتِ خارجہؓ انصاری تھا۔

جمادی الآخر سنہ ۱۳ ہجری میں خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات پائی تو حضرت اُمِّ کلثومؓ بطنِ مادر میں تھیں۔ والدِ گرامی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد پیدا ہوئیں۔ سِن بلوغت کو پہنچیں تو ان کی شادی مشہور صحابی حضرت طلحہؓ (یکے از اصحابِ عشرہ مبشرہ) سے ہوئی۔ ان سے تین بچے ہوئے زکریا، یوسف (جو کمسنی ہی میں فوت ہو گئے) اور عائشہ۔

حضرت طلحہؓ جنگِ جمل میں شہید ہوئے تو حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنی بہن اُمِّ کلثومؓ کو مکہ لے گئیں جہاں انہوں نے زمانۂ عدت ہی میں حج کیا ـــــ اس کے بعد حضرت اُمِّ کلثومؓ کا نکاح عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی ربیعہ سے ہوا۔ ان سے ابراہیم احول، موسیٰ، اُمِّ حمید اور اُمِّ عثمان چار بچے پیدا ہوئے۔

حضرت اُمِّ کلثومؓ کا شمار مشہور تابعیات میں ہوتا ہے۔ ان سے مغیرہ بن حکیمؒ، طلحہ بن یحییٰؒ اور جابر بن حبیبؒ وغیرہم نے روایت کی ہے۔

(الاصابہ لابن حجر عسقلانیؒ۔ طبقات ابن سعد)

حضرت کلثم بنتِ عمرو القرشیہ

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خاص شاگرد تھیں اس لیے رجال کی کتابوں میں ان کے نام کے ساتھ "صاحبۃ عائشہ" کا لقب لکھا جاتا ہے۔ کتبِ حدیث میں ان سے مروی بعض احادیث موجود ہیں۔ (سیرۃ عائشہؓ)

اُمِّ محمدؒ القرظی

مشہور (اہلِ کتاب) تابعی حضرت محمدؒ بن کعب القرظی کی والدہ تھیں۔ عہدِ رسالت میں موجود تھیں اور شرفِ اسلام سے بھی بہرہ ور ہوئیں لیکن اہلِ رجال نے صحابیات کے ذکر میں ان کا نام نہیں لیا، البتہ بعض علماء نے ان کا ذکر ایک تابعیہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کے قبیلہ بنو نضیر سے تھیں۔ ان کی شادی کعب بن حبان سے ہوئی تھی جو یہود کے قبیلہ بنو قریظہ سے تعلق رکھتے تھے اور انصار کے قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ غزوۂ بنو قریظہ میں گرفتار ہوئے لیکن کمسن تھے اس لیے چھوڑ دیئے گئے۔ ان کے فرزند محمدؒ بن کعب کا شمار مدینہ کے فاضل ترین علماء میں ہوتا تھا۔ زہد و عبادت میں بھی وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ اُمِّ محمدؒ بہت نیک اور عبادت گزار بی بی تھیں اور انہوں نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ حضرت محمدؒ بن کعب زندگی کے ہر دور میں نہایت پاکباز اور خدا ترس رہے مگر ہر وقت توبہ و استغفار میں مشغول رہتے تھے، یہ دیکھ کر اُمِّ محمدؒ فرماتی تھیں: ”اے میرے بیٹے محمدؒ! اگر تمہاری پاکبازانہ زندگی میرے سامنے نہ ہوتی تو تمہاری دن رات کی گریہ وزاری اور توبہ و استغفار سے میں یہ سمجھتی کہ تم نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں بچپن میں بھی پاکباز اور نیک سیرت پایا اور بڑے ہونے پر بھی اسی طرح دیکھ رہی ہوں۔“

حضرت محمدؒ نے عرض کیا: ”اماں جان! آپ جو سمجھتی ہیں وہ ٹھیک ہے لیکن میں اپنے کو گناہوں سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے کوئی ایسی لغزش ہو گئی ہو جو اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضی کا باعث ہو۔ اسی وجہ سے میں ہر وقت توبہ و استغفار کرتا رہتا ہوں۔“

(اہلِ کتاب صحابہ و تابعین)

حضرت صفیہؓ بنت شیبہؓ

حضرت شیبہؓ بن عثمان (کلید بردارِ کعبہ) کی صاحبزادی تھیں[۱] سلسلۂ نسب یہ ہے:

صفیہؓ بنت عثمانؓ بن ابی طلحہ بن عبد العزیٰ بن عثمان بن عبدالدار بن قصیّ قرشی عبدری۔

---

[۱] حضرت شیبہؓ بن عثمان کے قبولِ اسلام کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دوسری یہ کہ غزوۂ حنین سے کچھ دیر پہلے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ بہر صورت وہ غزوۂ حنین میں مجاہدانہ شریک ہوئے اور شروع سے اخیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔

کعبہ کی کلید برداری کا منصب حضرت شیبہؓ ہی کے خاندان (بنو عبدالدار) کے پاس تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ اپنے عہدِ خلافت میں خانۂ کعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے — انہوں نے خانۂ کعبہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، اس گھر میں جس قدر سونا چاندی ہے میں اس کو مسلمانوں میں تقسیم کردوں گا۔

حضرت شیبہؓ نے کہا: "امیر المومنین آپ کو اس کا کیا حق ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے ایسا نہیں کیا۔"

ان کی بات سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "میں انہی دونوں کی اقتدا کرتا ہوں۔"

حضرت شیبہؓ نے طویل عمر پاکر ۵۹ھ میں وفات پائی یہ امیر معاویہؓ کا دورِ خلافت تھا۔

حضرت شیبہؓ سے مروی چند احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ ان کے راویوں میں مصعبؒ بن شیبہؓ، نافع بن مصعبؒ، عکرمہؒ اور عبدالرحمٰنؒ بن زجاج وغیرہ شامل ہیں۔

ان کا شمار مشہور تابعات میں ہوتا ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خاص شاگرد تھیں۔ حدیث کی تمام کتابوں میں ان کی روایات موجود ہیں۔ احادیث میں ان کا ذکر وہ صفیہ بنتِ شیبہ صاحبۃ عائشہؓ کہہ کر کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے شیبہؒ کی بیٹی صفیہؒ حضرت عائشہؓ کی مخصوص شاگرد یا حضرت عائشہؓ کی صحبت یافتہ۔ لوگ ان سے مسائل اور حضرت عائشہؓ کی حدیثیں پوچھنے آتے تھے۔ حضرت صفیہؒ نے اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ سے بھی روایت کی ہے۔ (تہذیب التہذیب)

بی بی عائشہؒ بنتِ سعدؓ

سیدنا حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فاتح عراق عرب (دیکھئے از اصحاب عشرہ مبشرہ) کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے چھ اُمہات المؤمنینؓ کو دیکھا تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار صحابہؓ و صحابیاتؓ کو بھی۔ اس لیے تابعیات میں بہت بلند مقام رکھتی ہیں۔

بی بی عائشہؒ نے اپنے والد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت اُمّ ذرؓ سے روایت کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں آٹھ تابعین ہیں۔ وہ واحد خاتون ہیں جن سے امام مالکؒ بن انس نے روایت کی ہے۔

ابن حبانؒ نے ان کو ثقہ لکھا ہے۔ امام ذہبیؒ نے ان کا شمار حفاظِ حدیث میں کیا ہے اور تابعین کے تیسرے طبقہ میں ان کو جگہ دی ہے۔

بی بی عائشہؒ نے ۱۱۷ھ ہجری میں وفات پائی۔

(تہذیب التہذیب)

حضرت عائشہ بنتِ طلحہ رحمۃ اللہ علیہا

سیدنا حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ تیمی قرشی کی صاحبزادی اور سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نواسی تھیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسماء بنتِ ابی بکر صدیقؓ ان کی خالہ ہوتی تھیں۔ گویا دونوں جانب سے عالی نسب تھیں۔

ان کی والدہ حضرت اُمِّ کلثومؒ اور خود ان کا شمار مشہور تابعیات میں ہوتا ہے۔ ماں بیٹی دونوں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد تھیں۔ حضرت عائشہ بنتِ طلحہؒ اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں۔ ان سے اجلۂ تابعین نے روایت کی ہے۔ ابنِ حبانؒ اور ابنِ معینؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ ان کے فضل کی وجہ سے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے، اور اہلِ علم ان کا ادب کرتے تھے۔ عجلیؒ ان کو "تابعۃ ثقہ" لکھتے ہیں۔

حضرت عائشہؒ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں اعتبار سے اپنے زمانے کی خواتین میں نمایاں مقام رکھتی تھیں۔ عالمہ فاضلہ، ذہین، دانشمند اور اپنے زمانے کی نہایت بااثر اور نامور خاتون تھیں۔

ان کا پہلا نکاح حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حقیقی بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد اپنی خالہ حضرت اسماء بنتِ ابی بکر صدیقؓ کے بیٹے مصعب بن زبیرؓ والیٔ عراق کے نکاح میں آئیں۔ مصعب کی شہادت کے بعد ان کا نکاح عمر بن عبید اللہ التیمی سے ہوا۔ ان سے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی، عبدالرحمٰن، ابوبکر، عمران، طلحہ اور نُفَیسہ۔

"اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں ہے کہ "بہت سے شعراء نے ان کے

بارے میں اشعار بھی کہے ہیں اور وہ خود بھی شعر و سخن سے دلچسپی رکھتی تھیں۔"

"کتاب الاغانی" میں ابوالفرج اصفہانی نے حضرت عائشہ بنت طلحہؓ کے بارے میں بہت سی بے سروپا اور من گھڑت باتیں لکھی ہیں۔ یہ روایتیں درایت کی کسوٹی پر قطعاً پوری نہیں اترتیں۔ حضرت عائشہؓ کو آزاد خیال اور فیشن پسند کہنا سراسر بیہودگی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تکلف کی زندگی گزارتی تھیں لیکن ایسی نہیں کہ اس کے ڈانڈے عیش اور اسراف سے مل جائیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق اچھا کھاتی تھیں اور اچھا پہنتی تھیں۔ باقی رہا ان کا علم و فضل تو اس کا اعتراف ان کے تمام ہمعصر علماء کو تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی دعوت پر اس کے دربار میں گئیں وہاں مختلف علوم کے بارے میں ان کی گفتگو متعدد نامور علماء سے ہوئی۔ وہ سب ان کے تبحر اور وسعت معلومات کے قائل ہو گئے۔ ہشام اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ان کی خدمت میں ایک لاکھ درہم بطور نذرانہ پیش کیے اور نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا۔ سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔

(طبقات ابن سعد۔ تہذیب التہذیب۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ اشرف النساء)

بی بی صفیہ بنت الحارث

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد تھیں۔ علم حدیث کی ترقی و اشاعت میں سرگرم حصہ لیا۔ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ اور کئی صحابہ سے روایت کی ہے۔ ان کی روایتیں صحاح میں موجود ہیں اور ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب)

حضرت عمرہ بنتِ عبدالرحمٰنؒ

مشہور صحابی حضرت اسعدؓ بن زرارہ انصاری[1] کی پوتی تھیں۔ ان کا شمار جلیل القدر تابعیات میں ہوتا ہے۔ علمِ حدیث اور علمِ فقہ میں نادرۂ روزگار تھیں۔ انہوں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ اُمّ المؤمنینؓ کی بہت چاہیتی شاگرد تھیں

---

[1] سیدنا ابو اُمامہ اسعدؓ بن زرارہ انصاری کا شمار نہایت جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے وہ خزرج کی شاخ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیم سے نوازا تھا اور وہ زمانۂ جاہلیت میں بھی توحید کے قائل تھے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ انصار میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا اور حضورؐ کی بیعت کا شرف حاصل کیا (یہ ہجرتِ نبوی سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے جب حضرت اسعدؓ اپنے کسی کام کے لیے مکّہ گئے تھے) اس کے بعد حضرت اسعدؓ نے عقبہ کی تینوں بیعتوں میں بھی شرکت کا شرف حاصل کیا۔ بیعتِ عقبۂ کبیرہ میں حضورؐ نے ان کو بنو نجار کا نقیب مقرر فرمایا۔ انہوں نے مدینہ واپس جاکر باجماعت نماز کا انتظام کیا اور چالیس آدمیوں کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کی۔
سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اسلام کا داعیٔ اوّل بناکر مدینہ بھیجا (سنہ ۱۲ نبوت) تو حضرت اسعدؓ نے انہیں اپنا مہمان بنایا۔ حضورؐ مکّہ سے ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لائے تو آپ کی میزبانی کا شرف حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا لیکن آپؐ کی اونٹنی کو حضرت اسعدؓ نے اپنا "مہمان" بنایا۔ ہجرتِ نبوی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد (شوال سنہ ۱ ہجری میں) حضرت اسعدؓ نے گلے کی بیماری کی وجہ سے وفات پائی۔ حضورؐ ان کی وفات پر سخت ملول و محزون ہوئے۔ خود ان کی نمازِ جنازہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ وہ اُمّ المؤمنینؓ کی میر منشی تھیں اور لوگ انہی کی وساطت سے تحفے اور خطوط اُمّ المؤمنینؓ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ اکثر محدثین نے حضرت عمرہؒ کے علم وفضل اور ان کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "تہذیب التہذیب" میں ان کے بارے میں ابن المدینی کا یہ قول نقل کیا ہے:

عمرۃ احد الثقات العلماء بعائشۃ الاثبات فیھا

(عمرہ حضرت عائشہؓ کی حدیثوں کی ثقہ اور مستند جاننے والوں میں سے ایک تھیں)

اسی کتاب میں ابنِ حبانؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ

(یعنی (عمرہؒ) حضرت عائشہؓ کی حدیثوں کو سب سے بہتر جانتی تھیں)

سفیانؒ کہتے ہیں:

اثبت حدیث عائشۃ حدیث عمرۃ والقاسم وعروہ

(حضرت عائشہؓ کی مستند ترین حدیث وہ ہے جو عمرہ، قاسم اور عروہ کی حدیث ہو۔)

امام زہریؒ[1] نے جب تحصیلِ حدیث شروع کی تو ایک محدّث نے ان سے کہا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

پڑھائی اور بقیع میں لے جا کر دفن کیا۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں میں یہ پہلا سانحۂ ارتحال تھا۔ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت اسعدؓ نے اپنے پیچھے دو لڑکیاں چھوڑیں لیکن حضرت عمرہؒ کو سب نے حضرت اسعدؓ کی پوتی بتایا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دو لڑکیوں کے علاوہ ایک صاحبزادے عبدالرحمٰن بھی اپنی یادگار چھوڑے۔

[1] امام ابوبکر محمد (بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ الاصغر بن شہاب) المعروف بہ ابنِ شہاب الزہریؒ کا شمار اکابر حفاظِ حدیث اور فقہا میں ہوتا ہے بقول حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

(باقی اگلے صفحہ پر)

"اگر تم کو علم کی حرص ہے تو میں تم کو اس کا خزانہ بتاؤں تم عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے پاس جاؤ۔ وہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آغوش پروردہ ہیں۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اپنے زمانے میں وہ سُنّت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ باختلاف روایت ۵۰ھ ہجری یا ۵۱ھ یا ۵۶ھ یا ۵۰ھ یا ۵۸ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ قریش مکہ کے مشہور قبیلہ بنو زہرہ سے تھے۔ ان کے شیوخ میں حضرت عمرہؒ کے علاوہ حضرت عروہ بن زبیرؒ اور حضرت سعید بن مسیبؒ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ۸۱ھ ہجری میں مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے دمشق چلے گئے۔ وہاں خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ان کی بڑی قدر افزائی کی۔ ان کے تمام قرضے ادا کر دیئے اور ان کے گزارے کے لیے مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ مہیا کر دیا۔ عبدالملک کے بعد اس کے جانشین بھی امام زُہریؒ کی بہت قدر کرتے رہے۔ خلیفہ یزید ثانی (۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ) نے ان کو قاضی بنا دیا اور خلیفہ ہشام (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) نے ان کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کیا۔ امام زہریؒ دمشق سے اکثر مدینہ منورہ جاتے رہتے تھے اور وہاں دیر تک قیام کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۲۴ھ ہجری میں شغب کے قریب اپنی جاگیر اُدامی میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ امام زہریؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حدیث کی تدوین کی۔ انہوں نے اپنے علم کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کبھی دریغ نہیں کیا۔ وہ بہت بڑے محدث، علم الانساب کے ماہر اور شعر و شاعری کے نقاد تھے۔ رواۃِ سیرت کے بھی وہ امام ہیں۔ امام ابنِ اسحاقؒ انہی کے شاگردِ رشید تھے۔ امام زہریؒ نے ایک کتاب "نسبِ قومہ" بھی تالیف کی بعض تذکرہ نگاروں نے ان کو پہلی / دوسری صدی ہجری کا سب سے بڑا محدث تسلیم کیا ہے۔

امام زہریؒ کہتے ہیں کہ جب میں عمرہؒ کے پاس پہنچا تو ان کو علم کا اتھاہ سمندر پایا۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے تعلق کی بنا پر لوگ حضرت عمرہؒ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکرؒ بن محمد بن عمروؒ بن حزم حضرت عمرہؒ کے بھتیجے تھے، اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کو احادیث کی جمع و تحریر کا حکم دیا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو فرمان لکھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا:

"عمرہ کی حدیثیں لکھ کر خلیفۃ المسلمین کو بھیجی جائیں۔"

امام مالکؒ نے "موطا" میں لکھا ہے کہ پھوپھی (عمرہؒ) اپنے قاضی بھتیجے کی اجتہادی غلطیوں کی اصلاح کیا کرتی تھیں۔

عمرہؒ کے بھائی محمدؒ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا، ما بقیَ اَحدَ اَعلمَ بحدیث عائشۃؓ یعنی اس وقت حضرت عائشہؓ کی احادیث کا ان سے زیادہ جاننے والا کوئی موجود نہیں۔

ابن سعدؒ نے ان کو عالمہ کا لقب دیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے ان کو تابعین کے تیسرے طبقے میں شمار کیا ہے اور ان کو فقیہہ لکھا ہے۔ ابن معینؒ نے ان کو ثقہ حجۃ، عجلیؒ نے تابعۃ ثقہ اور ابن المدینی نے احد ثقات العلماء لکھا ہے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی روایتیں کی ہیں۔ ۔۔۔ ان سے روایت کرنے والوں میں بالعموم کبار تابعین ہیں۔

حضرت عمرہؒ نے ۱۰۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۷ برس کی تھی۔ (تہذیب التہذیب، طبقات ابن سعد، تذکرۃ الحفاظ)

حضرت فاطمہ بنتِ حسینؓ

شہیدِ کربلا سیّدنا حضرت حسینؓ ابنِ علیؓ کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا شمار نہایت جلیل القدر تابعیات میں ہوتا ہے ـــــ عام طور پر انہیں فاطمۃ الصغریٰ کہا جاتا ہے۔ والدہ کا نام اُمِّ اسحٰق بنتِ طلحہؓ بن عبیداللہ تھا۔ ان کا نکاح اپنے ابنِ عم حضرت حسنؒ بن حسنؓ بن علیؓ سے ہوا۔ ان سے چار بچے عبداللہ، ابراہیم، حسن اور زینب پیدا ہوئے حسنؒ بن حسنؓ کی وفات کے بعد ان کا نکاح عبداللہ بن عمرو بن عثمانؓ بن عفان سے ہوا۔ جن سے دو بیٹے محمدؒ دیباج (نہایت خوبرو ہونے کی وجہ سے ان کا لقب دیباج یعنی "ریشم" پڑ گیا تھا) اور قاسم پیدا ہوئے۔ چند سال بعد عبداللہ بن عمرو بھی فوت ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت فاطمہ صغریٰؒ نے باقی زندگی بیوگی کے عالم میں گزار دی۔ ایک دفعہ عبدالرحمٰن بن ضحاک فہری حاکمِ مدینہ نے ان کو نکاح کا پیام بھیجا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں اب ہمہ تن بچوں کی پرورش میں مصروف رہتی ہوں۔ اس نے بہت اصرار کیا بلکہ دھمکیاں تک دے ڈالیں۔ اس پر حضرت فاطمہؒ نے خلیفہ یزید بن عبدالملک کے پاس عبدالرحمٰن بن ضحاک کی شکایت کی وہ سخت غضبناک ہوا اور عبدالرحمٰن کو معزول کر کے سخت سزا دی۔

حضرت فاطمۃ الصغریٰؒ کا پایۂ علم و فضل بہت بلند تھا۔ حدیث اور فقہ میں وہ خاص تبحر رکھتی تھیں۔ ذکرِ الٰہی سے بھی بڑا شغف تھا اور دھاگے کی گرہوں پر سبحان اللہ کی تسبیح پڑھا کرتی تھیں۔ ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ ۱۰۰ھ ہجری میں وفات پائی۔ (طبقات ابنِ سعد۔ الاکمال)

حضرت عالیہ بنتِ ایفع

ایفع بن شراحیل کی صاحبزادی اور مشہور تابعی امام ابو اسحٰق سبیعیؒ[1] کی اہلیہ تھیں۔ وہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں، ان سے سوالات کیے اور احادیث کا سماع کیا۔

ان کے صاحبزادے یونس بن ابی اسحاقؒ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اُمّ محبّہ کے ساتھ حج کیا پھر ہم دونوں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اُن کو سلام کیا، ان سے مسائل پوچھے اور حدیثیں سُنیں۔ اس وقت حضرت صدیقہؓ نے گلابی کرتا پہن رکھا تھا اور ان کے سر پر سیاہ دوپٹہ تھا۔

پھر جب ہم واپس ہونے لگیں تو ہم سے حضرت صدیقہؓ نے فرمایا:

"تم میں سے ہر عورت پر حرام ہے کہ (چھپ کر) اور کان لگا کر اپنے شوہر کی باتیں سُنے۔" (طبقات ابنِ سعد)

---

[1] اصل نام عمرو بن عبداللہ تھا لیکن اپنی کنیت ابو اسحٰق سے مشہور ہیں۔ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت کے اخیر کو فہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت ابنِ عباسؓ، حضرت ابنِ زبیرؓ، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت زید بن ارقمؓ، حضرت ابو جحیفہؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ و تابعین سے سماعِ حدیث کیا اور علمائے کوفہ سے بھی کسبِ فیض کیا۔ ابن المدینیؒ نے ان کے شیوخ کی تعداد باختلافِ روایت تین یا چار سو لکھی ہے۔ ان میں اڑتیس صحابہ تھے۔ حافظ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے اور ان کے مناقب بہت ہیں۔ قرآن کریم کے وہ بہت مشہور قاری تھے اور حدیث کے اکابر حفاظ میں تھے۔ زہد و عبادت میں بہت انہماک تھا۔ کثرت سے روزے رکھتے تھے اور تین دن میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ کے زمانے میں روم پر فوج کشی میں شریک ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

۱۲۷ھ یا ۱۲۸ھ میں تقریباً سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے پیچھے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد چھوڑی ان میں اعمشؒ، قتادہؒ، سلیمان التیمیؒ، سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ جیسے اکابر تابعین بھی شامل تھے۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد دو ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ (تابعین)

بی بی قمیرؒ بنتِ عمرو (عمیر) الکوفیہ

مشہور تابعی (محدث) حضرت مسروقؒ بن الاجدع کی اہلیہ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد تھیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ اور اپنے شوہر حضرت مسروقؒ سے روایت کی ہے۔ ان کے اپنے رواۃ میں کئی ممتاز تابعین شامل ہیں۔ ان میں امام محمدؒ بن سیرینؒ، امام شعبیؒ، مقدام بن شریحؒ اور عبداللہ بن یشرمہؒ کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ ابوداؤد اور نسائیؒ میں ان کی روایات موجود ہیں۔ عجلی نے ان کو "تابعۃ ثقۃ" لکھا ہے۔ سالِ وفات معلوم نہیں۔

(تہذیب التہذیب)

حضرت عائشہؒ بنتِ قدامہؓ

مشہور صحابی حضرت قدامہؓ بن مظعون کی صاحبزادی تھیں۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت سفیان خزاعیہ تھا۔ ان کی شادی ابراہیم بن محمدؒ بن حاطب جمحیؒ سے ہوئی جن سے چار بچے پیدا ہوئے۔ حضرت عائشہؒ اپنے والد حضرت قدامہؓ بن مظعون سے روایت کرتی ہیں۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت سمیّۃؒ البصریہ

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو ان کا خاندان بھی وہاں آباد ہو گیا۔ انہیں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، وہاں سے مدینہ منورہ آئیں اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی شاگردی اختیار کی۔

تابعین میں سے کئی علماء حدیث نے ان سے روایتیں لی ہیں۔ (مسند احمد)

حضرت کبشہؓ بنتِ کعبؓ

حضرت کعبؓ بن مالک انصاری کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی حضرت ابوقتادہ انصاریؓ کے فرزند عبداللہؓ سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے روایت کرتی ہیں اور مشہور تابعیات میں شمار ہوتی ہیں۔

حضرت ابوقتادہؓ ایک دفعہ اپنے بیٹے کے گھر تشریف لے گئے۔ نماز کا وقت آیا تو بہو (حضرت کبشہؓ) نے وضو کے لیے پانی رکھا، اتنے میں ایک بلی آئی اور وضو کے برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی اور کوئی ہوتا تو بلی کو مار کر بھگا دیتا لیکن حضرت ابوقتادہؓ نے پانی کے برتن کو اور جھکا دیا تاکہ وہ اطمینان سے اپنی پیاس بجھالے پھر نظر اٹھائی تو دیکھا کہ بہو حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔ فرمایا: ——

"بیٹی اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ بلی نجس جانور نہیں ہے یہ تو گھروں کی آنے جانے والی ہے۔"

ایک حدیث میں یہ واقعہ خود کبشہؓ نے بیان کیا ہے۔ ان سے حمیدہؓ بنتِ عبیدؓ بن رفاعہ نے روایت کی ہے۔ (الاکمال فی اسماء الرجال)

حضرت تملک کوفیہؒ

آپ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتی ہیں۔ ان سے حضرت ابواسحٰق سبیعیؒ نے روایت کی ہے۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت حفصہ بنت عبدالرحمٰنؓ

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بھتیجی اور سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی تھیں۔ اپنی جلیل القدر پھوپھی کے آغوش تربیت میں پل کر جوان ہوئیں۔ بڑی عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ ایک دن نہایت باریک دوپٹہ اوڑھ کر پھوپھی کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ انہوں نے فوراً ان کے دوپٹہ کو غصہ سے چاک کر ڈالا۔ پھر فرمایا، تم نہیں جانتیں کہ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے کیا احکام نازل کیے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا گاڑھے کا دوپٹہ منگوا کر اوڑھایا۔

حضرت حفصہؓ کی شادی حواریٔ رسول ﷺ حضرت زبیرؓ بن العوام (یکے از اصحاب عشرہ مبشرہ) کے فرزند منذرؒ سے ہوئی۔ (الاکمال)

حضرت اسماء بنت عبدالرحمٰنؓ

حضرت حفصہؓ کی بہن تھیں۔ یہ بھی اپنی جلیل القدر پھوپھی اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد تھیں۔ بہن کی طرح علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند درجہ رکھتی تھیں۔ (الاکمال)

حضرت کریمہ بنت ہمامؓ

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خواتین تلامذہ کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ حضرت عائشہؓ سے خضاب کے بارے میں حدیث روایت کی ہے۔ (الاکمال)

حضرت ہندؒ بنتِ حارث فراسیہ

انہوں نے بعض اُمّہات المؤمنینؓ کو دیکھا اور ان سے کسب فیض کیا۔ وہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتی ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنتِ عبدالمطلب سے بھی ان کا سماع ثابت ہے۔ امام زہریؒ نے حضرت ہندؒ سے روایت کی ہے۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت فاطمہؒ بنتِ مُنذرؒ بن زبیرؓ

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ (یکے از اصحاب عشرہ مبشرہ والملقب بہ حواریٔ رسولؐ) کی پوتی اور سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نواسی تھیں۔ انہوں نے اپنی جلیل القدر دادی حضرت اسماءؓ بنتِ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت کی ہے۔

حضرت فاطمہؒ کی شادی اپنے ابن عم ہشام بن عروہؒ بن زبیرؓ سے ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے عروہ اور محمد پیدا ہوئے۔ (طبقات ابن سعد۔ الاکمال)

حضرت عمرۃؒ بنتِ قیس عدویہ بصریہ

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شاگرد تھیں۔ ان سے مسائل پوچھے اور احادیث کا سماع کیا۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتی ہیں اور ان سے جعفر بن کیسانؒ روایت کرتے ہیں۔

(طبقات ابن سعد)

بی بی صفیہ اُمِّ محمدؒ

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی باندی تھیں (انہوں نے آزاد کر دیا تھا) اُمّہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن سے بڑی عقیدت رکھتی اور نہایت خلوص اور محبت سے ان کی خدمت کرتی تھیں۔ اسی لیے امہات المؤمنینؓ بھی ان کو بہت عزیز جانتی تھیں۔ ان کا نکاح حضرت انسؓ بن مالک کے آزاد کردہ غلام سیرینؒ سے ہوا۔ تقریبِ نکاح اس شان کی تھی کہ تین اُمّہات المؤمنینؓ نے بی بی صفیہؒ کو سنوارا (دلہن بنایا) اور اٹھارہ بدری صحابہ اس میں شریک ہوئے ان میں حضرت اُبَیّؓ بن کعب انصاری بھی شامل تھے۔ بی بی صفیہؒ کی آراستگی کے بعد اُمّہاتُ المؤمنینؓ نے ان کے لیے دعا مانگی۔ مردانہ مجلس میں حضرت اُبیؓ بن کعب دعا مانگتے جاتے اور دوسرے صحابہ آمین کہتے جاتے تھے۔ بی بی صفیہؒ کے بطن سے ۳۳ھ ہجری میں جلیل القدر تابعی حضرت محمدؒ بن سیرینؒ[1] پیدا ہوئے اور انہی کے آغوشِ تربیت میں پرورش پا کر اقلیم علم و فضل کے تاجدار ہوئے۔

وہ ساری عمر اپنی والدہ کے بڑے مطیع اور خدمت گزار رہے۔ بی بی صفیہؒ کو رنگین اور نفیس کپڑوں کا بڑا شوق تھا۔ سعادت مند فرزند اس شوق کا خاص

---

[1] امام محمدؒ بن سیرینؒ کی کنیت ابوبکر تھی۔ انہوں نے خادمِ رسول اللہؐ حضرت انسؓ بن مالک کے دامنِ علم میں تربیت پائی۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے صحابہ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت ابنِ عباسؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت کعبؓ بن عجرہ وغیرہ سے بھی

(باقی اگلے صفحہ پر)

خیال رکھتے تھے اور جب کبھی والدہ کے لیے کپڑا خریدتے تھے تو کپڑے کی پائداری کے بجائے اس کی نفاست، نرمی اور خوبصورتی کو دیکھتے تھے۔ عید کے دن خود اپنے ہاتھوں سے ماں کے کپڑے رنگتے تھے۔ والدہ کے سامنے کبھی بلند آواز سے نہ بولتے اور ان سے اتنی آہستہ آواز میں گفتگو کرتے جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہے ہوں۔ ابنِ عون کا بیان ہے کہ ابنِ سیرینؒ جس وقت ماں سے گفتگو کر رہے ہوتے تو ان کی آواز اتنی پست ہوتی کہ ناواقف آدمی انھیں بیمار سمجھتا تھا ۔۔۔۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بی بی صفیہؒ نے طویل عمر پائی اور سعادت مند فرزند کا فضل و کمال اور عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(طبقات ابنِ سعد)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کسبِ فیض کیا۔ اسی طرح بہت سے تابعین سے بھی فیض اٹھایا۔ ان میں خواجہ حسن بصریؒ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح وہ حدیث کے دریائے زخّار بن گئے تھے۔ ابنِ سعدؒ، حافظ ذہبیؒ، امام نوویؒ اور حافظ ابنِ حجرؒ انھیں امام الحدیث لکھتے ہیں۔ علمِ فقہ اور تعبیر الرؤیا میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ نہایت عبادت گزار، متقی، پابندِ شریعت، متواضع اور دیانت دار بزرگ تھے، اس کے ساتھ ہی حق بات کہنے میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ غرض وہ اخلاقی اور دینی محاسن کا ایک مکمل ترین نمونہ تھے اور انھیں دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ سنہ ۱۱۰ھ ہجری میں اسی برس سے کچھ اوپر عمر پا کر اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ (طبقات ابنِ سعد۔ تہذیب التہذیب وغیرہ)

بی بی حفصہؒ بنتِ سیرینؒ

امام محمدؒ بن سیرینؒ کی بہن تھیں۔ ان کا شمار جلیل القدر تابعیات میں ہوتا ہے حافظ ابنِ حجرؒ نے "تہذیب التہذیب" میں ابنِ داؤد کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حفصہؒ نے بارہ برس کی عمر میں قرآن پڑھ لیا تھا اور حدیث کی تحصیل بھی کر لی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہوں نے چودہ سال کی عمر میں قرآن حکیم کو مطالب و معانی کے ساتھ حفظ کر لیا تھا اور فنِ تجوید و فنِ قرأت میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ بی بی حفصہؒ نے متعدد صحابہ اور تابعین سے روایت کی ہے ان میں حضرت انسؓ بن مالک، حضرت اُمِ عطیہؓ، حضرت خیرہ ام الحسن البصریؒ، ابوالعالیہؒ اور ربیع بن زیادؒ جیسی جلیل القدر شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ان سے ابنِ عونؒ، خالد الحذاؒ، قتادہؒ، ہشام بن حسانؒ وغیرہ متعدد تابعین نے روایت کی ہے۔ ابنِ حبانؒ نے ان کو ثقہ لکھا ہے۔ جرح و تعدیل کے امام حضرت یحییٰ بن معینؒ نے ان کو ثقہ حجۃ فرمایا ہے۔ امام ذہبیؒ نے ان کو حفاظِ حدیث کے دوسرے طبقہ میں شامل کیا ہے۔ امام بخاریؒ اور امام ابوداؤدؒ نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔

ایاس بن معاویہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حفصہؒ سے بڑھ کر فضل والا کسی کو نہیں پایا۔

حضرت حفصہؒ کو قرآنِ پاک کی تلاوت کا بہت شوق تھا۔ ہر رات کو تہجد میں نصف قرآنِ پاک ختم کر لیتی تھیں۔ فنِ قرأت میں ایسا کمال حاصل تھا کہ اگر امام محمدؒ بن سیرینؒ کو قرأت میں کسی مقام پر کوئی شبہ ہوتا تو وہ اپنے تلامذہ سے کہتے، ذرا ٹھہرو، میں حفصہ سے دریافت کر کے آتا ہوں۔

بی بی حفصہؒ بنتِ سیرینؒ نے ۱۰۱ ہجری میں وفات پائی۔

(طبقات ابنِ سعد۔ تہذیب التہذیب)

حضرت خیرہؒ

تابعین کے گل سرسبد حضرت خواجہ حسن بصریؒ (وفات سنہ ۱۱۰ھ) کی والدہ تھیں۔ ان کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ اور ان کے شوہر یسار انصار کے خاندان بنو نجار کے ایک صاحب کی غلامی میں تھے۔ انہوں نے بیوی کے مہر میں بنی سلمہ کو دے دیا تھا۔ بنی سلمہ نے ان کو آزاد کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یسار حضرت زیدؓ بن ثابت انصاری کے غلام تھے اور خیرہؒ، اُمّ المؤمنین حضرت اُمِ سلمہؓ کی کنیز تھی۔ دوسری روایت زیادہ مستند ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت خیرہؒ کے بطن سے سنہ ۲۱ھ میں پیدا ہوئے حضرت خیرہؒ اکثر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں۔ جب وہ ننھے حسن کو چھوڑ کر کسی کام میں لگ جاتیں اور وہ رونے لگتے تو حضرت اُمِ سلمہؓ ان کو بہلانے کے لیے دودھ منہ میں دے دیتیں، پھر ان کی ماں لوٹ کر دودھ دیتیں۔ اس طرح حضرت خیرہؒ کے خوش بخت فرزند کو اُمّ المؤمنین حضرت اُمِ سلمہؓ کی رضاعت کا شرف حاصل ہو گیا۔ حضرت خیرہؒ نے جہاں حضرت اُمِ سلمہؓ سے علمِ حدیث حاصل کیا وہاں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے چشمۂ علم سے بھی اپنی پیاس بجھائی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی تصنیف "سیرۃ عائشہؓ" میں ان کو اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شاگرد بتایا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت اُمِ سلمہؓ آسمانِ علم و ہدایت کی مہر و ماہ تھیں۔ جس خاتون نے ان دونوں سے کسبِ فیض کیا ہو اس کے مرتبۂ علمی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(تابعین)

بی بی صفیہ بنتِ ابی عبید ثقفی

فقیہ الامّت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اہلیہ اور سیدنا فاروقِ اعظمؓ کی بہو تھیں۔ ان کا شمار اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد خواتین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ اور حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ وغیرہ سے روایت کی ہے۔ ان سے متعدد تابعین عظام مثلاً حضرت سالمؒ بن عبداللہ، حضرت نافعؒ اور حضرت عبداللہ بن صفوانؒ نے روایت کی ہے۔ عجلی نے ان کو "تابعۃ ثقہ" لکھا ہے۔ ابنِ حبانؒ نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔

حضرت صفیہؒ کے سات بچے ہوئے، ابوبکر، ابوعبیدہ، واقد، عبداللہ، عمر، حفصہ اور سودہ۔ مختار بن ابی عبید ثقفی جس نے قاتلانِ حسینؓ سے سانحۂ کربلا سے انتقام لیا۔ حضرت صفیہؒ کا بھائی تھا۔ سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔ (طبقات ابن سعد، تہذیب التہذیب)

حضرت اُمِّ محمد بنتِ قیس

قریش کے خاندان بنو مطّلب سے تعلق تھا۔ والد کا نام قیس بن مخرمہ بن مطّلب بن عبد مناف بن قصیٰ تھا اور والدہ کا درّہ بنت عقبہ بن رافع جو انصار کے خاندان اوس کی شاخ بنو عبد الاشہل سے تھیں۔ انہوں نے اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت مُنیّہ بنتِ محرز

ان کا تعلق بنو حارث بن کعب سے تھا۔ بصرے کی رہنے والی تھیں۔ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ سے روایت کرتی ہیں۔ ان سے موسیٰ بن قطنؒ نے روایت کی ہے۔ (طبقات ابن سعد)

بی بی ملیکہؒ بنتِ منکدر

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ[1] سے روایت ہے کہ ایک دن ہم خانۂ کعبہ کے طواف میں مصروف تھے کہ میں نے ایک خاتون کو دیکھا جو حجرِ اسود کے قریب کھڑی ہوئی رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں:

"اے میرے اللہ! مجھ پر رحم فرما، اے میرے اللہ مجھ پر رحم فرما، میں تیرے گھر میں بہت دور سے حاضر ہوئی ہوں، اے میرے پروردگار میں تیرے رحم و کرم کی امید پر آئی ہوں، تو مجھ کو اس دنیا میں کسی کا محتاج نہ بنا۔"

---

[1] حضرت ابو یحییٰ مالک بن دینار البصریؒ کا شمار پہلی / دوسری ہجری کے اکابر اولیاء میں ہوتا ہے۔ امام نوویؒ نے ان کو "الزاہد التابعی" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ علامہ ابن خلکانؒ کہتے ہیں کہ وہ عالم، زاہد اور کثیر الورع والتقویٰ تھے۔ ابن العماد حنبلیؒ نے لکھا ہے کہ وہ بڑے سردار اور مشہور ولی تھے۔

ان کا تعلق ایک غلام خاندان سے تھا۔ اپنے ہاتھ سے قرآنِ پاک کی کتابت کر کے روزی کماتے تھے۔ زخارفِ دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خوفِ خدا سے اکثر لرزہ براندام رہتے تھے۔ اپنے ہر کام میں رضائے الٰہی کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ ۱۳۰ھ ہجری میں وفات پائی۔ مرنے سے پہلے وصیت کی کہ میرا دم نکل جائے تو میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈالیں اور میرے ہاتھوں کو گردن کے پیچھے لے جا کر باندھ دیں۔ پھر اسی حالت میں مجھے دفن کر دیا جائے تاکہ جب میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں تو ایک بھگوڑے غلام کی طرح حاضر ہوں۔ (غلامانِ اسلام)

حضرت مالک بن دینارؒ کہتے ہیں کہ ہم ان خاتون کی الحاح وزاری سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی قیام گاہ کا پتہ معلوم کیا تاکہ ان کے حالات سے آگاہ ہو سکیں پھر ہم ان کی قیام گاہ پر پہنچے اور کچھ دیر ان سے گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے فرمایا:

"اب آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ اتنی دیر آپ نے مجھے اپنے ساتھ گفتگو میں مصروف رکھا اور یوں مجھ کو اپنے رب کی عبادت سے محروم رکھا۔"

راوی کا بیان ہے کہ اُن خاتون کا نام ملیکہؒ بنتِ منکدر تھا۔

(صفتہ الصفوۃ لابن جوزی ص ۱۲ ج ۲)

حضرت مغیرہؒ بنتِ حسّان

انہوں نے خادم رسول اللہؐ حضرت انسؓ بن مالک کو دیکھا تھا اور ان کے ارشادات سُنے تھے۔ ان کے بھائی کا نام حجاج بن حسان تھا حضرت مغیرہؒ نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کی ہے اور ان کے بھائی حجاجؒ نے ان کی حدیث بیان کی ہے۔

(الاکمال فی اسماء الرجال)

حضرت بُنانہ مولاۃ عبدالرحمٰنؒ

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن حیان کی لونڈی تھیں۔ انہوں نے آزاد کر دیا۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خوانِ علم سے ریزہ چینی کرنے والی خواتین میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتی ہیں اور ان سے ابن جریجؒ نے روایت کی ہے۔

(الاکمال)

حضرت زینبؒ بنت مہاجر احمسیہ

علامہ ابن سعدؒ نے ان کا شمار تابعیات میں کیا ہے اور ان سے یہ روایت نقل کی ہے کہ میں (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں) ایک عورت کے ساتھ حج کے لیے مکہ معظمہ گئی۔ وہاں میں نے ایک خیمہ گاڑ لیا اور کسی سے بات نہ کرنے کی نذر مان لی۔ پھر ایک صاحب نے خیمے کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "السّلامُ عَلَیکُم"

میرے ساتھ والی عورت نے سلام کا جواب دیا۔ اُن صاحب نے پوچھا — "میں نے جس کو سلام کیا تھا اس نے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟"
میری ساتھی عورت نے کہا "یہ خاموش ہے اور اس نے کلام نہ کرنے کی منت مان رکھی ہے۔"

انہوں نے کہا: "اے عورت کلام کر کیونکہ کلام نہ کرنے کی منت ماننا جاہلیت کی رسم ہے۔"

میں نے کہا، "آپ کون ہیں؟ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔"
انہوں نے کہا: "میں ایک مہاجر ہوں۔"
میں نے کہا: "آپ کن مہاجروں میں سے ہیں۔"
انہوں نے کہا: "قریش سے۔"
میں نے پوچھا: "قریش کے کس قبیلے سے؟"
انہوں نے کہا: "تم تو بڑی سوال کرنے والی ہو۔ میں ابوبکرؓ ہوں۔"
میں نے کہا: "اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! ہمارا جاہلیت کا زمانہ تازہ تازہ ہے اور ہم میں سے بعض بعض سے بے خوف نہیں۔

اب اللہ نے ہمیں اسلام کی نعمت عطا کی ہے یہ کب تک باقی رہے گی؟"
حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "جب تک تمہارے امام صحیح رہیں گے۔"
میں نے پوچھا: "امام کون ہیں؟"
فرمایا: "کیا تمہاری قوم میں شرفاء نہیں ہیں جن کی بات مانی جاتی ہے۔"
میں نے کہا: "ہاں"
فرمایا: "یہی امام ہیں۔" (طبقات ابن سعد)

حضرت اُمِّ عثمانؓ

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہؓ بن سراقہ کی صاحبزادی اور سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نواسی تھیں۔ والدہ کا نام زینب بنت عمرؓ بن خطاب تھا۔ (زینبؓ حضرت عمرؓ کی سب سے چھوٹی اولاد تھیں ان کی والدہ فکیہہ اُمِّ ولد تھیں) اُمُّ المؤمنین حضرت حفصہؓ، حضرت اُمِّ عثمانؓ کی خالہ تھیں، وہ انہی سے روایت کرتی ہیں۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت اُمِّ محمدؓ تیمیہ

یزیدؒ بن مہاجر تیمی کی صاحبزادی ہیں والدہ کا نام ہند بنت مالک تھا وہ اُمُّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ عورت پورے کُرتے اور دوپٹے میں نماز پڑھے۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت اُمِّ عمروؒ بنتِ خوّاتؓ

جلیل القدر صحابی حضرت خوّاتؓ بن جُبیر اوسی انصاری کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسبِ فیض کیا اور انہی سے روایت کی ہے۔ اُن کے بھتیجے خوّات بن صالحؒ ان سے روایت کرتے ہیں کہ ایک انصاری خاتون حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اُس وقت میں بھی وہاں حاضر تھی۔ اس نے کہا کہ میری بیٹی کو ایک سخت مرض لاحق ہوگیا ہے جس سے اس کے بال گر جاتے ہیں اور ان میں کنگھی نہیں کی جاسکتی حالانکہ وہ دلہن بنائے جانے والی ہے۔ کیا میں اس کے بالوں میں بال ملا دوں تاکہ کنگھی کر سکوں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بال ملانے والی اور ملوانے والی دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

(طبقات ابنِ سعد)

حضرت حُسناؒ بنتِ معاویہؓ

یہ اپنے چچا سے روایت کرتی ہیں اور چچا رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے دو چچا تھے جن کے نام حارثؓ اور اسلمؓ تھے۔

صاحب "الاکمال فی اسماء الرّجال" کہتے ہیں کہ ان کی حدیث اہلِ بصرہ میں رائج تھی۔ حازمی نے ان کا نام خنسا بنت معاویہ لکھا ہے اور بعض نے حُسنا صرمیہ لکھا ہے۔ بہر صورت ان کا شمار تابعیات میں ہوتا ہے۔

(الاکمال فی اسماء الرجال)

حضرت معاذہ عدویہؒ

حضرت معاذہؒ بنتِ عبداللہ عدویہؒ کا شمار جلیل القدر تابعات میں ہوتا ہے۔ بصرہ کی رہنے والی تھیں اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شاگرد تھیں۔ اُمّ المومنینؓ کی بہت سی حدیثیں ان کی زبانی مروی ہیں۔ زہد و عبادت میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں اور اپنے دور کی عظیم المرتبت عارفات میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کی شادی صلۃ بن اشیم سے ہوئی تھی۔

جب اُن کے شوہر کا انتقال ہوا تو انہوں نے دل میں عہد کیا کہ اب کبھی بستر اور تکیہ استعمال نہ کروں گی۔ یہ عہد انہوں نے تادمِ مرگ نباہا۔ ان کو ہر وقت موت کا دھیان رہتا تھا۔ صبح ہوتی تو خیال کرتیں کہ بس آج آخری دن مہلت کا ہے اور آج ہی مجھ پر موت وارد ہو جائے گی۔ جب رات ہوتی تو خیال کرتیں کہ بس یہ زندگی کی آخری رات ہے، جس قدر یادِ خدا ہو سکے، کر لو۔ چنانچہ اسی طرح دن رات عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتیں۔ رات کو نیند کا غلبہ ہوتا تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتیں اور نفس سے مخاطب ہو کر فرماتیں:

"نیند تیرے سامنے ہے، قبر میں سونے کا خوب موقع ملے گا۔"

رات دن میں کئی سو نوافل، سنن و فرائض کے علاوہ پڑھتیں۔ ایک دن کسی نے ان سے کہا:

"اے رابعہ! تم اپنے نفس کو ضرورت سے زیادہ تکلیف دیتی ہو۔"

فرمایا: ———

"تکلیف کیسی بھائی، رات کو جب نیند آتی ہے تو نفس سے

کہتی ہوں کہ اب خدا کی یاد کر۔ جب زندگی کی شام ہو گی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوتے رہنا۔ دن کو بھوک لگتی ہے تو نفس سے کہتی ہوں کہ اب کام کرنے کا وقت ہے، رات کو فرصت سے کھا لینا۔ بھلا یہ بھی کوئی تکلیف کی بات ہے؟"

ایک دفعہ بیمار پڑیں۔ طبیب نے نبیذ تجویز کی۔ جب نبیذ تیار ہوئی اور انہوں نے اس کا پیالہ ہاتھ میں لیا تو دعا کی:

"خداوندا تو جانتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیذ پینے سے منع فرمایا ہے۔"

خدا کی قدرت، پیالہ اسی وقت اُن کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ اچھی ہو گئیں۔

حضرت معاذہؒ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علاوہ حضرت علیؓ اور حضرت ام عمروؓ سے بھی روایت کی ہے اور ان سے ابو عاصمؒ، ابو قلابہؒ، قتادہؒ، یزید الرشکؒ، اور حسن بصریؒ کی والدہ نے روایت کی ہے۔ حضرت یحییٰ بن معینؒ نے انہیں ثقہ اور حجۃ کہا ہے۔ ابن حبانؒ نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔

جعفر بن کیسانؒ سے روایت ہے کہ میں نے معاذہؒ کو پیروں کے بل بیٹھے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے دونوں ٹانگوں اور پیٹھ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا اور ان کے چاروں طرف عورتیں تھیں۔

حضرت معاذہؒ کا سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔

(طبقات ابن سعد، تہذیب التہذیب، نفحات الانس)

حضرت سکینہؓ بنتِ حسینؓ

سیدنا حضرت حسینؓ (شہیدِ کربلا) بن علیؓ کی صاحبزادی تھیں۔ سالِ ولادت بعض مؤرخین نے ۵۲ھ لکھا ہے لیکن اس میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کا اصل نام اُمیمہ تھا لیکن انہوں نے سکینہ کے نام سے شہرت پائی۔ سکینہ کا تلفظ عام طور پر "سَکِینَہ" کیا جاتا ہے (بروزنِ سَفِینَہ) لیکن "القاموس" کے مطابق صحیح تلفظ سُکَینَہ (بروزنِ جُہَینَہ) ہے۔ وہ سیدنا حضرت حسینؓ کے شیرخوار صاحبزادے حضرت علی اصغر (شہیدِ کربلا) کی حقیقی بہن تھیں۔ والدہ کا نام رباب تھا جو بنو کلب کی شاخ بنو عدی کے مشہور سردار امرؤ القیس بن عدی بن اوس کی بیٹی تھیں۔

حضرت سکینہؓ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں شیعی اور غیر شیعی مصنفین کے ہاں بے حد اختلاف ہے۔ شیعی مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت سکینہ واقعۂ کربلا میں کمسن تھیں اور جس وقت یہ سانحہ پیش آیا وہ اپنی والدہ کے ساتھ میدانِ کربلا میں موجود تھیں۔ سیدنا حضرت حسینؓ اپنی اس صغیر السن بچی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ سکینہ پر استغراق مع اللہ کا غلبہ ہے۔ واقعۂ کربلا کے بعد خواتینِ اہلِ بیت کو قید کر کے شام لے جایا گیا تو حضرت سکینہؓ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ آغا مہدی نے "سکینہ بنتِ حسینؓ" میں لکھا ہے کہ دمشق میں ایک مزار حضرت سکینہؓ کی طرف منسوب ہے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے قید کی حالت میں شام میں وفات پائی لیکن سید علی نقی مجتہد نے اپنی کتاب "شہیدِ انسانیت" میں لکھا ہے کہ واقعۂ کربلا کے بعد حضرت سکینہؓ کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں وہ معتبر اور مستند طریقہ سے ثابت نہیں۔

غیر شیعی مؤرخین نے حضرت سکینہؓ کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت سکینہؓ نے طویل عمر پائی۔ ان کا پہلا نکاح سیدنا حضرت حسنؓ بن علیؓ کے صاحبزادے حضرت ابوبکر عبداللہ سے ہوا۔ دوسرا نکاح حضرت زبیرؓ بن العوام (یکے از اصحاب عشرہ مبشرہ) کے صاحبزادے مصعب سے ہوا۔ ان کی شہادت کے بعد وہ عبداللہ بن عثمان خرامی کے عقدِ نکاح میں آئیں ان کے بعد ان کا چوتھا اور آخری نکاح زید بن عمرو بن عثمانؓ بن عفان سے ہوا۔ عبداللہ سے ان کے ایک بیٹی رباب پیدا ہوئی جو کمسنی میں فوت ہو گئی۔ زید سے ایک بیٹے عثمان پیدا ہوئے جو مدینہ میں قرین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان مؤرخین نے حضرت سکینہؓ کی شرافت و نجابت، ذہانت و ذکاوت، حسنِ صورت و سیرت، جود و سخا، نرم دلی، سخن پروری اور تقویٰ و طہارت کی بہت تعریف کی ہے۔ الزرکلی نے ان کو "سیدۃ نساء عصر" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت سکینہ عرب کے کئی نامور شعراء کی سرپرستی کرتی تھیں۔ ان میں جریرؔ فرزدقؔ جمیلؔ کثیرؔ اور ابنِ سریج کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ابنِ خلکان اور کچھ دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت سکینہؓ نے ۵ ربیع الاول سنہ ۱۱۷ ہجری کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے مصر میں وفات پائی اور ان کا مدفن بھی وہیں ہے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت سکینہؓ کی زندگی میں صرف ایک نکاح ہوا۔ یہ نکاح سیدنا حضرت حسنؓ کے صاحبزادے حضرت ابوبکر عبداللہؓ سے ہوا تھا ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ کربلا کا سانحہ پیش آگیا اور حضرت ابوبکر عبداللہؓ میدانِ کربلا میں دوسرے اصحابِ حسینؓ کے ساتھ شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت سکینہؓ نے پھر کسی سے شادی نہیں کی اور ساری عمر عبادتِ الٰہی میں گزار دی۔ ان مؤرخین نے ان کے زہد و تقویٰ اور اخلاقِ حسنہ کی بہت تعریف کی ہے۔

دوسری طرف ابوالفرج اصفہانی نے "کتاب الاغانی" میں حضرت سکینہ

کے بارے میں عجیب وغریب قصے بیان کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بڑی خوش ذوق خاتون تھیں۔ شعر وموسیقی کی دلدادہ تھیں اور ان کے مکان پر شاعروں، گویّوں اور دوسرے ارباب کمال کا جمگھٹا رہتا تھا جن کو وہ دل کھول کر انعام واکرام سے سرفراز کرتی رہتی تھیں۔ قطع نظر اس کے کہ ابوالفرج اصفہانی ایسا معتبر مؤرخ نہیں کہ اس کی باتوں کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیا جائے یہ بات ویسے بھی دور از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ خاندانِ نبوّت سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون جس نے نہایت پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی ہو اور کربلا کا دلدوز سانحہ بھی اس کی آنکھوں کے سامنے گزر چکا ہو وہ ایسی آزاد خیال اور تفریح پسند ہو جائے کہ احکامِ شریعت کو یکسر پسِ پشت ڈال دے۔ مگر ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے بعض اچھے بھلے مؤرخین نے بھی ابوالفرج کے تتبع میں اسی قسم کی باتیں اپنی کتابوں میں لکھ دی ہیں۔ ان میں مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم اور جسٹس سید امیر علی مرحوم پیش پیش ہیں۔ "مشاہیرِ نسواں" میں مؤخر الذکر کے حوالے سے ہمیں یہ عبارت ملتی ہے :-

> "حضرت سکینہ کی قابلیت کا اس قدر چرچا تھا کہ اُس عصر کی عورات ان کی وضع قطع پر چلنا اپنا فخر سمجھتی تھیں۔ ان کے ایک ایک لباس کی نقل ہوتی تھی خاص کر عورتوں کے سر کا لباس جو آپ نے ایجاد کیا اور آپ کے نام نامی پر "طُرّۃ السکینہ" کہلایا اس قدر مقبول ہوا کہ کچھ صدیوں کے بعد لیڈی مانٹیگ نے اس کو انگلستان میں رائج کیا۔ سکینہ فقط لباس ہی کے معاملے میں فیشن کی موجد نہ تھیں بلکہ علمی مذاق کی باتوں پر بھی ان کو وہی اقتدار حاصل تھا اگرچہ خلفائے بنی امیہ آپ کی حیرت انگیز قابلیت کو رشک سے دیکھتے تھے اور ان کے مکان میں علمی مجلسوں کا انعقاد ان کو گوارا نہ تھا لیکن وہ باہمت ہاشمیہ مرتے دم تک ایسی مجلسیں کرتی رہی۔ وہ خدمت گار کنیزوں کے جھرمٹ

میں تمکنت کے ساتھ بیٹھ کے دور دور کے علماء فضلاء کی تواضع
کرتی اور بڑے بڑے شعراء آکر اس سے رائے لیتے اور دادِ شاعری
کے خواہاں ہوتے۔ اس کی متواتر فیاضیوں نے اسلامی دنیا کو ترقی
دی اور اس کی بے لاگ نکتہ چینیوں نے بہت سے اہلِ کمال کو
دل شکستہ بنایا۔"

سید امیر علی کی یہ عبارت آرائی حضرت سکینہؓ کی مدح ہے یا ذم، اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

حضرت سکینہؓ بلاشبہ تاریخ اسلام کی ایک نامور شخصیت ہیں لیکن ان کی زندگی کے بہت کم پہلو ایسے ہیں جن کے بارے میں کوئی بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہو۔

(ابنِ خلکان۔ ابنِ سعد، مشاہیر نسواں، شرف النساء، اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

حضرت عُدَیسہؓ بنتِ اہبانؓ

بنو غفار سے تھیں۔ والد کا نام اہبانؓ بن صیفی تھا جن کو صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں۔

عبداللہ بن عبیدؒ حضرت عدیسہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ میرے والد کے پاس تشریف لائے اور ان کو اپنے لشکر میں شامل کرنا چاہا۔ میرے والد نے کہا، "میرے دوست اور آپ کے ابن عمؐ نے حکم فرمایا ہے کہ جب لوگوں میں اختلاف ہو تو میں لکڑی کی تلوار بنالوں چنانچہ اب میں نے لکڑی کی تلوار بنالی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں یہی تلوار لے کر آپ کے لشکر میں شامل ہو جاؤں۔ آخر کار حضرت علیؓ نے ان کو چھوڑ دیا۔ (طبقات ابن سعد)

بی بی عفیرہ عابدہؒ

بصرہ کی رہنے والی تھیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مشہور شاگرد حضرت معاذۃ عدویہؒ سے کسبِ فیض کیا اور علم و عرفان میں اتنا بلند مقام حاصل کیا کہ اپنے دور کی عارفاتِ کاملہ میں شمار ہوئیں۔ ہر وقت عبادت و ریاضت میں مشغول رہتی تھیں۔ خوفِ خدا سے اس قدر رویا کرتی تھیں کہ آخری عمر میں نابینا ہو گئیں۔ کسی نے کہا، بڑی بی، اندھا ہونا بڑی بدنصیبی ہے۔

بی بی عفیرہؒ نے جواب دیا: —— "اللہ تعالیٰ کے روبرو شرمندہ ہونا اس نابینائی سے زیادہ بدنصیبی ہے اور دل کا خدا کی جانب سے اندھا ہو جانا اس سے بھی بڑی بدنصیبی ہے۔"

روح بن سلمہؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے عفیرہ عابدہؒ سے کہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ رات کو سوتی نہیں ہیں۔

یہ سُن کر وہ رونے لگیں اور فرمایا: —— "میں خود چاہتی ہوں کہ کچھ سو لوں لیکن تم خود ہی بتاؤ میں کیسے سو سکتی ہوں جبکہ انسان کے دونوں محافظ (مقررہ فرشتے) دن اور رات کسی وقت بھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔"

ایک دفعہ کچھ عابد اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی۔ بی بی عفیرہؒ نے فرمایا: ——

"بھائیو! اگر گنہگاروں کی زبانیں خدا بند کر دیتا تو یہ بڑھیا گونگی ہوتی مگر چیر دُعا مانگنا سُنّت ہے۔ اللہ جنّت کے میروں سے تمہاری مہمانی فرمائے میرے اور تمہارے دلوں میں اپنے کرم سے موت کی یاد ڈالے اور مرتے دم تک ایمان سلامت رکھے۔"

(نفحات الانس صفۃ الصفوۃ)

بی بی خنساء بنتِ خدامؒ

حضرت حفص بن عمر الجعفیؒ فرماتے ہیں کہ خنساء بنتِ خدامؒ یمن کی رہنے والی تھیں۔ وہ بڑی پاکباز عبادت گزار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ انہوں نے چالیس سال متواتر روزے رکھے جس کی وجہ سے ہڈی اور چمڑہ ایک ہوگیا تھا۔ وہ یادِ الٰہی میں اس قدر روتی رہتی تھیں کہ رفتہ رفتہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ امام طاؤس بن کیسانؒ[1] اور امام وہب بن کیسانؒ[2] بھی ان کی بہت تعظیم کرتے تھے۔

جب رات آجاتی اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا تو ان کی درد و اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوتی:

"اے خالقِ ارض و سما میں کب تک اس دنیا میں قید رہوں گی مجھے جلد نجات دے تاکہ میں تیرا وعدہ پورا ہوتا ہوا دیکھ سکوں۔"

پھر ان پر گریہ طاری ہو جاتا اور پھر وہ دیر تک روتی رہتیں۔ ان کے رونے کی آواز پڑوسیوں تک بھی پہنچتی رہتی۔

(صفۃ الصفوۃ)

---

[1] پہلی صدی ہجری میں جلیل القدر تابعی ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۰۶ھ میں وفات پائی۔ فضل و کمال کے اعتبار سے بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ حدیث کے بڑے حافظ اور فقہ کے بلند پایہ عالم تھے۔ زہد و عبادت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

[2] مشہور تابعی ہیں۔ سنہ ۳۴ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ دوسرے مذاہب کے صحیفوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔ عابدِ شب بیدار اور نہایت حلیم الطبع تھے۔

بی بی اُمّ الخیر بنتِ حریش

اُمّ الخیر بنتِ حریش بن سراقۃ البارقی کوفہ کی ایک نڈر اور بیباک خاتون تھیں۔ وہ جنگِ صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے ساتھ تھیں اور نہایت فصیح و بلیغ رجزیہ اشعار پڑھکر لوگوں کو ان کی مدد پر ابھارتی تھیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ والیٔ کوفہ کو فرمان بھیجا کہ اُمّ الخیر بنت حریش کو عزت و احترام کے ساتھ میرے پاس دمشق بھیج دو۔ والیٔ کوفہ نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ دمشق پہنچیں تو امیر معاویہؓ نے ان کو اپنے حرم میں اتارا اور پھر ایک دن ایوانِ خلافت میں بلا بھیجا۔ انہوں نے دربار میں آتے ہی کہا:

"السلام علیک یا امیر المومنین و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ"

امیر معاویہؓ نے جواب مسنون دے کر فرمایا ــــــ "اُمّ الخیر میں اب کس طرح امیر المومنین کے لقب کا مستحق ہو گیا؟"

بولیں:ــــ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَاب (یعنی ہر بات کا ایک وقت معین ہے)

امیر معاویہؓ نے ان کی مزاج پرسی کی تو انہوں نے کہا "اللہ تعالیٰ نے خیر و عافیت کے ساتھ ایک روشن مجلس اور مہربان حکمران کی خدمت میں پہنچا دیا۔"

امیر معاویہؓ نے فرمایا ــــــ "میں اپنے حسنِ نیت ہی سے تم لوگوں پر فتح مند ہوا ہوں۔"

اُمّ الخیرؒ:۔ "اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ آپ کو لغزشِ مقال سے بچائے۔"

امیر معاویہؓ نے فرمایا: "نہیں میرا ارادہ نیک تھا اے اُمّ الخیر! تم کو وہ تقریر یاد ہے جو تم نے عمار بن یاسرؓ کے قتل کے وقت کی تھی؟

اُمّ الخیرؒ:۔ "اگر پہلے سے تیاری کی ہوتی تو یاد بھی رہتی، چند جملے تھے جو صدمے

کے سبب آپ ہی آپ زبان سے نکل گئے تھے۔ اس کے سوا اگر کوئی اور کلام سُننا چاہتے ہیں تو حاضر ہوں۔"

امیر معاویہؓ نے حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا، کسی کو اس کی تقریر یاد ہے؟ ایک صاحب نے اُمّ الخیر کی اس فصیح و بلیغ اور پُرجوش تقریر کے چند جملے امیرؓ کے سامنے پڑھے ان میں حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے گئے تھے اور لوگوں کو اہلِ شام سے لڑنے پر ابھارا گیا تھا۔

اب امیر معاویہؓ نے اُمّ الخیر سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔ "اے اُمّ الخیر! تیری اس تقریر نے تو لوگوں کو میرے خون کا پیاسا بنا دیا تھا۔ واللہ اگر اب میں تجھے قتل کر ڈالوں تو اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔"

اُمّ الخیرؓ: "واللہ مجھے ہرگز افسوس نہ ہوگا کیونکہ آپ کی شقاوت میری سعادت کا باعث ہوگی اور میں شہید کہلاؤں گی۔"

حضرت امیر معاویہؓ: "حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں تو کیا کہتی ہے؟"

اُمّ الخیرؓ: "جب وہ خلیفہ ہوئے لوگ ان سے راضی تھے اور جب وہ شہید کیے گئے تو لوگ اُن سے ناراض تھے۔"

امیر معاویہؓ: "مدح ایسی ہی گول مول ہوتی ہے۔"

اُمّ الخیرؓ: "خدا گواہ ہے اس سے کوئی اور مطلب نہیں۔ وہ سابقون الاولون میں سے تھے اور بیشک آخرت میں ان کا درجہ بلند ہے۔"

امیر معاویہؓ: "حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے تمہارا کیا خیال ہے؟"

اُمّ الخیرؓ: "جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہو اور جو آپؐ کی پھوپھی کے بیٹے اور آپؐ کی ہر مصیبت کے ساتھی ہوں، ان کے حق میں میری رائے کیا وزن رکھتی ہے؟"

اس کے بعد اُمّ الخیرؓ نے کہا، اے امیر آپ قریش میں احلم الناس مشہور ہیں اس قسم کے سوالوں سے مجھے معذور رکھیے ـــــ چنانچہ امیر معاویہؓ نے سوالات موقوف کر دیئے اور اُمّ الخیر کو ایک بیش قرار انعام دے کر رخصت کر دیا۔

(مشاہیر نسواں)

بی بی زرقاءؓ

ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ ہمدان سے تھا۔ عدی بن قیس کی بیٹی تھیں، اور اپنے قبیلے کی فصیح البیان شاعرات میں شمار ہوتی تھیں۔ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے شریک تھیں اور رجزیہ اشعار پڑھ پڑھ کر اپنے قبیلے کو لڑائی کے لیے ابھارتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پُرجوش اشعار سُن سُن کر ان کا قبیلہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ آخر دم تک لڑتا رہا۔ لڑائی کے بعد وہ کوفہ چلی گئیں اور اپنے گھر میں خاموشی سے زندگی کے دن گزارنے لگیں۔

ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہؓ کے دربار میں زرقاء کا ذکر چل پڑا۔ اہلِ دربار میں سے بعض نے کہا کہ زرقاء کے اشعار نے بڑا غضب ڈھایا اور کئی مرتبہ لڑائی کا رخ بدل ڈالا۔ امیر معاویہؓ نے پوچھا: "بتاؤ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے؟"

مصاحبوں نے کہا: "اے امیر یہ عورت واجب القتل ہے۔"

امیر معاویہؓ نے فرمایا، "یہ تو بہت بُرا مشورہ ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ میرے بعد یہ کہیں کہ معاویہ نے ایک عورت پر قابو پا کر اس کو قتل کر ڈالا میں ہرگز ایسا نہ کروں گا۔"

پھر انھوں نے عاملِ کوفہ کو خط لکھا کہ زرقاء کو عزت و احترام کے ساتھ چند معتمد محرموں اور قبیلہ کے سرداروں کے ہمراہ میرے پاس دمشق بھیج دو۔

عاملِ کوفہ کو یہ خط ملا تو اس نے زرقاء کو طلب کر کے امیر کے فرمان سے آگاہ کیا۔ زرقاء نے کہا، اگر امیر نے میرا دمشق جانا میری مرضی پر رکھا ہے تو میں وہاں نہ جانا بہتر سمجھتی ہوں اور اگر یہ امیر کا حتمی حکم ہے تو بہر حال اسے ماننا پڑے گا۔

عاملِ کوفہ نے کہا کہ یہ حکم تو قطعی ہے۔ چنانچہ اس نے زرقاء کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دمشق روانہ کر دیا۔ جب وہ امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے پہلے ان کی خیریت پوچھی اور پھر دریافت کیا کہ سفر کیسے طے ہوا۔

زرقاءؓ نے جواب دیا۔ "جس طرح لڑکی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے یا بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔"

امیرؓ نے فرمایا۔ "ہم نے عاملِ کوفہ کو اسی طرح ہدایت کی تھی۔ تم کو معلوم ہے کہ میں نے تم کو کس لیے یہاں بلایا ہے؟"

زرقاء بولیں، "جس چیز کا مجھے علم نہیں میں اسے کیسے جان سکتی ہوں۔"

امیر معاویہؓ نے فرمایا۔ "اے زرقاء کیا تو وہی نہیں جو صفین کی لڑائی میں سُرخ اونٹ پر سوار ہو کر لوگوں کو لڑائی کے لیے مشتعل کر رہی تھی تو نے کیوں ایسا کیا؟"

زرقاء نے کہا: "اے مسلمانوں کے امیر! جو کچھ ہونا تھا سو ہوا اب ماضی کو بھول جائیے۔ دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے کہ ایک حالت کے بعد دوسری حالت ہوتی ہے۔"

امیر معاویہؓ: "کیا تم کو اپنا اُس دن والا خطبہ یاد ہے؟"

زرقاء: "بخدا مجھے یاد نہیں۔ میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔"

امیر معاویہؓ: "لیکن میں تو نہیں بھولا۔ سنو! تم علیؓ کی فوج اور اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں:

"تم اس فتنے سے بچو جو تم کو ظلمت کی طرف دھکیل رہا ہے اور لوگوں کو راہِ راست سے بھٹکا رہا ہے۔ یہ کیسا اندھا، بہرا اور گونگا فتنہ ہے کہ نہ ہانکنے والوں کی ہانک سنتا ہے اور نہ کھینچنے والوں کی مرضی پر چلتا ہے۔ دیکھو چراغ آفتاب کے سامنے روشن نہیں ہوتا۔ اے مہاجرین یاد رکھو، عورتوں کی آرائش مہندی سے ہے اور مردوں کی خون سے۔۔۔۔۔۔"

بی بی دارمیتہ الحجونیہؒ

حضرت امیر معاویہؓ اپنے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ وہاں انہوں نے اہلِ مکہ سے بنو کنانہ کی ایک خاتون دارمیہ کا حال دریافت کیا جو حجون میں رہتی تھیں اور دارمیتہ الحجونیہ کے نام سے مشہور تھیں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ وہ زندہ سلامت موجود ہے۔ امیر معاویہؓ نے ان کو بُلا بھیجا۔ جب وہ امیر کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے فرمایا:

"اے حام کی بیٹی! جانتی ہو کہ تم کو کیوں بلایا گیا؟"

دارمیہ نے جواب دیا۔ "میرا حام سے کوئی واسطہ نہیں باقی رہی یہ بات کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے تو غیب کا علم اللہ ہی کو ہے۔"

امیر معاویہؓ نے فرمایا: "میں نے یہ پوچھنے کے لیے بلایا ہے کہ تو نے علیؓ کا ساتھ کیوں دیا اور مجھ سے کیوں دشمنی رکھی؟"

دارمیہؒ: "کیا آپ مجھے اس سوال کے جواب سے معاف نہ رکھیں گے؟"

امیر معاویہؓ: "نہیں تمہیں میرے سوال کا جواب دینا ہوگا۔"

دارمیہؒ: "آپ اصرار کرتے ہیں تو میں بتائے دیتی ہوں۔ میں علیؓ کو اس لیے دوست رکھتی تھی کہ وہ رعیت سے انصاف کرتے تھے۔ سب کو استحقاق کے مطابق حقوق دیتے تھے۔ مسکینوں سے محبت اور دینداروں کی عزت کرتے تھے۔ آپ کی اس لیے مخالف تھی کہ (میری دانست کے مطابق) آپ اپنے سے افضل کے ساتھ لڑے اور جس کے آپ مستحق نہ تھے اس حق کے طالب ہوئے۔ آپ نے خونریزی کرائی۔ ...."

امیر معاویہؓ: "کیا تو نے علیؓ کا کلام بھی سُنا؟"

زرقاء : " اے امیر! اللہ آپ کا بھلا کرے آپ نے بھولے بسرے واقعات یاد دلا کر میرا خون گرما دیا اور میری مردہ روح کو پھر زندہ کر دیا۔"

امیر معاویہؓ : "کیا تو علیؓ کا ساتھ دینے پر اب بھی خوش ہے؟"

زرقاء : "صرف خوش ہی نہیں بلکہ مجھے اس پر فخر ہے۔"

امیر معاویہؓ : " اے زرقاء! علیؓ کے ساتھ تیری وفاداری ان کی وفات کے بعد زیادہ قابلِ عزت ہے بہ نسبت اس عقیدت اور محبت کے جو ان کی زندگی میں تم ان کے ساتھ رکھتی تھیں۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف مجھ سے مانگو۔"

زرقاء : " جس شخص کے خلاف میں لوگوں کو بھڑکاتی رہی اور آمادۂ پیکار کرتی رہی اب اس کے سامنے دستِ سوال کیسے دراز کروں؟ ہاں بغیر سوال اور خواہش کے جو کچھ ملے گا اس سے انکار نہیں کروں گی۔"

حضرت امیر معاویہؓ بھی تحمل اور عفو و درگزر میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے بی بی زرقاءؓ اور ان کے ساتھیوں کو انعام و اکرام اور قیمتی خلعت دے کر رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد انہوں نے درباریوں کے سامنے بی بی زرقاء کی آزادانہ روش کی تعریف کی۔ (عقد الفرید۔ شرف النساء۔ مشاہیر نسواں)

دارمیہؒ: "کیوں نہیں، خود ان کی زبان سے سُنا جب وہ بولتے تھے تو دل کی گمراہی ایسے دور ہو جاتی تھی جیسے برتن کا زنگ زیتون کے تیل سے۔"

اسی طرح کئی اور سوال و جواب ہوئے۔ آخر امیر معاویہؓ نے فرمایا:

"اے دارمیہ! تیری کوئی حاجت ہو تو بیان کر، میں تیری کھری باتوں سے بہت خوش ہوا ہوں۔"

دارمیہؒ: "مجھے سَو سرخ اونٹنیاں عنایت کیجیے جن کے ساتھ ان کے نر اور چرواہے بھی ہوں۔"

امیر معاویہؓ: "ان کو کیا کرو گی؟"

دارمیہؒ: "بچوں کو ان کا دودھ پلاؤں گی اور بڑوں کو حیا دلاؤں گی۔ ان کی وجہ سے قبائل میں شرافت کا درجہ پاؤں گی اور ان میں امن قائم کروں گی۔"

امیر معاویہؓ: "اگر میں تیری یہ حاجت پوری کر دوں تو پھر تیرے دل میں میرے لیے علیؓ کے برابر جگہ ہو گی یا نہیں؟"

دارمیہؒ: "آپ کے لیے بھی کچھ کم جگہ نہ ہو گی۔"

اس پر امیر معاویہؓ نے دو شعر پڑھے جن کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں تیرے ساتھ حلم کا برتاؤ نہ کروں تو پھر کون ہے میرے بعد جس سے امید کی جائے۔ یہ اونٹنیاں تجھ کو مبارک ہوں اور یاد رکھ اس شخص کو جو عداوت کے جواب میں حسنِ سلوک کرتا ہے۔ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے فرمایا، "واللہ اگر علیؓ زندہ ہوتے تو ان حالات میں ایک اونٹنی بھی تجھ کو نہ دیتے۔"

دارمیہ نے کہا: "ہاں خدا کی قسم یہ سچ ہے۔ وہ مسلمانوں کے مال سے ایک پیسہ بھی مجھے عطا نہ کرتے۔"

پھر وہ امیر معاویہؓ کو دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئیں۔

(عقد الفرید)

بی بی بکارہ ہلالیہؒ

عرب کے قبیلہ بنو ہلال کی شیوا بیان شاعرہ تھیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نہایت عقیدت مند اور مداح تھیں جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا تو انہوں نے شروع سے اخیر تک حضرت علیؓ کی پُرجوش حمایت اور حضرت امیر معاویہؓ کی پُرزور مخالفت کی، اس سلسلے میں انہوں نے بہت سے اشعار کہے جو لوگوں کے دلوں میں آگ لگا دیتے تھے۔ امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں وہ اس قدر ضعیف ہو چکی تھیں کہ بدن میں رعشہ تھا اور آنکھوں سے بہت کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک دفعہ امیر معاویہؓ کے دربار میں حاضر ہوئیں اور سلام کر کے بیٹھ گئیں۔ امیر معاویہؓ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

"بکارہ! افسوس زمانہ نے تمہاری حالت کو بہت متغیر کر دیا۔"

بولیں: "اے امیر زمانہ کی گردش ایسا ہی تغیر و تبدل کرتی رہتی ہے جو زندہ رہ جاتا ہے وہ بڈھا ہو جاتا ہے جو مر جاتا ہے گم ہو جاتا ہے۔"

اہلِ دربار میں سے بعض اصحاب نے امیر معاویہؓ کو بکارہ کے بعض اشعار یاد دلائے جو انہوں نے امیرؓ کے خلاف کہے تھے۔ ان میں اس قسم کے اشعار بھی تھے:

"میری آرزو تھی کہ ... جاؤں لیکن بنی امیہ کے کسی خطیب کو منبر پر نہ دیکھوں مگر اللہ نے میری ... دراز کر دی کہ زمانہ کی عجیب نیرنگیاں میری نظر سے گزریں آئے دن ... تم کے خطیب دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں۔"

بکارہ نے یہ باتیں سنیں تو کہا:

"اے امیر مکرنے سے کچھ حاصل نہیں اور جھوٹی خوشامد کی مجھے

عادت نہیں اور اسی قسم کے اور اشعار جو ان کو اور امیر کو معلوم نہیں، ان اشعار سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔"

امیر معاویہؓ یہ سُن کر ہنسے اور فرمایا، "ہوں گے لیکن یہ امر مجھے تمہارے ساتھ نیک سلوک کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ تم اپنی حاجت بیان کرو میں اسے خوشی کے ساتھ پورا کروں گا۔"

بکارہ نے کہا، "(اس بے لطفی کے بعد) اس وقت میں کوئی حاجت بیان نہیں کروں گی۔" ـــــ پھر وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں۔

(عقد الفرید)

حضرت جسرہؒ بنت دجاجہ عامری

کوفہ کی رہنے والی تھیں اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شاگرد تھیں۔ حج اور عمرہ کا بہت شوق تھا۔ فرماتی ہیں کہ میں نے تقریباً چالیس عمرے کیے اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو ربذہ میں دیکھا۔

حضرت صدیقہؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت کرتی ہیں۔ ان سے قدامہ عامریؒ نے روایت کی ہے۔

(طبقات ابن سعد)

اُمِّ عاصمؒ

اُمِّ عاصمؒ امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ فاروقؓ کی پوتی اور بنوامیہ کے آٹھویں خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی والدہ تھیں۔ اُمِّ عاصمؒ کی والدہ کو حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اپنی بہو کیسے بنایا ـــــ؟ یہ تاریخِ اسلام کا ایک ایمان افروز واقعہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ فاروق کا معمول تھا کہ رات کو اکثر اپنے خادم اسلم کو ساتھ لے کر شہر میں گشت کیا کرتے تھے۔ اس گشت کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے حالات سے باخبر ہو کر ان کے مسائل کو حل کر سکیں۔ ایک رات کو اسی طرح گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک مکان کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اچانک انہوں نے مکان کے اندر سے کسی عورت کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی:

"بیٹی اٹھو اور اس دودھ میں کچھ پانی ملا دو"۔ اس کے بعد انہوں نے ایک لڑکی کی آواز سُنی جو کہہ رہی تھی:

> "اماں! کیا آپ نے امیرالمؤمنین کا حکم نہیں سُنا؟ انہوں نے منادی کرائی تھی کہ کوئی شخص دودھ میں پانی ملا کر دوسروں کے ہاتھ فروخت نہ کرے۔"

ماں نے سخت لہجے میں کہا، "لڑکی باتیں نہ بنا اٹھ اور دودھ میں پانی ملا دے۔ یہاں ہمیں کون دیکھ رہا ہے۔"

لڑکی نے جواب دیا: "اماں! اللہ تو ہمیں دیکھ رہا ہے اس طرح بے ایمانی کرنے سے وہ ناراض ہوگا اور پھر یہ امیرالمؤمنین کے حکم کی نافرمانی بھی تو ہے۔ کیا یہ گناہ نہیں کہ ہم امیرالمؤمنین کے سامنے تو ان کی اطاعت کریں اور

ان کی غیر حاضری میں ان کی نافرمانی کریں۔ میں تو یہ گناہ نہیں کروں گی۔"

حضرت عمرِ فاروقؓ کے کانوں میں ماں بیٹی کی یہ باتیں پڑیں تو انہوں نے اسلم سے فرمایا، اس مکان کو اچھی طرح پہچان لو۔

صبح ہوئی تو انہوں نے اسلم کو اس مکان پر یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ یہ عورتیں کون ہیں ـــــ اسلم نے واپس آکر بتایا کہ یہ مکان ایک بیوہ کا ہے اور لڑکی اس کی ناکتخدا بیٹی ہے۔ حضرت عمرِ فاروقؓ کو اس لڑکی کی خدا خوفی اور دیانتداری اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے عاصمؓ کے لیے اس لڑکی کا رشتہ مانگ لیا۔ اس طرح یہ نیک سیرت خاتون حضرت عمرِ فاروقؓ کی بہو بن گئی۔ اُمِّ عاصم اسی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئیں اور اسی کی آغوشِ تربیت میں پرورش پاکر نہایت بلند اخلاق اور ستودہ صفات خاتون بنیں۔ ان کی شادی مصر کے گورنر عبدالعزیز بن مروان سے ہوئی جو بنوامیہ کے پانچویں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے بھائی تھے۔

سنہ ۶۱ھ یا سنہ ۶۲ھ میں اُمِّ عاصمؒ کے بطن سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہوئے۔ وہ سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد سنہ ۹۹ھ میں مسندِ خلافت پر بیٹھے اور ایک بار پھر دنیا کو خلافتِ راشدہ کا دور دکھا دیا۔ انہیں اپنے عدل و انصاف، علم و فضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے عمرِ فاروقِ ثانی کہا جاتا ہے۔

افسوس کہ اُمِّ عاصم کو اپنے فرزند کی خلافت کا زمانہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور وہ اس سے بہت پہلے وفات پا گئیں۔ ان کی وفات کے بعد عبدالعزیز نے ان کی بہن حفصہ بنت عاصم سے نکاح کر لیا لیکن حفصہ ان اوصاف و خصائل سے متصف نہ تھیں جو اُمِّ عاصم کی سیرت و کردار کا خاصہ تھیں۔ چنانچہ عبدالعزیز کے رشتہ دار حفصہ کو دیکھتے تھے تو ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آجاتے تھے "لیت حفصہ من رجال ام عاصم" یعنی کاش حفصہ بھی اُمِّ عاصم جیسی بلند اخلاق ہوتی ـــــ رفتہ رفتہ یہ قول عرب میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ (مشاہیر نسواں، تذکرۃ الخواتین، الفاروق)

حضرت اُمِّ عبداللہ فاطمہ بنتِ حسنؓ

اصل نام فاطمہ تھا لیکن انھوں نے اپنی کنیت اُمِ عبداللہ سے شہرت پائی۔
سیدنا حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی صاحبزادی اور سیدنا حضرت علی اوسط (زین العابدینؓ) بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ تھیں۔ ۵۷ھ ہجری میں سیدنا حضرت محمد باقرؒ انہی کے بطن سے پیدا ہوئے[1]۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا حضرت حسینؓ حجازِ مقدس سے کربلا جاتے وقت اپنے خاندان کی جن خواتین کو اپنے ساتھ لے گئے ان میں حضرت اُمِ عبداللہ بھی شامل تھیں اور ان کے شوہر سیدنا علی زین العابدینؒ اور کمسن فرزند حضرت محمد باقرؒ بھی ان کے ساتھ تھے۔ کربلا کے دلدوز واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔
اپنے گرامی مرتبت شوہر کی طرح حضرت اُمِ عبداللہؒ بھی بہت عبادت گزار صابر اور با خدا خاتون تھیں۔ ان سے بہت سی کرامات منسوب ہیں۔ (مدارج النبوۃ)

---

[1] اثنا عشری حضرات حضرت علیؓ کو پہلا حضرت حسنؓ کو دوسرا حضرت حسینؓ کو تیسرا حضرت علی زین العابدینؒ کو چوتھا اور حضرت محمد باقرؒ کو پانچواں امام معصوم مانتے ہیں سیدنا حضرت زین العابدینؒ کثرتِ عبادت، زہد و اتقا اور علم و فضل کے اعتبار سے یکتائے زمانہ تھے اس کے علاوہ جملہ محاسنِ اخلاق کے پیکرِ جمیل تھے۔ صبر و تحمل، حلم و حیا، جود و سخا، انکسار و تواضع، عفو و درگزر، غیرت، خودداری، عزم و ہمت، سادگی اور خدمتِ خلق ان کی کتابِ اخلاق کے سب سے روشن ابواب ہیں اپنے اخلاقِ عالیہ کی وجہ سے مرجع خلائق تھے۔
۳۳ھ یا ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۴ھ یا ۹۵ھ میں وفات پائی۔ سیدنا حضرت محمد باقرؒ آپ کے بڑے صاحبزادے تھے ۵۷ھ میں پیدا ہوئے نہایت وسیع العلم اور متبحر عالم تھے۔ عبادتِ الٰہی اور زہد و اتقا میں اپنے والدِ گرامی کا نمونہ تھے۔ اپنے اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے ان کو بھی عامۃ الناس میں درجۂ محبوبیت حاصل ہو گیا تھا۔ ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

فاطمہ بنتِ عبدالملک

فاطمہ بنتِ عبدالملک کا شمار پہلی صدی ہجری کی نہایت معزز اور بلند کردار خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کے مقام اور مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ بنو امیہ کے چھ خلفاء سے ان کا براہِ راست قریبی تعلق تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

وہ بنو امیہ کے پانچویں خلیفہ عبدالملک بن مروان کی بیٹی، چھٹے خلیفہ ولید اوّل، ساتویں خلیفہ سلیمان، نویں خلیفہ یزید ثانی اور دسویں خلیفہ ہشام کی بہن اور آٹھویں خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اہلیہ تھیں۔[1]

فاطمہ سنہ ٦٣ھ اور سنہ ٧٠ھ کے درمیان کسی وقت پیدا ہوئیں۔ والدین نے بڑے ناز و نعم سے ان کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ سنہ ٨٦ھ میں جب وہ سن بلوغت کو پہنچ چکی تھیں، خلیفہ عبدالملک نے ان کی شادی اپنے بھتیجے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے کر دی اور داماد کو خناصرہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے جلد ہی بعد عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور ولید بن عبدالملک تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اس نے سنہ ٨٧ھ ہجری میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ منورہ کا گورنر مقرر

---

[1] ان خلفاء کے عہدِ حکومت کی تفصیل یہ ہے۔

عبدالملک بن مروان	—	سنہ ٦٥ھ تا سنہ ٨٦ھ
ولید اوّل بن عبدالملک	—	سنہ ٨٦ھ تا سنہ ٩٦ھ
سلیمان بن عبدالملک	—	سنہ ٩٦ھ تا سنہ ٩٩ھ
عمر بن عبدالعزیزؒ	—	سنہ ٩٩ھ تا سنہ ١٠١ھ
یزید ثانی بن عبدالملک	—	سنہ ١٠١ھ تا سنہ ١٠٥ھ
ہشام بن عبدالملک	—	سنہ ١٠٥ھ تا سنہ ١٢٥ھ

کیا۔ اس زمانے میں وہ بڑے نفاست پسند اور شاہ خرچ تھے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پہنتے اور عمدہ سے عمدہ خوشبویات استعمال کرتے، داڑھی پر عنبر کا سفوف مَلتے، اچھی سے اچھی غذائیں کھاتے اور بڑے جاہ وحشم سے رہتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اہلِ خانہ کو کس طرح رکھا ہوگا۔ ۹۳ھ میں انہیں مدینہ منورہ کی گورنری سے سبکدوش کردیا گیا۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک ان کا بہت مداح اور قدردان تھا اس نے ۹۹ھ میں اپنی وفات سے پہلے انہیں خلافت کے لیے نامزد کردیا۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد وہ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ یہ ذمہ داری سنبھالتے ہی ان کی زندگی میں یکسر انقلاب آگیا۔ انہوں نے ایک باجبروت مطلق العنان حکمران بننے کے بجائے اسوۂ فاروقی اختیار کیا اور اپنے آپ کو حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور حضرت ابوہریرہؓ جیسے درویش صفت بزرگوں کے قالب میں ڈھال لیا۔ اسی لیے انہیں فاروقِ ثانی کہا جاتا ہے۔ علامہ ابنِ خلدونؒ لکھتے ہیں:

> "حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مروانی سلسلہ کی درمیانی کڑی تھے انہوں نے اپنی تمام مساعی خلفائے راشدین اور صحابہؓ کے دَور کے احیاء کے لیے وقف کردیں۔"

خلیفہ بنتے ہی انہوں نے اپنے خاندان کی جاگیریں وغیرہ ان کے اصل مالکوں اور حقداروں کو واپس کردیں۔ اہلیہ بی بی فاطمہ کے پاس اپنے باپ کا دیا ہوا ایک بیش بہا ہیرا تھا، اس کے علاوہ بھائیوں کا دیا ہوا کافی مال وزر تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سے فرمایا کہ تم کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے اس نگینہ، زیورات، اور مال کو بیت المال میں داخل کردو یا مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ اطاعت شعار بیوی نے وہ بیش قیمت ہیرا اور دوسری چیزیں بلا چون وچرا بیت المال میں جمع کرادیں اور اپنے درویش سیرت شوہر کی رفاقت کو ترجیح دی اس کے بعد انہوں نے انتہائی عسرت اور فقر وفاقہ سے زندگی گزاری لیکن کبھی حرفِ شکایت

زبان پر نہ لائیں۔ بچے بھی اسی تنگی ترشی سے زندگی گزارتے تھے مگر وہ ہمیشہ ان کو صبر و قناعت کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔

خلافت کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اعلیٰ اور مرغن کھانے بالکل ترک کر دیئے تھے۔ گھر میں اکثر دال پکتی تھی۔ ایک روز گھر کے خادم نے بی بی فاطمہؒ سے شکایت کی کہ ہر روز دال کھاتے کھاتے تنگ آگیا ہوں۔ انہوں نے کہا، تمہارے آقا امیرالمؤمنین کی بھی یہی غذا ہے (اور ہماری بھی)۔ وہ خاموش ہو گیا۔

ایک دفعہ عیدالفطر سے چند دن پہلے بی بی فاطمہؒ نے اپنے شوہر نامدار سے کہا کہ عید کے دن پہننے کے لیے بچوں کے پاس بہت معمولی کپڑے ہیں اگر آپ نئے کپڑوں کا بندوبست کر سکیں تو ان کا جی خوش ہو جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مہتمم بیت المال کو ایک رقعہ لکھا کہ میرا ایک ماہ کا وظیفہ پیشگی بھیج دیجئے۔ اس نے رقعہ کی پشت پر یہ الفاظ لکھ کر اسے واپس بھیج دیا۔ "امیرالمؤمنین کیا آپ کو یقین ہے کہ اگلے ماہ تک زندہ رہیں گے۔" یہ الفاظ پڑھ کر وہ اشکبار ہو گئے اور اہلیہ سے کہا کہ ہمارے بچوں کو بہشت میں عمدہ پوشاک ملے گی اس لیے یہاں عمدہ لباس کی ضرورت نہیں —— اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی ایسی باتوں کا مطالبہ نہ کیا۔

ایک مرتبہ شوہر نامدار نے ان کے سامنے لبنان کے شہد کا شوق ظاہر کیا انہوں نے لبنان کے عامل ابن معدی کرب کو لکھ بھیجا اس نے بہت سا شہد بھیج دیا جب یہ شہد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے فاطمہؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا، معلوم ہوتا ہے تم نے لبنان کے عامل سے فرمائش کر کے شہد منگوایا ہے۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو اس کو چکھا تک نہیں اور فروخت کروا کر قیمت بیت المال میں جمع کرا دی۔

ایک مرتبہ عراق کی ایک عورت اپنی یتیم بچیوں کے لیے وظیفہ مقرر کرانے کی غرض سے دمشق آئی اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے گھر کا پتہ پوچھ کر بی بی فاطمہ کے پاس

چلی گئی۔ وہ اس وقت روٹیاں پکا رہی تھیں اس کو پاس بٹھا لیا۔ عورت نے مکان کے در و دیوار پر نظر ڈالی اور حیران ہو کر کہا:

"میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ اس گھر کے فیض سے اپنے گھر کی ویرانی دور کروں لیکن یہ تو خود ویران ہو رہا ہے۔"

فاطمہ بولیں، "بہن تم جیسے لوگوں کے گھروں کو آباد کرنے کے لیے ہی یہ گھر ویران ہو رہا ہے۔" پھر اس عورت کی ضرورت دریافت کی اور جب امیرالمؤمنین گھر تشریف لائے تو مناسب تعارفی الفاظ کے ساتھ اسے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے اس کی یتیم بچیوں کے وظیفے مقرر کر دیئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو مسلمہ بن عبدالملک بہنوئی کی عیادت کے لیے آئے، انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؒ ایک میلی سی پھٹی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ اپنی بہن (فاطمہؒ) سے کہا کہ امیرالمؤمنین کی قمیص بدل ڈالو، لوگ عیادت کے لیے آتے ہیں وہ یہ قمیص دیکھ کر کیا کہیں گے۔ بی بی فاطمہ بولیں، خدا کی قسم اس کے سوا دوسری قمیص نہیں ہے۔

غرض ناز و نعم میں پلی ہوئی اس شہزادی اور ملکہ نے اپنے درویش خو شوہر کا دورِ خلافت اسی عسرت او زناداری کی حالت میں گزارا۔ شوہر کی وفات ۱۰۱ھ کے بعد وہ کافی عرصہ زندہ رہیں مگر تکلف کی زندگی دوبارہ مرتے دم تک اختیار نہ کی۔

مشہور ترک مصنف ذہنی آفندی نے اپنی کتاب "مشاہیر النساء" میں بی بی فاطمہؒ کی زندگی کا ایک اور ہی نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فاطمہ بنتِ عبدالملک بن مروان زیادہ تر "ذات النحار" کے لقب سے مشہور ہیں۔ صاحبِ ولایت تھیں۔ اُن کا مزار بُصریٰ (شام) میں ہے جہاں ان کے اکثر معتقدین حاضر ہوتے رہتے ہیں۔"

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ۔ تابعین۔ تاریخ اسلام)

اُمِّ ربیعہؒ

امام ابو عثمان ربیعۃ الرائیؒ (المتوفی ۱۳۶ھ) کی والدہ تھیں۔ان کی شادی مدینہ منورہ کے رہنے والے ایک جوانِ صالح ابو عبدالرحمٰن فروخ سے ہوئی جو قبیلہ بنی تیم بن جرہ کے غلام تھے۔ امام ربیعہؒ ابھی شکمِ مادر میں تھے کہ اُن کے والد ابو عبدالرحمٰن فروخ کو خراسان کی مہم پر جانا پڑا۔ گھر سے چلتے وقت انہوں نے اپنی اہلیہ کو تیس ہزار اشرفیاں دیں اور کہا کہ یہی میری کل پونجی ہے انہیں احتیاط سے رکھنا۔میرا ارادہ ہے کہ اگر اللہ مجھے میدانِ جہاد سے زندہ سلامت واپس لائے تو اس رقم سے تجارت کروں، ہاں اگر میری غیر حاضری میں تمہیں کوئی ضرورت پیش آجائے تو تم اس رقم میں سے جتنی چاہو خرچ کر سکتی ہو اور میرے جانے کے بعد اللہ تمہیں لڑکا یا لڑکی دے تو اس کی پرورش عمدہ طریقے سے کرنا۔یہ کہہ کر انہوں نے بیوی کو خدا حافظ کہا اور دمشق جا کر اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔

اس زمانے میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ مسلسل جاری تھا، ایک مہم کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی۔یہاں تک کہ فروخ کو ان مہموں میں حصہ لیتے لیتے پورے ستائیس برس گزر گئے لیکن جہاد میں مصروفیت نے انہیں گھر نہ لوٹنے دیا اور نہ گھر سے ان کا کوئی رابطہ ہی قائم ہو سکا ـــــ اُدھر ان کے گھر سے نکلنے کے چار پانچ ماہ بعد اللہ نے ان کی بیوی کو فرزند عطا کیا جس کا نام انہوں نے ربیعہ رکھا۔ وہ بڑی دانشمند اور دور اندیش خاتون تھیں۔گو شوہر کی جدائی نے ان کی زندگی بے کیف کر دی تھی لیکن انہوں نے بچے کی پرورش نہایت عمدہ طریقے سے کی۔جب ربیعہ سنِ شعور کو پہنچے تو والدہ

نے ان کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے شوہر کی چھوڑی ہوئی تمام اشرفیاں سب کی سب ربیعہ کی تعلیم پر خرچ کر دیں۔

ربیعہ بھی بیحد ذہین اور محنتی تھے انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کر لیا اور پھر چند سال کے اندر اندر قرآن، حدیث، فقہ، ادب اور دوسرے تمام علوم پر ایسا عبور حاصل کر لیا کہ ان کے علمی کمالات کی سارے عرب میں دھوم مچ گئی اور وہ بیس بائیس برس کی عمر میں اپنے وقت کے امام تسلیم کیے گئے۔ لوگ اب نوجوان ربیعہ کو "امام ربیعۃ الرائیؒ" کہتے تھے۔ امام ربیعہ کا یہ معمول تھا کہ روزانہ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر لوگوں کو باقاعدگی سے درس دیتے تھے اور طلبہ دُور دُور سے آکر ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے تھے۔ ان طلبہ میں سے کئی بعد میں خود اپنے وقت کے امام بنے۔ امام مالکؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، اور کئی دوسرے مشاہیرِ وقت امام ربیعہؒ ہی کے شاگرد تھے۔

ستائیس برس کے بعد فروخ کو جہاد سے فرصت ملی تو اُنھوں نے سیدھا وطن کا رخ کیا۔ کئی دن کے سفر کے بعد وہ مدینے میں اس شان سے داخل ہوئے کہ گھوڑے پر سوار تھے۔ تلوار کمر سے بندھی ہوئی تھی اور ایک لمبا نیزہ ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر نیزے کی انی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام ربیعہؒ دروازہ کھول کر باہر نکلے — باپ بیٹا ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ فروخ بے تکلفی سے اندر جانے لگے تو امام ربیعہ نے انھیں ٹوکا:

"اے شخص تو میرے مکان میں بلا اجازت کیوں داخل ہو رہا ہے؟"

فروخ نے برہم ہو کر کہا: "او دشمنِ خدا یہ میرا اپنا گھر ہے، تو اس میں کیوں گھسا ہوا ہے؟"

امام ربیعہؒ نے بھی بڑا تلخ جواب دیا۔ اس طرح بات بڑھ گئی اور دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ شور وغل سن کر ہمسائے جمع ہو گئے۔ ربیعہ فروخ سے کہہ رہے تھے کہ خدا کی قسم میں تجھے حاکمِ وقت کے پاس لے جائے بغیر نہ چھوڑوں گا

اور فروخ کی زبان پر بھی اسی قسم کے الفاظ تھے۔ کسی نے امام مالکؒ کو بھی اس جھگڑے کی خبر دے دی۔ وہ اپنے اُستاد کا معاملہ سمجھ کر فوراً وہاں آ گئے اور بڑے نرم لہجے میں فروخ سے مخاطب ہو کر کہا:

"میاں آپ زبردستی غیر کے مکان میں کیوں گھسنا چاہتے ہیں؟ آپ کسی دوسری جگہ کیوں نہیں ٹھہر جاتے؟"

اس وقت فُروخ نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میرا نام عبدالرحمٰن فروخ ہے اور یہ میرا اپنا گھر ہے۔ ستائیس برس کے بعد میدانِ جہاد سے واپس آیا ہوں تو آپ میں سے کوئی مجھے پہچانتا ہی نہیں۔

فروخ کی آواز سُن کر ان کی بیوی نے کواڑوں کے پیچھے سے جھانکا تو فوراً شوہر کو پہچان گئی۔ امام ربیعہ اور فروخ دونوں کو اندر بلا بھیجا اور پھر امام ربیعہ کو بتایا کہ یہ تمہارے والد ہیں۔ ساتھ ہی فروخ سے کہا کہ یہ نوجوان آپ کا فرزند ہے جو آپ کے جانے کے چند ماہ بعد پیدا ہُوا تھا۔ اب دونوں باپ بیٹے گلے مل کر خوب روئے۔

کھانا کھانے اور آرام کرنے کے بعد فروخ نے بیوی سے اپنی بچائی ہوئی رقم (تیس ہزار اشرفیوں) کے بارے میں پوچھا۔ بیوی نے کہا آپ اطمینان رکھیے، ساری رقم محفوظ ہے۔ اتنے میں نماز اور درس کا وقت ہو گیا۔ امام ربیعہ اذان سُنتے ہی مسجدِ نبوی میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بیوی نے شوہر سے کہا کہ آپ بھی مسجدِ نبوی میں جا کر نماز پڑھ آئیے۔ فروخ مسجد میں گئے تو دیکھا کہ ساری مسجد لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے درمیان ایک صاحب بڑی شان اور وقار کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمام لوگ بڑے ادب اور احترام سے سر جھکائے ہوئے ہیں اور وہ صاحب ان کے سامنے درس دے رہے ہیں۔ یہ درس دینے والے صاحب امام ربیعہ تھے۔ چونکہ انھوں نے سر پر اونچی ٹوپی پہن رکھی تھی، اس لیے فروخ انہیں دور سے پہچان نہ سکے۔ کسی سے پوچھا یہ بزرگ کون ہیں؟

اس نے حیران ہو کر کہا "آپ ان کو نہیں پہچانتے، یہ امام ربیعۃ الرائی بن ابی عبدالرحمٰن ہیں۔"

فروخ کو یہ سن کر اس قدر مسرت ہوئی کہ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور بے اختیار ان کے منہ سے نکلا "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میرے بیٹے کا درجہ اتنا بلند کیا۔" خوشی خوشی گھر آئے اور بیوی کو بتایا کہ آج میں نے اپنے بیٹے کی جو عزت اور شان دیکھی، اس سے پہلے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی نہیں دیکھی تھی۔

بیوی نے کہا، "آپ کو بیٹے کی یہ عظمت و شان پسند ہے یا تیس ہزار اشرفیاں؟" ——— فروخ نے جواب دیا، "خدا کی قسم تیس ہزار اشرفیاں اس مرتبے اور شان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔"

بیوی نے کہا، "تو پھر سُن لیں کہ میں نے یہ تمام رقم اس کی تعلیم پر خرچ کر دی۔" فروخ نے بے ساختہ جواب دیا "خدا کی قسم ان اشرفیوں کا اس سے بہتر استعمال اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ تم نے بہت خوب کیا کہ ان اشرفیوں کو ٹھکانے لگا کر میرے بیٹے کو ایک ایسے خزانے کا مالک بنا دیا جس کو کبھی زوال نہیں۔"

امام ربیعۃ الرائیؒ کا شمار ائمہ تابعین میں ہوتا ہے۔ علم و فضل کے اعتبار سے ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ نہ صرف اس دور کے سر آمدِ روزگار علماء و فقہاء بلکہ فرمانروایانِ وقت بھی ان کے سامنے سرِ عقیدت جھکاتے تھے اور یہ مرتبہ ان کو اپنی دور اندیش اور علم دوست ماں کی بدولت حاصل ہوا جنھوں نے اپنے بچے کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے مال و دولت کی کچھ پروا نہ کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی پہلی منزل ماں کی گود ہے اور ماں ہی بچوں کی زندگی کی معمار ہے۔ اگر مائیں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بڑے ہو کر قوم اور وطن کے قابلِ فخر سپوت نہ بنیں۔

(تابعین۔ غلامانِ اسلام)

اُمِّ حکیم بنتِ قارِظ (قارِض)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت عبیداللہؓ بن عباسؓ کی اہلیہ تھیں۔ ابنِ اثیرؒ نے ان کا نام عائشہ بنتِ عبد المدان لکھا ہے۔ حسنِ صورت و حسنِ سیرت کے اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتی تھیں اور شعر گوئی میں بہت اعلیٰ مذاق پایا تھا۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں حضرت عبیداللہؓ یمن کے والی تھے۔ اُمِّ حکیم بھی ان کے ساتھ یمن میں مقیم تھیں۔ جنگِ صفین کے بعد امیر معاویہؓ نے بُسر بن ابی ارطاۃ کو یمن کی تسخیر کے لیے روانہ کیا تو حضرت عبیداللہؓ، عبداللہ بن عبد المدان کو اپنا قائم مقام بنا کر کوفہ چلے گئے۔ بُسر نے یمن پہنچ کر پہلے عبداللہ بن عبد المدان کا کام تمام کیا۔ پھر حضرت علیؓ کے حامیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا۔ اُمِّ حکیمؓ اور ان کے دو صغیر السن بچے عبدالرحمٰن اور قثم بھی یمن میں تھے۔ بُسر کے لشکریوں نے ان بچوں کو ان کی ماں کے سامنے قتل کر ڈالا۔ اس سانحۂ جانگداز سے ماں پر قیامت بیت گئی۔ انہوں نے غم و الم کی حالت میں بہت سے دردناک اور دلگداز اشعار کہے جو ان کو سنتا بے اختیار رو دیتا تھا۔ یہ اشعار عربی ادب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

یَا مَنْ اَحَسَّ بُنَیَّیَ اللَّذَیْنِ ھُمَا
کَالدُّرَّتَیْنِ تَشَظّٰی عَنْھُمَا الصَّدَفُ

(ہے کوئی جس نے میرے ان دونوں (پیارے) بچوں کو دیکھا ہے جو مثل ان دو موتیوں کے تھے جو ابھی سیپی سے نکلے ہوں)

کہا جاتا ہے کہ فرطِ الم کی وجہ سے ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا۔ حج کے موقع پر بچوں کے غم میں کہے ہوئے اشعار لوگوں کے سامنے پڑھا کرتی تھیں۔ خود بھی روتی تھیں اور سامعین کو بھی رلایا کرتی تھیں۔

اُمِّ حکیم کا سالِ وفات کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔

(اسد الغابہ۔ مشاہیر نسواں۔ دائرۃ المعارف)

لیلیٰ الاخیلیہ

پہلی صدی ہجری میں ایک نامور عرب شاعرہ ہوئی ہے۔ اس کے والد کا نام عبداللہ بن الرحّال بن کعب بن معاویہ تھا جو قبیلہ عقیل بن کعب سے تھا۔ اس کے اسلاف میں سے کسی شخص کا لقب الاخیل (یعنی باز) تھا۔ اسی لیے اس خاندان میں یہ نام عام ہو گیا تھا۔ لیلیٰ کو بھی اسی نسبت سے الاخیلیہ کہا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ لیلیٰ کو اپنے ابن عم توبہ بن حُمَیّر الخفاجی سے بہت محبت تھی۔ توبہ بھی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے عبداللہ بن الرحّال سے لیلیٰ کا رشتہ مانگا لیکن اس نے توبہ کی درخواست منظور نہ کی اور لیلیٰ کی شادی بنی الادلع کے ایک شخص سے کر دی۔ تاہم لیلیٰ کے دل سے توبہ کی یاد نہ گئی۔ توبہ اپنے قبیلے کا نامی شہسوار تھا اور اکثر اردگرد کے قبائل پر چھاپے مارتا رہتا تھا۔ لیلیٰ کی شادی کے کچھ عرصہ بعد حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں قبیلہ عوف بن عامر عقیل نے توبہ کو اس کے آئے دن کے چھاپوں سے تنگ آ کر مار ڈالا۔ لیلیٰ کو خبر ہوئی تو اس کو سخت صدمہ پہنچا اور اس نے توبہ کے غم میں نہایت دردناک مرثیے کہے۔ یہ مرثیے عربی ادب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔

لیلیٰ اعلیٰ درجہ کی مرثیہ گو ہی نہیں تھی بلکہ مدحیہ اشعار کہنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے خلیفہ عبدالملک بن مروان اور حجاج بن یوسف ثقفی کی مدح میں بھی بے شمار قصائد نظم کیے جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں۔

لیلیٰ نے اپنے اشعار میں اور بھی کئی لوگوں کو اپنا ممدوح بنایا۔ ایک

دفعہ عرب کے نامور شاعر فرزدق سے کسی نے پوچھا کہ کیا تجھے کسی دوسرے شاعر کے کلام پر رشک بھی آیا ہے۔ اس نے کہا، مجھے کبھی کسی کے شعر پر رشک نہیں آیا لیکن لیلی الاخیلیہ کے ان اشعار پر جو اس نے عمرو بن خلیع کی مدح میں کہے ہیں مجھے اکثر رشک ہوا کرتا ہے۔

یا ایہا السدم الملوی راسہ	اے کج کلاہ نوجوان
لیقود عن اہل الحجاز بریما	کیا تو حجاز کے بیچ میل لشکر کے ساتھ
اترید عمرو بن الخلیع ودونہ	عمرو بن خلیع پر چڑھائی کرے گا اس کی حمایت پر
کعبٌ اذاً لوجدتہٗ مرؤما	تو کعب ہے تو اسے رحم کیا گیا پائے گا۔
ان الخلیع ورھطہٗ فی عامر	خلیع اور اس کی قوم، بنی عامر میں
کالقلب لیس جوءجوءاً وحزیما	دل کی طرح محفوظ ہیں
لا تغزون الدھر آل مطرف	آل مطرف کو تو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا
لا ظالماً ابداً ولا مظلوما	نہ ظالم بن کر نہ مظلوم بن کر
قوم رباط الخیل وسط بیوتھم	یہ ایسی قوم ہے کہ گھوڑوں کے اصطبل اور چمکتے ہوئے
واسنۃ زرق تخال نجوما	تیر جن کو تو تارا گمان کرے، ان کے گھروں میں ہیں
ومخرق عنہ القمیص تخالہٗ	اور ان کے گھروں میں سردار ہے کہ جس کے کپڑے محنت
بین البیوت من الحیاء سقیما	کرتے کرتے پھٹ گئے ہیں تو اسے دیکھے کہ یہ تو بیمار
حتی اذا رفع اللواء رایتہٗ	ہے حیا کے سبب یہاں تک کہ جنگ کا جھنڈا بلند ہو
تحت اللواء علی الخمیس زعیما	تو تو اسے علم کے نیچے بڑے لشکر کا سردار پائے گا
لن تستطیع بان تحول عزھم	ان کی عزت ٹل نہیں سکتی
حتی تحول ذا الھضاب یسوما	جب تک کہ پہاڑ اپنی جگہ سے نہ ہلے
ان سالموک فدعھم من ھذہ	اگر وہ تجھ سے صلح کریں تو غنیمت جان
وارقد کفی لک بالرقاد نعیما	اور سو جا یہی نعمت تیرے لیے کافی ہے۔

لیلیٰ کو کئی مرتبہ حضرت امیر معاویہؓ، خلیفہ عبدالملک اور حجاج سے

گفتگو کا موقع ملا۔ اس گفتگو کی تفصیل مختلف کتابوں میں ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی فصیح البیان، روشن دماغ اور ذہین خاتون تھی۔ ایک دفعہ حجاج کے پاس گئی اور ایک رات اس کی ایک بیوی کے ہاں قیام کیا۔ دوسرے دن صبح کو حجاج سے رخصت ہونے آئی تو اس نے اپنے غلام سے کہا اسے ۵۰۰ دے دو۔ لیلیٰ نے کہا، اے امیر شاید آپ کی مراد پانچ سو اونٹوں سے ہے۔ ایک درباری نے کہا، نہیں بکریاں دی جائیں گی۔ لیلیٰ نے کہا۔ یہ امیر کی شان کے خلاف ہے وہ ایسا ہرگز نہ کریں گے۔

حجاج کا ارادہ فی الواقع بکریاں دینے کا تھا لیکن لیلیٰ کی باتیں سن کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ بکری کا لفظ تک زبان پر نہ لا سکا اور اس کو پانچ سو اونٹ دے کر ہی رخصت کیا۔

علامہ اصمعیؒ کا بیان ہے کہ لیلیٰ نے بڑھاپے میں حجاج سے درخواست کی کہ وہ اسے اس کے ابن عم قتیبہ بن مسلم کے پاس خراسان پہنچا دے۔ لیکن کہتے ہیں کہ جب وہ واپس آ رہی تھی تو راستے ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے برعکس ابو الفرج اصفہانی کا بیان ہے کہ لیلیٰ، توبہ بن حمیرؔ کی قبر پر فوت ہوئی۔ اس سلسلے میں اس نے ایک طویل کہانی بیان کی ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

(عقد الفرید، مشاہیر نسواں۔ دائرہ معارف اسلامیہ)

عقیلہ بنتِ ضحاک

پہلی صدی ہجری کے مشہور عرب شاعر اَلفَرَزْدَق[1] کا بیان ہے کہ ہماری قوم کے ایک شخص کے دو غلام گم ہو گئے (یا بھاگ گئے) وہ اونٹنی پر سوار ہو کر ان کی تلاش کے لیے نکلا۔ راستے میں وہ باد و باراں کے طوفان میں گھِر گیا۔ قریب ہی بنو حنیفہ کا ایک گھر نظر آیا۔ وہ پناہ لینے کے لیے اس گھر کے اندر بطور مہمان چلا گیا اور اپنی اونٹنی کو باہر ایک طرف بٹھا کر باندھ دیا۔ وہاں اسے ایک عجیب واقعہ پیش آیا جسے اس نے اس طرح بیان کیا:۔

---

[1] الفرزدق کا تعلق بنو تمیم کی ایک شاخ مجاشع بن دارم سے تھا۔ وہ بصرہ کے مقام پر تقریباً ۲۰ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ اصل نام ہمام بن غالب بن صعصعہؓ ہے۔ اس کے باپ دادا سخاوت میں بہت مشہور تھے لیکن اس کے اپنے ابتدائی حالات پردۂ تاریکی میں ہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اس کے والد نے جنگِ جمل کے بعد اس کو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ وہ جوانی ہی میں ایک قادر الکلام شاعر ہو گیا۔ رفتہ رفتہ وہ اُموی دَور کے تین نامور ہجو گو شاعروں میں شمار ہونے لگا دوسرے دو جریر اور اخطل تھے۔ فرزدق نے بعد میں مدحیہ داستعطافیہ قصائد بھی بکثرت لکھے اور دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی جس زمانے میں زیاد بن ابیہ عراق کا گورنر تھا، فرزدق نے کچھ ایسے اشعار کہے جن سے وہ برہم ہو گیا۔ فرزدق بصرہ سے بھاگ کر مدینہ کے گورنر سعیدؓ بن العاص کے پاس جا کر پناہ گزین ہوا لیکن بعد کو مروان بن الحکم نے اسے وہاں سے بھی نکال دیا۔ زیاد کے انتقال کے بعد وہ پھر بصرہ چلا گیا۔ ابتداء میں اس کے تعلقات بنو امیہ سے اچھے نہ تھے لیکن بعد میں بہت اچھے ہو گئے یہاں تک کہ اس نے ان میں سے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" مجھے وہاں بیٹھے کچھ دیر گزری تھی کہ ایک حسین لڑکی جس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمکتی تھیں، آئی اور پوچھا، یہ کس کی اونٹنی ہے! ایک سیاہ فام کنیز نے جو پہلے سے میرے پاس بیٹھی تھی، کہا، تمہارے اس مہمان کی۔

اس نے میری طرف رخ کر کے کہا، " اَلسَّلَامُ عَلَیکُم "۔
میں نے سلام کا جواب دیا تو اس نے پوچھا، آپ کس قبیلے سے ہیں؟
میں نے کہا، بنی حنظلہ سے۔
اس نے پوچھا، بنی حنظلہ کے کون سے خاندان سے؟
میں نے کہا، بنی نہشل سے۔
اس پر وہ مسکرائی اور کہا، تو آپ ان لوگوں سے ہیں جن کے گھرانے کی فرزدق نے تعریف کی ہے۔

ان الذی سمک السما بنی لنا
بیتا دعائمه اعز و اطول

(بے شک جس ذات نے آسمان کو بلند و بالا بنایا ہے اس نے ہمارے لیے ایسا گھر تعمیر کیا ہے جس کے ستون نہایت مضبوط اور بڑے طویل ہیں۔)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

بعض کی شان میں مدحیہ قصائد بھی کہے۔ ایک دفعہ اس نے حج کے موقع پر خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے سامنے سیدنا حضرت علی بن حسینؓ (زین العابدین) کی شان میں ایسا زوردار قصیدہ کہا کہ لوگ انگشت بدنداں ہو گئے۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق "نفس پرستی، بزدلی، ظلم اور خود نمائی فرزدق کے نمایاں اوصاف تھے۔" ان اوصاف کے باوجود شاعری میں اس کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ جو کہتا تھا، لوگوں کے دلوں پر نقش ہو جاتا تھا۔ جریر اور اخطل سے اس کی اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ فرزدق نے سنہ ۱۱۴ھ میں سو سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے پیچھے ایک بسیط دیوان چھوڑا۔
(دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۵۔ ابن خلکان)

بیتاً بزرارة محتب بفنائہ
ومجاشع ابوالفوارس نہشل

(ایسا گھر جس میں بڑے بڑے نامور لوگ آتے رہے اور مجاشع ابوالفوارس بھی آچکے ہیں۔)

میں نے کہا، ہاں ـــ اور مجھ کو یہ شعر بہت پسند آئے پھر وہ ہنسی اور کہا لیکن ابن الخطفی نے تمہارے اس گھر کو اپنے اس شعر سے ڈھا دیا ہے:

اخزے الذی رفع السماء مجاشعاً
وبنی بناء بالحفیض الاسفل

(یعنی) جس ذات نے آسمان کو رفعت عطا کی ہے اس نے مجاشع کو ذلیل و رسوا کر دیا اور اس کے لیے سب سے نیچے خشک جگہ میں ٹھکانا بنایا ہے)

یہ شعر سن کر میری طبیعت مکدر ہو گئی اور اس کے آثار میرے چہرے پر بھی نمودار ہوئے۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا، آپ رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ زمانے کا یہی دستور ہے کہ ایک کہتا ہے اور ایک سنتا ہے۔

پھر اس نے پوچھا: "آپ کہاں جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یمامہ"

اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا ـــ "آپ کی منزلِ مقصود آپ کے سامنے ہی ہے۔" پھر اس نے یہ شعر پڑھا:

تذکرنی بلاداً خیر اھلی
بھا اھل المروءة والکرامة

(تو نے مجھے ایسا علاقہ یاد دلایا ہے جس کے باشندے میرے بہترین ساتھی ہیں جو بڑی مروت اور بزرگی کے حامل ہیں۔)

میں نے پوچھا ـــ "تمہارا عقد ہو گیا ہے یا نہیں؟

اس نے جواب دیا ؎

اذا وقد النیام فان عمرا
تورقه الهموم الی الصباح

(جب سونے والے گہری نیند سوجاتے ہیں تو عمرو کو تفکرات صبح تک بیدار رکھتے ہیں)

میں نے پوچھا — "یہ عمرو کون ہے ؟"

اس نے جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

سالت ولو علمت کففت عنه
ومن لك بالجواب سوی الخبیر

(تو نے (عمرو کے بارے میں) پوچھا ہے اگر تجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو اس سوال سے رک جاتا بجز خوب جاننے والے کے اور تجھے اس کا جواب کون دے سکتا ہے)

پھر کچھ اور شعر پڑھے اور دفعتہً خاموش ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ سن رہی ہے۔ پھر اس کی زبان پر یہ شعر جاری ہو گئے۔

یخیل لی هیا عمرو بن کعب
کانك قد حملت علی السریر

(مجھے خیال ہوتا ہے کہ اے عمرو بن کعب — گویا لوگ تیرا جنازہ اٹھائے لیے جا رہے ہیں)

فان تك هکذا یا عمرو انی
مبکرة علیك الی القبور

(پس اے عمرو اگر یہ بات ہے تو میں — صبح سویرے تیرے پاس قبروں میں پہنچ جاؤں گی)

یہ کہہ کر اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر اس طرح گری کہ گرتے ہی دم نکل گیا۔

میں نے لوگوں سے پوچھا : "یہ لڑکی کون ہے ؟"

انہوں نے بتایا : "ضحاک بن عمرو بن محرق بن نعمان بن منذر بن

مادّ اسماء کی بیٹی عقیلہ ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ عمرو کون شخص ہے؟"
انہوں نے بتایا "اس کا چچیرا بھائی عمرو بن کعب بن محرق۔"
میں وہاں سے رخصت ہو کر یمامہ پہنچا تو میں نے عمرو بن کعب کو تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ فوت ہو چکا ہے اور عین اس وقت عقیلہ چیخ مار کر گری تھی، اس کو یمامہ میں دفنایا جا رہا تھا۔" (کتاب الاغانی)

حضرت اُمِّ علقمہؒ مولاۃ عائشہ صدیقہؓ

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شاگرد تھیں۔ ان سے تربیت پا کر بڑی عالمہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ام المؤمنین سے روایت کی ہے اور ان کے فرزند علقمہ بن ابی علقمہ حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ (طبقات ابن سعدؒ)

بلجاء خارجیہ

امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں بلجاء ایک مشہور خارجیہ گزری ہے۔ وہ بڑی بہادر، نڈر، تعلیم یافتہ، عصمت مآب، عابدہ اور زاہدہ عورت تھی لیکن بدقسمتی سے خوارج میں شامل ہو گئی تھی اور حکومت کے خلاف شورش اور ہنگاموں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتی تھی۔ امیر معاویہؓ کے گورنر عراق زیاد بن ابیہ کو اس کی باغیانہ سرگرمیوں کی خبر ہوئی تو اس نے قسم کھائی کہ بلجاء اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اس کو عبرتناک سزا دے گا۔ بلجاء کو زیاد کی قسم کے بارے میں بتایا گیا تو وہ مطلق ہراساں نہ ہوئی اور اپنی سرگرمیوں میں برابر مشغول رہی۔ آخر وہ زیاد کے ہاتھ آ گئی۔ اُس نے اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر اس کی لاش سڑک پر پھینکوا دی۔ (تاریخ خوارج)

اُمِّ علقمہ

حجاج بن یوسف ثقفی پہلی صدی ہجری میں بنو امیہ کا مشہور فوجی افسر اور گورنر گزرا ہے۔ وہ اپنی بعض خوبیوں اور کارناموں کے باوجود تاریخ میں ایک ظالم و سفاک انسان کی حیثیت سے مشہور ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُموی حکومت یا اپنے مخالفین پر قابو پا کر ان سے نہایت بے رحمانہ سلوک کرتا تھا۔ اس کی سفاکی کا شکار ہونے والے لوگوں میں صحابۂ کرامؓ بھی شامل تھے اور تابعینؒ بھی۔ عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں اس نے مکہ معظمہ پر قبضہ کرنے کے لیے خانہ کعبہ پر منجنیقوں کے ذریعے پتھر برسانے سے بھی گریز نہ کیا۔ جلیل القدر صحابیہ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی رُو سے سفاک ٹھہرایا جس زمانے میں حجاج عراق کا گورنر تھا، خوارج کے ساتھ سرکاری فوج کے کئی معرکے ہوئے۔ علماء اسلام نے اگرچہ خوارج کو مردود و مبغوض ٹھہرایا ہے لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ قرنِ اوّل کے خوارج بڑے جانباز لوگ تھے اور اپنے مقصد کی خاطر جان پر کھیل جانا ان کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ پھر ان کی زندگی (معاشرت) بہت سادہ بلکہ زاہدانہ ہوتی تھی اور وہ عبادتِ الٰہی سے بہت شغف رکھتے تھے اُموی فوج کے خلاف لڑنے والے خارجیوں میں اُمِّ علقمہ نام کی ایک انتہائی دلیر اور جنگجو عورت بھی تھی۔ اس نے ہر معرکے میں ایسی جراُت اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا کہ اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی۔ بدقسمتی سے ایک لڑائی میں وہ سرکاری فوج کے ہاتھ گرفتار ہو گئی اور اسے حجاج کے سامنے پیش کیا گیا۔ چونکہ حجاج نے اس کے ہم مسلک لوگوں پر قابو پا کر ان کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کیا تھا اس لیے وہ اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔ دشمن کے قبضے میں ہونے کے باوجود اس کے طنطنے میں کوئی

کمی نہ آئی اور وہ حجاج کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ حجاج نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اے خارجیہ میرے منہ کی طرف دیکھ"

اُمِّ علقمہ نے نہایت حقارت اور نفرت کے ساتھ کہا۔ "جو منہ بارگاہِ خداوندی سے مردود ہو چکا ہے میں اس کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔"

حجاج نے غضب ناک ہو کر اپنے مصاحبوں سے پوچھا، "اس گستاخ عورت کے خون کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟" سب نے بیک زبان کہا۔ "حلال ہے"

یہ سُن کر اُمِّ علقمہ خوفزدہ ہونے کے بجائے مسکرانے لگی۔

حجاج اس کو ہشاش بشاش اور متبسم دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اس سے پوچھا: "اس موقع پر جب کہ موت تیرے سر پر کھڑی ہے تو کیوں مسکرا رہی ہے؟"

اُمِّ علقمہ نے کہا، "اس لیے کہ تیرے مصاحبوں نے تیرے دوست کے مصاحبوں کو بھی مات کر دیا۔"

حجاج نے پوچھا: "وہ کون میرا دوست ہے؟"

اُمِّ علقمہ بولی: "فرعون ــــ اس نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں اپنے درباریوں اور مصاحبوں سے مشورہ کیا تو ان سب نے یک زبان ہو کر مشورہ دیا کہ ارجہ واخاہُ یعنی اس کو اور اس کے بھائی کو چند روز کی مہلت دے لیکن تیرے مصاحب فرعون کے مصاحبوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ ایک عورت کے قتل کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

حجاج پر اُمِّ علقمہ کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے اسے آزاد کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو اس سے کہا جا میں تجھے مہلت دیتا ہوں اپنے گھر بیٹھ اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو۔

(مشاہیر النساء - مشاہیر نسواں)

جہنیزہ والدۂ شبیب خارجی

غزالہ زوجۂ شبیب خارجی

شبیب بن نعیم شیبانی پہلی صدی ہجری میں خوارج[1] کا ایک مشہور سردار گزرا ہے۔ ۷۶ ہجری میں اس نے حکومت کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کیا۔ یہ عبدالملک بن مروان کا زمانہ خلافت تھا اور حجاج بن یوسف ثقفی اس کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ شبیب ایک آزمودہ کار جنگجو اور جانباز آدمی تھا۔ اس نے متعدد معرکوں میں اپنی قلیل جمعیت کے باوجود سرکاری فوجوں کو تابڑ توڑ شکستیں دیں۔ ان معرکوں میں اس کی والدہ جہنیزہ اور بیوی غزالہ بھی اس کے ساتھ ہوتی تھیں اور اس کے پہلو بہ پہلو سربکف ہوکر لڑتی تھیں۔ غزالہ کی جانبازی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک لڑائی میں اس کا حجاج سے سامنا ہوگیا، اس نے ایسی پامردی سے حجاج کا مقابلہ کیا کہ وہ پیچھے ہٹنے پر

---

[1] خوارج کی بنیاد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے عہدِ خلافت میں اس وقت پڑی جب انہوں نے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے (جنگ صفین) میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کو حَکَم (ثالث) بنایا۔ یہ لوگ ڈیڑھ سو سال تک عالم اسلام میں نت نئے فتنے اٹھاتے رہے۔ بلاشبہ جانبازی، جرأت و بسالت، بے جگری اور زہد و عبادت میں خوارج اپنی مثال آپ تھے لیکن افسوس کہ ان کے ان اوصاف کا صَرف بے محل ہوا۔ وہ گمراہی اور ضلالت کی دلدل میں پھنس کر رہ گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ وہ دین سے ایسے ہی جدا ہو جائیں گے جیسے تیر کمان سے جدا ہوتا ہے۔ قرنِ اوّل و دوم میں ان

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مجبور ہو گیا اور پھر کبھی خود غزالہ کے مقابل نہ ہوا۔ یہ وہی حجاج تھا جس سے سارا عراق اور حجاز کانپتا تھا۔ ایک شاعر اسی واقعہ کو اس طرح نظم کرکے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لوگوں نے قیام عدل و شریعت کے نام پر سرفروشی کے حیرت انگیز مظاہرے کیے لیکن جن علاقوں پر وہ قابض ہو جاتے وہاں ان کی جانبازی ادبے جگری سنگ دلی کا روپ دھار لیتی اور وہ مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عام لوگوں میں نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ مختلف فرقوں میں بٹتے گئے۔ ان کے مشہور فرقے یہ تھے:

نجدات، ازارقہ، حازمیہ مجہولیہ، صلیتیہ، ظفریہ، بہیسیہ، حکمیہ، میمونیہ، صفریہ، حروریہ، اباضیہ وغیرہ۔

ان میں سے چند اہم فرقوں کے عقائد حسب ذیل ہیں:

نجدات: دروغ گوئی اور گناہِ صغیرہ پر اصرار شرک ہے۔ ہاں اگر کوئی اجتہاد کی بناء پر غلطی کرے تو وہ معذور ہے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت طلحہؓ اور ان کے ساتھی نعوذ باللہ کافر ہو گئے کیونکہ انہوں نے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے حکم ربانی سے انحراف کیا۔

ازارقہ: تمام غیر خارجی کافر ہیں۔ جہاد سے جی چرانے والا مومن نہیں ہو سکتا۔ فتنے سے بچنے کے لیے عزلت گزیں ہونا بھی کفر ہے۔ اس لیے سارا دارالاسلام دورِ فتنہ میں دارالحرب کی حیثیت رکھتا ہے جہاں کے باشندوں کا قتل، ان کے بچوں کا قتل اور مال کا غصب کرنا جائز ہے۔ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ غیر خارجیوں سے رشتے ناطے مناکحت قائم کرنا، ان کے پیچھے نماز پڑھنا اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا ناجائز ہے۔

ظفریہ: جنت دوزخ یا عام پیغمبروں کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا البتہ خدا کا انکار یا اس کی ذات سے عدم واقفیت سے کفر لازم آجاتا ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حجاج کو ملامت کرتا ہے:

اسد علیّ و فی الحروب نعامۃ
فتخاء تصفر من صفیر الصافر
ھلا برزت الی غزالۃ فی الوغیٰ
بل کان قلبک فی جناح الطائر

یعنی حجاج مجھ پر تو شیر ہے لیکن معرکوں میں بزدل۔ وہ سست شتر مرغ کی طرح بزدل ہو جاتا ہے۔

حجاج! تو لڑائی میں غزالہ کے مقابلہ میں کیوں نہ نکلا اور نکلتا کیونکر! تیرا تو دل دھڑک رہا تھا۔

پیہم کامیابیوں سے شبیب کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی کہ اس نے عراق کے دارالامارت کوفہ کا رُخ کیا۔ حجاج نے سوید بن عبدالرحمٰن اور عثمان بن قطن کو دو دو ہزار فوج کے ساتھ شبیب کو دو سمتوں سے روکنے کے لیے بھیجا۔ شبیب بہادری سے لڑتا ہوا حیرہ کی طرف نکل گیا، پھر کچھ دور آگے جاکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میمونیہ: سورۂ یوسف قرآن کا جزو نہیں۔ پوتیوں نواسیوں، بھانجیوں اور بھتیجیوں سے نکاح جائز ہے۔

اباضیہ: یہ دوسرے فرقوں سے نسبتاً کم متشدد تھے۔ غیر خارجیوں میں شادی بیاہ جائز سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک خارجی غیر خارجی کا وارث ہو سکتا ہے۔ یہ کسی شخص کو اس وقت تک قتل نہیں کرتے تھے جب تک اسے "دعوتِ اسلام" نہ دے لیں حجت نہ قائم کریں اور اعلانِ قتال نہ کر دیں۔

صحابہ کرامؓ کے بارے میں ان سب کے عقائد قریب قریب یکساں تھے۔ ان کی اپنی الگ فقہ ہے عبداللہ بن زید، یحییٰ بن کامل، سعید بن ہارون وغیرہ ان کے مشہور فقہا ہیں۔ انہوں نے عقائد و مسائلِ شرعیہ میں کتابیں لکھی ہیں۔ (تاریخ خوارج - اردو دائرہ معارف اسلامیہ بحوالہ ابن زہیر وغیرہ)

چکر کاٹتا ہوا کوفہ کو پلٹا۔ اس کی بیوی غزالہ نے منت مانی تھی کہ کوفہ کی جامع مسجد میں دو رکعت نفل پڑھوں گی۔ وہ کچھ دن چڑھے شوہر کے ساتھ صرف ستر آدمی لے کر شہر میں داخل ہوئی حالانکہ سارا شہر دشمن تھا اور سرکاری فوج بھی بہت بڑی تعداد میں شہر کے اندر موجود تھی۔ شبیب بے باکانہ قصر امارت کی طرف بڑھا اور اپنے گرز سے قصر کے دروازے پر ضربیں لگائیں۔ حیرت کی بات ہے کہ کسی کو اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ پھر وہ غزالہ کے ساتھ جامع مسجد پہنچا۔ خود مسجد کے دروازے پر تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور غزالہ نے اندر جا کر نہایت اطمینان سے دو رکعت نماز پڑھی اور رکعتیں بھی معمولی نہیں پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ پڑھی اور دوسری میں سورۂ آل عمران۔ یہ قرآن پاک کی سب سے طویل سورتیں ہیں اور دو دو اور اڑھائی اڑھائی پاروں پر محیط ہیں۔ غزالہ نماز سے فارغ ہوئی تو اپنے شوہر اور ساتھیوں کو لے کر مزاحم ہونے والوں کو مارتی گراتی اپنی فرودگاہ پر پہنچ گئی۔ حجاج کی فوج دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت شبیب اور غزالہ نے کوفہ کا رُخ کیا۔ حجاج بن یوسف بصرہ میں تھا اس کو کوفہ کی طرف خوارج کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو ایک زبردست فوج کے ساتھ تیزی کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہوا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شبیب اور غزالہ کوفہ میں داخل ہو گئے۔ جو لوگ جامع مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے ان کو قتل کر دیا اور غزالہ نے اطمینان سے اپنی نذر پوری کر لی۔

اب حجاج کو بڑا جوش آیا اس نے ایک تجربہ کار افسر عبدالرحمٰن بن اشعث کو چھ ہزار منتخب بہادر دے کر شبیب کے استیصال پر مامور کیا۔ عبدالرحمٰن نے بڑی احتیاط اور مستعدی سے شبیب کا تعاقب کیا لیکن شبیب اس کو جھانسے پر جھانسا دیتا آگے بڑھ جاتا اس طرح عراقی فوجیں

تھک گئیں۔ اسی اثنا میں عید الاضحیٰ کا زمانہ آگیا۔ شبیب نے فریقین کے عید منانے کے لیے چند دن کے لیے صلح کا پیغام بھیجا۔ عبدالرحمٰن نے اسے منظور کر لیا۔ حجاج کو خبر ہوئی تو اس نے عبدالرحمٰن کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ عثمان بن قطن کو افسر مقرر کیا۔ عثمان نے بلا تاخیر شبیب پر حملہ کر دیا۔ اس کے پاس صرف ایک سو اسّی آدمی تھے جن میں جہیزہ اور غزالہ بھی شامل تھیں۔ انہوں نے سرفروشی کا بے مثال مظاہرہ کیا اور خونریز لڑائی کے بعد کثیر التعداد عراقی فوج کو شکستِ فاش دی۔ عثمان بن قطن لڑتا ہوا مارا گیا۔ شبیب کی کامیابیوں کو دیکھ کر بہت سے شورش پسند عوام بھی اس کے ساتھ ہو گئے اور اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔

اب حجاج نے خلیفہ عبدالملک سے مدد طلب کی، اس نے چھ ہزار منتخب شامی جنگجوؤں پر مشتمل کمک روانہ کی۔ اِدھر حجاج نے اپنے ایک آزمودہ کار افسر عتاب بن ورقاء کو شبیب کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ایک کہن سالہ اور تجربہ کار بہادر زہرہ بن حویہ کو بطور مشیر بھیجا۔ ساباط کے قریب اس لشکر کا شبیب سے سامنا ہوا، اس کے پاس صرف ایک ہزار آدمی تھے مگر انہوں نے ایسی جانبازی سے سرکاری فوج کا مقابلہ کیا کہ اس کا منہ پھیر دیا۔ عتاب بن ورقاء اور زہرہ بن حویہ دونوں مارے گئے اور عراقی فوج تتر بتر ہو گئی۔ اس شرمناک شکست نے حجاج کو سخت برہم کر دیا اس نے حارث بن معاویہ کو ایک ہزار فوج دے کر شبیب کو روکنے کے لیے بھیجا جو معمولی سی جمعیت کے ساتھ کوفہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شبیب نے حارث بن معاویہ کو شکست دے کر قتل کر دیا اور کوفہ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اسی اثناء میں عبدالملک کی بھیجی ہوئی کمک بھی کوفہ پہنچ گئی۔ حجاج عراق اور شام کی کمکی فوج کو ساتھ لے کر شہر سے نکلا اور شبیب پر پُرزور حملہ کیا۔ خارجی بڑی پامردی سے لڑے۔ شبیب کے ساتھ جہیزہ اور غزالہ بھی اس لڑائی میں شریک تھیں اور نہایت بہادری سے لڑ رہی تھیں۔ اب کی بار متحدہ عراقی اور شامی لشکر بھی جان توڑ کر لڑ رہا تھا۔ اس نے پہلے کوفہ کے

باہر خارجیوں کی نو تعمیر مسجد پر قبضہ کیا اور پھر ان پر زبردست دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ حجاج اپنی فوج کے پیچھے کھڑا ہو کر اس کو جوش دلا رہا تھا۔ اثنائے جنگ میں شبیب کا بھائی مصاد مارا گیا وہ بڑا نامی بہادر تھا اس سے حجاج کا حوصلہ بڑھ گیا۔ خوارج غزالہ اور جہیزہ کو لڑتے دیکھ کر برابر لڑائی میں مشغول تھے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ آخر حجاج نے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ ان عورتوں کو ہر صورت میں مار گراؤ۔ وہ چکر کاٹ کر عقب سے خوارج پر حملہ آور ہوئے اور غزالہ کو مار گرایا لیکن جہیزہ بچ گئی[1] اب خارجیوں کی ہمت پست ہو گئی اور وہ میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ شبیب اپنے بچے کھچے ساتھیوں کو لے کر اہواز کی طرف نکل گیا۔ حجاج نے عبدالرحمٰن حکمی کو تین ہزار فوج دے کر اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ایک مقام پر شبیب نے اس فوج کا زبردست مقابلہ کیا لیکن پھر میدان چھوڑ کر آرام لینے کے لیے کرمان چلا گیا۔ اب حجاج نے سفیان بن ابرد اور حکم بن ایوب والی بصرہ کو ایک آزمودہ کار لشکر دے کر اس کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ اہواز کے ساحل کے قریب ان کی شبیب سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔ اس کے پاس بہت تھوڑے آدمی تھے لیکن وہ صبح سے شام تک بڑی بہادری سے مقابلہ کرتا رہا۔ اندھیرا زیادہ ہو گیا تو فریقین نے لڑائی سے ہاتھ روک لیے۔ شبیب نے رات گزارنے کے لیے دریا کو عبور کر کے دوسری سمت نکل کر جانا چاہا کہ عین پل کے وسط میں اس کا گھوڑا بدکا اور پانی میں گر پڑا۔ شبیب بھی پانی میں غوطے کھانے لگا۔ لوہے کی زرہ اور دوسرے جنگی اسلحہ نے تیرنا ناممکن بنا دیا اس وقت اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:

---

[1] ابن خلکان کا بیان ہے کہ غزالہ کے ساتھ جہیزہ بھی اسی لڑائی میں ماری گئی لیکن ابن اثیر اور طبری نے لکھا ہے کہ وہ شبیب کی موت کے بعد بھی زندہ تھی۔

لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلاً

جب غوطہ کھا کر ایک بار ابھرا تو اس کی زبان سے نکلا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے دریا کی پہنائیوں میں غرق ہوگیا۔ یہ واقعہ ۷۷ھ کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس کی لاش نکلوا کر سینہ چیرا گیا اور دل نکال کر دیکھا گیا تو وہ غیر معمولی جسامت کا اور پتھر کی طرح سخت تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے سینے میں دو دل پائے گئے۔

ابن اثیرؒ اور علامہ طبریؒ کا بیان ہے کہ شبیب کی غرقابی کے وقت اس کی ماں جہیزہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ کسی نے اس سے جا کر کہا کہ شبیب مارا گیا۔ اس نے کہا، شبیب اور مارا جائے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آخر جب دوسرے دن اسے بتایا گیا کہ وہ ڈوب کر مر گیا تو اس نے کہا، ہاں یہ ممکن ہے۔

مؤرخین نے جہیزہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ روم کی رہنے والی تھی اور شبیب کی ولادت سے پہلے اسے باندی بنا کر شام لایا گیا تھا۔ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر شبیب کے باپ یزید بن نعیم نے اسے خرید لیا اور اس سے شادی کر لی وہ اپنے شوہر پر جان چھڑکتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔ شبیب اس کے بطن سے ۲۵ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ جب وہ بطنِ مادر میں تھا تو جہیزہ نے خواب میں دیکھا کہ اس سے ایک تارا نکلا جو زمین اور آسمان کے درمیان چمکنے لگا، پھر وہ پانی میں گر پڑا اور غائب ہوگیا۔ اس خواب کی تعبیر یہ دی گئی کہ اس کا بیٹا بڑی تیزی سے بامِ عروج پر پہنچے گا اور اس کی موت پانی میں ڈوبنے سے ہوگی ——— بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ خواب سچا تھا۔

(تاریخِ اسلام۔ تاریخِ ملت۔ تاریخِ خوارج۔ خواتین کی بہادری)

دوسری صدی ہجری

۱۔ حضرت رابعہ بصریؒ (عارفہ)
۲۔ اخت المزنیؒ (عالمہ)
۳۔ ام سفیان ثوریؒ (عارفہ)
۴۔ بی بی امۃ الاسلامؒ (عالمہ، عارفہ)
۵۔ بی بی رابعہ شامیہؒ (عارفہ)
۶۔ شہزادی علیہؒ (عالمہ و شاعرہ)
۷۔ بی بی کردیہؒ (عارفہ)
۸۔ بی بی فاطمہؒ نیشاپوری (عارفہ)
۹۔ بی بی ام طلقؒ (عارفہ)
۱۰۔ بی بی عملیہؒ بنت حسان (عاقلہ فاضلہ)
۱۱۔ حضرت نفیسہؒ بنت حسنؒ (عالمہ و عارفہ)
۱۲۔ ام یحییٰؒ (عالمہ)
۱۳۔ بی بی شعوانہؒ (عارفہ)
۱۴۔ ملکہ خیزران (نیک طینت مخیر)
۱۵۔ بی بی مریمؒ بصریہ (عارفہ)
۱۶۔ شہزادی عباسہ (عالمہ، دانا)
۱۷۔ خواہر سندی بن شاہک (نیک دل، دانشمند)
۱۸۔ سیدہ عائشہؒ (عالمہ، عارفہ)
۱۹۔ ام جعفر عتابہ (عالمہ، معارف پرور، مخیر)
۲۰۔ ملکہ زبیدہ (رحم دل، مخیر، علم دوست)
۲۱۔ بی بی ام احسانؒ (عارفہ)
۲۲۔ بی بی حکیمہؒ (عارفہ)
۲۳۔ لیلیٰ بنت طریف (بہادر خارجیہ، شاعرہ)

حضرت رابعہ بصری یا رابعۃ العدویۃؒ

ان کا شمار دوسری صدی ہجری کی شہرہ آفاق عارفات میں ہوتا ہے۔ قبیلہ قیس بن عدی کی ایک شاخ العتیق کی کنیز تھیں۔ اسی نسبت سے ان کو عدویہ اور القیسیہ کہا جاتا تھا۔ اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کی بنا پر "اُمّ الخیر" کے لقب یا کنیت سے بھی شہرت پائی۔ ان کا ایک لقب "تاج الرجال" بھی ہے۔

۹۵ھ ہجری (بروایتِ دیگر ۹۹ھ) میں بصرہ (عراق) کے ایک نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام اسمٰعیل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھیں اس لیے ان کا نام رابعہ (یعنی چوتھی لڑکی) مشہور ہوگیا۔ بچپن میں کسی شخص نے انہیں پکڑ کر فروخت کر دیا تھا اور وہ غلامی ہی کی حالت میں پلی بڑھیں۔ اپنے مالک کے گھر کا کام انجام دینے کے بعد جو وقت بچتا اس میں عبادت کرتی رہتیں۔ اُن کے مالک نے ان کی عبادت و ریاضت کو دیکھ کر انہیں آزاد کر دیا۔ بہت سے تذکرہ نویسوں نے ان کے حالاتِ زندگی بڑی تفصیل سے لکھے ہیں مگر ان میں خاصے تضادات پائے جاتے ہیں اور بعض سوالات جو ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، ان کے جوابات بھی نہیں ملتے۔ مثلاً ان کی تعلیم و تربیت کیسے ہوئی، انہوں نے طریقت اور سلوک کی راہ کیسے اختیار کی۔ کون سے شیوخ تھے جن سے انہوں نے کسب فیض کیا، کیا انہوں نے پردہ ترک کر دیا تھا یا پردے کے پیچھے بیٹھ کر مردوں سے گفتگو کرتی تھیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ انہوں نے بڑھاپے میں چہرے کا پردہ ترک کیا ہو اور مردوں نے اسی زمانے میں ان کے فیوض و برکات سے فائدہ اٹھایا ہو۔

بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ حضرت رابعہؒ نے تمام زندگی تجرد کی

حالت میں گزار دی اور بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے شادی کر لی تھی اور ان کی اولاد بھی تھی مگر ادھیڑ عمر میں بیوہ ہو گئیں اور اس کے بعد دوسرا نکاح نہیں کیا۔ اولاد کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر صورت بیشتر تذکرہ نگاروں نے ان کی عبادت و ریاضت، دانش و حکمت اور زہد و اتقا کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی بے شمار کرامات بیان کی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ غلامی سے آزاد ہونے کے بعد وہ صحرا میں عزلت گزین ہو گئیں۔ معلوم نہیں عزلت گزینی کا زمانہ کتنے سالوں پر محیط ہے لیکن یہی وہ دَور ہے جس میں انہوں نے سلوک و معرفت کی منزلیں طے کیں۔ اس کے بعد بصرے آ گئیں اور باقی ساری زندگی وہیں گزاری۔ بصرہ میں قیام کے بعد جلد ہی ان کے زہد و تقویٰ اور علم و معرفت کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق کسبِ فیض کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے ان میں اس دَور کے بڑے بڑے مشائخِ طریقت، زہاد اور صلحا بھی شامل تھے۔ تذکرہ نگاروں نے اس سلسلے میں امام سفیان ثوریؒ، حضرت مالک بن دینارؒ، حضرت شفیق البلخیؒ اور حضرت رباح القیسیؒ کے اسمائے گرامی صراحت کے ساتھ لیے ہیں۔ بعض نے تو خواجہ حسن بصریؒ کا نام بھی لیا ہے لیکن یہ روایت بالکل غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ خواجہ حسن بصریؒ کی وفات (سنہ ۱۱۰ھ) کے وقت حضرت رابعہؒ کی عمر صرف گیارہ یا چودہ سال کی تھی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ حضرت رابعہؒ نے خواجہ حسن بصریؒ سے کسبِ فیض کیا ہو لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے کہ خواجہ حسنؒ جیسی بزرگ شخصیت نے بڑھاپے میں ایک نوخیز لڑکی سے اکتسابِ فیض کیا ہو۔

حضرت رابعہ بصریؒ کے ارشادات اور ملفوظات جو مختلف تذکروں میں نقل ہوئے ہیں، اُن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار تھیں اور اس کی رضا کے سوا کسی چیز کی طلبگار نہ تھیں۔ ان کی اللہ سے محبت

بالکل بے غرض تھی۔ یہ خالص محبت صرف اس کی ذات کی خاطر تھی۔ لوگوں کو بھی وہ حق تعالیٰ سے ایسی ہی محبت کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ ان کی ایک مشہور دعا سے ان کے خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دعا اس طرح منقول ہے:

"اے میرے مالک! اگر میں دوزخ کے ڈر سے تیری عبادت کرتی ہوں تو تو مجھے دوزخ میں پھینک دے اور اگر میں جنت کی خاطر تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے جنت سے محروم کر دے لیکن اگر میں صرف تیری ہی خاطر تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھ کو اپنے دیدار سے محروم نہ کرنا۔"

ایک دفعہ کسی نے ان سے کہا کہ جو لوگ آپ سے اخلاص و عقیدت رکھتے ہیں آپ ان سے مدد کیوں نہیں مانگتیں؟ انہوں نے فرمایا۔ "میں تو دنیا کی چیزیں اُس سے بھی مانگتے ہوئے شرماتی ہوں جو ہر شے کا خالق اور مالک ہے پھر ان سے کیسے مانگوں جو کسی چیز کے (حقیقی) مالک نہیں۔"

ایک اور موقع پر فرمایا۔ "کیا اللہ تعالیٰ غریبوں کو ان کی غریبی کے سبب بھلا دے گا یا امیروں کو ان کی دولت کی وجہ سے یاد رکھے گا؟ جب اس کو میرے حال کا علم ہے تو ایسی کون سی بات ہے جو میں اس کو یاد دلاؤں؟ جو کچھ اس کی رضا ہے وہی ہماری بھی مرضی ہونی چاہیے۔"

ایک دفعہ حضرت رابعہؒ نے ایک جوان کو سر پر پٹی باندھے ہوئے دیکھا۔ اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا، میرے سر میں درد ہے۔ انہوں نے پوچھا، تیری عمر کتنی ہے؟ اس نے کہا، تیس سال۔ پوچھا، کیا ان تیس سالوں میں پہلے بھی کبھی بیمار ہوا؟ اس نے کہا، نہیں۔ فرمایا — افسوس کہ تیس سال تم نے تندرستی کے شکر کی پٹی تو نہ باندھی لیکن صرف ایک دن کی بیماری میں شکایت کی پٹی باندھ لی۔

ایک دفعہ کسی نے ان سے پوچھا، کیا آپ اللہ کو دوست رکھتی ہیں؟ فرمایا،

بے شک میں اللہ کو دوست رکھتی ہوں۔ سوال کرنے والے نے پھر پوچھا، کیا آپ شیطان کو دشمن سمجھتی ہیں، فرمایا، اللہ کی محبت نے مجھے اس قدر مستغرق اور وارفتہ بنا رکھا ہے کہ مجھے شیطان کی دشمنی کی نہ پروا ہے اور نہ اتنی فرصت کہ اس طرف توجہ دوں۔

ایک دفعہ بصرہ کے کچھ لوگ حضرت رابعہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے — "اے رابعہ مردوں کو کیوں ایسے مرتبے حاصل ہوئے جو عورتوں کو کبھی نہیں مل سکے۔ کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اسی لیے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے مرتبۂ نبوت پر ہمیشہ مردوں ہی کو فائز کیا اور اس اعزاز سے عورتوں کو ہمیشہ محروم رکھا۔"

حضرت رابعہؒ نے جواب دیا: "بھائیو! کیا تم نے کبھی سُنا ہے کہ کسی عورت نے آج تک خدائی کا دعویٰ کیا ہو۔ یہ اعتبار بھی صرف مردوں ہی کے حصے میں آیا کہ انہوں نے خدائی تک کا دعویٰ کرنے سے گریز نہ کیا۔ رہی دوسری بات تو یہ درست ہے کہ اللہ نے کبھی کسی عورت کو مرتبۂ نبوت پر فائز نہیں کیا، مگر یہ بھی تو سوچو کہ جتنے نبی، صدیق، شہید اور ولی ہوئے ہیں وہ عورتوں ہی کے بطن سے پیدا ہوئے، انہی کی گود میں تربیت پائی اور پروان چڑھے۔ کیا عورتوں کا یہ رتبہ کچھ کم ہے؟" یہ سُن کر سب لوگ لاجواب ہو گئے۔

مختلف تذکروں میں اسی قسم کے لاتعداد واقعات حضرت رابعہ بصریؒ سے منسوب ہیں جن کو اگر جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن نہ ان سب کی صحت کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ ان سب سے یکسر انکار کیا جا سکتا ہے۔ حضرت رابعہؒ نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت رابعہؒ شعر وسخن سے بھی بہرہ ور تھیں۔ امام غزالیؒ نے "احیاء علوم الدین" میں ان کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں جن میں سے یہ کچھ یہ ہیں: ——

اُحِبُّکَ حُبَّیْنِ حُبَّ الْهَوٰی	وَحُبًّا لِاَنَّکَ اَهْلٌ لِّذَاکَا
فَاَمَّا الَّذِیْ هُوَ حُبُّ الْهَوٰی	فَشُغْلِیْ بِذِکْرِکَ عَمَّنْ سِوَاکَا
وَاَمَّا الَّذِیْ اَنْتَ اَهْلٌ لَّهٗ	فَکَشْفُکَ لِیْ الْحُجُبَ حَتّٰی اَرَاکَا
فَلَا الْحَمْدُ فِیْ ذَا وَلَا ذَاکَ لِیْ	وَلٰکِنْ لَّکَ الْحَمْدُ فِیْ ذَا وَذَاکَا

(میں نے دو طرح تجھ سے محبت کی۔ ایک تو خود غرضانہ اور دوسری اس لیے کہ تو اس کے لائق ہے۔ خود غرضانہ محبت میں ماسوا سے میری آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن اس محبت میں جو تیری شان کے شایان ہے، تو کشفِ حجاب کرتا ہے تاکہ میں تیرے جمال کا مشاہدہ کر سکوں۔ ان دونوں صورتوں میں کسی میں بھی میں تعریف کی مستحق نہیں ہوں البتہ دونوں صورتوں میں سب تعریفوں کے لائق تو ہی ہے)

"دائرہ معارف اسلامیہ" کے مطابق حضرت رابعہ بصریؒ نے ۱۸۵ھ (۸۰۱ء) میں بصرہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں۔ لیکن "مشاہیر نسواں" میں سید امیر علی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ۱۳۵ھ میں وفات پائی اور "جبل الطیر" نامی پہاڑ میں جو بیت المقدس کے مشرق میں واقع ہے، دفن ہوئیں۔ ان کے مزار پر زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

(مشاہیر نسواں، نفحات الانس، مشاہیر النساء، تذکرۃ الاولیاء، شرف النساء، دائرہ معارف اسلامیہ، احیاء علوم الدین)

بی بی اخت المزنیؒ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد شیخ ابو ابراہیم المزنیؒ کی بہن تھیں اور علمِ فقہ میں یکتائے زمانہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے امام شافعیؒ کے مسئلہ زکوٰۃ معدن میں تغیر و تبدل کیا ہے اور ایک شرط کا اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔ (مشاہیر نسواں)

اُمِّ سفیان ثوریؒ

حضرت سعید بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ اور تبع تابعین کے گل سرسبد حضرت امام سفیان ثوریؒ (المتوفی ۱۶۱ھ) کی والدہ تھیں۔ شوہر حضرت سعید بن مسروقؒ بہت اونچے درجے کے عالم تھے اور حدیثِ نبوی کی تحدیث و روایت میں معروف تھے۔ وہ خود بھی بہت نیک سیرت اور صاحبِ علم خاتون تھیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک بار رات کو آسمان پر نگاہ اٹھائی تو یوں محسوس ہوا کہ میرا دل پہلو میں نہیں ہے۔ اس کا ذکر میں نے اپنی والدہ سے کیا تو انہوں نے فرمایا:

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آسمان پر عبرت پذیری اور غور و فکر کی غرض سے نگاہ نہیں ڈالی بلکہ تمہارا مقصد صرف تفریح تھا۔"

حضرت سفیان ثوریؒ کے والدین کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی جو ان کے حصولِ علم کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی مگر اُمِّ سفیانؒ کے جذبۂ دینی اور ہمتِ مردانہ نے اس کو دور کر دیا۔ ایک دن انہوں نے حضرت سفیانؒ کو حصولِ علم کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

"یا بُنَیَّ اطلب العلم وانا اکفیک بمغزلی"

(اے میرے بیٹے تم حصولِ علم میں مشغول رہو، میں چرخہ کات کر تمہارے اخراجات پورے کروں گی)

اُمِّ سفیانؒ نے بیٹے کو صرف حصولِ علم ہی کی ترغیب نہیں دی بلکہ ان کو یہ نصیحت بھی کی کہ یہ علم ان کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کا سبب ہو، ان

کے بگاڑنے کا باعث نہ ہو۔ وہ عبادت ہو، تجارت نہ ہو، ان کا یار ہو مار نہ ہو۔ چنانچہ ایک بار بڑی دلسوزی سے نصیحت کی کہ:

"بیٹے جب تم دس حرف لکھ چکو تو دیکھو کہ تمہاری چال ڈھال اور حلم و وقار میں کوئی اضافہ ہوا یا نہیں اگر کوئی اضافہ نہیں ہوا تو علم نے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

(تبع تابعین)

بی بی امۃ الاسلامؒ

دوسری صدی ہجری میں مشہور عالمہ و فاضلہ گزری ہیں۔ بقول مؤلف سفینۃ الاولیاء ۱۱۸ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام قاضی ابوبکر بن کامل بن خلف تھا۔ بی بی امۃ الاسلام نے اپنے وقت کے سرآمد روزگار عالم شیخ محمدؒ اسماعیل بصلائیؒ سے تمام علوم ظاہری حاصل کیے اور پھر علوم طریقت میں بھی درجۂ کمال حاصل کیا۔ انہوں نے ماہ رجب ۱۹۵ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر نسواں)

بی بی رابعہ شامیہؒ

شیخ احمد بن ابی الحواریؒ المتوفی ۲۰۳ھ ہجری کی اہلیہ تھیں۔ نہایت پرہیزگار اور عابدہ و زاہدہ تھیں۔ بی بی حکیمہؒ کی شاگرد تھیں اور ان سے کسب فیض کرکے خود بھی زمرۂ عارفات میں شامل ہو گئی تھیں۔ بی بی حکیمہؒ کی طرح ان کو بھی دوسری صدی ہجری کی اولیاء اللہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان پر ہمیشہ محبت الٰہی اور

خوف کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھیں اور فی البدیہہ عارفانہ اشعار کہا کرتی تھیں۔

کشف و کرامات کے کئی واقعات بھی ان سے منسوب ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک دن ان کے سامنے کھانے کا ایک طشت رکھا گیا! انہوں نے خادمہ سے کہا کہ اس طشت کو میرے سامنے سے ہٹالے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آج خلیفۃ المسلمین نے وفات پائی۔ بعد میں اس بات کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ واقعی اس دن امیر المؤمنین ہارون الرشید نے وفات پائی تھی۔

ایک دن وہ اپنی استاد بی بی حکیمہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے فرمایا: "رابعہ! میں نے سنا ہے کہ تیرا شوہر احمد بن ابی الحواری دوسری شادی کرنے کی فکر میں ہے۔"

بی بی رابعہؒ نے کہا: جی ہاں۔

بی بی حکیمہؒ نے فرمایا: "میں حیران ہوں کہ ایسا عالم اور دانا ہو کر وہ دو عورتوں کی محبت کو کیونکر اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور خدا کی محبت سے دل پھیرتا ہے۔"

بی بی رابعہؒ نے کہا: کیا آپ کو یہ آیت یاد نہیں اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ

بی بی حکیمہؒ نے فرمایا: کیا تم اس کا مطلب بھی صحیح طرح جانتی ہو؟

بی بی رابعہؒ نے کہا: نہیں۔

بی حکیمہؒ نے فرمایا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ حاضر ہونے والا اپنے معبود کے روبرو حاضر ہو اور اس کے دل میں سوائے اس کے اور کسی کا خیال نہ ہو۔"

بی بی رابعہؒ کہتی ہیں کہ حضرت حکیمہؒ کی بات کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ ہمیشہ یادِ خدا میں محو رہتی بھی اور لوگوں سے چھپتی پھرتی تھی کہ مبادا وہ مجھے دیوانہ خیال کریں۔

(نفحات الانس)

شہزادی علیّہ

تیسرے عباسی خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) کی بیٹی اور پانچویں عباسی خلیفہ ہارون الرشید (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) کی علاتی بہن تھی۔ والدہ کا نام مکنونہ تھا۔ والد نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ چنانچہ اس نے قرآن و حدیث کی تعلیم بھی پائی اور دوسرے علوم متداولہ میں بھی اعلیٰ درجے کی دسترس حاصل کی۔ شعر و سخن کا خاص ذوق رکھتی تھی اور موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اس کی زندگی پر نظر ڈالیں تو وہ دین اور دنیا کا عجیب امتزاج دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف تو وہ بڑی پرہیزگار اور پابندِ صوم و صلوٰۃ تھی۔ فجر کی نماز کے بعد بلاناغہ نہایت خوش الحانی سے تلاوتِ قرآن کیا کرتی تھی پھر مطالعۂ کتب میں مشغول ہو جاتی تھی، دوسری طرف وہ فالتو وقت میں کمرہ بند کر کے موسیقی سے جی بہلایا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت خوش آواز تھی۔ نہ صرف سخن فہم تھی بلکہ خود بھی ایک نغز گو شاعرہ تھی۔ اس کے اشعار نہایت فصیح و بلیغ ہوتے تھے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کمال درجے کے حُسنِ صورت سے نوازا تھا لیکن اس کے ماتھے پر ایک مسّہ تھا جو بہت بدنما معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس عیب کو چھپانے کے لیے سونے کا ایک بدر نما زیور بنوایا جس پر قیمتی ہیرے اور لعل جڑے گئے تھے یہ زیور اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں اس کا رواج ہو گیا۔ آج کل مشرقی ممالک کی دوشیزائیں "جھومر" نام کے جس زیور سے اپنا ماتھا سجاتی ہیں وہ شہزادی علیّہ ہی کی ایجاد اور یادگار ہے۔

شہزادی علیّہ نے اپنے بھتیجے مامون الرشید کے عہدِ خلافت

(سنہ ۱۹۸ھ تا سنہ ۲۱۸ھ) کے دوران پچاس برس کی عمر میں وفات پائی۔

(عقد الفرید۔ مشاہیر نسواں

روزنامہ "کوہستان" لاہور ۲۰ مارچ ۱۹۶۴ء)

بی بی کردیہ

بصرہ یا اہواز کی رہنے والی تھیں اور بی بی شعوانہؒ کی خاص شاگرد تھیں عبادت و ریاضت میں بہت انہماک تھا اور اپنے دور کی خدا رسیدہ خواتین میں شمار ہوتی تھیں۔

بی بی کردیہؒ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت شعوانہؒ کی خدمت میں حاضر تھی۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا اور میں وہیں سو گئی۔ حضرت شعوانہؒ نے مجھ کو جھنجوڑ کر جگایا اور فرمایا:

"اے کردیہ! یہ سونے کی جگہ نہیں ہے سونے کی اصل جگہ تو گورستان ہے۔"

کردیہؒ کا بیان ہے کہ حضرت شعوانہؒ کی صحبتِ بابرکت سے میرا دل دنیا کی محبت سے خالی ہو گیا اور دنیا پرست میری نگاہ میں حقیر ہو گئے مجھ کو روزی کی مطلق فکر نہ رہی۔ میرے دل میں مسلمانوں سے بڑی محبت پیدا ہو گئی اور میں کسی بھی مسلمان کو خواہ اس کی دنیوی حیثیت کتنی ہی معمولی ہوتی، حقیر نہ سمجھتی تھی۔

(نفحات الانس)

(قرۃ العین)

(فاطمہ)

بی بی فاطمہ نیشاپوری رح

بی بی فاطمہ خراسان (ایران) کے شہر نیشاپور کی رہنے والی تھیں۔ معرفتِ الٰہی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اور حضرت ذوالنون مصریؒ جیسے بزرگوں نے ان کے فضائل و کمالات کا اعتراف کیا ہے۔

بی بی فاطمہؒ طویل مدت تک بیت اللہ شریف میں مقیم رہیں۔ اس دوران میں خانہ کعبہ کی جو خدمت بن آتی تھیں، کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ان سے بڑے بڑے علماء اور اولیاء نے کسبِ فیض کیا۔ انہیں قرآن کریم کی تفسیر اور مطالب بیان کرنے میں ایسا کمال حاصل تھا کہ جو سنتا تھا عش عش کر اٹھتا تھا۔ عبادتِ الٰہی سے اس قدر شغف تھا کہ فرض نمازوں کے علاوہ ساری ساری رات نوافل پڑھنے میں گزار دیتی تھیں۔ لباس بہت معمولی ہوتا تھا اسی طرح کھانا بھی بالکل سادہ ہوتا تھا وہ بھی شاید ہی کبھی پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ عقیدت مند بہترین ملبوسات اور کھانے پیش کرتے مگر وہ سب غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ وہ لوگوں کو تلقین کیا کرتی تھیں کہ تمہارے ہر نیک عمل میں خلوص کارفرما ہونا چاہیے۔ تمہارا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے ہو اور اسے کرتے وقت تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں ایک باکمال دیکھی ہے اور وہ فاطمہ نیشاپوری ہے۔ جس مقام اور مسئلہ کے بارے میں ان سے گفتگو کی، ان کو اس سے آگاہ پایا۔

بی بی فاطمہؒ کو اگر کبھی سفر کا اتفاق پیش آتا تو وہ بالعموم بیت المقدس

کا سفر ہوتا۔ وہ بیت المقدس جاکر وہاں سے واپس مکہ معظمہ آجاتیں اور کسی جگہ ان کا دل نہ لگتا تھا۔ اس عارفہ نے ۲۲۳ھ ہجری میں وفات پائی۔" (نفحات الانس۔ شرف النساء)

بی بی اُمِّ طلق ؒ

بی بی اُمِّ طلق ؒ دوسری صدی ہجری میں نہایت عبادت گزار اور خدا رسیدہ خاتون گزری ہیں۔ نماز کے معاملے میں ان کا ذوقِ عبادت انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ محمدؒ بن سنان باہلی شعبہؒ بن دخانؒ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اُمِّ طلق ؒ دن رات میں چار سو نوافل پڑھتی تھیں، اور مقدور بھر تلاوتِ قرآن بھی کرتی تھیں۔

تبع تابعین کی مقدس جماعت کے مشہور بزرگ حضرت سفیان بن عیینہؒ (متوفی ۱۹۸ھ) بی بی اُمِّ طلق ؒ کے ہم عصر تھے اور گاہے گاہے کسبِ فیض کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن اُمِّ طلقؒ نے ان سے فرمایا: "اے سفیانؒ! تم قرآن مجید کی تلاوت کس خوش الحانی سے کرتے ہو لیکن ڈرتے رہو کہ کہیں یہی چیز قیامت کے دن تمہارے لیے وبال نہ ہو جائے۔" حضرت سفیانؒ یہ سن کر رونے لگے یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے۔

عاصم حجدریؒ کا بیان ہے کہ اُمِّ طلقؒ فرمایا کرتی تھیں کہ انسانی دل بادشاہ ہے اگر تم اس کو قابو میں رکھو اور یہی غلام ہے اگر تم اس کی پیروی کرو۔

ابنِ رومی کہتے ہیں کہ میں اُمِّ طلق کے گھر گیا۔ ان کے گھر کی چھت بہت نیچی تھی۔ میں نے کہا، اُمِّ طلق تمہارے گھر کی چھت کس قدر نیچی ہے۔ فرمایا، حضرت عمرؓ نے اپنے عاملوں کو لکھا تھا کہ اپنی عمارتیں اونچی نہ بناؤ۔ جب تم اپنی عمارتیں اونچی بنانے لگو گے تو وہ تمہارا بدترین زمانہ ہوگا۔

(طبقات ابنِ سعد۔ صفتہ الصفوۃ لابن جوزی جلد ۴ ص ۳۲)

بی بی عُلَیّہؒ بنت حسان

دوسری صدی ہجری کے سرآمدِ روزگار محدث امام اسمٰعیلؒ[1] بن عُلَیّہ کی والدہ تھیں۔ بصرہ میں بنو شیبان کی باندی تھیں۔ امام اسمٰعیلؒ کے والد ابراہیم بن مقسم کوفہ میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور کاروبار کے سلسلے میں ان کی آمدورفت بصرہ میں بھی رہتی تھی۔ وہیں انہوں نے بی بی عُلَیّہؒ کو بنو شیبان سے لے کر ان سے نکاح کر لیا۔ عُلَیّہ نہایت شریف الطبع، دانشمند اور عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔ فقہ و حدیث وغیرہ میں ان کو ایسا کمال حاصل تھا کہ علامہ خطیب بغدادیؒ کے بیان کے مطابق علامہ صالح المری اور بصرہ کے دوسرے بڑے بڑے علماء اور فقہاء ان کے مکان پر آ کر ان سے علمی اور فقہی مسائل میں گفتگو کرتے تھے۔ امام اسمٰعیلؒ ان کے بطن سے سنہ ۱۱۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت

---

[1] امام اسمٰعیل بن عُلَیّہؒ سنہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۳ھ میں فوت ہوئے ان کے علم و فضل پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے۔ ان کے دادا مقسم قیقان (قلات) کی ایک لڑائی میں پکڑے گئے (گویا امام اسمٰعیلؒ کے آباؤ اجداد کا وطن پاکستان تھا) والد ابراہیم بن مقسم عبدالرحمٰن بن قطبۃ الاسدی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے۔ اربابِ سِیَر نے امام اسمٰعیلؒ کو ریحانۃ الفقہاء، سید المحدثین، العلامہ اور اَحدُ الاسلام کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ان کو علمِ حدیث میں خاص کمال حاصل تھا اور یہ علم انہوں نے اپنے دور کے متعدد نامور ائمہ حدیث سے حاصل کیا تھا۔ امام منذرؒ، امام ابوداؤدؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ذہبیؒ اور ابن المدینیؒ جیسے عظیم المرتبت بزرگ بھی ان کی ثقاہت اور فضل و کمال کے معترف اور مداح ہیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

نہایت عمدگی سے کی اور ان کو بصرہ کے ائمۂ حدیث کے پاس بھیج کر اعلیٰ تعلیم دلائی۔ علامہ عبدالوارث جوادیؒ جو اس دور کے مشہور محدث تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک دن عُلَیّہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو لے کر میرے پاس آئیں اور کہا:

"یہ میرا فرزند ہے اس کو اپنے ساتھ رکھیئے تاکہ یہ آپ کی سی خو بو پیدا کرے۔"

امام اسمٰعیلؒ اپنے والد ابراہیم کے بجائے اپنی والدہ کے نام کی نسبت سے ابن عُلَیّہ مشہور ہوئے۔ اس کا ایک سبب تو ان کی والدہ کا غیر معمولی علم و فضل تھا اور دوسرا یہ کہ ان کی والدہ نے ان کو تعلیم دلانے کے لیے بڑی تگ و دو کی تھی۔ بی بی عُلَیّہ شادی کے بعد بھی بالاستقلال بصرہ ہی میں مقیم رہیں۔ ان کے ایک اور بیٹے ربعی بن ابراہیم تھے جو امام اسمٰعیلؒ کے بعد پیدا ہوئے وہ بھی بہت بڑے عالم اور محدث تھے اور ماں کی نسبت سے انہیں بھی ربعی بن عُلَیّہ کہا جاتا تھا۔ اس خاندان میں صدیوں تک فقہاء و محدثین پیدا ہوتے رہے۔

(غلامانِ اسلام ـ خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

فقہ میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان پر اکثر خشیتِ الٰہی کا غلبہ رہتا تھا اور ہنسنے بلکہ مسکرانے سے بھی گریز کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے دس سال میں ان کو ایک مرتبہ بھی ہنستے نہیں دیکھا۔ نہایت عبادت گزار تھے اور قرآن حکیم کی تلاوت بڑے شوق سے کیا کرتے تھے۔ فقہ و حدیث میں انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں چار کے نام معلوم ہیں، کتاب التفسیر، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب المناسک۔ ان کے دو صاحبزادے ابو اسحاق ابراہیمؒ اور حمادؒ تھے۔ یہ دونوں بھی اپنے عہد کے مشہور محدث تھے۔

(غلامانِ اسلام ـ خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان)

حضرت نفیسہؒ بنتِ حسنؒ

حضرت نُفَیسہؒ بنتِ حسنؒ کا شمار دوسری صدی ہجری کی سرآمدِ روزگار عالمات و عارفات میں ہوتا ہے۔ وہ حضرت حسنؒ بن زیدؒ بن حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی صاحبزادی اور حضرت اسحٰقؒ بن جعفر صادقؒ بن محمد باقرؒ بن علی زین العابدینؒ بن حسینؓ بن علیؓ کی اہلیہ تھیں۔ ۱۴۵ھ (بروایتِ دیگر ۱۳۴ھ) میں پیدا ہوئیں۔ اہل بیت کے تقویٰ شعار گھرانے میں پلی بڑھیں اور جملہ محاسنِ اخلاق کا پیکرِ جمیل بن گئیں۔ سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا پھر تفسیر حدیث اور دوسرے علوم دینی میں کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد اپنا بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں گزارنے لگیں۔ سنِ بلوغت کو پہنچیں تو ان کی شادی اپنے ابنِ عم اسحٰقؒ بن جعفر صادقؒ سے ہو گئی وہ بھی نہایت عابد و زاہد نوجوان تھے۔ انہوں نے مدت تک مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں قیام کیا، اس دوران میں بے شمار تشنگانِ علم نے ان کی جوئے علم سے اپنی پیاس بجھائی اور وہ "نفیسۃُ العِلم والمَعرفت" کے لقب سے مشہور ہو گئیں۔

چند سال کے بعد وہ اپنے شوہر نامدار کے ساتھ مدینہ منورہ سے مصر چلی گئیں اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ مصر جا کر ان کی عبادت و ریاضت میں اور اضافہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ صائم الدہر اور قائم اللیل تھیں۔ خشیتِ الٰہی سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتی تھیں۔ زبان اکثر توبہ و استغفار میں مشغول رہتی تھی۔ نمازِ تہجد کا خاص التزام تھا۔ زندگی میں تیس مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ حج کے موقع پر مسجدِ حرام میں داخل ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتیں تو تلبیہ کے وقت زار و قطار روتی جاتیں پھر غلافِ کعبہ کے ساتھ لپٹ کر خوب روتیں اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ یہ دعا مانگتیں۔

"الٰہی تو ہی میرا آقا و مولا ہے میں ناچیز بندی تیری رضا چاہتی ہوں۔ تو مجھے ایسا کر دے کہ میں تیری رضا پر راضی رہوں"!

حضرت امام شافعیؒ سیدہ نفیسہؒ کے ہمعصر تھے وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف علمی مسائل پر گفتگو کرتے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام موصوفؒ نے علم حدیث میں سیدہ نفیسہؒ سے استفاضہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے کے مرتبہ شناس اور قدردان تھے۔ امام شافعیؒ نے ۲۰۴ھ میں اپنی وفات سے پہلے وصیت کی کہ میرا جنازہ سیدہ نفیسہؒ کے گھر کے سامنے سے گزارا جائے۔ چنانچہ جب ان کا جنازہ سیدہ کے گھر کے سامنے پہنچا تو انہوں نے گھر کے اندر ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔

حضرت نفیسہؒ سے بہت سی کرامات منسوب ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے علم و فضل زہد و اتقا اور کرامات کی وجہ سے اہلِ مصر ان کے بہت معتقد تھے اور آج تک ان کی عقیدت کا یہی عالم ہے۔ ۲۰۸ھ میں حضرت نفیسہؒ نے وفات پائی تو ان کے شوہر نے ارادہ کیا کہ سیدہ کی میت مدینے لے جا کر دفن کریں لیکن اہلِ مصر رو رو کر ہلکان ہو گئے۔ بار بار حضرت اسحٰقؒ سے التجائیں کرتے تھے کہ سیدہ کی میت کو مصر سے نہ لے جائیں آخر انہوں نے ان کی درخواست قبول کر لی اور سیدہ نفیسہؒ کی آخری آرامگاہ قاہرہ کے قریب بنائی گئی۔ ان کا مزار "مشہدِ نفیسہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر سیدہ نفیسہؒ کے عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

حضرت نفیسہؒ کی وفات کا واقعہ بھی بڑا ایمان افروز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ رمضان المبارک کے مہینے میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں کہ اچانک ضعف غالب ہوا اور نبض ڈوبنے لگی۔ سب نے اصرار کیا کہ روزہ توڑ ڈالیں لیکن انہوں نے فرمایا، تیس سال سے میری یہ آرزو تھی کہ میں روزے کی حالت میں اپنے خالق کے حضور جاؤں، اب یہ آرزو پوری ہونے کو ہے تو روزہ کیوں توڑ دوں۔ یہ فرما کر قرآن کریم کی آیات پڑھتے پڑھتے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ (مشاہیر نسواں۔ ابنِ خلکان وغیرہ)

اُمِّ یحییٰ ؒ — قرآنِ حکیم کی ایک گمنام عالمہ

حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ فرماتے ہیں[1] کہ میں ایک مرتبہ حج کو گیا۔ اثنائے سفر میں مجھے ایک بوڑھی خاتون ایک مقام پر بیٹھی ہوئی ملی اس نے اون کا کرتا پہن رکھا تھا اور اون ہی کی اوڑھنی اوڑھ رکھی تھی میں نے اس کے پاس جا کر کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

خاتون نے جواب میں کہا: سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (یٰسین۔ ۵۸)

میں نے پوچھا: "اللہ تم پر رحم کرے یہاں کیا کر رہی ہو؟"

خاتون: مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ (الاعراف - ۱۸۶)

(جسے اللہ گمراہ کر دے اس کو راہ بتانے والا کوئی نہیں)

---

[1] حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مبارک تبع تابعین کی اس مقدس جماعت کے گلِ سرسبد ہیں جس کا ہر فرد اپنی ذات میں دین کا ستون اور زمانہ کا امام تھا۔ وہ ۱۱۸ھ میں مرو (MERV) میں پیدا ہوئے۔ والد مبارک آزاد کردہ غلام تھے اور نہایت متقی آدمی تھے۔ انہوں نے فرزندِ دلبند کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا۔ جب وہ مرو میں فارغ التحصیل ہو چکے تو مزید تعلیم کے لیے سالہا سال تک مختلف ملکوں اور شہروں (شام، عراق، یمن، مصر، کوفہ، بصرہ وغیرہ) میں گھومتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے عہد کے سرآمدِ روزگار علماء سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے شیوخ میں سرِ فہرست حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ؒ، امام سفیان ثوری ؒ اور امام اوزاعی ؒ ہیں۔ ان کے علاوہ امام مالک ؒ، امام اعمش ؒ، حضرت ہشام بن عروہ ؒ، امام لیث بن سعد ؒ، حضرت یحییٰ بن سعید انصاری ؒ، حضرت حماد بن سلمہ ؒ، سلیمان التیمی ؒ اور سفیان بن عیینہ ؒ جیسے فضلائے اُمت

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں نے خیال کیا کہ وہ راستہ بھول گئی ہے (یا اپنے قافلے سے بچھڑ گئی ہے) چنانچہ اس سے پوچھا: "تمہارا ارادہ کہاں جانے کا ہے؟"

خاتون: سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا۔ (بنی اسرائیل - ۱)

(پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجدِ حرام (بیت اللہ۔ مکہ معظمہ) سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) لے گئی)

میں سمجھ گیا کہ وہ حج بیت اللہ سے فارغ ہو چکی ہے اور اب بیت المقدس (یروشلم) جانا چاہتی ہے ـــــ اب میں نے پوچھا:

کب سے یہاں بیٹھی ہو؟

خاتون: ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (مریم - ۱۰)

(پوری تین راتیں)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بھی ان کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

"ابن المبارک کے زمانے میں ان سے زیادہ علم کی تلاش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔"

(تہذیب التہذیب)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ قرآن، حدیث، فقہ، سیرت و مغازی اور دوسرے دینی علوم کے علاوہ دنیوی علوم زبان و ادب، نحو و بلاغت، لغت و شاعری وغیرہ کے بھی بحرِ زخار تھے۔ گویا ان کی ذات دینی اور دنیوی علوم کی جامع تھی یہاں تک کہ علمِ طب بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں تھا۔

ایک دفعہ کسی شخص نے امام سفیان ثوریؒ کے سامنے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو "یا عالم المشرق" کہہ کر خطاب کیا۔ انہوں نے فرمایا "کیا کہہ رہے ہو ـــــ وہ تو عالم المشرق والمغرب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زبردست قوتِ حافظہ عطا کی تھی۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں نے کہا: "تمہارے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ وقت تم نے کیونکر گزارا؟"

خاتون: هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ (الشعراء۔ ۷۹)

(وہی (اللہ) مجھے کھلاتا پلاتا ہے (یعنی اللہ میرے رزق کا بندوبست کر دیتا ہے)

میں نے پوچھا: "وضو کیسے کرتی ہو؟"

خاتون: فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا (المائدہ۔ ۶)

(نہ پاؤ پانی تو پاک مٹی سے تیمم کرلو)

مطلب یہ کہ پانی نہیں ملتا تو تیمم کر لیتی ہوں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بقول علامہ ابن سعدؒ وہ معتبر تھے، حجت تھے، کثیر الحدیث تھے اور اس قابل تھے کہ ان کے قول کو سند تسلیم کیا جائے۔ فقہ میں اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ ان کی موجودگی میں بڑے بڑے علماء و فقہاء مسئلہ بتانے سے احتراز کرتے تھے۔ وہ عبادت و ریاضت، زہد و ورع، سخاوت، امانت و دیانت اور حسنِ معاشرت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں اسمٰعیل بن عیاشؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ روئے زمین پر عبداللہ بن مبارکؒ جیسی کوئی شخصیت نہیں ہے اور میری دانست میں کوئی اچھی خصلت ایسی نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں ودیعت نہ کر دیا ہو۔ بعض اربابِ سیر نے انہیں اولیاء اللہ میں شامل کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ مستجاب الدعوات اور صاحبِ کرامات تھے۔

بہر صورت وہ شریعت و طریقت کے مرج البحرین تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے حج کیے۔ شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ جب بھی موقع ملتا میدانِ جہاد میں پہنچ جاتے اور سر دھڑ کی بازی لگا کر کفار کے خلاف دادِ شجاعت دیتے۔ عادات و اخلاق میں وہ صحابۂ کرامؓ کا نمونہ تھے۔ کتبِ حدیث میں ان سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں نے پوچھا: "میرے پاس کھانا ہے، کھاؤ گی؟"

خاتون: - اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ (البقرہ۔ ۱۸۷)

(روزوں کو رات تک پورا کرو)

مطلب یہ کہ میں روزے سے ہوں۔

میں نے کہا: "یہ رمضان المبارک کا مہینہ تو نہیں ہے؟"

خاتون: - وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (البقرہ۔ ۱۵۸)

(جو بطور نفل کے نیک کام کرے تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے)

مطلب یہ کہ میرا نفلی روزہ ہے۔

میں نے کہا: "سفر کی حالت میں تو فرض (رمضان کا) روزہ نہ رکھنے کی بھی اجازت ہے۔"

خاتون: - وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ۔ ۱۸۴)

(اور اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے حق میں بہتر ہو بشرطیکہ تم کو ثواب کا علم ہو۔)

میں نے کہا: "جس طرح میں تم سے باتیں کر رہا ہوں تم اس طرح کیوں مجھ سے باتیں نہیں کرتیں۔"

خاتون: - مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (قٓ۔ ۱۸)

(انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر ایک نگہبان فرشتہ مقرر ہے)

مطلب یہ کہ انسان کو اپنی ہر بات کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

مروی احادیث کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اپنی روایات میں اسناد کا خاص خیال رکھتے تھے۔

رمضان المبارک ۱۸۱ھ میں جہاد فی سبیل اللہ کے شام جا رہے تھے کہ ہیت کے مقام پر مختصر علالت کے بعد وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۶۳ برس

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں نے پوچھا: "تمہارا تعلق کس قبیلے سے ہے؟"

خاتون: لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل-۳٦)

(جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو۔ بلاشبہ کان آنکھوں اور دل سب سے باز پرس ہو گی۔)

مطلب یہ کہ ایسی باتوں سے کان اور دل کو آلودہ نہ کرو جن کا جواب دینا پڑے۔

میں نے کہا: "معاف کرنا مجھ سے غلطی ہوئی۔"

خاتون: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ (یوسف-۹۲)

(آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے)

میں نے کہا: "اگر تم چاہو تو میں تم کو اپنی اونٹنی پر بٹھا کر لے چلوں اور جہاں چاہو وہاں پہنچا دوں۔"

خاتون: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (البقرہ-۱۹۷)

(اور نیکی کا کام جو تم کرو گے، اللہ اس کو جانتا ہے)

میں یہ سن کر اونٹنی اس کے قریب لے گیا، اسے بٹھایا اور خاتون سے کہا کہ اس پر سوار ہو جاؤ۔ مگر وہ سوار ہونے سے پہلے بولی:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور-۳۰)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی تھی۔ مقام وفات اگرچہ ایک دور افتادہ مقام تھا لیکن جنازے پر اس قدر ہجوم ہوا کہ چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کی وفات کی خبر سنی تو بے ساختہ کہا "افسوس علماء کے سردار کا انتقال ہو گیا۔" ابن مبارکؒ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن ان میں سے "کتاب الزہد والرقائق" کے سوا اکثر نایاب ہیں۔

(مومنوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں)

مطلب یہ کہ تم اپنی آنکھیں بند کر لو یا منہ پھیر کر کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں بلا جھجک سوار ہو جاؤں۔

چنانچہ میں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور اس سے کہا: "لو اب سوار ہو جاؤ۔" جب وہ خاتون سوار ہونے لگی تو اچانک اونٹنی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی اوڑھنی کجاوے سے الجھ کر پھٹ گئی۔ میں نے اس پر اظہارِ افسوس کیا تو وہ بولی: ———

مَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (الشوریٰ-۳۰)

(تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے اور اللہ بہت سی خطاؤں کو معاف کر دیتا ہے)

یعنی اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔

میں نے کہا: "ذرا ٹھہرو، میں اونٹنی کے پاؤں باندھ دوں تاکہ تم اطمینان سے سوار ہو سکو۔"

خاتون: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ (الانبیاء-۷۹)

(پس ہم نے سمجھا دیا سلیمانؑ کو)

یعنی اونٹنی کے پاؤں ضرور باندھو یہ اسی طرح سمجھے گی۔

میں نے اونٹنی کے پاؤں باندھے اور اس سے کہا، اب سوار ہو جاؤ وہ سوار ہو گئی اور یہ آیت پڑھی: ———

سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ۔ وَ اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔ (الزخرف - ۱۳/۱۴)

(پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارا مطیع کیا اور ہم اس کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور بے شک ہم سب اپنے پروردگار

کی طرف لوٹنے والے ہیں)

میں نے اونٹنی کی مہار پکڑی اور اس کو ہنکاتے ہوئے چل پڑا۔ میری رفتار بھی تیز تھی اور جوش میں میری آواز بھی بہت بلند ہوگئی۔ اس پردہ خاتون بولی:

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (لقمٰن۔۱۹)

(اپنے چلنے میں اعتدال سے کام لو اور اپنی آواز کو پست رکھو)

اب میں آہستہ آہستہ چلنے لگا اور ساتھ ہی حُدی خوانی کرنے لگا۔ اس پر خاتون نے کہا: ـــــــ

فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (المزمّل۔۲۰)

(پڑھو جتنی توفیق ہو قرآن سے)

مطلب یہ کہ اس حدی خوانی سے بہتر ہے کہ قرآن پاک سے کوئی رکوع پڑھو۔

میں نے کہا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت سی خوبیاں دی ہیں سب لوگ تم جیسے کس طرح بن جائیں۔ اس پردہ بولی: ـــــــ

وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران۔۷)

(یعنی صرف عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں)

پھر میں نے چلتے چلتے اس سے پوچھا: "کیا تمہارا شوہر بھی ہے؟"

اس نے کہا: ـــــــ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ (المآئدہ۔۱۰۱)

(اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت پوچھو جو اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار معلوم ہوں)

اب میں خاموش ہوگیا اور چلتے چلتے قافلے کے قریب جا پہنچا۔ میں نے خاتون سے پوچھا: "کیا قافلے میں آپ کا کوئی قرابت دار ہے؟"

اس نے کہا :ـــــ

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (الکہف-۴۶)

(مال اور بیٹے دُنیوی زندگی کی زینت ہیں)

میں نے سمجھ لیا کہ قافلے میں اس کے بیٹے موجود ہیں۔ میں نے پوچھا: وہ کوئی نشانی ہو تو بتاؤ تاکہ میں ان کو تلاش کر دوں۔"

وہ بولی :ـــــ

وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (النحل-۱۶)

(یعنی علامتیں ہیں اور ستارے ہی سے وہ راستہ پاتے ہیں)

میں سمجھ گیا کہ اس کے بیٹے قافلے کے رہبر ہیں۔ چنانچہ میں اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے قافلے میں چکر لگانے لگا اور اس سے کہا کہ اپنے بیٹوں کو ڈھونڈ لے۔

وہ بولی :ـــــ

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا (النسآء-۱۲۵) وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النسآء-۱۶۴) يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ- (مریم-۱۲) ـــــ

(اور بنایا اللہ نے ابراہیمؑ کو دوست اور بات کی موسٰیؑ سے اچھی طرح‘ اے یحییٰ پکڑ لو کتاب کو مضبوطی سے)

مطلب یہ کہ تم ابراہیم، موسٰی اور یحییٰ کے نام لے کر آواز دو۔

یہ سن کر میں نے زور سے آواز دی، یا ابراہیم یا موسٰی یا یحییٰ۔ فوراً تین خوبصورت نوجوان ایک خیمے سے نکلے اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ اپنی والدہ کو اونٹنی سے اتارا۔ جب ہم سب اطمینان سے بیٹھ گئے تو خاتون نے اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر یہ آیت پڑھی:

فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ

فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (الكهف ۱۹)

(اب اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ دے کر شہر کی طرف بھیجو پھر وہ تحقیق کرے کہ کون سا کھانا زیادہ پاکیزہ ہے سو اس میں سے تمہارے لیے کچھ کھانا لائے)

یہ سنتے ہی ان میں سے ایک نوجوان دوڑا گیا اور قریبی شہر سے کچھ کھانا خرید لایا۔ وہ کھانا میرے سامنے رکھا گیا تو خاتون نے کہا: ——

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ

—— (الحاقہ - ۲۴)

(یعنی خوشگواری کے ساتھ کھاؤ پیو بہ سبب ان اعمال کے جو تم نے پچھلے دنوں میں کیے ہیں۔)

مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے نوجوانوں سے کہا: ——"جب تک تم مجھے اس خاتون کی حقیقت نہ بتلاؤ گے میں اس کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

نوجوانوں نے کہا: ——

"یہ ہماری والدہ ہیں اور ان کی پچھلے چالیس سال سے یہی کیفیت ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے کوئی لفظ آیاتِ کلامِ پاک کے سوا زبان سے نہیں نکالا۔ یہ پابندی انہوں نے اپنے اوپر اس لیے لگائی ہے کہ کوئی ایسا لفظ زبان سے نہ نکل جائے جس کی قیامت کے دن باز پرس ہو۔"

میں نے کہا: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (الجمعہ ۴)

(الاَبشیہیؒ المطرف فی کل فن مستظرف ص ۵۶ - ۵۷ جلد ۱ ۔ عبدالحمید احمد حنفی مصر ۱۳۶۸ھ)

یہ خاتون کون تھیں، ان کا نام کیا تھا اور کس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں —؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کسی نے ان کی کنیت اُمِّ یحییٰ بیان کی ہے اور کسی نے ان کا نام رابعہ بصری لکھا ہے لیکن یہ سب قیاسی باتیں ہیں۔ ان کا اصل نام اور حسب و نسب اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

بی بی شعوانہ رح

دوسری صدی ہجری میں نہایت پاکباز اور خدارسیدہ خاتون گزری ہیں ایران کی رہنے والی تھیں۔ اُن کا مستقل قیام شہر اُبلّہ میں تھا۔ نہایت عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے خوش الحانی کی نعمت بدرجۂ وافر عطا کی تھی۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت ایسی پُرسوز آواز میں کرتی تھیں کہ سننے والوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کے مواعظ و خطبات بھی نہایت مؤثر ہوتے تھے اور ان کی مجالسِ وعظ میں بڑے بڑے زہاد اور عباد حاضر ہوا کرتے تھے۔

نہایت رقیق القلب تھیں اور یادِ خدا میں اکثر رویا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ لوگوں نے کہا:

"آپ اس قدر نہ رویا کریں مبادا آنکھوں کو نقصان پہنچ جائے۔"

فرمایا: ـــــــ

"دنیا میں رو رو کر اندھا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ دوزخ کا عذاب اندھا کر دے۔"

پھر فرمایا: ـــــــ

"جو آنکھ اپنے محبوب کے دیدار سے محروم ہے اور پھر اس کے دیدار کی مشتاق بھی ہے بغیر گریہ و زاری کے اچھی معلوم نہیں ہوتی۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ لوگ انہیں رونے سے منع کرتے تو کہتیں:

"کاش خوفِ خدا سے روتے روتے میں اندھی ہو جاؤں، اتنا روؤں کہ آنسو خشک ہو جائیں پھر خون روؤں یہاں تک کہ میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ تک نہ رہے۔"

ایک مرتبہ حضرت فُضَیلؒ بن عیاضؒ [۱] ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کے لیے درخواست کی ۔ اس وقت حضرت شعوانہؒ بہت ضعیف العمر ہوچکی تھیں ۔ انہوں نے حضرت فُضَیلؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"کیوں بھائی تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی ایسا واسطہ ہے کہ اگر میں دعا کروں تو قبول ہوجائے ۔ کوئی ایسی بات ہو تو بتا دو جو قبولیت کا سبب بن جائے ۔"

یہ سن کر حضرت فُضَیلؒ خوفِ خدا سے کانپنے لگے اور پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے ۔

حضرت شعوانہؒ کے یہ تین اقوال بہت مشہور ہیں :

(۱) خدا کی محبت کا پیاسا کبھی سیراب نہیں ہو سکتا ۔
(۲) جو آنکھ اپنے محبوب و مطلوب کے دیدار سے محروم ہو اس کا روتے رہنا ہی بہتر ہے ۔
(۳) جو خود نہ رو سکتا ہو اس کو رونے والوں پر رحم کھانا چاہیے ۔ وہ اپنی بدنصیبی اور گناہوں پر روتے ہیں ۔

---

[۱] حضرت فُضَیلؒ بن عیاضؒ کا شمار دوسری صدی ہجری کے اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے ۔ ابتدائی عمر میں ڈاکہ زنی کیا کرتے تھے پھر تائب ہو گئے اور بغداد جا کر حضرت امام ابوحنیفہؒ سے علم حاصل کیا ۔ اس کے بعد خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا ۔

محرم سنہ ۱۸۷ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا ۔

(اربابِ طریقت)

ملکہ خیزران

تیسرے عباسی خلیفہ مہدی[1] کی چہیتی بیوی تھی۔ بڑی دانشمند نیک طینت اور مخیر خاتون تھی۔ اپنے اوصافِ حمیدہ کی بدولت شوہر کے مزاج پر پوری طرح حاوی تھی۔ اس کی سفارش پر خلیفہ مہدی نے بنی امیہ کے بہت سے معتوب امیروں کی ضبط شدہ جاگیریں واپس دے دیں۔ اس کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ جسے کئی مؤرخین نے بیان کیا ہے، یہ ہے:

ایک دن ملکہ خیزران اپنے محل میں بڑی شان و شوکت سے بیٹھی تھی کہ ایک لونڈی نے آکر عرض کیا:

"ملکۂ عالم! محل کی ڈیوڑھی کے دروازے پر ایک نہایت ہی شکستہ حال غریب

---

[1] بنو اُمیہ تقریباً ایک صدی تک عالمِ اسلام پر حکمران رہے لیکن جب ۱۳۲ھ ۷۵۰ء میں بنو عباس نے امویوں کی سلطنت کا تختہ الٹا تو انھوں نے اس بدنصیب خاندان کے لوگوں کو چُن چُن کر مار ڈالا۔ صرف وہی لوگ زندہ بچے جو کسی نہ کسی طرح روپوش ہو گئے تھے۔ پہلا عباسی خلیفہ عبداللہ ابوالعباس سفاح اپنے چار سالہ دورِ حکومت میں بنو اُمیہ کی بیخ کنی میں مصروف رہا۔ اس کی وفات کے بعد ابوجعفر منصور تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے اکیس سالہ عہدِ حکومت میں بنو عباس کی حکومت کو نہ صرف مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا بلکہ اسے بہت عروج پر پہنچا دیا۔ ۱۵۸ھ ۷۷۵ء میں منصور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد المہدی تختِ خلافت پر بیٹھا۔ اس وقت عباسی سلطنت میں ہر طرف امن چین تھا اور مشرق میں بنو اُمیہ کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ مہدی نے دس سال ایک ماہ حکومت کرنے کے بعد ۱۶۹ھ ہجری ۷۸۵ء میں وفات پائی۔

عورت کھڑی ہے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

ملکہ نے کہا: "اس عورت کا حسب و نسب دریافت کرو اور یہ بھی معلوم کرو کہ اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔"

لونڈی نے باہر آکر غریب عورت سے بہتیرا پوچھا لیکن اس نے نہ اپنے نسب اور خاندان کا پتہ دیا اور نہ یہ بتایا کہ وہ ملکہ سے کیوں ملنا چاہتی ہے۔ اس کا بس ایک ہی جواب تھا کہ وہ جو کہنا چاہتی ہے خود ملکہ سے زبانی کہے گی۔

لونڈی نے اندر آکر ملکہ کو اس عورت کا جواب سنایا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی پڑپوتی زینب بنت سلیمان بھی اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ وہ بنو عباس کی خواتین میں بہت دانا تسلیم کی جاتی تھیں۔ ملکہ نے ان سے مشورہ کیا کہ اس عورت کو اندر آنے دوں یا ملنے سے انکار کر دوں۔

انھوں نے کہا "ضرور بلواؤ۔ بھلا دیکھیں تو وہ کیا چاہتی ہے۔"

چنانچہ ملکہ نے لونڈی کو حکم دیا کہ اس عورت کو اندر لے آؤ۔

تھوڑی ہی دیر میں ملکہ کے سامنے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک انتہائی شکستہ حال عورت کھڑی تھی۔ اس کے دل کش خدوخال سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شریف زادی ہے لیکن میل کچیل اور بوسیدہ کپڑوں نے اس کی حالت گداگروں سے بھی بدتر بنا رکھی تھی۔ وہ عورت پہلے تو ملکہ کا کرّوفر دیکھ کر ٹھٹکی مگر پھر فوراً ہی جرأت کر کے ملکہ کو سلام کیا اور کہنے لگی:

"اے ملکہ! میں مروان بن محمدؒ کی بیٹی مزنا ہوں جو خاندانِ بنو اُمیّہ کا آخری تاجدار تھا۔"

جونہی اس عورت کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ملکہ خیزران کا چہرہ فرطِ غضب سے سُرخ ہو گیا اور اس نے کڑک کر کہا: "اے بدبخت عورت! تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس محل کے اندر قدم رکھے؟ کیا تو نہیں جانتی کہ تیرے اہلِ خاندان

نے عباسیوں پر کیسے خوفناک مظالم ڈھائے ؟ اے سنگدل ! کیا تو وہ دن بھول گئی جب بنو عباس کی بوڑھی عورتیں تیرے پاس یہ التجا لے کر گئی تھیں کہ تو اپنے باپ سے سفارش کر کے میرے شوہر (مہدی) کے چچا امام محمد بن ابراہیم عباسی کی لاش دفن کرنے کی اجازت لے دے۔ کم بخت عورت ! خدا تجھے غارت کرے تو نے ان معزز اور مظلوم خواتین پر ترس کھانے کی بجائے انھیں ذلیل کر کے محل سے نکلوا دیا۔ کیا تیری یہ حرکت انسانیت کی توہین نہیں تھی ؟ — مانا کہ آپس میں دشمنی تھی لیکن پھر بھی ایک بے بس اور لاچار دشمن کے ساتھ ایسا سلوک جائز نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم سے حکومت چھین لی اور تمھیں ذلیل کیا۔ مزنا خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ !"

مزنا ملکہ کی باتیں سن کر بالکل مرعوب نہ ہوئی بلکہ اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولی : " بہن ! اپنے آپے سے باہر نہ ہو جو کچھ میں نے کیا خدا سے اس کی سزا پالی۔ خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سچ ہے۔ اسی کی پاداش میں خدا نے مجھے ذلیل و خوار کر کے تمہارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کسی وقت میں تم سے زیادہ شوخ اور شریر تھی، دولت اور حشمت میرے گھر کی لونڈی تھی۔ مجھے اپنے حسن پر ناز تھا اور تکبر نے مجھے اندھا کر رکھا تھا مگر تم نے دیکھا کہ جلد ہی زمانے نے اپنا ورق الٹ ڈالا۔ خدا نے اپنی تمام نعمتیں مجھ سے چھین لیں۔ اب میں ایک فقیر سے بھی بدتر ہوں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمھارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو ؟ اچھا خوش رہو، میں جاتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر مزنا نے تیزی سے باہر کا رُخ کیا لیکن ابھی چند قدم جانے پائی تھی کہ خیزران نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور چاہا کہ گلے سے لگا لے لیکن مزنا نے پیچھے ہٹ کر کہا : " خیزران تم ملکہ ہو اور میں ایک غریب اور بے کس عورت۔ میرے کپڑے بوسیدہ اور غلیظ ہیں میں اس قابل نہیں کہ ایک ملکہ مجھ سے بغلگیر ہو۔"

خیزران نے آبدیدہ ہو کر لونڈیوں کو حکم دیا کہ مزنا کو نہلا دُھلا کر اعلیٰ درجے کی پوشاک پہناؤ اور پھر اسے عطر میں بسا کر میرے پاس لاؤ۔

لونڈیوں نے ملکہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت مزنا کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ چاند بدلی سے نکل آیا ہے۔ خیزران بے اختیار اس سے لپٹ گئی، اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا۔

" دسترخوان بچھواؤں ؟ "

مزنا نے کہا " ملکہ آپ پوچھتی کیا ہیں، شاید مجھ سے زیادہ اس محل میں اور کوئی بھوکا نہ ہوگا "۔

فوراً دسترخوان بچھ گیا، مزنا سیر ہو کر کھا چکی تو ملکہ نے پوچھا:

" آج کل تمہارا سرپرست کون ہے ؟ "

مزنا نے آہِ سرد بھر کر کہا " آج کس میں ہمت ہے کہ میری سرپرستی کرے۔ مدتوں سے در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ کوئی رشتہ دار بھی دنیا میں موجود نہیں کہ اس کے ہاں جا پڑوں۔ بس کچھ قرابت ہے تو وہ اسی گھرانے (بنو عباس) سے ہے۔"

خیزران نے فوراً کہا، " مزنا آزردہ مت ہو آج سے تم میری بہن ہو، میرے بہت سے محل ہیں تم ان میں سے ایک محل پسند کر لو اور یہیں رہو جب تک میں جیتی ہوں، تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گی۔"

چنانچہ مزنا نے ایک عالی شان محل پسند کر لیا اور خیزران نے اس میں تمام ضروریاتِ زندگی اور لونڈی غلام مہیا کر دیئے۔ ساتھ ہی پانچ لاکھ درہم نقد بھی اس کے حوالے کیے کہ جس طرح جی چاہے خرچ کرے۔

شام کو خلیفہ مہدی حرم میں آیا اور دن بھر کے حالات پوچھنے لگا۔ ملکہ خیزران نے اسے آج کا واقعہ تفصیل سے سنانا شروع کیا۔ جب اس نے بتایا کہ میں نے مزنا کو اس طرح جھڑکا اور وہ قہقہہ لگا کر شانِ بے نیازی کے ساتھ واپس

چل دی تو خلیفہ فرطِ غضب سے بے تاب ہوگیا اور اس نے ملکہ کی بات کاٹ کر کہا :—

"خیزران تم پر ہزار افسوس ہے کہ خدا نے تمھیں جو نعمتیں عطا کی ہیں تم نے ان کا شکریہ ادا کرنے کا ایک بیش بہا موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ تمہاری یہ حرکت ایک ملکہ کے شایانِ شان نہیں تھی۔"

خیزران نے کہا، "امیر المومنین! میری پوری بات تو سن لیں —— اس کے بعد جب اس نے مزنا کے ساتھ اپنے حُسنِ سلوک کی تفصیل بتائی تو مہدی کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے خیزران کی عالی ظرفی کو بہت سراہا اور کہا آج سے میری نظر میں تمہاری قدر دو چند ہوگئی ہے۔ پھر اس نے اپنی طرف سے بھی مزنا کو اشرفیوں کے توڑے بھیجے اور ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ آج میری زندگی کا سب سے بڑا یومِ مسرت ہے کہ اس نے ہمیں تمھاری خدمت کی توفیق دی۔ اب تم اطمینان سے یہاں رہو۔

اس کے بعد مزنا طویل عرصہ تک زندہ رہی۔ مہدی کی وفات ۱۶۹ھ / ۷۸۵ء کے بعد اس کا بیٹا ہادی بھی مزنا کی بے حد تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ ہادی کے بعد ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں ہارون الرشید خلیفہ بنا تو اس نے بھی مزنا کو ماں کے برابر سمجھا۔ اس کے عہدِ خلافت کی ابتدا میں مزنا نے وفات پائی تو ہارون الرشید بچوں کی طرح بلک بلک کر رویا اور اس کے جنازے کو شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ قبرستان پہنچایا۔

○

ملکہ خیزران کے بطن سے مہدی کے دو بیٹے موسیٰ ہادی اور ہارون الرشید پیدا ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے یہ دونوں باپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوئے۔ بدقسمتی سے خلیفہ ہادی ماں کا اطاعت گزار نہ نکلا۔ اس نے ملکہ خیزران کو ان تمام اختیارات سے محروم کر دیا جو اس کو خلیفہ مہدی کے زمانے میں حاصل تھے۔ مگر اس کا زمانۂ حکومت بہت مختصر تھا اس نے پندرہ ماہ بعد وفات پائی اور ہارون الرشید مسند نشین ہوا۔ اس نے ماں

کے تمام اختیارات بحال کر دیئے اور اس کے اعزاز و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ملکہ خیزران بہت فیاض اور رحم دل تھی۔ کوئی مصیبت میں مبتلا ہوتا تو اس کی مصیبت دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ اس طرح غریبوں محتاجوں اور ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتی رہتی تھی اس لیے وہ عوام الناس میں بے حد ہر دلعزیز تھی اور وہ اس کا نام نہایت عزت و احترام کے ساتھ لیتے تھے۔ اس نیک دل ملکہ نے بعہد ہارون الرشید ۱۷۳ھ ۷۸۹ء ہجری میں وفات پائی۔ (تاریخ اسلام)

بی بی مریمؒ بصریہ

دوسری / تیسری صدی ہجری میں شہرۂ آفاق عارفہ گزری ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ کی ہم وطن اور ہم عصر تھیں۔ نہایت عبادت گزار اور اللہ سے ڈرنے والی خاتون تھیں۔ معرفتِ الٰہی کا ذکر ہوتا تو ان کو کئی بار غش آجاتا۔ فرمایا کرتی تھیں کہ جب سے میں نے آیت

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ

سُنی ہے، روزی کے فکر سے بے نیاز ہو گئی ہوں اور نہ کبھی اس کی تلاش میں زحمت اٹھائی ہے۔

ان کی وفات کا واقعہ بہت عجیب ہے کہتے ہیں کہ ایک مجلس میں چند اہلِ دل عشقِ الٰہی کی باتیں کر رہے تھے۔ مریمؒ بھی وہاں موجود تھیں۔ ان پر اس گفتگو کا ایسا اثر ہوا کہ زہرہ پھٹ گیا اور وہ جاں بحق ہو گئیں۔

یہ واقعہ حضرت رابعہ بصریؒ کی وفات (۱۳۵ھ) کے کچھ دن بعد پیش آیا۔
(نفحات الانس)

شہزادی عبّاسہ

خلیفہ المہدی عباسی (المتوفی ۱۶۹ھ ـ ۷۸۵ء) کی بیٹی اور خلیفہ الہادی اور ہارون الرشید کی بہن تھی۔ ۱۵۴ھ ہجری میں بمقام کوفہ پیدا ہوئی۔ اس کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی اور مختلف علوم میں اس نے درجۂ تبحّر حاصل کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کی تفسیر اور شرح ایسی عمدگی سے کرتی تھی کہ بڑے بڑے علماء حیران رہ جاتے تھے۔ کلام اللہ کی قرأت بھی نہایت سوز اور خوش الحانی سے کرتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھی۔ حسنِ صورت، ذہانت، سلیقہ شعاری اور معاملہ فہمی اس کے خاص اوصاف تھے۔ اس کی پہلی شادی محمد بن سلیمان بن علی عباسی سے بعہدِ خلیفہ ہارون الرشید ہوئی۔ ہارون الرشید نے اس کے شوہر کو بصرہ، بحرین، فارس، اہواز، عمان اور یمامہ کا حاکم (گورنر) بنا دیا۔ محمد بن سلیمان ۱۷۲ھ ہجری میں بمقام بصرہ لاولد فوت ہوگیا۔ اس کے بعد ہارون الرشید نے اس کا نکاح ابراہیم بن صالح بن علی سے کردیا۔ وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد فوت ہوگیا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عباسہ اور جعفر برمکی کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی تھی۔ یہ محبت ان کے خفیہ نکاح پر منتج ہوئی۔ ہارون الرشید کو علم ہوا تو وہ سخت برافروختہ ہوا اور اس نے کچھ عرصہ بعد جعفر کو قتل کرا دیا۔ لیکن یہ واقعہ بالکل غلط ہے اور عباسی خاندان کی خواتین کو بدنام کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ دورِ حاضر کے بعض محققین نے اس داستان کو بالکل بے سروپا قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں "اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں یہ عبارت ملتی ہے:

وہ یکے بعد دیگرے اس کی تین شادیاں ہوئیں مگر تینوں شوہروں کا اس

کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا۔ اسی بنا پر ابونواس نے طنز آمیز اشعار لکھے۔ برامکہ کے زوال اور جعفر بن یحییٰ البرمکی کے سلسلے میں بھی اس کا نام لیا جاتا ہے، اور الطبری نے کچھ واقعات نقل کیے ہیں لیکن الطبری سے پہلے کے بعض مؤرخین اس واقعے کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ ابونواس کے شارحین نے عباسہ کے جن شوہروں کے نام لیے ہیں ان میں جعفر کا نام شامل نہیں۔ ابنِ خلدون نے اس کی واقعیت کو مشتبہ قرار دیا۔ جعفر سے عباسہ کے تعلقات کا افسانہ جو الطبری کی فارسی اشاعت میں درج ہے، یکسر غلط ہے۔" (جلد۔ ۱۲)

ہارون الرشید اپنی لائق بہن سے اس کے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کا ایک اور سبب بھی تھا وہ یہ کہ خلیفہ الہادی نے اپنے نابالغ بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانا چاہا حالانکہ المہدی کی وصیت کے مطابق ہادی کے بعد مسندِ خلافت پر ہارون الرشید کا حق تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ الہادی نے ہارون الرشید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا اور اپنے نابالغ بیٹے کو اس کی جگہ نامزد کر دیا۔ یہ بات دونوں بھائیوں میں سخت کشیدگی کا باعث بن سکتی تھی لیکن عباسہ نے الہادی کو ایسے احسن طریقے سے سمجھایا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آگیا اور سنہ ۱۷۰ ہجری میں اس کی وفات کے بعد ہارون الرشید کسی نزاع کے بغیر مسندِ خلافت پر بیٹھ گیا۔ اس سلسلے میں عباسہ نے جو مساعی کی تھیں ہارون الرشید کے دل میں اُن کی بڑی قدر تھی اور اس نے انہیں ہمیشہ یاد رکھا۔

عباسہ کا سالِ وفات کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔

(دائرہ معارف اسلامیہ۔ مشاہیر نسواں۔ شرف النساء)

خواہرِ سندی بن شاہک

سندی بن شاہک مولیٰ ابی جعفر منصور کا شمار سلطنت عباسیہ کے عماید میں ہوتا ہے۔ اس کا اصل نام محمدؔ تھا اور ماں کا نام شاہک تھا اسی نسبت سے ابنِ شاہک مشہور ہوا۔ وطنِ مالوف سندھ (ہند) تھا۔ اس کی نسبت سے سِندی کے نام سے شہرت پائی۔ خلیفہ ابو جعفر منصور اور ہارون الرشید کے زمانے میں وہ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ منصور اور ہارون کے زمانے میں اُمورِ خلافت میں بہت زیادہ دخیل تھا۔ اس کو اپنی دانائی، خیر خواہی اور معاملہ فہمی کی بدولت عباسی حکمرانوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ اس کو صاحب الحراس کہا جاتا تھا۔

سندی بن شاہک کی ایک بہن تھی جو سرکاری کاموں کی انجام دہی میں اس کے ساتھ شریک رہتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی باہمت اور سوجھ بوجھ رکھنے والی عورت تھی۔ جس زمانے میں سندی بن شاہک جیل خانے کا افسرِ اعلیٰ (داروغہ) تھا، اس کی بہن جیل خانے کے انتظام اور قیدیوں کی نگرانی میں اس کا دستِ راست تھی۔

۱۷۹ھ ہجری میں ہارون الرشید نے حضرت موسیٰ کاظمؒ (اثنا عشریوں کے ساتویں امام) کو گرفتار کیا اور بغداد لے جا کر قید خانے میں ڈال دیا۔ ان کی نگرانی پر یہی خواہرِ سندی بن شاہک مقرر ہوئی۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے:

فحبسہ عند السندی بن شاھک و تولی حبسہ اخت السندی بن شاھک وکانت تتدین

(ہارون نے ان کو سندی بن شاہک کے زیرِ انتظام قید خانے

۔میں رکھا اور ان پر سندی بن شاہک کی بہن نگران مقرر کی وہ دیندار عورت تھی)
اس نے قید خانے میں حضرت موسیٰ کاظمؒ کی عبادت اور ریاضت دیکھی
تو بہت متاثر ہوئی اور بے اختیار اس کی زبان پر یہ الفاظ آگئے

خاب قوم تعرضوا لهذا الرجل الصالح

(اس مردِ صالح کو چھیڑنے والے نامراد ہیں)

لیکن افسوس کہ وہ مقدس قیدی سے ہمدردی رکھنے کے باوجود ان کی کوئی مدد
کرنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ سیدنا موسیٰ کاظمؒ نے سنہ ۱۸۳ھ میں قید خانے
ہی میں وفات پائی۔ (خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان۔ از قاضی اطہر مبارکپوری)

سیّدہ عائشہؒ

سیدنا حضرت جعفر صادقؒ کی صاحبزادی تھیں۔ کمال درجہ کی عابدہ و
زاہدہ تھیں۔ اپنے یکتائے دہر والدِ گرامی سے علم حاصل کیا۔

اکثر فرمایا کرتی تھیں:

"اے اللہ تیری عزت و جلال کی قسم اگر تو نے مجھے دوزخ
میں ڈالا تو میں اپنی توحید کو ہاتھ میں لوں گی اور تمام دوزخیوں
کو سناؤں گی کہ میں نے تیری وحدانیت کا سچے دل سے اقرار کیا
لیکن پھر بھی تو نے مجھے عذاب دیا۔"

یہ مقامِ ناز تھا۔ عارفانِ کامل اپنے خالق پر ناز کرتے ہیں اور وہ ان کے
ناز اٹھاتا ہے۔

سیدہ عائشہؒ نے سنہ ۱۴۵ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

اُمِّ جعفر عتابہ

محمد بن حسین بن قحطبہ کی بیٹی، یحییٰ برمکی[1] کی بیوی اور جعفر برمکی کی والدہ تھی۔ اصل نام فاطمہ تھا مگر وہ اپنے لقب عتابہ سے مشہور ہوئی۔ اس کی کنیت اُمِّ جعفر تھی۔ نہایت عالمہ فاضلہ، معارف پرور اور فیاض خاتون تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ ایک اونچے درجہ کی متکلمہ اور اعلیٰ درجے کی خوشنویس تھی۔ علاوہ ازیں علمِ حساب میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتی تھی۔ جس طرح اس کا شوہر اور فرزند سخاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اسی طرح اس کا دستِ سخاوت بھی نہایت کشادہ تھا۔ سینکڑوں غریب عورتیں اس کے دسترخوان پر پرورش پاتی تھیں اور بیسیوں اربابِ ہنر و کمال اس کی جوئے سخاوت سے سیراب ہوتے تھے۔

---

[1] ابوالفضل یحییٰ بن خالد بن جعفر بن جاماسب برمکی خلیفہ ہارون الرشید عباسی کا وزیرِ اعظم تھا۔ وہ عزت و مرتبہ اور جلالت و منزلت کی اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ آج تک ملک شاہ سلجوقی کے وزیرِ کبیر خواجہ نظام الملک طوسی کے سوا شاید ہی کسی دوسرے وزیر کو یہ مرتبہ حاصل ہوا ہو۔

یحییٰ ۱۲۰ھ میں ایک مجوسی النسل خاندان (آلِ برمک) میں پیدا ہوا۔ سب سے پہلے اس کے دادا جعفر بن جاماسب نے اسلام قبول کیا پھر اس کا تمام خاندان حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ جعفر کا بیٹا خالد نہایت قابل اور منتظم شخص تھا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت خلیفہ عبداللہ سفاح اور ابو جعفر منصور کا وزیر بن گیا۔ یحییٰ اسی نامور باپ کا فرزند تھا۔ خلیفہ مہدی نے اس کو اپنے بیٹے ہارون الرشید کا اتالیق بنا دیا تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یحییٰ کی بیوی نے ہارون الرشید کو اس کے بچپن میں اپنا دودھ پلایا تھا۔ اس کو اس طرح

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خلیفہ ہارون الرشید نے بچپن میں اُمِ جعفر فاطمہ کا دودھ پیا تھا اور وہ اپنی اس رضاعی ماں کی بے حد عزت کرتا تھا۔ جس زمانے میں برمکی خاندان خلیفہ ہارون الرشید کے قہر و غضب کا نشانہ بنا اور اس کے حکم سے یحییٰ اور اس کے فرزندوں جعفر اور فضل کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا تو ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ فاطمہ (عتابہ) کے لیے کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہے وہ جب چاہیں میرے پاس آ سکتی ہیں اور جو سفارش کرنا چاہیں کر سکتی ہیں۔

عتابہ تک ہارون کا یہ قول پہنچا تو وہ رقہ سے بغداد پہنچی اور محلِ شاہی میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ جب اجازت ملنے میں دیر ہوئی تو وہ ننگے پاؤں بلا نقاب شاہی محل تک آئی۔ خاندان کی بربادی کی وجہ سے وہ اس وقت غم کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ابن فضل حاجب نے ہارون الرشید کو بتایا کہ عتابہ اس حالت میں دروازے پر کھڑی ہے تو وہ فوراً اٹھا اور برہنہ پا چل کر اس کا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ہارون کی رضاعی ماں کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ ہارون الرشید ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں مسندِ حکومت پر بیٹھا تو اس نے یحییٰ کو وزیرِ اعظم اور مدار المہام بنا کر سلطنت کا تمام نظم و نسق اس کے سپرد کر دیا۔ ہارون اس کو بمنزلہ باپ کے سمجھتا تھا اور باداجان کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ یحییٰ جود و سخا، علم و فضل اور تدبیر و سیاست میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کی معارف پروری اور فیاضی کی داستانوں سے تاریخ اور ادب کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یحییٰ جب بوڑھا اور کمزور ہو گیا تو اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے فرزندوں فضل اور جعفر کو ہارون کے وزیر بنوا دیا۔ وہ بھی تمام صفات میں اپنے باپ کے مثیل تھے۔ بدقسمتی سے آخر میں بعض اسباب کی بنا پر یہ خاندان ہارون الرشید کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ یہ عتاب اتنا شدید تھا کہ یحییٰ، فضل اور جعفر تینوں کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ان کی حویلیوں اور محلوں کو گرا کر کھنڈر بنا دیا گیا۔ کچھ دن بعد ہارون نے جعفر کو قتل کرا دیا۔ یحییٰ اور فضل مدت تک قید کی مصیبتیں جھیلتے رہے اور قید خانے ہی میں فوت ہو گئے۔ یحییٰ کا سالِ وفات ۱۹۰ھ / ۸۰۶ء ہے۔

استقبال کیا اور پیشانی کا بوسہ لے کر نہایت عزت و احترام سے اپنے پاس بٹھایا۔
عتابہ کی آمد کا مقصد اپنے شوہر اور بیٹوں کو قید سے چھڑانا تھا۔ اس نے کہا:
"امیر المؤمنین! کیا ہم زمانہ کی سختیوں کے اسی طرح شکار بنے رہیں گے اور کیا ہم پر جھوٹی تہمتیں لگائی جاتی رہیں گی، کیا میں نے اسی دن کے لیے آپ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔"

ہارون نے تجاہلِ عارفانہ سے کہا۔ "کیوں مادرِ مہربان کیا ہوا؟"
عتابہ نے کہا۔ "مہدی عباسی کے بعد یحییٰ آپ کے لیے بمنزلہ والد کے ہے اور جس رتبہ کا وہ شخص ہے اس سے آپ واقف ہیں۔ ہادی کے مقابلے میں اس نے آپ کی ولی عہدی کے لیے جو کوششیں کیں ان کا بھی آپ کو علم ہے۔"
ہارون نے کہا۔ "لیکن جو حکمِ الٰہی تھا وہ تو جاری ہو چکا ہے۔"
عتابہ بولی ۔ "خدا کو بڑی قدرت ہے
یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (پ ۱۳- رکوع ۱۲)
(اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے)

ہارون نے کہا۔ "ہاں بے شک یہ سچ ہے کہ خدا جس کا چاہتا ہے قصور معاف کرتا ہے مگر ان لوگوں کا قصور ایسا نہیں جس کو خدا معاف کر دے۔"
عتابہ بولی: "معاملاتِ غیب تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ امیر المؤمنین کو کیسے معلوم ہو گیا کہ خدا معاف نہیں کرے گا۔"
ہارون یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا:-

واذا المنیۃ انشبت اظفارھا	الفیت کل تمیمۃ لا تنفع
(جب موت اپنے ناخن چبھوتی ہے	تو کوئی تعویذ فائدہ نہیں دیتا)

عتابہ نے فوراً کہا امیر المؤمنین میں تو یحییٰ کے حق میں تعویذ نہیں ہوں اور نہ میرا یہ دعویٰ ہے لیکن آپ اسی شاعر کا یہ دوسرا شعر بھی تو پڑھیے۔

وا ذا افتقرت الی الذخائر لم تجد	ذخرا یکون کصالح الاعمال
(جب تم کو سرمائے کی ضرورت پیش آئے	تو کوئی سرمایہ اچھے اعمال سے بڑھ کر نہیں ملے گا)

یہ تقریر سن کر ہارون نے سر جھکا لیا پھر دیر تک دونوں کے درمیان عالمانہ گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار عتابہ نے سبز زمرد کا ایک ڈبہ پیش کیا جس میں ہارون کے بچپن کے ٹوٹے ہوئے دانت اور بال جو مشک میں ڈوبے ہوئے تھے، موجود تھے اس نے ان کا واسطہ دے کر یحییٰ کی رہائی کی درخواست کی لیکن ہارون آل برمک سے اتنا سخت ناراض تھا کہ اس کا دل نہ پسیجا اور عتابہ ناکام واپس گئی۔ چند دن بعد ہارون نے جعفر برمکی کو قتل کرا دیا۔ یحییٰ اور فضل بدستور قید رہے اور قید خانے ہی میں فوت ہو گئے۔

عتابہ کی زندگی کا آخری دور بہت عبرتناک تھا۔ محمد بن غسان گورنر کوفہ کا بیان ہے کہ میں عید الاضحیٰ کے دن اپنی والدہ کے سلام کو گیا۔ ان کی مجلس میں ایک بوڑھی خاتون پرانی چادر اوڑھے نہایت فصیح و بلیغ گفتگو کر رہی تھی۔ میری والدہ نے کہا، بیٹا اپنی خالہ کو سلام کرو۔ میں نے پوچھا، یہ کون ہیں؟ کہا کہ یہ عتابہ اُمّ جعفر برمکی ہیں۔ یہ سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ان کی شان و تجمّل کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور آج وہ کس حال میں ہیں۔ میں نے ادب سے ان کو سلام کیا اور حال پوچھا، کہا، اے بیٹا کیا پوچھتا ہے دنیا ایک آنے جانے والی چیز ہے کل کی بات ہے کہ عید کے دن میرے سرہانے چار سو کنیزیں کھڑی ہوتی تھیں پھر بھی میں کہتی کہ جعفر میرا خیال نہیں رکھتا اور آج یہ حالت ہے کہ میرے پاس صرف دو پوستین ہیں ایک کو اوڑھ لیتی ہوں اور ایک کو بچھا لیتی ہوں۔

(البرامکہ)

ملکہ زبیدہ

اُمِ جعفر زبیدہ پانچویں عباسی خلیفہ ہارون الرشید (سنہ ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء تا ۱۹۳ھ / ۸۰۹ء)
کی ملکہ تھی۔ اس کے والد کا نام جعفر تھا جو دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور
(سنہ ۱۳۶ھ / ۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء) کا بیٹا تھا۔ زبیدہ سنہ ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء میں موصل میں پیدا
ہوئی۔ اس وقت اس کا والد موصل کا گورنر تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کا نام اَمَتہُ العزیز
رکھا اور بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی۔ اَمَتہُ العزیز نے ابھی زندگی کی پانچ
ہی بہاریں دیکھی تھیں کہ سنہ ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں جعفر کا انتقال ہوگیا اور وہ یتیم رہ گئی۔
دادا ابوجعفر منصور نے اسے بغداد بلا لیا۔ ننھی اَمَتہُ العزیز بڑی خوبصورت
بچی تھی۔ دادا نے اس کی تروتازہ رنگت کی وجہ سے اس کا نام زبیدہ رکھ دیا۔
(زبیدہ، زُبدۃ کا اسمِ تصغیر ہے جس کا مطلب ہے ملائی، مکھن یا گیندے
کا پھول۔ بعض نے زبیدہ کا مطلب متھنی بھی لکھا ہے یعنی وہ آلہ جس سے
دہی کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے)۔ یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ لوگ اُس کے اصل
نام اَمَتہُ العزیز کو بالکل بھول گئے۔ ابوجعفر منصور نے اپنی پیاری پوتی کی
تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور اس کام کے لیے نہایت لائق اور فاضل
استاد مقرر کیے۔ زبیدہ بڑی سلیم الفطرت اور ذہین بچی تھی اس نے بڑے
ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کی۔ اسی عمر میں اس کو قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی
سے دلی اور روحانی تعلق پیدا ہوگیا جو عمر بھر قائم رہا۔ دوسرے علومِ دینی اور
عربی ادب میں بھی اس نے بڑی دسترس حاصل کرلی۔ جوان ہوئی تو حسنِ صورت
کے علاوہ حسنِ سیرت سے بھی آراستہ تھی اور علم و فضل کے اعتبار سے بھی بہت
بلند مقام رکھتی تھی۔ سنہ ۱۶۵ ہجری / ۷۸۲ء میں زبیدہ کے چچا مہدی نے جو ابوجعفر منصو

کے بعد خلیفہ بن چکا تھا، اس کی شادی اپنے بیٹے ہارون الرشید سے کر دی۔ یہ شادی شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ انجام پائی۔ مہدی کے بعد زبیدہ کے شوہر کا بڑا بھائی ہادی خلیفہ بنا (سنہ ۱۶۹ھ / ۷۸۵ء)۔ اس نے سنہ ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں وفات پائی تو ہارون الرشید مسندِ خلافت پر بیٹھا اور زبیدہ کو ایک وسیع و عریض سلطنت کی خاتونِ اوّل ہونے کی عزت حاصل ہو گئی۔ ہارون الرشید کا تیئیس سالہ دورِ خلافت ملکہ زبیدہ کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر وہ امورِ مملکت میں براہِ راست دخل نہ دیتی تھی لیکن اس کے اثر و اقتدار کی کوئی حد و نہایت نہیں تھی۔

زبیدہ بڑی خوش پوش، رحمدل، مخیر اور علم دوست خاتون تھی۔ ایک طرف تو اس کے جاہ و حشم کا یہ حال تھا کہ اس کا ایک ایک جوڑا ہزاروں دینار میں تیار ہوتا تھا، اس کی جوتیاں ہیروں اور موتیوں سے مزین ہوتی تھیں، اس کے محل میں عنبر کی شمعیں جلتی تھیں، اس کے باورچی خانے کا یومیہ خرچ دس ہزار درہم تھا اور سینکڑوں لوگ اس کے دسترخوان پر پرورش پاتے تھے اور دوسری طرف اس کی دینداری کی کیفیت یہ تھی کہ اس کے حرم میں سو کنیزیں قرآن کریم کی حافظہ تھیں جو باری باری نہایت خوش الحانی سے قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح اس کا محل ذکرِ الٰہی سے معمور رہتا تھا۔ علماء و شعراء کی بھی بڑی قدردان تھی اور بعض کو مستقل وظیفے دیتی تھی۔ وہ نماز روزے کی سختی سے پابند تھی۔ عمر بھر عذرِ شرعی کے بغیر نہ کبھی کوئی نماز قضا کی اور نہ کوئی روزہ چھوڑا۔ زندگی میں کئی مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ان میں ایک پاپیادہ حج بھی شامل تھا۔ اس کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے بھی بے انتہا دلچسپی تھی اور ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی رہتی تھی۔ عراق سے مکہ معظمہ کو جو راستہ جاتا تھا اس پر حاجیوں اور مسافروں کے لیے موزوں مقامات پر سرائیں بنوائیں اور کنوئیں کھدوائے۔ یہ راستہ تیز ہواؤں یا آندھیوں کی وجہ سے اکثر ریت سے اٹ جاتا تھا اور مسافر صحرا میں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ ملکہ زبیدہ

نے لاکھوں دینار صرف کر کے راستے کے دونوں طرف پتھر کی مضبوط دیواریں بنوا دیں تاکہ کسی کو راستہ معلوم کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ ملکہ نے صرفِ کثیر سے کئی مسجدیں بھی بنوائیں۔ علاوہ ازیں ایک نہر عرعار کوہِ لبنان سے بیروت تک بنوائی جس کے پل آج تک قناطر زبیدہ کے نام سے مشہور ہیں۔

"انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" میں ہے کہ ملکہ زبیدہ نے تبدیلِ آب و ہوا کے لیے سرزمینِ ایران میں ایک پُرفضا مقام پسند کر کے وہاں شہر تبریز آباد کیا۔ سیّد امیر علی کا بیان ہے کہ مصر کا قدیم شہر اسکندریہ جو دوسری صدی ہجری میں قریب قریب بالکل اُجڑ گیا تھا، ملکہ زبیدہ کے حکم سے اس کو ازسرِنو تعمیر کیا گیا۔

ملکہ زبیدہ کا سب سے بڑا کارنامہ جو اس کا نام قیامت تک زندہ رکھے گا، "نہرِ زبیدہ" کی تعمیر ہے۔ ہارون الرشید کے دورِ خلافت سے کئی سال پہلے مکہ معظمہ میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی تھی اور حاجیوں کو سخت تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ ایک دفعہ تو مکے میں پانی کا ایسا قحط ہوا کہ ایک مشکیزہ دس درہم میں اور بڑی مشک ایک اشرفی میں ملتی تھی۔ ملکہ زبیدہ کو جب حجاج اور اہلِ مکہ کی مصیبت کا علم ہوا تو اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ کوئی ایسا مستقل انتظام کرے گی جس سے مکے والوں کو پانی برابر پہنچتا رہے اور ہر سال لاکھوں حاجیوں کو بھی پانی خوب ملتا رہے۔ اس نے کھدائی اور تعمیرات کے بڑے بڑے ماہروں کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا کہ مکہ معظمہ کے نواحی علاقے میں چشمے تلاش کریں۔ ان ماہرین نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ملکہ کو اطلاع دی کہ انہوں نے دو جگہوں پر چشمے ابلتے دیکھے ہیں۔ ایک چشمہ تو مکہ معظمہ سے پچیس میل کے فاصلے پر طائف کے راستے میں ہے اور دوسرا چشمہ کرا کی پہاڑیوں میں نعمان نام کی ایک وادی میں ہے لیکن ان چشموں کا پانی مکہ معظمہ تک لے جانا بہت مشکل ہے کیونکہ راستے میں متعدد پہاڑیاں ہیں۔ نیک دل

ملکہ نے حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے ان چشموں کا پانی مکہ معظمہ تک پہنچانے کے لیے ایک نہر کھود دو۔ اس کام پر خواہ کتنا ہی روپیہ خرچ ہو جائے اس کی کچھ پروا نہ کرو اگر کوئی مزدور ایک کدال مارنے کی اجرت ایک اشرفی بھی مانگے تو اس کو دے دو۔

ملکہ کا حکم ملتے ہی انجینئروں نے بے شمار کاریگروں اور مزدوروں کی مدد سے نہر کھودنے کا کام شروع کر دیا۔ یہ لوگ مسلسل تین سال تک دن رات پہاڑیاں کاٹنے اور نہر بنانے میں مشغول رہے۔ آخر اللہ نے ان کی محنتِ شاقہ کو بار آور کیا اور نہر تیار ہو گئی۔ اس کام پر ملکہ کے سترہ لاکھ طلائی دینار خرچ ہوئے۔ جب اخراجات کا حساب ملکہ کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ دریائے دجلہ کے کنارے اپنے محل میں بیٹھی تھی اس نے حساب کے کاغذات پر سرسری نظر بھی نہ ڈالی اور سب کو یہ کہہ کر دریا میں ڈال دیا کہ ہم نے اس حساب کو "حساب کے دن" کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ یہ کام میں نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے کیا ہے۔ اگر میرے ذمہ کسی کو کچھ دینا آتا ہو تو وہ مجھ سے لے اور اگر میرا کسی کے ذمہ کچھ باقی ہو تو میں نے اس کو معاف کیا۔ پھر ملکہ نے نہر کی تعمیر میں حصہ لینے والے تمام ماہرین، کاریگروں اور مزدوروں کو دل کھول کر انعام دیا اور بڑی خوشی منائی۔ فی الحقیقت دونوں چشموں سے دو الگ الگ نہریں نکالی گئیں، آگے چل کر یہ دونوں نہریں ایک دوسرے سے مل گئیں اور پھر یہی ایک نہر عرفات تک چلی گئی۔ اسی نہر کا نام نہر زبیدہ ہے۔ پہاڑوں کے اندر راستے میں جگہ جگہ حوض بھی بنائے گئے تاکہ بارش کا پانی بھی ان حوضوں میں جمع ہو کر نہروں میں شامل ہوتا رہے۔ نہروں کی گزرگاہ کو ایسے مسالے سے بنایا گیا ہے کہ پانی زمین کے اندر جذب نہیں ہونے پاتا اس علاقے میں اکثر ریت کے طوفان آتے رہتے ہیں اس لیے نہروں کو اوپر سے پاٹ دیا گیا۔ تاکہ ریت ان میں گرنے نہ پائے۔ شروع شروع میں "نہر زبیدہ" کا نام "عین المشاش" تھا لیکن اللہ نے زبیدہ کے نام کو دوام بخشنا تھا اس لیے بعد میں وہ اسی کے

نام سے مشہور ہوگئی ۔ یہ نہر مکہ معظمہ سے چند میل دور جبل عرفات کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی ایک مقام "چاہِ زبیدہ" پر ختم ہو جاتی ہے ۔ وہاں تک اس کی کل لمبائی ۲۳ ہزار میٹر ہے ۔ ملکہ کی خواہش تھی کہ نہر خاص مکہ معظمہ شہر تک پہنچ جائے لیکن کوئی ایسی رکاوٹ پیش آگئی کہ اسے "چاہِ زبیدہ" تک ہی ختم کرنا پڑا ۔ پھر بھی اہلِ مکہ کو اس سے بڑا آرام ہو گیا کیونکہ چاہِ زبیدہ سے مکہ تک پانی مختلف طریقوں سے شہر میں آتا رہتا تھا ۔ نہر پر پانی کی تقسیم کے لیے جگہ جگہ حوض اور کنویں بنے ہوئے ہیں ۔

ملکہ زبیدہ کے بطن سے ہارون الرشید کا بیٹا محمد امین پیدا ہوا ۔ ہارون الرشید نے ملکہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا حالانکہ اس کا بڑا (سوتیلا) بھائی عبداللہ المامون اس سے کہیں زیادہ لائق تھا ۔ ہارون نے اس کے بارے میں یہ وصیت کی کہ امین کے بعد وہ ولی عہد ہوگا ساتھ ہی اس نے ان کے درمیان ملک کی تقسیم بھی کر دی ۔ ۱۹۳ھ (۸۰۹ء) میں ہارون الرشید نے خراسان میں وفات پائی تو امین بغداد پہنچ کر تختِ خلافت پر بیٹھ گیا ۔ مامون اس وقت مرو میں تھا ۔ وہ کچھ عرصہ تو خاموش رہا اور انہی علاقوں پر قناعت کی جو باپ نے اس کے سپرد کیے تھے لیکن جب امین نے اس کی ولی عہدی کو منسوخ کر کے اپنے صغیر السن بیٹے موسیٰ کو ولی عہد نامزد کیا تو دونوں بھائیوں میں شدید مخالفت کا آغاز ہو گیا ۔ ۱۹۵ھ (۸۱۱ء) میں امین نے علی بن عیسیٰ کو پچاس ہزار فوج دے کر خراسان پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا ۔ ادھر سے مامون نے طاہر بن حسین کو اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا ۔ رے کے قریب دونوں فوجوں کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی جس میں علی بن عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا ۔ اس کے بعد مسلسل دو برس تک دونوں میں معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں جن میں مامون ہی غالب رہا ۔ ۱۹۷ھ (۸۱۲ء) میں مامون کے جرنیل طاہر بن حسین نے بغداد کا محاصرہ کر لیا ۔ یہ محاصرہ ایک برس تک جاری رہا ۔ آخر امین نے شکست

کھائی۔ طاہر بن حسین نے اسے گرفتار کر کے ۲۵ محرم ۱۹۸ھ/۸۱۳ء کو قتل کر ڈالا۔
اب مامون الرشید تمام سلطنت عباسیہ کا بلا شرکت غیرے فرمانروا بن گیا۔

ملکہ زبیدہ نے اپنے فرزند کے قتل کی خبر سنی تو فرط غم سے نڈھال ہو گئی۔ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھی۔ ایک پُر درد مرثیہ ایک خط میں لکھ کر مامون الرشید کو بھیج دیا۔ مرثیہ یہ تھا:

لوارث علم الاولین و فهمهم
وللملك المامون من ام جعفر
کتبت وعینی مستهل دموعها
الیك ابن عمی من جفون ومحجر
وقد مسنی ذل وضر کآبة
وارق عینی یا ابن عمی تفکر
اتی طاهر لا طهر الله طاهراً
فما طاهر فیما اتی بمطهر
فاخرجنی مکشوفة الوجه حاسراً
وانهب اموالی واخرب ادوری
یعز علی هارون ما قد لقیته
وما مر بی من ناقص الخلق اعور
فان کان ما ابدی بامر امرته
صبرت لامر من مقدر

ام جعفر کی طرف سے یہ خط ہے خلیفہ مامون کے نام جو کہ پہلوں کے علم و فہم کا وارث ہے
اے ابن عم میں تجھ کو لکھ رہی ہوں اور میری آنکھیں پلکوں سے خون بہاتی ہیں
مجھ کو ذلت اور اذیت دہ رنج پہنچا اور فکر نے میری آنکھوں کو بے خواب کر دیا۔
یہ طاہر کیا ہوا ہے خدا جس کو طاہر نہ کرے اور جو کچھ اس نے کیا اس کے الزام سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس نے مجھ کو برہنہ سر اور بے پردہ گھر سے نکالا اور میرا مال لوٹ لیا اور میرے مکانات برباد کر دیئے۔ اس یک چشم ناقص الخلقت کے ہاتھ سے مجھ پر جو گزرا ہارون جیتا ہوتا تو اس پر گراں گزرتا۔ طاہر نے جو کچھ کیا اگر تیرے حکم سے کیا تو مقدر پر میں صبر کرتی ہوں۔

مامون کو یہ خط ملا اور اس نے یہ اشعار پڑھے تو وہ بے اختیار رو پڑا اور کہا:

"واللہ میں خود اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لوں گا!"

بدلہ تو اس نے کیا لینا تھا البتہ جب تک ملکہ زبیدہ جیتی رہی مامون الرشید نے اس کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا۔ اس نیک دل خاتون نے یکم جمادی الاولیٰ ۲۱۶ھ/۸۳۱ء کو بغداد میں وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں، اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۰، الاعلام وغیرہ)

بی بی اُمِّ احسانؒ

ان کا شمار دوسری صدی ہجری کی عارفاتِ کامل میں ہوتا ہے۔ کوفہ کی رہنے والی تھیں اور زہد و عبادت میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ ان کے عم زاد اور قبیلہ کے دوسرے لوگ بہت آسودہ حال تھے لیکن وہ بہت سادہ زندگی گزارتی تھیں۔ امام سفیان ثوریؒ ان کے ہم عصر تھے۔ وہ اکثر ان کی باتیں سننے کے لیے ان کے مکان پر جایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اُمِّ احسانؒ کے گھر میں ایک بوریے کے سوا کبھی کچھ نہ دیکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے صاحبزادے بھی بہت خوشحال تھے لیکن انہوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا اور ایک معمولی حجرے میں زاہدانہ زندگی گزار دی۔

ایک دفعہ امام سفیان ثوریؒ نے ان سے کہا:

"اے اُمِّ احسان! اگر آپ کے چچا زاد بھائیوں (یا صاحبزادوں) کو آپ کے حالات کی اطلاع دی جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے لیے آرام و آسائش کا سامان مہیا کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔"

یہ سن کر اُمِّ احسانؒ کے چہرے پر تکدر کے آثار نمودار ہوئے اور انہوں نے فرمایا:

"اے سفیان! تمہاری قدر اس کلمہ نے میری نظروں میں کم کر دی۔ ذرا خیال تو کرو کہ وہ ذاتِ بابرکات جو دنیا کی ہر شے کی خالق اور مالک ہے اس سے تو میں نے دنیا کی کسی چیز کا سوال نہیں کیا پھر بھلا ان لوگوں سے کیسے سوال کر سکتی ہوں

جو خود صاحبِ احتیاج ہیں۔ خدا کی قسم مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ منظور نہیں کہ خدا کی یاد سے غافل ہو جاؤں اور کسی اور چیز کی طرف دھیان دوں۔"

امام سفیان ثوری[۱] کی اس تنبیہ پر چیخیں نکل گئیں اور انہوں نے رقت آمیز لہجے میں فرمایا: "اے اُمِّ احسان! آپ واقعی اللہ کی خاص بندی ہیں۔"

حضرت اُمِّ احسان کا سالِ وفات کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔ (نفحات الانس)

بی بی حکیمہؒ

دوسری صدی ہجری کی مشہور عارفات میں شمار ہوتی ہیں۔ حضرت علی کَرَّمَ اللہُ وجہہٗ کی نسل سے تھیں۔ ان کا وطن دمشق تھا۔ بے حد عبادت گزار اور باخدا خاتون تھیں۔ علم و فضل میں بھی بڑے بلند مقام پر فائز تھیں۔ قرآنِ حکیم سے بڑا شغف تھا اس کی تفسیر ایسی عمدگی سے کرتی تھیں کہ سننے والوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت نقش ہو جاتی تھی۔ (نفحات الانس)

---

[۱] امام سفیان ثوریؒ تبع تابعین کی مقدس جماعت کے ایک جلیل القدر رکن تھے۔ علم و فضل کے اعتبار سے ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔ ۹۶ھ یا ۹۷ھ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بھی کوفہ میں ہوئی۔ انہوں نے کوفہ کے تمام ممتاز شیوخِ حدیث و فقہ سے استفادہ کیا۔ پھر بصرہ اور حجاز کے مختلف مقامات کے شیوخِ حدیث سے کسبِ فیض کیا اور علم و فضل کے بحرِ زخار بن گئے۔

خطیب بغدادیؒ کا بیان ہے کہ ان کو تیس ہزار احادیث زبانی یاد تھیں۔ سالہا سال تک مسندِ درس و افتاد پر متمکن رہے اور بے شمار لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ پہنچایا۔ نہایت عابد و زاہد رقیق القلب اور سادہ مزاج بزرگ تھے۔ خلفاء و امراء سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ سنہ ۱۶۱ ہجری میں وفات پائی۔

لیلیٰ بنتِ طریف

مؤرخین میں اس کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابنِ خلکان نے اس کا نام فارعہ اور فاطمہ لکھا ہے لیکن ابنِ اثیر اور سیّد امیر علی لکھتے ہیں کہ اس کا نام لیلیٰ تھا۔

خلیفہ ہارون الرشید (۱۷۰ھ/۷۸۶ء تا ۱۹۳ھ/۸۰۹ء) کے عہد میں ایک مشہور خارجی ولید بن طریف کی بہن تھی۔ بڑی حسین و جمیل، بہادر اور اونچے درجے کی شاعرہ تھی۔ ۱۷۸ھ/۷۹۴ء ہجری میں اس کے بھائی ولید بن طریف نے جابور اور نصیبین میں حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے دربار کے ایک مشہور افسر یزید شیبانی کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اس کی خارجی باغیوں سے کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ بالآخر خارجیوں نے شکست کھائی اور ان کا سردار ولید بن طریف میدانِ جنگ میں کام آیا۔

لیلیٰ کو اپنے بھائی کی ہلاکت کی خبر ملی تو اس نے زرہ پہنی، ہتھیار سجائے اور گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی فوج پر حملہ آور ہوئی۔ اس کے حملے کی تاب نہ لا کر شاہی فوج کی کئی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اب سپہ سالارِ فوج یزید شیبانی دوسروں کو ہٹا کر خود لیلیٰ کے مقابلہ پر آیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لیلیٰ کا رشتہ دار تھا۔ اس نے لیلیٰ کے گھوڑے کو پہلے تو ایک نیزہ مارا لیکن پھر کچھ خیال آیا اور بڑی دردمندی کے ساتھ لیلیٰ کو سمجھایا کہ شاہی فوج بڑی طاقتور ہے اور اس کے وسائل لامحدود ہیں تم اس سے لڑ کر اپنے خاندان کو بدنام نہ کرو اور خواہ مخواہ اپنی جان نہ گنواؤ۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ واپس جاؤ اور اپنے گھر میں شریف عورتوں کی سی زندگی گزارو۔

یزید شیبانی کی تقریر میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ لیلیٰ میدانِ جنگ سے کنارہ کش ہو گئی لیکن واپس جاتے وقت اس کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا اور زبان پر اس کے اپنے ہی یہ شعر جاری تھے:

فیا شجر الخابور مالک مورقا کانک لم تجزع علی بن طریف
اے خابور کے درخت تم کیوں سر سبز ہو۔ گویا تم ابن طریف کی موت پر غمزدہ ہی نہ ہوئے

فتی لا یحب الزاد الا من التقی ولا المال الا من قنا و سیوف
(ولید) ایک ایسا جوان تھا جو صرف زادِ تقویٰ اور تیغ و نیزہ کی دولت پسند کرتا تھا

فقدناک فقدان الشباب و لیتنا فدیناک من فتیاننا بالوف
(اے ولید) ہم نے تمہیں اس طرح کھویا ہے جس طرح جوانی کو کوئی کھو دے کاش ہم اپنے ایک ہزار جوان تیری ذات پر قربان کر دیتے

علیہ سلام اللہ وقفا فانني اری الموت وقاعاً بکل شریف
(ولید پر) خدا کی رحمت ہو موت ایک دن ہر شریف کو آنے والی ہے

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے:

"یہ پورا مرثیہ اس قدر بلند اور پُر درد ہے کہ اکثر علمائے ادب اس کو چشمِ ادب سے دیکھتے ہیں۔ ابو علی قالی نے اپنی امالی میں اس کو نقل کیا ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ فارعہ کے مراثی خنساءؓ کے ہم پلہ ہیں۔ اس مرثیہ کا پہلا شعر تو اس قدر مقبول ہے کہ عموماً علمائے بدیع اس کو تجاہلِ عارفانہ کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔"

(خواتینِ اسلام کی بہادری،
تاریخِ اسلام۔ سید امیر علی)

تیسری صدی ہجری

۱۔ حضرت آمنہ رملیہؒ (عالمہ، عارفہ)

۲۔ بی بی عائشہؒ عباسیہ (عالمہ، شاعرہ)

۳۔ بی بی تحفہؒ (عارفہ)

۴۔ بی بی امۃ الجلیلؒ (عارفہ)

۵۔ بی بی جیدہؒ (عارفہ، دانشمند)

۶۔ بی بی بنت کعبؒ (عارفہ)

۷۔ بی بی عباسہؒ بنت فضل (عالمہ، عابدہ)

۸۔ بی بی اُمامہ (شاعرہ)

۹۔ اُم عباس (عالمہ، شاعرہ، حاضر جواب)

۱۰۔ حضرت جوہر براثیہؒ (عارفہ)

۱۱۔ بی بی رابعہ قزداری (شاعرہ، عابدہ)

۱۲۔ بی بی ام علیؒ (عارفہ)

۱۳۔ بی بی ولدہؒ بنت محمد (شاعرہ)

۱۴۔ بی بی ام محمدؒ (عارفہ)

۱۵۔ بی بی ام ہارونؒ (عارفہ)

۱۶۔ بی بی الطہرہ (فاضلہ، مدبرہ)

۱۷۔ بی بی قطر الندی (عالمہ، فاضلہ)

۱۸۔ بی بی ام محمدؒ (عارفہ)

۱۹۔ ملکہ بوران (عالمہ، فاضلہ، علم دوست، مخیر)

۲۰۔ بی بی ام الفضل عباسیہؒ (عالمہ)

۲۱۔ بی بی فضل (شاعرہ)

حضرت آمنہ رملیہؒ

حضرت آمنہ رملیہؒ کا شمار دوسری / تیسری صدی ہجری کی جلیل القدر عالمات و عارفات میں ہوتا ہے۔ تقریباً ۱۶۳ھ ہجری میں بغداد کے ایک نواحی شہر رملہ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے بہت ذہین اور علم حاصل کرنے کی شائق تھیں، لیکن والدین بہت غریب تھے وہ ان کی تعلیم کا کوئی خاص اہتمام نہ کر سکے البتہ گھر پر جو معمولی تعلیم دے سکتے تھے، دے دی۔ جب ذرا بڑی ہوئیں تو اپنی والدہ کے ساتھ حج کے لیے مکہ معظمہ گئیں۔ اس زمانے میں ایک بزرگ عالم دین مسجد حرام میں درس دیا کرتے تھے۔ حضرت آمنہؒ ان کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئیں اور ایک عرصہ تک ان سے قرآن و حدیث کا علم حاصل کرتی رہیں۔ جب وہ وفات پا گئے تو حضرت آمنہؒ مدینہ منورہ چلی گئیں جہاں امام مالکؒ نے مسندِ درس بچھا رکھی تھی۔ حضرت آمنہؒ مدت تک ان سے علمِ حدیث حاصل کرتی رہیں اور بہت سی احادیث زبانی یاد کر لیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کے اندازے کے مطابق ان سے مروی احادیث کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔

اس کے بعد وہ دوبارہ مکہ معظمہ گئیں اور امام شافعیؒ سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً چھتیس سال کی ہو چکی تھی۔ امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو وہ کوفہ پہنچ گئیں جہاں بہت سے علماء و فضلاء موجود تھے۔ حضرت آمنہؒ نے بڑے ذوق و شوق سے ان سے بھی کسبِ فیض کیا اور تمام علوم دینی میں یکتائے روزگار ہو گئیں۔ جب کوفہ سے وطن واپس گئیں تو ان کے علم و فضل کا چرچا دُور دُور تک پھیل چکا تھا۔ انہوں نے مخلوقِ خدا کو فیض پہنچانے کی

خاطر اپنا حلقۂ درس قائم کیا تو لوگ تحصیلِ علم کے لیے جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ بڑے بڑے علماء بھی سماعتِ حدیث کے لیے ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ سنہ ۲۰۹ھ ہجری میں انہیں بغداد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک درویشِ کامل کی توجہ سے ان کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ اپنا تمام مال و اسباب راہِ خدا میں دے دیا اور درویشانہ زندگی اختیار کر لی اب ہر وقت عبادتِ الٰہی اور گریہ و زاری میں مشغول رہتی تھیں۔ اسی حالت میں سات حج پیادہ پا کیے۔ ان کے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی بنا پر لوگ ان کو خاصانِ خدا میں شمار کرتے تھے اور ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے ایک عظیم المرتبت ولی اللہ حضرت بشر حافیؒ (المتوفی ۲۲۷ھ) کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح اہلِ سنت و جماعت کے چوتھے امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ (المتوفی ۲۴۱ھ) بھی ان کی عظمت و جلالت کے معترف تھے۔

ایک دفعہ حضرت بشر حافی بیمار ہوئے تو حضرت آمنہؒ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئیں۔ اتفاق سے امام احمد حنبلؒ بھی وہاں تشریف لے آئے۔ انہوں نے حضرت بشرؒ سے پوچھا، یہ کون خاتون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا، یہ آمنہ رملیہ ہیں، میری عیادت کو آئی ہیں۔

امام صاحبؒ نے ان کی شہرت سن رکھی تھی۔ اب انھیں قریب پا کر بہت خوش ہوئے اور حضرت بشرؒ سے فرمایا:

"ان سے کہئے کہ میرے لیے دعا کریں۔"

حضرت بشر حافیؒ نے حضرت آمنہؒ سے عرض کیا:

"یہ احمد بن حنبل ہیں، آپ سے دعا کے خواستگار ہیں۔"

حضرت آمنہؒ نے ہاتھ اٹھا کر نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔

"اے اللہ! احمد بن حنبل اور بشر دونوں جہنم کی آگ سے پناہ مانگتے ہیں تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، ان کو اس آگ سے محفوظ رکھ"۔[1]

ایک دفعہ کسی رئیس نے دس ہزار اشرفیاں ان کی نذر کرنا چاہیں۔ انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ جب اس نے بہت اصرار کیا تو رکھ لیں لیکن ان کو ہاتھ نہ لگایا اور شہر میں منادی کرادی کہ جس کو روپیہ کی ضرورت ہو وہ آکر مجھ سے لے جائے۔ چنانچہ حاجت مند لوگ آتے تھے اور بقدرِ ضرورت ان سے رقم لے جاتے تھے۔ شام ہوتے ہوتے انہوں نے تمام اشرفیاں تقسیم کر دیں حالانکہ اس دن ان کے گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔

حضرت بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ آمنہؒ کا معمول تھا کہ نصف شب کو بیدار ہو جاتیں اور صبح تک نہایت خشوع وخضوع سے عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتیں۔ ایک دفعہ میں نے انہیں یہ دعا مانگتے سُنا:

"اے خالقِ ارض وسماء تیری نعمتیں بے حد وحساب ہیں لیکن کس قدر ظالم ہیں وہ لوگ جو ان کی قدر نہیں کرتے۔ تو ارحم الراحمین ہے مگر دنیا تجھ کو بھولی ہوئی ہے۔

اے میرے پیارے آقا میری عزت تیرے ہی ہاتھ ہے۔ قیامت کے دن سب کے سامنے مجھے رسوا نہ کرنا اگر ایسا کیا تو لوگ یہی

---

[1] بعض تذکرہ نگاروں نے اس واقعہ کو حضرت آمنہ رملیہؒ کی کرامت کے طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے یہ بیان منسوب کیا ہے کہ اسی رات کو آسمان سے ایک پرچہ میری گود میں آکر گرا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد لکھا ہوا تھا کہ ہم نے کر دیا اور ہم زیادہ بھی کر سکتے ہیں (یا یہ کہ ہمارے پاس مزید نعمتیں بھی ہیں)۔

(با کمال مسلمان عورتیں از مولانا عبدالقیوم ندوی)

کہیں گے کہ اللہ نے اپنی بندی کو رسوا کیا جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اے میرے پیارے آقا تجھ کو یہ بات یقیناً گوارا نہ ہوگی۔ اگر تو نے اس کو گوارا کیا تو میں ہرگز ہرگز اسے گوارا نہ کروں گی کہ لوگ تجھے الزام دیں۔"

ایک مرتبہ انہوں نے حضرت بشرؒ سے فرمایا۔ "اے بشر! میں تو سوتی ہوں مگر میرا دل بیدار رہتا ہے۔"

ان کا دستور تھا کہ کسی کے ہاں کا کھانا نہ کھاتیں کہ مبادا اس میں مالِ حرام یا کسی مشکوک چیز کا کوئی جزو شامل ہو البتہ کسی کے بارے میں یقین ہو تا کہ وہ متقی اور پرہیزگار ہے تو اس کے ہاں کا کھانا کھا لیتیں۔

حضرت آمنہ رملیہؒ کی عائلی زندگی کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا اور نہ یہ وضاحت کی ہے کہ وہ دور دراز شہروں میں جا کر سالہا سال تک تحصیل علم کیسے کرتی رہیں اور اس دوران میں ان کا سرپرست اور نگران کون تھا۔ ان کا سالِ وفات بھی کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔ انہوں نے تیسری صدی ہجری میں کسی وقت وفات پائی۔

(دائرہ معارف اسلامیہ۔ مشاہیر نسواں۔ باکمال مسلمان عورتیں)

بی بی عائشہؒ عباسیہ

آٹھویں عباسی خلیفہ معتصم باللہ (متوفی سنہ ۲۲۷ھ) کی صاحبزادی تھی۔ والد نے اس کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کی۔ چنانچہ وہ جملہ علوم میں یگانۂ روزگار ہو گئی اور اپنے عہد کے اہلِ علم و فضل میں شمار ہونے لگی۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا اور اسے بہت اونچے درجے کی شاعرہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ نہایت شگفتہ مزاج تھی اور روتوں کو ہنسا دیا کرتی تھی۔ سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی تحفہؒ

تحفہؒ تیسری صدی ہجری میں ایک برگزیدہ خاتون گزری ہیں۔ مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ نے ان کو "اولیاء اللہ" میں شمار کیا ہے۔ کثرتِ عبادت و ریاضت کی وجہ سے ان کو معرفتِ الٰہی حاصل ہوگئی تھی۔ وہ فی البدیہہ معرفت کے اشعار تضمین کرتی تھیں۔ کسی شخص کی کنیز تھیں اس نے انہیں دیوانہ سمجھ کر بیمارستان بھیج دیا جہاں ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔ حضرت سری سقطیؒ ان کے ہم عصر تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میری طبیعت ایسی پریشان تھی کہ تہجد سے بھی محروم رہا۔ صبح ہوئی تو جگہ جگہ پھرتا تھا کہ کسی طرح یہ اضطراب دور ہو لیکن اس میں ذرا بھی تخفیف نہ ہوئی۔ آخر پھرتا پھراتا بیمارستان میں چلا گیا وہاں ایک پاکیزہ صورت عورت کو پابزنجیر دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ عورت آبدیدہ ہوگئی اور کچھ شعر پڑھے۔ میں نے بیمارستان کے منتظم سے دریافت کیا کہ یہ عورت کون ہے؟ اس نے کہا کہ اس کا نام تحفہ ہے اور یہ فلاں شخص کی کنیز ہے اس کو جنون ہوگیا ہے۔

تحفہ یہ سن کر اس قدر روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر اس نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:۔

معشر الناس ماجننت ولکن
انا سکرانة وقلبی صاحبی

(لوگو! میں مجنون نہیں لیکن میں معرفتِ الٰہی میں مست و مدہوش ہوں اور میرا قلب میرا ساتھی (ہمنوا) ہے۔)

(نفحات الانس)

بی بی امۃُ الجلیلؒ

طبقاتِ شعرانی میں ہے کہ امۃ الجلیلؒ عرب کی پارسا اور خدارسیدہ خواتین میں سے تھیں۔ ایک مرتبہ اُس عہد کے اربابِ سلوک میں یہ بحث چھڑی کہ " ولایت " کے معنی کیا ہیں۔ سب نے اپنی اپنی رائے دی، لیکن ان آراء میں اختلاف تھا۔ آخر یہ قرار پایا کہ امۃ الجلیل سے اس کے معنی پوچھے جائیں۔ چنانچہ جب ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

" ولی وہ ہے جو ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہے اور زخارفِ دنیا سے مطلق دل نہ لگائے بلکہ کسی وقت بھی اس کی توجہ ماسوا کی طرف نہ جائے۔"

پھر انہوں نے اربابِ سلوک سے مخاطب ہو کر فرمایا:

" جب کوئی تم سے کہے کہ فلاں ولی یادِ حق کو چھوڑ کر کسی اور کام میں مشغول ہے تو ہرگز اس کی ولایت کا یقین نہ کرنا۔"

قیاساً ان کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے۔ (نفحات الانس)

بی بی عبیدہؒ

عبیدہ خاتون عباسی خلیفہ ماموں الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) اور معتصم باللہ (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) کے عہد میں نہایت پارسا اور باکمال خاتون ہوئی ہیں۔ ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں ان کی لیاقت اور ہنرمندی کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

(مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب)

بی بی بنتِ کعبؒ

تیسری صدی ہجری میں مشہور عارفہ ہوئی ہیں۔ شیخ ابوسعید خرازؒ کی ہمعصر تھیں کبھی کبھی عارفانہ شعر بھی کہا کرتی تھیں مولانا جامیؒ نے اُن کو اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے اور ان کے یہ اشعار نقل کیے ہیں :

عشق او باز اندر آوردم بہ بند
کوششِ بسیار ناید سود مند

عشق دریائے کرانہ ناپدید!!
کے تواں کردن شتاب اے مستمند

عشق را خواہی کہ با پایاں بری!
بس کہ بپسندید باید ناپسند

زشت باید دید انگارید خوب
زہر باید خورد انگارید قند

توسنی کردم ندانستم ہمے!
کز کشیدن تنگ تر گردد کمند

(نفحات الانس)

بی بی عباسہؒ بنتِ فضل

یہ خاتون امام ابوعبداللہ محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ تھیں۔ فقہ و حدیث اور زہد و عبادت میں یگانۂ روزگار تھیں۔ — ۲۹۰ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی اُمامہ

خلیفہ الواثق باللہ عباسی (۲۲۷ھ تا ۲۳۲ھ / ۸۴۱ء تا ۸۴۷ء) کے عہد میں ایک نامور خاتون ہوئی ہے جو عربی شعر و ادب میں بہت اونچا مقام رکھتی تھی اور تمام عالم اسلام میں اس کی سحرالبیانی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ اس نے اپنے دَور کے ایک مشہور جوانمرد رئیس اسود بن فنان کی شان میں یہ مدحیہ اشعار کہے جو آناً فاناً عرب کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے۔

اذا شئت ان تلقی فتی لو وزنتہ | بکل معدی و کل یمان

وفی بھما فضلاً وجوداً و سودداً | وزناً فذاک الاسود بن فنان

فتی لا یری فی ساحۃ الارض مثلہ

لیوم خراب او لیوم ظعان

ترجمہ و مفہوم

جب تو (اے مخاطب) چاہے کہ ایسے نوجوان سے ملے کہ اگر تو اس کا موازنہ کسی یمنی یا معدی کے خانوادہ کے کسی فرد سے کرے اور ان دونوں کے مقابلہ میں اسے فضیلت، سخاوت اور سرداری میں بڑھا ہوا پائے تو پھر وہ اسود بن فنان ہی ہے۔ روئے زمین پر اس کا ثانی کوئی نہیں اس دن جب میدانِ کارزار میں ہر چیز تباہ و برباد ہو رہی ہو یا جب ہودج نشین عورتیں باہر نکل چکی ہوں۔ (تذکرۃ الخواتین)

اُمِّ عبّاس

ساتویں عبّاسی خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ / ۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) کی بیگم تھی نہایت ذہین وفطین اور عالمہ فاضلہ خاتون تھی۔ شعروشاعری میں بھی درک رکھتی تھی۔ اگرچہ اس کی پرورش خالص بدویانہ (صحرائی) ماحول میں ہوئی تھی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صحرائی علاقے میں بود و باش رکھنے والے کسی علمی اور دینی گھرانے سے تھا اور اس کی تعلیم و تربیت بہت عمدگی سے کی گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ عنفوانِ شباب کو پہنچنے تک اس کو علم الانساب سے گہری واقفیت ہوگئی تھی جس نے مامون الرشید کو اس سے شادی کرنے پر آمادہ کیا۔ عربی ادب کی بعض کتابوں میں یہ واقعہ مزے لے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

مامون الرشید ایک دن اپنے چند محافظوں کو ساتھ لے کر شکار اور سیر و تفریح کے لیے نکلا۔ چلتے چلتے شہر سے دور صحرا میں پہنچ گیا وہاں کسی جانور کے پیچھے گھوڑا ڈالا اور اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ شکار تو ہاتھ نہ آیا البتہ ایک چشمے (یا دریائے فرات) کے قریب ایک دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس حسین و جمیل دوشیزہ کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے عرب خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس کے کندھے پر پانی کا مشکیزہ تھا جس کے بوجھ تلے دبی جارہی تھی۔ نشیب سے فراز پر آتے ہوئے مشکیزہ سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہوگیا اور اس نے مدد کے لیے اپنے باپ کو آواز دی۔

يَا أَبَتِ أَدْرِكْ فَاهَا۔ قَدْ غَلَبَنِي فُوهَا لَا طَاقَةَ لِي بِفِيهَا۔

(ابا دوڑ کر آ اور مشکیزے کا منہ تھام تو اس کے دہانے پر میرا زور نہیں چلتا اور یہ میرے قابو سے باہر ہے)

اس کا باپ کہیں دور تھا اس نے بیٹی کی آواز نہ سنی البتہ مامون الرشید یہ

فصیح وبلیغ جملہ سن کر پھڑک اٹھا اور دوشیزہ کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا پھر اس سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے لڑکی! تم تو بہت خوب عربی بولتی ہو۔"

دوشیزہ: "کیا میں عرب کی رہنے والی نہیں ہوں۔"

مامون: "تمہارا تعلق کس قبیلے سے ہے؟"

دوشیزہ: "بنی قضاعہ سے"

مامون: "بنی قضاعہ کی کس شاخ سے ؟"

دوشیزہ: "بنی کلب سے"

مامون: "ایسے قبیلے میں تم کیوں پیدا ہوئیں؟"

دوشیزہ: "کیوں میرے قبیلے کو کیا ہے؟ وہ تو بڑی عزت والا ہے اس پر کوئی الزام نہیں۔ مہمان نواز ہے اور تلوار کا دھنی ——— مگر اے شخص تم کس قبیلے سے ہو؟"

مامون: "کیا تم کو انساب سے واقفیت ہے؟"

دوشیزہ: "ہاں خوب واقفیت ہے۔"

مامون: "میں بنو مضر سے ہوں۔"

دوشیزہ: "لیکن کونسا مُضَر؟"

مامون: "جو حسب ونسب کے اعتبار سے سب سے معزز اور معظّم ہے۔"

دوشیزہ: "میں سمجھ گئی تم بنو کنانہ سے ہو لیکن کنانہ کی کس شاخ سے ؟"

مامون: "جس کے فرزند سب سے شریف اور بردبار ہوتے ہیں۔"

دوشیزہ: "(ہنس کر) اچھا تو تم قریش سے ہو لیکن قریش کے کس خاندان سے۔"

مامون: "جس کا ذکر سب سے اونچا اور جس کا فخر بے مثال ہے۔"

دوشیزہ: "خدا کی قسم! تم بنی ہاشم سے ہو لیکن بنی ہاشم کے کس گھرانے سے۔"

مامون: "جس کے گھر سب سے بلند، جس کا قبیلہ سب سے اشرف جس سے

اعدا رہاشم ہیبت زدہ تھے۔"

دوشیزہ نے یہ سُن کر ادب سے سر جھکایا اور کہا:

" السّلامُ علیکَ یا امیرالمؤمنین!" پھر اس نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے:

مامون ذوالمنن الشریفه	وصاحب المرتبة المنیفه
وقائد العساکر الکثیفه	هل لك فی ارجوزة لطیفه
اظرف من فقه ابی حنیفه	لا - والذی انت له خلیفه
ماظلمت فی حیّنا ضعیفه	عاملنا بمؤن خفیفه
اللص والتاجر فی قطیفه	والذئب والنعجة فی سقیفه

(اے شریفانہ احسانات والے مامون! اے عالی اور کامل مرتبے والے اور اے عظیم الشان لشکروں کی قیادت کرنے والے ایک پاکیزہ نظم سُنیئے جو فقاہت ابو حنیفہ سے بھی لطیف ہے! اس ذات کی قسم جس کا تو خلیفہ ہے ہمارے قبیلے میں کبھی کسی کمزور بڑھیا پر بھی ظلم نہیں ہوا اور آپ کے پُرامن دورِ خلافت میں چور اور تاجر ایک چادر میں اور بھیڑیا اور بکری ایک چھت کے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔)

مامون الرشید اس دوشیزہ کی وسعتِ معلومات، حاضر جوابی ذہانت اور اشعار سُن کر ششدر رہ گیا اور اس نے اس کو اپنی ملکہ بنانے کا ارادہ کر لیا۔ واپس آ کر اس نے دوشیزہ کے والدین کو اس کے لیے پیغام بھیجا جو انھوں نے فوراً قبول کر لیا۔ یوں وہ دوشیزہ شاہی حرم میں داخل ہو گئی۔ اسی کے بطن سے مامون الرشید کا بیٹا عباس پیدا ہوا۔ مامون الرشید بہترین علمی اور ادبی ذوق رکھتا تھا اس لیے وہ اُمِ عباس کی بہت قدر کرتا تھا اور اکثر اس سے علمی گفتگو کیا کرتا تھا۔

(عقد الفرید)

حضرت جوہر براثیہؒ

تیسری صدی ہجری کی بڑی نامور عارفہ گزری ہیں۔ ۲۳۶ھ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوئیں۔ زندگی کے ابتدائی دور میں کسی عباسی خلیفہ کی کنیز تھیں۔ ایک دن کسی درسگاہ کے قریب سے گزر ہوا، وہاں ایک بزرگ بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ بڑے دلنشین انداز میں بہت سے طلبہ کو درسِ حدیث دے رہے تھے۔

حضرت جوہر کے قدم وہیں زمین پر گڑ گئے۔ دیر تک سماعِ حدیث کرتی رہیں۔ آگے بڑھیں تو جامع مسجد آگئی، وہاں بھی ایک نورانی صورت کے محدث طلبہ کو حدیث کا درس دے رہے تھے اور کئی طلبہ حدیثیں لکھ رہے تھے۔ حضرت جوہر ان ایمان افروز مناظر سے بہت متاثر ہوئیں اور ان کے دل کی دنیا بدل گئی۔ واپس محل میں پہنچیں تو سکوت اختیار کر لیا۔ وقت کا بیشتر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزارنے لگیں۔ بلا ضرورت ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالتی تھیں۔ دوسری کنیزیں ان کو بہت چھیڑتی تھیں مگر وہ خاموش رہتی تھیں۔ آخر ایک دن انہوں نے بہت اصرار کے ساتھ ان سے سکوت کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا:۔

"میں اللہ کی کنیز ہوں اور اسی کے احکام کی اطاعت کرنا میرا فرض ہے۔"

انہوں نے کہا — "خلیفہ کو کیا جواب دو گی؟"

فرمایا — "یہی جو تم کو دیا ہے۔"

رفتہ رفتہ ان کی عبادت گزاری اور سکوت کی خبر خلیفہ تک پہنچ گئی اس

نے انہیں فوراً آزاد کر دیا۔

اب انہوں نے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے آپ کو خدمتِ حدیث اور عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا۔ سُنّتِ نبوی کی پیروی میں حضرت ابو عبداللہ براثیؒ سے نکاح کر لیا۔ وہ اس زمانے کے ایک بڑے محدث، فقیہ اور متقی بزرگ تھے۔

حضرت جوہر براثیہؒ دولتِ دنیا سے بالکل بے نیاز تھیں۔ ایک دفعہ خلیفہ نے انہیں دس ہزار دینار کی تھیلی بھیجی۔ انہوں نے یہ کہہ کر انہیں لینے سے انکار کر دیا کہ دنیا کا مال طبیعت میں تکبر اور رعونت پیدا کرتا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

خلیفہ نے اب انہیں بیس ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ انہیں رکھ لیں اور غربا و مساکین میں تقسیم کر دیں۔ مگر حضرت جوہرؒ نے یہ بھی قبول نہ کیے اور لانے والے قاصد سے کہا کہ امیر المؤمنین سے کہنا، میں ایک گوشہ نشین عورت ہوں مجھے معلوم نہیں ان دیناروں کا مستحق کون ہے اور غیر مستحق کون۔ اگر میں نے کسی غیر مستحق کو دے دیئے تو آخرت میں اللہ کو کیا جواب دوں گی۔ بہتر یہی ہے کہ امیر المؤمنین انہیں خود مستحقین میں تقسیم کریں۔

ایک مرتبہ خلیفہ نے پیغام بھیجا کہ قصرِ خلافت میں قدم رنجہ فرمائیں تاکہ ہمیں آپ کی خدمت کا موقع ملے اور حصولِ برکت بھی ہو۔ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ قصرِ خلافت اور فقیر کی کٹیا میں بڑا فرق ہے۔ میں اپنی کٹیا سے اٹھ کر قصر میں جاؤں تو آپ کے عیش و راحت میں خلل پڑے گا۔ مجھے یہاں ہی پڑا رہنے دیں ——— ایک دفعہ والیٔ بغداد کی اہلیہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہیں اپنے گھر لے جانا چاہا مگر وہ اس کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوئیں اور فرمایا، میں ایک سیدھی سادی عورت ہوں اور اس کٹیا میں اپنے جیسے لوگوں کے درمیان رہنا ہی مجھے پسند ہے جو اطمینانِ قلب مجھے یہاں میسر ہے کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا ——— حضرت جوہر براثیہؒ نے ۲۹۷ھ ہجری میں وفات پائی۔

(تذکارِ عارفات، مولانا محمد اسحاق بھٹی)

بی بی رابعہ قزداری

بلخ کے علاقہ قزدار میں رہتی تھیں لیکن اصل و نسل کے اعتبار سے اعرابیہ تھیں۔ ان کے والد کا نام کعب بن حارث اور عرف زین العرب تھا۔ وہ وہ مقدم الشعرا رودکی[1] کی ہم عصر اور فارسی کی قادر الکلام شاعرہ تھیں۔

---

[1] ابو عبداللہ جعفر (رُودکی) بن محمد بن حکیم عبدالرحمٰن بن آدم نواحِ سمرقند کا رہنے والا تھا۔ اس کا شمار تیسری/چوتھی صدی ہجری کے عظیم فارسی شعراء میں ہوتا ہے۔ اہلِ ایران اسے استادِ شاعراں و مقدم شعرائے عجم کہتے ہیں۔ نہایت ذہین و فطین تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا اور اسی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ قرأت کا فن بھی سیکھا۔ اس کی زندگی کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہیں۔ ہاں اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اپنے اشعار کی بدولت اس نے چند سالوں کے اندر اندر ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور فارس و ماوراء النہر کے سامانی فرمانروا سلطان نصر (اول) بن احمد (۲۶۱ھ تا ۲۷۹ھ) نے اس کو اپنا درباری شاعر بنا لیا۔ رُودکی نے اس کی شان میں بہت سے قصیدے لکھے وہ آخری عمر میں نابینا ہو گیا تھا (بعض نے اسے پیدائشی نابینا لکھا ہے اور بعض نے اس کی بصارت زائل ہونے کے کچھ اور اسباب لکھے ہیں) رُودکی نے ۳۲۹ھ میں رُودک میں وفات پائی۔

رُودکی ایران کا پہلا شاعر ہے جس نے فارسی تشبیب و قصیدہ میں خاص ادبی روایات قائم کیں۔ بہت سے شعراء اس کو قصیدے کا استاد

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہا جاتا ہے کہ یادِ الٰہی کی بدولت وہ زمرۂ عارفات میں داخل ہو گئی تھیں اور ان کے کلام پر عشقِ حقیقی کا رنگ غالب تھا۔ بدقسمتی سے ان کا حقیقی بھائی بدگمانی میں مبتلا ہو گیا اور عشقِ مجازی کی تہمت لگا کر ان کو جان سے مار ڈالا۔

ذیل کا قطعہ رابعہ قزداریؒ سے منسوب کیا جاتا ہے :-

عشق او باز اندر آوردم بہ بند
کوشش بسیار نایدسودمند
توسنی کردم ندانستم ہمے
کز کشیدن سخت تر گردد کمند![1]

(مشاہیر نسواں بحوالہ مجمع الفصحاء)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تسلیم کرتے ہیں۔ بعض مصنفین کے بیان کے مطابق رودکی نے اپنی زندگی میں تیرہ لاکھ اشعار اور چھ مثنویاں لکھیں۔ اس کا دیوان قصائد، رباعیوں، مثنویوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ رباعی پہلی مرتبہ رودکی کے ہاں نظر آتی ہے۔

(اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ)

[1] جامیؒ نے "نفحات الانس" میں یہ دونوں شعر بنتِ کعبؒ سے منسوب کیے ہیں۔

بی بی اُمِّ علیؒ

بی بی اُمِّ علیؒ تیسری صدی ہجری میں بہت بڑی عارفہ گزری ہیں۔ وہ مشہور ولی اللہ شیخ احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ کی حرمِ محترم تھیں۔ ان کے والدین بہت مالدار تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے بے انتہا دولت چھوڑی لیکن مخیر بیٹی نے سب خدا کی راہ میں لٹا دی اور اپنے عابد و زاہد شوہر کے ساتھ قناعت کی زندگی اختیار کی۔

بی بی اُمِّ علیؒ حضرت بایزید بسطامیؒ اور شیخ ابوحفصؒ کی ہم عصر تھیں۔ ان دونوں بزرگوں نے ان سے کسبِ فیض کیا۔ حضرت بایزیدؒ فرمایا کرتے تھے:

"جو شخص تصوف کے میدان میں قدم رکھنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے اندر اُمِّ علی جیسی کیفیت اور ہمت پیدا کرے۔"

شیخ ابوحفصؒ کہتے ہیں کہ جب تک میں نے اُمِّ علیؒ زوجہ احمد خضرویہ کی باتیں نہیں سُنی تھیں، میں عورتوں کی جنس ہی کو حقیر سمجھتا تھا اور ان سے باتیں کرنا مکروہ جانتا تھا مگر جب اُمِّ علی کی باتیں سنیں تو مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتِ معرفت سے جسے چاہتا ہے نوازتا ہے۔ اس میں مرد یا عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔

ایک دفعہ بلخ کی ایک عورت بی بی اُمِّ علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی:

"اے اُمِّ علی! میں آپ کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

انہوں نے جواب دیا :

" اس کے برعکس تم اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ذریعے میرا تقرب کیوں نہیں چاہتیں ؟ "

حضرت اُمِّ علیؒ کے بہت سے مقولے صوفیۂ کرام میں مشہور ہیں ان میں سے دو مقولے یہ ہیں :

① حاجت کا پورا نہ ہونا بے عزت ہونے سے بہتر ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنے انعامات کی بارش کی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ تب اس نے مصیبتوں اور سختیوں میں مبتلا کیا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صرف اس لیے کیا کہ اس کو اپنے بندوں سے محبت ہے۔ (نفحات الانس)

بی بی ولدہ بنتِ محمدؒ

اَندلُس کے فرمانروا محمدؒ اوّل (۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ) کی بیٹی تھی۔ نہایت عالمہ اور فاضلہ خاتون تھی۔ اہلِ قرطبہ کے نزدیک اس کی وہی قدر و منزلت تھی جو اہلِ یورپ کے نزدیک سیافو اور کانڈے کی ہے۔ (سیافو یونان کی شہرۂ آفاق شاعرہ تھی۔ اس نے شاعری میں ایک نئی بحر ایجاد کی تھی جو اسی کے نام سے مشہور تھی ــــــ کانڈے اسپین کا مشہور مورخ تھا، اس نے اسپینی زبان میں ایک نہایت مبسوط تاریخ مسلمانوں کے تسلطِ اندلس کی لکھی ہے۔

سالِ ولادت ۱۷۶۵ء سالِ وفات ۱۸۶۰ء) (تمدنِ عرب)

بی بی اُمِّ محمدؒ

شیخ المشائخ شیخ الاسلام ابو عبداللہ محمد بن حفیف (المتوفی ۳۳۱ھ) کی والدہ ماجدہ تھیں۔ زہد و عبادت میں یگانۂ روزگار تھیں۔ مولانا عبدالرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے۔

ان کا وطن مالوف شیراز تھا، وہاں سے اپنے فرزند حضرت ابو عبداللہؒ کے ساتھ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے بہت سے مجاہدات اور مکاشفات کا ذکر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو عبداللہ رمضان کے آخری عشرہ میں شب بیداری کیا کرتے تھے کہ شاید ان کو لیلۃ القدر نصیب ہو جائے۔ ایک رات وہ اسی طرح بالاخانے میں جاگ کر ذکرِ الٰہی کر رہے تھے کہ ان کی والدہ (اُمِّ محمدؒ) نے جو گھر کے اندرونی حصے میں قبلہ رو بیٹھ کر عبادِ الٰہی میں مشغول تھیں، آواز دی:

"اے محمد اے فرزند آنچہ تو آنجا مے طلبی اینجاست"

(اے محمد اے بیٹے جس چیز کا تو وہاں طلب گار ہے وہ یہاں ہے)

شیخ ابو عبداللہؒ یہ سن کر بالاخانے سے نیچے اترے تو دیکھا کہ انوارِ لیلۃ القدر سے ان کی والدہ کا حجرہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ اسی وقت والدہ کے قدموں پر گر پڑے۔ خود فرماتے ہیں کہ اس دن سے مجھے اپنی والدہ کی حقیقی قدر معلوم ہوئی۔

بی بی اُمِّ محمدؒ نے ۳۱۲ھ ہجری میں وفات پائی۔

(نفحات الانس و خزینۃ الاصفیاء)

بی بی اُمِّ ہارونؒ

صاحبِ "طبقاتِ شعرانی" کا بیان ہے کہ یہ خاتون نہایت عبادت گزار اور خدا رسیدہ تھیں۔ ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتی تھیں اور ہمیشہ سوکھی روٹی پر گزارہ کرتی تھیں۔

رات کی تاریکی میں اپنے خالق و مالک کی عبادت کرنے میں انہیں خاص لطف حاصل ہوتا۔ جب سپیدۂ سحری نمودار ہوتا تو فرماتیں:

"ہائے دوری ہو گئی۔"

مطلب یہ کہ رات کی تنہائی میں اپنے خالق کی عبادت کرنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ دن کے وقت نہیں ہوتا۔

ان کی خود رفتگی کا یہ عالم تھا کہ بیس برس تک سر میں نہ تیل ڈالا اور نہ کنگھی کی لیکن ان کے بال اس قدر صاف اور چمکیلے تھے کہ دوسری خواتین ان پر رشک کرتی تھیں۔

انہیں قیامت کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا۔ ایک دفعہ دنیا و مافیہا سے بے خبر چلی جا رہی تھیں کہ کسی کی آواز کانوں میں پڑی

"اس کو پکڑ لو"

یہ سنتے ہی غش کھا کر گر پڑیں۔ لوگوں نے اٹھایا اور ہوش میں لائے تو فرمایا:

"میں نے سمجھا قیامت آ گئی اور میرے لیے حکم ہوا کہ اس عورت کو پکڑ لو، اسی لیے میں بے ہوش ہو گئی۔"

ایک روایت میں ہے کہ ایک دن بی بی اُمِّ ہارونؒ جنگل میں بیٹھی

تھیں کہ ایک شیر وہاں آنکلا۔ انہوں نے شیر سے مخاطب ہو کر کہا:
"اے شیر اگر میرے گوشت سے اللہ تعالیٰ نے تیری روزی مقرر کی ہے
تو آ اور مجھے کھا جا۔"—— یہ سنتے ہی شیر نے منہ موڑ لیا اور چلا گیا۔
بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ اکثر جنگل کی طرف نکل جایا کرتی تھیں۔
اور اس قسم کا واقعہ انہیں بارہا پیش آیا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی شیر یا دوسرے
درندے نے ان کو نقصان پہنچایا ہو۔ سب ان کو دیکھ کر اپنا رُخ دوسری طرف کر
لیتے تھے۔ (مشاہیر نسواں بالکمال عورتیں)

بی بی اطہرہ

خلیفہ محمدؒ اوّل (وفات ۲۷۳ھ) بن عبدالرحمٰن والئ اندلس کی ملکہ
کا نام ہے۔ یہ ملکہ بڑی فاضلہ اور نیک طینت تھی۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ
حقیقی معنوں میں اسم بامسمّٰی تھی۔ ۲۳۰ھ میں اس کے بطن سے عبداللہ
بن محمدؒ پیدا ہوا۔ والدہ نے اس کی تعلیم و تربیت اپنی ذاتی نگرانی میں نہایت اہتمام
سے کی۔ عبداللہ جب ۲۷۵ھ میں تخت نشین ہوا تو ماں کا حد سے زیادہ
احترام کرتا رہا۔ وہ ہر اہم کام میں ماں سے مشورہ کرتا تھا۔ اس کو اپنی والدہ
سے اس قدر محبت تھی کہ جب وہ صفر ۲۹۹ ہجری میں فوت ہوئی تو اس
پر قیامت بیت گئی۔ اس نے ایک عالی شان مقبرہ القصر (واقع رصافہ)
میں اس کے لیے تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ اس کی اپنی قبر بھی ماں کے مقبرے
کے قریب بنائی جائے۔ ماں کی جدائی کا غم اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ
بھولتا تھا۔ اسی غم میں اس نے تیرہ ماہ بعد اپنی جان بھی جان آفریں کے
سپرد کر دی۔ (نفح الطیب)

بی بی قطر الندی

سولھویں عباسی خلیفہ المعتضد باللہ (۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ) کی اہلیہ اور اٹھارویں عباسی خلیفہ المقتدر باللہ (۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ) کی والدہ تھیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ اور لائق خاتون تھیں۔ وہ اہل علم و فضل خواتین کی بھی بہت قدردان تھیں اور اکثر ان کو انعام و اکرام سے نوازتی رہتی تھیں۔ جب خلیفہ المقتدر باللہ تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ نابالغ تھا۔ ملکہ قطر الندی نے نہ صرف اس کی نابالغی کے زمانے میں بھی بلکہ بعد میں بھی بڑی قابلیت کے ساتھ حکومت کی وہ خود عدالت اپیل کی صدارت کرتی تھیں (یہ ان کے بڑھاپے کا زمانہ تھا) ان کے اجلاس میں عالم اور شریف مردوں اور عورتوں کا بہت ہجوم رہتا تھا علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ ۳۰۶ھ میں انہوں نے ایک ہسپتال کھولا اور سات ہزار دینار سالانہ اس کے مصارف کے لیے مقرر کیے۔ حکومت کے مکمل اختیارات ان کے ہاتھ میں تھے۔ وہ محکمۃ المظالم میں دربار کرتی تھیں، ہر جمعہ کو لوگوں کی عرضیاں دیکھتی تھیں اور شاہی فرامین کو اپنے دستخطوں سے جاری کرتی تھیں۔ (مشاہیر نسواں، مختصر تاریخ صحرائیان عرب)

بی بی اُمِّ محمدؒ

حضرت خواجہ ابوالحسن سری سقطیؒ (المتوفی ۲۵۳ھ) کی نہایت عالمہ اور فاضلہ شاگرد تھیں۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے "نفحات الانس" میں ان کو زمرۂ اولیاء میں شمار کیا ہے۔ ان سے بہت سی کرامات منسوب ہیں۔ حضرت سری سقطیؒ اُن کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ خاتون اللہ تعالیٰ کے تمام واجب کردہ احکام کو ملحوظ رکھتی ہے۔ (نفحات الانس)

ملکہ بوران

خلیفہ مامون الرشید عباسی کے وزیر حسن بن سہل سرخسی کی بیٹی تھی جعفر ۱۹۲ھ میں پیدا ہوئی۔ خدیجہ نام رکھا گیا اور بوران لقب ہوا۔ یہ پیار کا لقب اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ اس کا اصل نام بھول گئے۔ والد نے بوران کی تعلیم و تربیت کا بہترین اہتمام کیا اور وہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنے زمانے کی بہترین عورت تسلیم کی گئی۔ حسن و جمال کے علاوہ اللہ نے اس کو عقل و ذہانت علم و ادب اور سلیقہ مندی کی نعمتوں سے بھی نوازا تھا۔ بچپن میں وہ شاہی محلوں میں بھی آتی جاتی رہتی تھی، اس طرح مجلسی آداب و قواعد سے بخوبی آگاہ ہو گئی تھی۔ ملکہ زبیدہ (مامون الرشید کی سوتیلی ماں) کے فیضِ صحبت نے اس کو تہذیب و شائستگی کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا۔ خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) نے بوران کے اوصافِ حمیدہ کا چرچا سنا تو اس نے بوران کے لیے حسن بن سہل کو پیام بھیجا۔ اس کو کیا عذر ہو سکتا تھا فوراً رضامند ہو گیا۔ ۲۰۲ھ میں مرد (مرو) کے مقام پر مامون الرشید کا نکاح بوران سے ہو گیا۔ اس وقت بوران کی عمر دس سال کی تھی اس لیے دلہن میکے سے رخصت ہو کر سسرال نہیں آئی (بعض روایتوں میں ہے کہ ۲۰۲ھ میں بوران کی صرف منگنی ہوئی تھی) رخصتی یا شادی کی رسم ۲۱۰ ہجری میں عمل میں آئی۔ مؤرخین نے اس شادی کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۲۱۰ھ میں مامون الرشید نے حسن بن سہل سے بوران کی رخصتی کے لیے درخواست کی۔ حسن نے فم الصلح کے مقام پر برات بلا بھیجی۔ فم الصلح دریائے دجلہ کے کنارے واسط کے قریب آب و ہوا اور موقع کے لحاظ سے ایک بے نظیر جگہ تھی اور وہاں حسن کے کئی شاندار محلات تھے۔

مامون الرشید مع ارا کینِ دولت خاندانِ شاہی اور تمام فوج وحشم، دولہا بن کر بغداد سے روانہ ہوا اور فم الصلح میں جا قیام کیا۔ حسن بن سہل نے اس شہر کو اس طرح سجایا تھا کہ وہ "عروس البلاد" دکھائی دیتا تھا۔ حسن اور اس کے خاندان والوں نے بڑی دھوم دھام سے برات کا استقبال کیا اور برابر ۱۹ دن تک اس کی ایسے فیاضانہ حوصلے سے مہمانداری کی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند دن کے لیے امیرانہ زندگی بسر کرلی۔ حسن نے اول خاندانِ بنو ہاشم، افسرانِ فوج اور تمام عہدیدارانِ سلطنت پر مشک اور عنبر کی گولیاں نثار کیں۔ ہر گولی کے اندر ایک پرچہ تھا جس پر جاگیر، خلعت، املاک، لونڈی، غلام، اسپ خاصہ اور نقدی کی ایک خاص تعداد یا مقدار درج تھی اور یہ حکم تھا کہ جس پرچہ پر جو چیز درج ہے وہ اسی وقت وکیل المرصد (صدر خزانچی) سے حاصل کرلے۔ خواص کے لیے تو یہ لوٹ تھی اور عوام پر مشک و عنبر کی گولیوں کے ساتھ درہم و دینار کی بارش ہو رہی تھی۔ سارے عرصۂ قیام میں برات کی نہایت پُرتکلف عجمی اور عربی کھانوں سے تواضع کی گئی۔ تمام لشکر میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کو بازار سے کوئی چیز خریدنے کی ضرورت پیش آئی ہو بلکہ ہر چیز حسن کی طرف سے مہیا کی جاتی تھی۔

دولہا (مامون الرشید) کو زنانخانہ میں بلایا گیا تو وہاں اس کے لیے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا۔ مامون اس پر رونق افروز ہوا تو اس پر بیش قیمت موتی نچھاور کیے گئے۔ یہ موتی زریں فرش پر بکھر کر عجب بہار دکھاتے تھے۔ اس وقت مامون الرشید کی زبان پر بے اختیار ابونواس کا یہ شعر جاری ہوگیا جو اس نے کبھی صفتِ شراب میں کہا تھا:

کان صغریٰ وکبریٰ من فواقعہا

حصباء درٍ علی ارضٍ من الذہب

(جامِ شراب کے چھوٹے چھوٹے بُلبلے ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا سونے کی زمین پر موتیوں کے دانے بکھرے پڑے ہیں)

تیسرے دن مامون الرشید جب دوبارہ محلسرا میں گیا اور دولھا دلھن ایک ساتھ مسند پر بیٹھے تو بوران کی دادی نے ایک ہزار بیش بہا موتی دونوں پر نچھاوُ کیے (یہ موتی ایک طلائی سینی میں تھے)۔ اس رسم کے وقت مامون کی سوتیلی ماں ملکہ زبیدہ خاتون اور اس کی بہن حمدودہ بھی موجود تھیں۔ اسی رات کو مامون الرشید کے خلوت کدہ میں چالیس من عنبر کی ایک شمع طلائی لگن میں روشن کی گئی [۱]۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حسن بن سہل وزیرِ اعظم نے اس تقریب میں پچاس کروڑ درہم یعنی بارہ کروڑ پچاس لاکھ روپیہ صرف کیا اور مامون الرشید نے اپنے خُسر کو بہ تقریبِ تہنیت شادی دو کروڑ پچاس لاکھ روپیہ انعام دیئے اور فم الصلح کو حسن کی مستقل جاگیر بنا دیا۔ انیس دن بعد شوال کی ساتویں تاریخ سنہ ۲۱۰ ہجری کو مامون الرشید بغداد واپس آیا۔ اپنے ارکانِ دولت کو انعام واکرام سے سرفراز کیا اور غربا میں اشرفیوں کی ہزاروں تھیلیاں تقسیم کیں۔

اس زمانے اور آج کل کے سکّے کی قیمتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس لیے زمانۂ حاضر کے لوگوں کو شادی کے یہ اخراجات مبالغہ معلوم ہوں گے لیکن اس شادی کے تمام واقعات ابنِ خلدونؒ، ابنِ اثیرؒ، ابوالفدا اور ابنِ خلکانؒ وغیرہ اکثر مؤرخین نے پوری تفصیل سے لکھے ہیں اس لیے ان سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا البتہ ان اخراجات پر اسراف کا اطلاق ضرور کیا جا سکتا ہے یہ اس زمانے کے بادشاہوں اور امیروں کے چوچلے تھے۔

جب بوران بادشاہ بیگم ہو کر محل میں داخل ہوئی تو اپنی لیاقت، دانائی

---

[۱] من کی مقدار اُس زمانے میں موجودہ زمانے کے مَن کی مقدار کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

اطاعت شعاری اور سلیقہ مندی سے خلیفہ مامون الرشید کی طبیعت پر حاوی ہوگئی۔ اس اثر و رسوخ کو وہ ہمیشہ عوام الناس کے فائدہ کے لیے کام میں لاتی رہی۔ وہ بڑی نیک دل فیاض اور مخیّر خاتون تھی۔ اس نے بغداد میں کئی بیمارستان (شفاخانے) اور مدرسے بنوائے۔ ان کے علاوہ خواتین کے لیے ایک دارالعلوم بطورِ خاص تعمیر کرایا۔ ان سب کے اخراجات پورا کرنے کے لیے اس نے جاگیریں وقف کیں۔

اس شادی کے صرف آٹھ سال بعد مامون الرشید نے ۱۸ رجب ۲۱۸ھ ہجری کو وفات پائی تو بوران کو شدید صدمہ پہنچا اور اس نے قصرِ مامون میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اس نے تقریباً اسّی برس کی عمر میں ۲۷۱ھ میں بمقام بغداد انتقال کیا، اور جامع السلطان کے قبہ کے سامنے دفن ہوئی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بورانی اسی ملکہ کی ایجاد اور یادگار ہے۔ (واللہ اعلم) (المامون۔ مشاہیر نسواں)

بی بی اُمّ الفضل عباسیہ

ساتویں عباسی خلیفہ مامون الرشید کی صاحبزادی تھیں۔ وہ اپنے زمانے کے تمام مروجہ علوم میں یکتائے روزگار تھیں۔ ان کا نکاح امام محمّد تقی ؑ سے ہوا اور ان کے بطن سے حضرت محمّد نقی ؑ پیدا ہوئے۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی فضل

دسویں عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ (۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) کے عہد میں یگانۂ روزگار شاعرہ ہوئی ہے۔ پہلے خلیفہ کی کنیز تھی۔ اس نے آزاد کردیا تو اس نے شادی کرلی اور بغداد ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس کا شمار اپنے دور کی چوٹی کی شاعرات میں ہوتا ہے۔

(مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب)

چوتھی صدی ہجری

۱۔ بی بی میمونہؒ (عالمہ، عارفہ، واعظہ)

۲۔ بی بی اَمۃ الواحدؒ (عالمہ)

۳۔ بی بی صفیہ (عالمہ، شاعرہ، ادیبہ)

۴۔ بی بی موزونہ (شاعرہ، ادیبہ)

۵۔ بی بی حمدہؒ (عالمہ، محدثہ، واعظہ)

۶۔ شہزادی جمیلہ (کریم النفس، فیاض)

۷۔ بی بی قدقؒ (عالمہ خطیبہ)

۸۔ ملکہ صبیحہ (مخیّر، دانشمند، باکمال)

۹۔ بی بی عابدہ، بنت احمد بن محمد (عالمہ، خطاطہ)

۱۰۔ بی بی عابدہؒ بنت احمد بن قاسم (عالمہ، عارفہ، شاعرہ)

۱۱۔ بی بی مریم اَندلسیہ (عالمہ، معلّمہ، شاعرہ)

۱۲۔ ملکہ سیدہؒ (دانشمند، مخیّر، مدبرہ)

۱۳۔ بی بی ام عیسیٰؒ (عالمہ، فقیہہ)

۱۴۔ بی بی نجم السعید رضیہ (شاعرہ، ادیبہ)

۱۵۔ بی بی بریکؒ (عارفہ)

۱۶۔ بی بی فاطمہ بنت زکاریہ الزالبیری (عالمہ، انشاء پرداز)

۱۷۔ رابعہ بنت کعب قزداریہ (شاعرہ)

۱۸۔ بی بی ستارہ (عالمہ، فاضلہ)

۱۹۔ بی بی عائشہؒ بنت احمدؒ (ادیبہ، شاعرہ، خطاطہ)

۲۰۔ بی بی عائشہؒ شامیہ (عالمہ)

۲۱۔ بی بی منفوسہؒ (عارفہ)

بی بی میمونہؒ

بی بی میمونہؒ چوتھی صدی ہجری کی یگانۂ روزگار عالمات وعارفات میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کے مواعظ کی اثر انگیزی سے سخت سے سخت دل موم ہوجاتے تھے۔ انہوں نے اوائل عمر ہی میں قرآن حفظ کرلیا تھا اور نہ صرف علوم ظاہری میں رتبۂ تبحر رکھتی تھیں بلکہ رموز معرفت سے بھی باخبر تھیں۔ ایک دن اثنائے وعظ میں انہوں نے بیان کیا کہ جو لباس حلال کا ہو اور اس کا پہننے والا گناہوں سے اجتناب کرے وہ جلدی نہیں پھٹتا (بہت دیرپا ہوتا ہے) پھر فرمایا، یہ پیرہن جو میرے جسم پہ ہے وہ میری والدہ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے، اسے میں ۴۷ برس سے پہن رہی ہوں ابھی تک یہ بالکل صحیح وسالم ہے۔

بی بی میمونہؒ کی بہت سی کرامات لوگوں میں مشہور تھیں۔ ان کی سب سے بڑی کرامت ان کا فضل وکمال اور حسن خطابت تھی۔ ان کے مواعظ کی تاثیر سے ہزاروں گم گشتگان راہ کو ہدایت نصیب ہوئی ——— بی بی میمونہؒ نے ۳۹۵ھ ہجری میں وفات پائی۔ (خزینۃ الاصفیاء)

بی بی اَمَۃُ الواحدؒ

چوتھی صدی ہجری کی یگانۂ روزگار عالمات میں شمار ہوتی ہیں۔ اصل نام ستیہ تھا اور والد کا نام حسین بن اسمٰعیل تھا۔ علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ اور علم فرائض میں درجۂ تبحر رکھتی تھیں۔ اپنے فضل وکمال کی بناء پر خواص وعوام میں "امامہ" کے معزز لقب سے مشہور ہوگئی تھیں۔ رمضان ۳۷۷ھ ہجری میں نوّے برس کی عمر میں وفات پائی۔ (خزینۃ الاصفیاء)

بی بی صفیہ

اَندلُس کے فرمانروا عبدالرحمٰن ثالث (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ) کے عہد میں ایک نامور خاتون گزری ہے۔ وہ عبداللہ رازی کی بیٹی تھی اور علوم مروجہ میں تبحر رکھنے کے علاوہ اعلیٰ درجے کی خطاط (خوشنویس) تھی۔ شعر و سخن میں بھی اس کو درجۂ کمال حاصل تھا۔ اس کے اشعار بہت سلیس لیکن نہایت عالمانہ ہوتے تھے۔ خلیفہ عبدالرحمٰن اس کے اشعار کا مداح تھا۔ (تاریخ اسپین کا نڈے)

بی بی مُوزنہ

یہ بھی خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث فرمانروائے اَندلُس کے عہد میں گزری ہے۔ یہ خلیفہ کے حرم میں کنیز تھی۔ نہایت خوش الحان اور جادو بیان شاعرہ تھی۔ خلیفہ اکثر اس کے اشعار اس کی اپنی زبان سے سنتا اور محظوظ ہوتا تھا۔ ایک نغز گو شاعرہ ہونے کے علاوہ مُوزنہ ادب انشا میں بھی زبردست دسترس رکھتی تھی۔ اس کی تحریریں انشاء پردازی کا شاہکار ہوتی تھیں چنانچہ خلیفہ نے اس کو اپنا ذاتی معتمد (سیکرٹری) بنا لیا تھا۔ (تاریخ اسپین کا نڈے)

بی بی حمدہؒ

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ایک زبردست واعظہ ہوئی ہیں۔ باپ کا نام واثق تھا۔ بغداد کی رہنے والی تھی۔ انہوں نے شیخ احمد بن علی بن بدران الحلوانیؒ سے علمِ حدیث حاصل کیا تھا۔ بی بی حمدہؒ نے بغداد کے باب المراتب میں اپنی درسگاہ قائم کی تھی وہاں وہ مجلس وعظ بھی منعقد کیا کرتی تھیں اور لوگوں کو حدیث و فقہ کا درس بھی دیا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور کے ایک نامور عالمِ دین اور خطیب ابنِ سمعانیؒ نے فنِ خطابت اور علمِ حدیث دونوں بی بی حمدہؒ سے سیکھے تھے۔

(تذکرۃ الخواتین)

شہزادی جمیلہ

موصل اور حلب وغیرہ کے حمدانی حکمران شاہ ناصر الدولہ ابو محمد الحسن (سنہ ۳۱۷ھ تا سنہ ۳۵۸ھ) کی بیٹی تھی۔ یہ خاتون بڑی کریم النفس اور فیاض تھی۔ سنہ ۳۶۶ھ میں حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ گئی تو تمام حاجیوں کو شربت پلایا، پانچ سو اونٹ پیادہ حاجیوں کو عطا کیے، ۳۰۰ غلام اور دو سو لونڈیاں آزاد کیں اور دس ہزار دینار خاص بیت اللہ میں تقسیم کیے۔ غرض اس نے ایسی ایسی سخاوتیں کیں کہ لوگوں کو ملکہ زبیدہ کا زمانہ یاد آگیا۔ اس کے بعد بھی یہ شہزادی جس سال حج کو جاتی تھی اس سال کو لوگ "عام الجمیلہ" کہتے تھے وہ ہر سال پہلے سے زیادہ سخاوت کرتی تھی۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی قدفہ

والد کا نام غفار بن نصیر تمیمی تھا خلیفہ حکم ثانی (المستنصر) کے عہد (۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ) میں اندلس کی ایک نامور فاضلہ ہوئی ہے۔ مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے ادبیات اور مختلف علوم وفنون کی بیش بہا کتابوں کا ایک ذخیرہ اپنے لیے جمع کیا تھا ——— وہ نہایت خوش بیان اور خوش الحان تھی۔ اپنی فصیح وبلیغ تقریر سے سامعین کو مسحور کر دیتی تھی۔

(کانڈے)

ملکہ صبیحہ

اَندَلُس (ہسپانیہ) کے اُموی خلیفہ الحکم ثانی (بن عبدالرّحمٰن ثالث) کی ملکہ تھی۔ الحکم ثانی نے سن ۳۵۰ ھ سے ۳۶۶ ھ تک حکومت کی۔ اس کی ملکہ (صبیحہ) نہایت دانشمند، مخیّر اور باکمال خاتون تھی۔ الحکم اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ متواتر دس سال تک اس نے سلطنت کا کوئی بڑا یا چھوٹا کام ملکہ صبیحہ کے مشورے کے بغیر نہیں کیا۔ ملکہ صبیحہ کو مردم شناسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس نے محمد بن عبداللہ کو اپنا معتمد (سیکرٹری) بنایا تھا، جو علم وفضل، حلم و وقار اور تدبیر و سیاست میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ ملکہ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اہلِ حاجت کی بھی دل کھول کر مدد کرتی تھی۔

۳۶۶ ھ میں الحکم ثانی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہشام ثانی (المؤیّد) تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اس نے اپنی ماں کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا اور امورِ سلطنت میں اس سے مشورے لیتا رہا۔ ۳۶۷ ھ میں ایک عظیم الشان نہر مکمل ہوئی جس کی کھدائی کئی سال پہلے ملکہ کے حکم سے شروع کی گئی تھی۔ ۳۷۱ ھ میں ملکہ نے ایک عالیشان مسجد شہر قرطبہ میں تعمیر کرائی۔

ملکہ صبیحہ نے اپنے فرزند ہی کے عہدِ حکومت میں ۳۹۴ ہجری میں وفات پائی۔

(تاریخ اسپین کا نڈے)

بی بی عایذہ بنتِ احمد بن محمدؒ

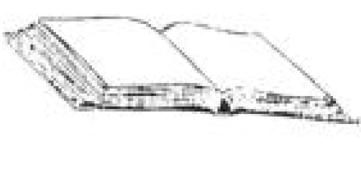
قرطبہ (اسپین۔ اندلس) کے عامل احمد بن محمدؒ کی صاحبزادی تھیں جملہ علوم و فنون اور حسنِ اخلاق میں شہرۂ آفاق تھیں۔ فنِ کتابت (خوشنویسی) میں ایسا کمال پیدا کیا کہ اُس دور میں کسی کو ان کی ہمسری کا یارا نہ تھا۔ انہوں نے اندلس کے علم دوست خلیفہ الحکم (المتوفی ۳۶۶ھ) کے لیے بے شمار کتابیں نقل کی تھیں۔ ابنِ حیان کا بیان ہے کہ عایذہ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت میں سارے اندلس میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔ وہ بہت اونچے درجے کی شاعرہ بھی تھیں۔

(کانڈے)

بی بی عایذہ بنتِ احمد بن قاسمؒ

یہ خاتون بھی چوتھی صدی ہجری میں شہر قرطبہ میں ہوئی ہیں۔ علم و فضل کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھیں اور زہد و ریاضت میں دوسری رابعہ بصریؒ تھیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتی تھیں ان کا کلام اتنا پاکیزہ اور دلآویز ہوتا تھا کہ خلیفۂ وقت عبدالرحمٰن (المتوفی ۳۵۰ھ) اکثر ان کے اشعار سن کر بے خود ہو جاتا تھا اور بے اختیار اس کی زبان پر کلماتِ تحسین جاری ہو جاتے تھے۔

(کانڈے)



بی بی مریم اَندلُسیہ

ان کا شمار چوتھی صدی ہجری کی یگانۂ روزگار عالمات میں ہوتا ہے۔ والد کا نام ابو یعقوب انصاری تھا۔ اَندُلُس (ہسپانیہ) کے شہر شلب کی رہنے والی تھیں مگر وہاں کی سکونت ترک کر کے اشبیلیہ میں مستقل اقامت کر لی تھی۔ جملہ علوم دینی و دُنیوی میں درجۂ تبحر رکھتی تھیں۔ انہوں نے اشبیلیہ میں ایک درسگاہ قائم کی تھی جس میں علم کا شوق رکھنے والی خواتین دور دور سے آکر ان سے تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اشبیلیہ کے بڑے اونچے اونچے خاندانوں کی لڑکیاں بی بی مریم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ وہ ان کو بڑی محنت اور توجہ سے دینی علوم کے علاوہ معانی، بیان، بدیع، شعر اور ادب کی تعلیم بھی دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ جو خواتین ان کی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتی تھیں اکثر بڑے اعلیٰ اور معزز خاندانوں میں ان کے رشتے ہو جاتے تھے۔

بی بی مریمؒ نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی اس لیے لوگ ان کو حاجہ بھی کہتے تھے۔ بی بی مریمؒ نہ صرف ایک اونچے درجے کی عالمہ تھیں بلکہ ایک سچی مومنہ بھی تھیں اور بڑی سختی سے احکامِ شریعت کی پابندی کرتی تھیں۔ اسی لیے سارے ملک میں ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ وہ شعر و سخن کا بھی نہایت عمدہ ذوق رکھتی تھیں۔ علامہ مقری نے "نفح الطیب" میں ان کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعرہ تھیں۔

بی بی مریم نے طویل عمر پا کر پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں انتقال کیا۔

(مشاہیر نسواں)

ملکہ سیّدہ

رے، ہمدان اور اصفہان کے دَیلمی (بُویہی) فرمانروا فخرالدولہ ابوالحسن علی (۳۶۶ھ تا ۳۸۷ھ) کی بیگم تھی۔ ۳۸۷ھ میں فخرالدولہ نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا اور جانشین مجدالدولہ ابوطالب رستم نابالغ تھا۔ چنانچہ حکومت کی باگ ڈور ملکہ سیّدہ نے سنبھال لی۔ وہ نہایت دانشمند قابل اور مدبّر خاتون تھی۔ اس نے حکومت کا کاروبار ایسی خوش اسلوبی سے چلایا کہ رعایا خوشحال ہوگئی لیکن جب مجدالدولہ نے بالغ ہونے کے بعد عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے اپنی والدہ کی ہدایتوں پر چلنا چھوڑ دیا اور ایک نالائق شخص ابوعلی کو وزیر بنا کر اس کے غلط مشوروں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ملکی نظم و نسق ابتر ہوگیا اور لوگوں میں بے چینی پھیل گئی۔ ملکہ سیّدہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ لارستان پہنچی اور وہاں کے حاکم حسین بن بدر سے مدد چاہی۔ حسین نے ایک فوجِ گراں کے ساتھ دارالحکومت شیراز پر چڑھائی کی اور مجدالدولہ کو شکست دے کر اسے اور اس کے وزیر ابوعلی دونوں کو قید خانے میں ڈال دیا اور حکومت سیّدہ کے حوالے کر دی۔ جب وہ تاج و تخت کی مالک ہوئی تو حسین بن بدر کو اس قدر انعام و اکرام دیا کہ وہ خوش ہوگیا۔ پھر وہ رفاہِ عامہ کی طرف متوجہ ہوئی اور ایسے ایسے کام کیے کہ لوگ آسودہ حال ہوگئے اور ہر طرف امن چین کا دَور دَورہ ہوگیا۔ یہ قابل ملکہ اپنے وزراء اور حکام پر کڑی نگرانی رکھتی اور ان سے باقاعدہ مراسلت رکھتی۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر غیر ممالک کے سفیروں سے گفتگو کرتی اور کسی سے مشورہ کیے بغیر ان کے سوالوں کے نہایت معقول جواب دیتی۔ ایک دفعہ سلطان محمود غزنوی (۳۸۹ھ تا ۴۲۱ھ) نے اس کو

پیغام بھیجا کہ اپنی مملکت میں میرے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کرو ورنہ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ملکہ سیدہ نے اس کے جواب میں سلطان محمود کو لکھا:۔

"اگر سلطان مجھ سے لڑنے آتا ہے تو بسم اللہ وہ مجھے میدانِ جنگ سے روگرداں ہوتے نہ دیکھے گا۔ جنگ کا نتیجہ ہمیشہ فتح یا شکست کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر مجھے فتح ہوئی تو اطراف واکناف میں مشہور کروں گی اور اس پر فخر کروں گی کہ محمود جیسے نامور فرمانروا کو میں نے شکست دی۔ اور سلطان کی بدنامی ہوگی کہ ایک عورت نے اس کو پسپا کیا اور اگر مجھے شکست ہوئی تو ایک عورت کو شکست دے کر سلطان کو نہ ناموری حاصل ہوگی اور نہ اس کے لیے کوئی قابلِ فخر کارنامہ ہوگا۔"

سلطان محمودؒ کے پاس یہ خط پہنچا تو اس نے لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا اور جب تک سیدہ زندہ رہی اس نے اس کے ملک کا قصد نہ کیا۔

چندسال حکومت کرنے کے بعد سیدہ کی محبتِ مادری جوش میں آئی اور اس نے مجدالدولہ کو آزاد کر کے تخت پر بٹھا دیا۔ اب وہ اپنی والدہ کی نصیحتوں پر چلتا رہا اور ملک بھی آباد اور خوشحال رہا لیکن جب ۴۲۰ھ ہجری میں سیدہ نے وفات پائی اور مجدالدولہ نے حسبِ سابق من مانی کرنی چاہی تو سلطان محمود غزنوی نے فوراً اس پر یلغار کر دی اور ملک پر قبضہ کر لیا۔ مجدالدولہ کو وہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ خراسان لے گیا۔ (مشاہیر نسواں بحوالہ خلاصۃ الاخبار و حدیقۃ الاقلیم)

بی بی اُمِ عیسیٰؒ

مشہور عالِم ابراہیم بن اسحاق حربیؒ کی صاحبزادی تھیں۔ علمِ فقہ کی بڑی مستند عالمہ ہوئی ہیں۔ لوگ مختلف مسائلِ فقہ میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور شافی جوابات پاتے تھے۔ انہوں نے ۳۲۸ھ ہجری میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی نجم السّعید رضیہ

اندلس کے خلیفہ حکم ثانی (سنہ ۳۵۰ھ تا سنہ ۳۶۶ھ) کی اہلیہ تھی شعر و سخن اور زبانُ ادب میں یگانۂ دہر تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد اس نے بہت سے مشرقی ممالک کا سفر کیا اور ہر جگہ کے علماء نے اس کی بڑی قدر کی۔ (تمدنِ عرب)

بی بی بیبک ؒ

تیسری / چوتھی صدی ہجری میں شہر مرو میں ایک مشہور عارفہ ہوئی ہیں۔ شیخ ابو سعید ابو الخیرؒ (متوفی سنہ ۴۴۰ھ) فرماتے ہیں کہ شہر مرو میں ایک ضعیفہ ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی:

"اے ابو سعید میری ایک فریاد ہے۔"

میں نے کہا: — "بیان کر"

اس نے کہا: — "لوگ تو دعا کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ دیر اپنے آپ سے بیگانہ کر دے لیکن میں تین برس سے یہ دعا کر رہی ہوں کہ الٰہی ایک پل بھر کے لیے مجھے ہوش عطا کر تاکہ دیکھوں کہ میں کون ہوں، آیا کچھ خودی رکھتی ہوں یا نہیں مگر ابھی تک یہ کیفیت میسر نہیں ہوئی۔"

یہ خاتون بی بی بیبک تھیں۔ سالِ وفات معلوم نہیں۔

(نفحات الانس)

بی بی فاطمہؒ بنتِ زکاریۃ الزابلیری

اُندلس کے اُموی خلیفہ الحکَم ثانی (المتوفی ۳۶۶ھ) کے حرم میں ایک جاریہ خاتون تھی جس کا نام فاطمہ تھا ـــــ اس کے باپ کا نام زکاریۃ الزابلیری تھا جو ایوانِ خلافت کا عہدیدار تھا۔

فاطمہ اکثر القصر (واقع لبُنہ) میں رہتی تھی۔ وہ بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھی۔ صَرف، نحو، ادب، حساب اور دیگر علوم مروجہ میں اس کو درجۂ متبحر حاصل تھا۔ الحکَم کو وہ اس وجہ سے سب خواتینِ حَرم سے بڑھ کر عزیز تھی کہ انشاء پردازی میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اکثر الحکَم کی طرف سے خطوط اور فرامین لکھتی، جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے نثرِ اعلیٰ کا نمونہ ہوتے تھے۔ ابنِ حیانؒ، کا بیان ہے کہ اَندلُس میں نہ کوئی دوسری عورت فاطمہؒ سے بہتر انشاء پرداز تھی اور نہ کوئی مرد اس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتا تھا۔ اس کے پاس علمی اور صنعتی کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ تھا۔

(تاریخ اسپین کا مڈے)

رالعہ بنتِ کعب قزداریہ

چوتھی صدی ہجری کے ہندوستان میں کرمان و مکران سے متصل طوران (توران) ایک مستقل ریاست تھی۔ یہ علاقہ حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ امارت و خلافت میں فتح ہوچکا تھا۔ ۳۴۰ھ سے ۲۷۰ھ تک طوران پر مختلف افراد حکومت کرتے رہے (یہ موروثی یا خاندانی حکمران نہیں تھے) ان حکمرانوں

کو متغلب حکمران کہا جاتا ہے۔ اس زمانے کو طوائف الملوکی کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا خاتمہ ۴۱۶ھ میں غزنویوں نے کیا۔

حکومتِ طوران کا دارالحکومت قزدار (قصدار) تھا۔ متغلبین کے دورِ حکومت میں رالعہ بنتِ کعب قزداریہ نامور شاعرہ ہوئی ہے۔ اس کو عربی اور فارسی پر زبردست عبور حاصل تھا اور وہ ان دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی۔ یہ خاتون چوتھی صدی ہجری میں گزری ہے، اور اس صدی کے شہرۂ آفاق عرب سیاح اور جغرافیہ دان ابنِ حوقل نے اپنے سیاحت نامہ "المسالک و الممالک" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

("ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" از قاضی اطہر مبارکپوری
و تاریخِ سندھ وغیرہ)

بی بی ستارہؒ

شیخ الرئیس بو علی سینا[1] کی والدہ تھیں۔ وطنِ مالوف بخارا تھا۔ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے لختِ جگر کو مکتب روانہ کرنے سے پہلے خود ضروری علوم و فنون کی تعلیم دی اور قرآنِ کریم حفظ کرایا۔ اس

---

[1] الشیخ الرئیس بو علی سینا یا ابنِ سینا تاریخِ عالم کی قدآور شخصیت ہیں۔ بخارا کے قریب ایک گاؤں افشنہ میں ۳۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بن سینا تھا۔ غیر معمولی ذہانت کی بدولت دس سال کی عمر میں حفظِ قرآن کے علاوہ مبادی علم و ادب سے واقف ہو گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے فقہ، منطق، ریاضی، ہیئت، فلسفہ، اقلیدس، طبیعیات، طب اور مابعد الطبیعیات وغیرہ تمام علوم میں کامل

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوعلی سینا نے آئندہ کے تعلیمی مراحل بکمال سرعت نہایت آسانی سے طے کرلیے۔ بی بی ستارہؒ کا شمار چوتھی صدی ہجری کی باکمال خواتین میں ہوتا ہے۔ (مشاہیرِ نسواں وغیرہ)

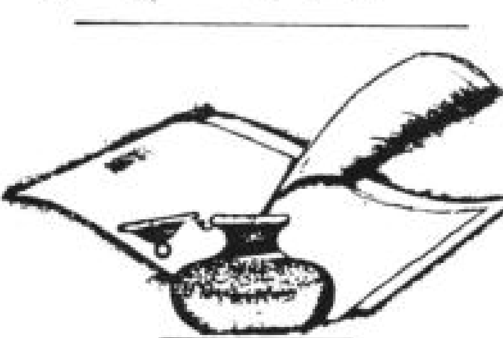
(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

مہارت حاصل کرلی۔ انہوں نے مختلف علوم و فنون پر کثیر التعداد کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کتاب الشفا (جو فلسفہ کی انسائیکلو پیڈیا ہے) اور "القانون فی الطب" نے (جو طب کی معرکہ آرا کتاب ہے) خاص شہرت حاصل کی۔ ان کی متعدد کتابوں کا ترجمہ مغربی زبانوں میں بھی ہوچکا ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

کتاب النجات، کتاب السیاست، تہافۃ التہافۃ، ابنِ رُشد و فلسفہ، بحث عن القوۃ النفسانیہ، تسع رسائل فی الحکمۃ والمنطق۔ منطق المشرقیین والقصیدۃ المزدوجہ فی المنطق۔

بوعلی سینا اپنی زندگی میں اس دَور کے کئی حکمرانوں سے وابستہ رہے۔ وہ سب ان کے قدر دان تھے۔ اب بھی مشرق و مغرب میں ہر جگہ ان کو ایک نہایت ممتاز طبیب، عالم اور فلاسفر کی حیثیت سے بہت بلند مقام حاصل ہے اور ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ مستشرقین ان کو AVICENNA کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بوعلی سینا نے ۴۲۸ھ ہجری میں ہمدان کے مقام پر وفات پائی۔



بی بی عائشہ بنتِ احمدؒ

چوتھی صدی ہجری میں نہایت باکمال خاتون گزری ہیں۔ قرطبہ (اندلس) کی رہنے والی تھیں۔ مؤرخ ابنِ حیانؒ کا بیان ہے کہ اندلس کی خواتین میں کوئی شریف عورت علم و فہم اور شعر و ادب میں اس باکمال خاتون (عائشہ بنتِ احمدؒ) کے پایہ کی نہ تھی۔ اندلس کے حکمران ان کے مرتبۂ علمی کی بے حد قدر کرتے تھے اور اکثر ان کو انعام و اکرام سے نوازتے رہتے تھے۔ جملہ علوم میں کمال رکھنے کے علاوہ ان کو فنِ کتابت (خوشنویسی) میں عجیب ملکہ حاصل تھا۔ ان کا سوادِ خط اتنا خوب صورت تھا کہ جو دیکھتا تھا دنگ رہ جاتا تھا۔ انہوں نے بے شمار علمی کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھیں اور علمائے اندلس نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتی تھیں اور اپنے دور کے نہایت بلند پایہ شعراء میں شمار کی جاتی تھیں۔

کتاب المغرب کا مصنف لکھتا ہے کہ "ابو عبداللہ طبیب عائشہ کا چچا تھا۔ وہ اندلس کا چوٹی کا شاعر تھا لیکن ہم اگر یہ کہیں کہ عائشہ ابو عبداللہ سے زیادہ باکمال شاعرہ تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔"

ایک دفعہ عائشہ مظفر بن منصور بن ابی عامر[1] کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور

---

[1] منصور بن ابی عامر ہشام ثانی فرمانروائے اندلس (۳۶۶ھ تا ۳۹۹ھ) کا وزیر تھا۔ وہ بڑا ہوشیار اور باصلاحیت آدمی تھا۔ کہنے کو تو وزیر تھا لیکن حکومت کے تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے عیسائی دشمنوں کو بہت سی لڑائیوں میں شکست دی اس لیے المنصور کے لقب سے مشہور ہوا۔ مظفر اسی کا فرزند تھا۔

فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے :

اراك الله فيه ما تريد	جو ارادہ تو رکھتی ہے خدا تجھے ویسا ہی
ولا برحت معاليه تزيد	اس کو دکھائے اور اس کے رتبے ہمیشہ بڑھتے
فقد دلت مخايله على ما	رہیں —— اس کا بشرہ تجھے اس چیز کی
تؤمله و طالعه السعيد	امید دلا رہا ہے جو تو ارادہ رکھتی ہے
تشوقت الجياد له و هزله	ہواؤں نے اس کی طرف شوق کیا اور اس کے لیے
حسام هوى واشرقت البنود	محبت کی تلوار متحرک ہوئی اور علم بلند ہوئے
وكيف يخيب مثيل قد نمته	کس طرح وہ شیر بچہ ناکام رہے گا
الى العليا ضواغمة اسود	جو شیرانِ اسود کی اولاد سے ہے
فسوف تراه بدرًا فى سماء	تو اس کو چودھویں رات کے چاند کی مانند
من العليا كواكبه الجنود	دیکھے گا آسمانِ بلند میں اور اس کا لشکر تارے ہیں۔
فانتم ال عامر خير ال	پس اے آلِ عامر تم سب سے زیادہ شریف اولاد
زكا الابناء منكم والجدود	ہو۔ تمہارے باپ اور بیٹے سب ذہین ہیں۔
وليدكم لدى راى كشيخ	تمہارے بچے رائے زنی کے وقت بڈھے
وشيخكم لدى حرب وليد	اور تمہارے بڈھے شمشیر زنی کے وقت بچے ہیں۔

بی بی عائشہؒ کا سالِ وفات کسی مؤرخ نے بیان نہیں کیا۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی عائشہ شامیہؒ

یوسف دمشقی کی صاحبزادی تھیں۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں نامور عالمہ گزری ہیں۔ انہوں نے تمام علوم مروجہ مولانا عبداللہ ہرویؒ سے حاصل کیے۔ کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان میں سے "الاشارات الخفیہ فی منازل العلمیہ" بہت مشہور ہے۔ یہ کتاب "منازل السائرین" کا اختصار ہے۔

(مشاہیر نسواں)

بی بی منفوسہؒ

شاہِ فارس و عراق ابو الفوارس زید (المتوفی ۳۷۲ھ ہجری) کی صاحبزادی تھیں۔ صاحبِ طبقاتِ شعرانیؒ نے ان کو طبقۂ اولیاء میں شمار کیا ہے۔ بے حد عبادت گزار تھیں اور ہر وقت یادِ الٰہی میں مستغرق رہتی تھیں۔ شیوۂ تسلیم و رضا ان کی زندگی کا نہایت روشن پہلو تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد کی نعمت سے بارہا نوازا لیکن ان کے صبر کا امتحان یوں لیا کہ کسی بچے کو طویل زندگی عطا نہ کی۔ ان کے سب بچے چھوٹی عمر ہی میں فوت ہو جاتے تھے۔ جب کوئی بچہ فوت ہوتا تو وہ اس کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھ جاتیں اور کہتیں :-

"خدا کی قسم تیرا آگے جانا میرے نزدیک بہتر ہے اس سے کہ تو میرے پیچھے جاتا اور میرا صبر بہتر ہے اس سے کہ میں تجھ پر نوحہ کروں۔ اگر تیری جدائی حسرت ناک ہے تو یقیناً اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتر ہے۔

پھر جوش میں آکر عمرو بن معدی کرب کا یہ شعر پڑھتیں :

و انا القوم لا نغنیض دموعنا

علی ھالك منا و ان قصم الظھر

(ہم ایسے لوگ ہیں کہ اپنے مُردوں پر نہیں روتے اگرچہ صدمے سے کمر ٹوٹ جاتی ہے)

اس کے بعد نہایت صبر سے بچے کی تجہیز و تکفین کرتیں پھر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتیں۔

سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔

(طبقاتِ شعرانی، عارفاتِ سلطانی)

پانچویں صدی ہجری

۱۔ سیدہ فاطمہ ام الخیر (عابدہ، زاہدہ، عارفہ)
۲۔ بی بی امّ محمدؒ (عارفہ)
۳۔ سیدہ خدیجہ جیلانیؒ (عالمہ، عارفہ، واعظہ)
۴۔ بی بی عروضیہؒ (عالمہ)
۵۔ امِّ زین الدینؒ (عالمہ، عابدہ)
۶۔ بی بی عائشہ آندلسیہؒ (محدثہ)
۷۔ بی بی اُمّ البلاء (عالمہ، مدبرہ)
۸۔ بی بی ست الملک (عالمہ، مدبرہ)
۹۔ ملکہ ترکان خاتون (دانشمند، مدبرہ)
۱۰۔ بی بی امۃ العزیزؒ (عالمہ، شاعرہ)
۱۱۔ بی بی صفیہ بنتِ نظام الملک (عالمہ فاضلہ)
۱۲۔ بی بی اُمّ الخیرؒ حجازیہ (عالمہ فاضلہ)
۱۳۔ بی بی فاطمہ بنتِ الاُقرع (خطاطہ)
۱۴۔ بی بی کریمہ بنتِ احمد مروزیؒ (عالمہ، محدثہ)
۱۵۔ بی بی زلیخا بنتِ علی (عالمہ)
۱۶۔ بی بی زہون (عالمہ، شاعرہ)
۱۷۔ بی بی اسماء (عالمہ، مدبرہ، مخیّرہ)
۱۸۔ بی بی سیّدہ (دانشمند، مدبرہ، مخیّرہ)
۱۹۔ بی بی اعتماد رامقیہؒ (عالمہ، ادیبہ)

سیّدہ فاطمہ اُمّ الخیر

پیرانِ پیر سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی[1] رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ تھیں۔ نہایت پاکباز، عابدہ زاہدہ اور خدا رسیدہ خاتون تھیں۔ ان کی شادی سیّد ابو صالح جنگی دوست رحؒ سے ہوئی تھی، وہ بھی بڑے متّقی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کا عقدِ نکاح سیّدہ فاطمہ رحؒ سے جن حالات میں ہوا ان کو پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ روایت ہے کہ عنفوانِ شباب میں سید ابو صالح اکثر ریاضات و مجاہدات میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دفعہ دریا کے کنارے عبادت کر رہے تھے۔ کھانا کھائے ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ اچانک ایک سیب دریا میں بہتا ہوا دکھائی دیا۔ بسم اللہ کہہ کر اسے پکڑ لیا اور کھا گئے۔ پھر دل میں خیال پیدا ہوا کہ معلوم نہیں اس سیب کا مالک کون ہے۔ میں نے بغیر اجازت کھا کر امانت میں خیانت کی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے

---

[1] پیرانِ پیر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ اسلام کی نہایت برگزیدہ ہستی ہیں۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اہلِ سُنّت کے سبھی مکاتبِ فکر ان کا نام نہایت عزت و احترام سے لیتے ہیں اور ان میں سے کچھ ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے باقاعدگی سے مختلف تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں یہ قادریہ سلسلۂ تصوف کے بانی ہیں۔ ۴۷۰ھ یا ۴۷۱ھ میں جیلان (گیلان) میں پیدا ہوئے۔ کمسنی ہی میں یتیم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے میں حاصل کی۔ والدہ ماجدہ اور نانا سید عبداللہ صومعی رحؒ نے ان کی تربیت پر خاص توجہ دی۔ ۱۸ سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے بغداد گئے۔ سالہا سال تک تحصیلِ علم میں مشغول رہے، اس دوران میں ابوالخیر شیخ حماد بن مسلم الدباس رحؒ سے علمِ طریقت بھی حاصل کیا۔ پھر پچیس سال تک

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور دریا کے کنارے کنارے پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت سیب کے مالک کی تلاش میں چل پڑے۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کو لبِ دریا ایک وسیع

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

مجاہدات و ریاضات میں مشغول رہے۔ اس کے بعد شیخ ابوسعید مبارک مخزمیؒ کی بیعت کی اور ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ۵۲۱ھ میں بغداد میں وعظ و تبلیغ کا آغاز فرمایا اور اس قدر شہرت پائی کہ ان کے لیے ایک خانقاہ تیار کی گئی اور شیخ ابوسعید مبارک مخزمیؒ کی قائم کی ہوئی درسگاہ کو وسیع کر کے انہیں اس کا شیخ الجامعہ مقرر کیا گیا۔ ان کے وعظ و ارشاد سے ہزاروں یہودی اور عیسائی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور لاکھوں فُسّاق و فجّار نے توبہ کی۔ فرمانروایانِ وقت اور وزراء تک ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ دُور دُور سے ان کے پاس فتاویٰ آتے تھے اور وہ ان کا جواب دیتے تھے۔ چند ہی سالوں کے اندر اندر تمام دنیائے اسلام میں ان کے علم و فضل کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس کے علاوہ ان کو سرآمدِ روزگار ولی اللہ تسلیم کیا گیا۔ ان کی کرامات کی کثرت پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے۔

امام ابنِ تیمیہؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی کرامات حدِ تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔ امام نوویؒ کا قول ہے کہ "جس کثرت کے ساتھ معتبر اور ثقہ راویوں کی زبانی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات ہم تک پہنچی ہیں اور کسی ولی کی کرامات اس طرح نہیں پہنچیں۔" ان کی سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی جس کی وجہ سے عالمِ اسلام میں ایمان اور روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی۔ حضرت پیرانِ پیر نے ۵۶۱ھ میں وفات پائی۔ مرقد مبارک بغداد میں مرجعِ خواص و عوام ہے۔ انہوں نے ہزاروں مرید اور شاگرد اپنی یادگار چھوڑے۔ ان کے علاوہ دین اخلاق اور تصوف پر متعدد تصانیف بھی چھوڑیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:۔ غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب، الفتح الربانی والفیض الرحمانی، کبریتِ احمر، جلاء الخاطر فی الباطن والظاہر، مکتوبات۔

(غبطۃ الناظر ابن حجرؒ۔ نفحات الانس جامیؒ۔ اخبار الاخیار عبدالحق محدث دہلویؒ وغیرہ)

باغ نظر آیا۔ اس میں سیب کا ایک تناور درخت تھا جس کی شاخوں سے پکتے ہوئے سیب پانی میں گر رہے تھے۔ سید ابوصالح نے لوگوں سے اس باغ کے مالک کا پتا دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے مالک جیلان کے ایک رئیس سید عبداللہ صومعیؒ ہیں۔ فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سارا ماجرا بیان کیا اور بصد ادب بلا اجازت سیب کھا لینے کے لیے معافی چاہی۔

سید عبداللہ صومعیؒ خاصانِ خدا میں سے تھے، وہ سمجھ گئے کہ یہ نوجوان اللہ کا خاص بندہ ہے۔ دل میں تڑپ اٹھی کہ اس کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لوں۔ فرمایا، دس سال تک اس باغ کی رکھوالی کرو اور مجاہدۂ نفس کرو پھر سیب معاف کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔ سید ابوصالحؒ نے یہ شرط منظور کر لی اور دس سال تک باغ کی رکھوالی کرتے رہے۔ ساتھ ہی سید عبداللہ صومعیؒ کی ہدایات کے مطابق مدارجِ سلوک بھی طے کرتے رہے۔ دس سال کے بعد سید عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ دو سال اور باغ کی رکھوالی کرو۔ سید ابوصالحؒ نے تعمیلِ ارشاد کی۔ بارہ سال کی مدت پوری ہوتے ہی سید عبداللہ نے انہیں بلا کر فرمایا، اے فرزند تو آزمائش کی کسوٹی پر پورا اترا ہے لیکن ابھی ایک خدمت اور باقی ہے وہ یہ کہ میری ایک لڑکی ہے جو پاؤں سے لنگڑی، ہاتھوں سے لنجی، کانوں سے بہری اور آنکھوں سے اندھی ہے اس بیچاری کو اپنے نکاح میں قبول کرو تو میں سیب تمہیں بخش دوں گا۔ سید ابوصالحؒ نے یہ شرط بھی منظور کر لی اور سید عبداللہؒ نے اپنی لختِ جگر کا نکاح ان سے کر دیا۔ ان کی یہ لختِ جگر سیدہ فاطمہ تھیں۔ شادی کے بعد سید ابوصالحؒ نے سیدہ فاطمہؒ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے تمام اعضا صحیح وسالم ہیں اور وہ کمال درجہ کے حسنِ ظاہری سے متصف ہیں۔ دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید یہ کوئی اور لڑکی ہے اسی وقت باہر نکل گئے اور شیخ عبداللہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا یہی

لڑکی میری لختِ جگر اور تمہاری بیوی ہے۔ اس کی جو صفات میں نے تم سے بیان کی تھیں ان کا مطلب یہ تھا کہ اس نے آج تک کوئی کام شریعت کے خلاف نہیں کیا اس لیے لُنجی ہے، آج تک گھر سے باہر قدم نہیں نکالا اس لیے لنگڑی ہے، آج تک خلافِ حق کوئی بات نہیں سُنی اس لیے بہری ہے۔ آج تک کسی نامحرم پر نظر نہیں ڈالی اس لیے اندھی ہے۔

اب سیّد ابو صالحؒ سب کچھ سمجھ گئے اور ان کے دل میں اپنی اہلیہ کے لیے بے حد محبت اور عزت پیدا ہو گئی۔ اس طرح بخیر و خوبی ان دونوں پاکباز ہستیوں کی رفاقتِ حیات کا آغاز ہوا۔ انہوں نے جیلان (گیلان) ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہیں سیّدہ فاطمہؒ کے بطن سے باختلافِ روایت ۴۷۰ھ یا ۴۷۱ھ میں عالمِ اسلام کی وہ مایۂ ناز ہستی پیدا ہوئی جس کے مہتم بالشان تبلیغی اور اصلاحی کارناموں نے خزاں رسیدہ شجرِ ملت کو سرسبز کر دیا اور راہِ راست سے بھٹکے ہوئے لاکھوں انسانوں کو راہِ ہدایت پر گامزن کر دیا۔ ہماری مراد سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ہے۔

حضرت شیخ ابھی کم سن ہی تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ والدہ ماجدہ نے بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا اور اپنے چار پانچ سالہ فرزند کی تعلیم و تربیت اور نگرانی پر خاص توجہ دی۔ اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ سیّدنا شیخ عبدالقادرؒ ایک مثالی جوانِ صالح بنے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے مقامی مکتب میں حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے بغداد جانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے والدہ ماجدہ سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے باچشمِ پُرنم اپنے لختِ جگر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا، میرے نورِ بصر تیری جدائی تو ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی لیکن جس مبارک مقصد کے لیے تم بغداد جانا چاہتے ہو میں اس کے راستے میں حائل نہ ہوں گی۔ حصولِ علم ایک مقدس فریضہ ہے، میری دعا ہے کہ تم تمام علوم میں درجۂ کمال حاصل کر و میں تو

شاید اب جیتے جی تمہاری صورت نہ دیکھ سکوں گی مگر میری دعائیں ہر حال میں تمہارے ساتھ رہیں گی۔

پھر فرمایا، تمہارے والد مرحوم کے ترکہ میں سے اسّی دینار میرے پاس ہیں، چالیس دینار تمہارے بھائی کے لیے رکھتی ہوں اور چالیس زادِ راہ کے لیے تمہارے سپرد کرتی ہوں۔

پھر سیدہ فاطمہؒ نے یہ چالیس دینار سیّد عبدالقادرؒ کی بغل کے نیچے ان کی گدڑی میں سی دیئے۔ جب وہ گھر سے رخصت ہونے لگے تو ان سے فرمایا:

"میرے پیارے بچے! میری آخری نصیحت سن لو۔ اسے کبھی نہ بھولنا وہ یہ ہے کہ ہمیشہ سچ بولنا اور خواہ کچھ بھی ہو جائے جھوٹ کے نزدیک بھی نہ پھٹکنا۔"

سعادت مند فرزند نے بادیدۂ گریاں عرض کیا:۔

"اماں جان! میں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔"

سیدہ فاطمہؒ نے اپنے نورالعین کو گلے لگا لیا اور پھر ایک آہِ سرد کھینچ کر فرمایا:

"جاؤ تمہیں اللہ کے سپرد کیا وہی تمہارا حافظ و ناصر ہے۔"

والدہ ماجدہ سے رخصت ہو کر شیخ عبدالقادرؒ بغداد جانے والے ایک قافلے کے ساتھ ہو لیے۔ اس زمانے میں طویل بیابانی راستوں میں تنہا سفر کرنا ممکن نہ تھا۔ لوگ قافلے بنا کر سفر کرتے تھے اور اپنی حفاظت کا مقدور بھر اہتمام کرتے تھے پھر بھی رہزنوں کا خطرہ ہر وقت دامنگیر رہتا تھا۔ شیخ عبدالقادرؒ کا قافلہ جب ہمدان سے آگے ترتنک کے سنسان کوہستانی علاقے میں پہنچا تو ساٹھ قزاقوں کے ایک جتھے نے قافلے پر حملہ کر دیا اور اہلِ قافلہ کا سب مال و اسباب لوٹ لیا۔ شیخ عبدالقادرؒ ایک طرف کھڑے تھے کہ ایک ڈاکو نے ان سے پوچھا:

" اے لڑکے تمہارے پاس بھی کچھ ہے ؟ "

انہوں نے بلاخوف وہراس اطمینان سے جواب دیا ، ہاں میرے پاس چالیس دینار ہیں ۔ ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ڈاکو کو ان کی بات پر یقین نہ آیا اور وہ ان پر ایک نگاہِ استہزا ڈالتا ہوا چلا گیا ۔ پھر ایک دوسرے ڈاکو نے ان سے یہی سوال کیا ۔ انہوں نے اس کو بھی وہی جواب دیا ۔ یہ ڈاکو بھی ان کی بات کو ہنسی میں اڑا کر چلا گیا ۔ شدہ شدہ یہ بات ڈاکوؤں کے سردار احمد بدوی تک پہنچی ، اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ ۔ ڈاکوؤں نے سید صاحب کو پکڑ کر احمد بدوی کے سامنے پیش کیا تو اس نے ان سے پوچھا :

" لڑکے سچ سچ بتا تیرے پاس کیا ہے ؟ "

انہوں نے بے دھڑک جواب دیا : " میں پہلے بھی تیرے دو ساتھیوں کو بتا چکا ہوں کہ میرے پاس چالیس دینار ہیں ۔ "

سردار نے کہا ۔ " کہاں ہیں نکال کر دکھاؤ ۔ "

حضرت نے فرمایا ، میری بغل کے نیچے گدڑی میں سلے ہوئے ہیں ۔

سردار نے گدڑی کو ادھیڑ کر دیکھا تو اس میں سے واقعی چالیس دینار نکل آئے ۔ سردار اور اس کے ساتھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ سردار نے استعجاب کے عالم میں کہا :

" لڑکے تمہیں معلوم ہے کہ ہم ڈاکو ہیں لیکن پھر بھی تم نے دیناروں کا بھید ہم پر ظاہر کر دیا ۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ "

حضرت نے فرمایا ۔ " میری پاکباز والدہ نے گھر سے رخصت ہوتے وقت مجھے نصیحت کی تھی کہ ہمیشہ سچ بولنا ۔ بھلا ان چالیس دیناروں کی خاطر میں والدہ کی نصیحت کیسے فراموش کر دیتا ؟ "

یہ سُن کر سردار پر رقت طاری ہوگئی اور وہ روتے ہوئے بولا :

"آہ! اے بچے تم نے اپنی ماں سے کیے ہوئے عہد کا اتنا پاس رکھا۔ حیف ہے مجھ پر کہ اتنے سالوں سے اپنے خالق کا عہد توڑ رہا ہوں۔ اے بچے آج سے میں اس کام سے توبہ کرتا ہوں۔"

دوسرے ڈاکوؤں نے بھی اپنے سردار کا ساتھ دیا۔ لوٹا ہوا تمام مال قافلے والوں کو واپس کر دیا اور اس کے بعد نیکی اور پرہیزگاری کی زندگی اختیار کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ جس زمانے میں شیخ عبدالقادرؒ بغداد میں تحصیلِ علم میں مشغول تھے، ایک دفعہ سیدہ فاطمہؒ نے کسی کے ہاتھ ان کے لیے سونے کا ایک ٹکڑا بھیجا۔

سیدہ فاطمہؒ کے سالِ وفات کے بارے میں سب تذکرے خاموش ہیں۔ البتہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے زمانۂ تعلیم میں ان کی غیر حاضری ہی میں کسی وقت وفات پائی۔

(غبطۃ الناظر، نفحات الانس۔ اخبار الاخیار۔ تذکرہ سیدنا غوث اعظم)

بی بی اُمِّ محمدؒ

محمد بن علی بن عبداللہ کی صاحبزادی تھیں۔ سنہ ۳۷۴ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ اپنے دور کے نامور صوفی شیخ ابن سمعونؒ کی شاگرد تھیں۔ عبادتِ الٰہی سے خاص شغف تھا۔ بکثرت ریاضات و مجاہدات کیے اور اولیاء اللہ میں شمار ہوئیں۔ سنہ ۴۶۰ ہجری میں انتقال کیا۔ ان کا مزار شیخ ابنِ سمعونؒ کے مزار کے پاس ہے۔

(خزینۃ الاصفیاء)

سیّدہ خدیجہ جیلانیؒ[1]

شیخ ابی عبداللہ بن شیخ یحییٰ زاہد رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی تھیں۔ پیرِ پیراں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۶۲ھ) ان کے حقیقی بھتیجے تھے۔ بعض روایتوں میں ان کی کنیت اُمِّ محمّدؒ بیان کی گئی ہے۔ نہایت عبادت گزار اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ جلیل القدر بھتیجے کی طرح علم و عرفان کی دولت سے مالا مال تھیں۔ لوگوں میں ان کے مستجاب الدعوات ہونے کی عام شہرت تھی۔ مشکل کے وقت لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کراتے اور برکت حاصل کرتے تھے۔

ایک دفعہ جیلان میں خوفناک قحط پڑا۔ لوگوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر بارش کے لیے دعائیں کیں۔ شہر سے باہر صحرا میں جاکر بار بار استسقا کی نمازیں پڑھیں لیکن موسم کی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا اور خشک سالی شدید سے شدید تر ہوتی گئی، آخر سب لوگ مل کر سیّدہ خدیجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

---

[1] مولانا جامیؒ نے ان کا نام خدیجہؒ لکھا ہے لیکن دوسرے بہت سے تذکروں میں ان کا نام عائشہؒ بھی آیا ہے۔

مُلّا علی قاریؒ صاحب نزہتہ الخاطر الفاتر کا بیان ہے کہ سیّدہ عائشہؒ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ تھیں لیکن دوسری کسی روایت سے ان کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔

حضرت پیرِ پیرانؒ کی پھوپھی صاحبہ کے نام میں تو اختلاف ہے لیکن ان کی کنیت "اُمِّ محمّد" پر سب کا اتفاق ہے اور ان کے فضائل و کمالات پر بھی سب متفق ہیں (مؤلف)

ان سے درخواست کی کہ خدارا بارش کے لیے دعا کریں۔ سیدہ خدیجہؒ اس وقت اپنے مکان کے صحن میں جھاڑو دے رہی تھیں۔ انہوں نے لوگوں کو اس قدر پریشان اور بے کل دیکھا تو دستِ دعا اٹھائے اور کہا، بارالٰہا میں نے جھاڑو دی ہے تو چھڑکاؤ کر دے۔ ان کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور اس قدر بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ سیدہ خدیجہؒ خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً فصیح بلیغ وعظ بھی کہا کرتی تھیں۔ ان کے مواعظ نہایت پُرتاثیر ہوتے تھے انہیں سن کر اکثر گم گشتگانِ راہ، راہِ راست پر آجاتے تھے۔ سیدہ خدیجہؒ نے جیلان ہی میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

(نفحات الانس)

بی بی عروضیہؒ

ان کا شمار پانچویں صدی ہجری کے اندلس کی شہرہ آفاق عالمات میں ہوتا ہے علامہ ابوالمطرف عبدالرحمٰن بن غلبون کی خادمہ تھیں۔ انہوں نے آزاد کر دیا تو بلنسیہ (والنشیا) میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ علمِ صرف، علمِ نحو، علمِ معانی، علمِ بدیع، علمِ لغت اور علمِ عروض میں یگانۂ روزگار تھیں۔ علمِ نحو اور علمِ لغت انہوں نے اپنے آقا ابوالمطرف عبدالرحمٰنؒ سے حاصل کیا تھا مگر وہ ان دونوں علوم میں استاد پر فوقیت لے گئیں۔ ان کو مبرد کی کتاب "کامل" اور قالی کی کتاب "نوادر" زبانی یاد تھیں اور ان کی شرح نہایت عمدگی سے کرتی تھیں۔ اس دور کے ایک مشہور عالم سلیمان بن نجاح کا بیان ہے کہ میں نے عروضیہ سے "کامل" اور "نوادر" پڑھیں اور علمِ عروض بھی سیکھا۔

بی بی عروضیہ نے سنہ ۴۵۰ھ ہجری میں وفات پائی اور شہر دانیہ میں مدفون ہوئیں۔

(نفح الطیب)

اُمّ زین الدینؒ

ان کا شمار پانچویں صدی ہجری کی یگانہ روزگار عالمات و عابدات میں ہوتا ہے۔ ویسے تو ان کو تمام علوم دینی میں دسترس حاصل تھی لیکن علمِ تفسیر میں خاص مہارت رکھتی تھیں۔ ان کے بھائی امام عبدالوہابؒ بھی بہت بڑے مفسّرِ قرآن تھے۔ انہوں نے "کتاب الجواہر" کے نام سے بیس ۲۰ جلدوں میں قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھی تھی۔ اُمّ زین الدینؒ کو یہ تمام تفسیر زبانی یاد تھی۔ ان کے بیٹے زین الدینؒ بھی علامۂ دہر تھے اور اپنے وقت کے امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ ایک مرتبہ اپنے ماموں (امام عبدالوہابؒ) سے تفسیر کا سبق لے کر گھر آئے تو والدہ نے پوچھا، ماموں نے آج کیا پڑھایا؟ انہوں نے جو پڑھا تھا بیان کر دیا۔ انہوں نے پوچھا، فلاں آیت کے ساتھ فلاں قول بھی بیان کیا؟ بیٹے نے کہا، نہیں۔ مسکرا کر کہا کہ بھائی بھول گئے ہوں گے۔

اُمّ زین الدینؒ کو عبادتِ الٰہی سے خاص شغف تھا۔ اپنے وقت کا بیشتر حصہ مصلّے پر بیٹھ کر گزارتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسی حالت میں مسلسل چالیس سال گزار کر وفات پائی۔ (مسلمان خواتین کی دینی و علمی خدمات)

بی بی عائشہ اندلسیہ

جس زمانے میں اندلس پر مسلمانوں کا پرچمِ اقبال پوری شان و شوکت سے لہرا رہا تھا بی بی عائشہؒ مدینہ منورہ سے اندلس پہنچیں اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ ان کو دس ہزار احادیث زبانی یاد تھیں اور ان سب کے سلسلۂ روایت کو وہ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچاتی تھیں۔ (نفح الطیب)

بی بی اُمّ البلاء

اُندلس کے شہر وادی الحجارۃ کے ایک سوداگر یوسف کی بیٹی تھی۔ اس کا شمار پانچویں صدی ہجری کی باکمال عالمات وشاعرات میں ہوتا ہے۔ "کتاب المغرب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بوڑھے نے اس کو شادی کا پیغام بھیجا۔ جواب میں ام البلاء نے اس کو یہ شعر لکھ بھیجے۔

الشیب لا یخدع فیہ لصبی — بحیلۃ فاسمع الی النصح
بڑھاپے کے دھوکے میں لڑکپن نہیں آتا — کسی طرح میری نصیحت کو سُن!

فلا تکن اجہل من فی الوریٰ — یبیت فی الجہل کما یضحی
دنیا میں جاہلوں کی ناک نہ بن جیسے — دن رات سوائے حماقت کے کوئی کام نہیں

یہ فاضلہ اپنے وطن کی مناسبت سے "حجاریہ" کے لقب سے بھی مشہور ہے۔ اس کے یہ شعر حسنِ معذرت میں نہایت عمدہ ہیں۔

افہم مطارح احوالی وما حکمت — بہ الشواھد واعذرنی ولا تلم
سمجھ لے میرے مقتضائے حال اور قرائن سے — اور معذور رکھ مجھے۔ ملامت نہ کر

ولا تکلنی الی عذر ابینہ — شر المعاذیر ما یحتاج للکلم
اور مجھ سے اظہارِ عذر کی امید نہ رکھ — عذروں میں بدتر عذر وہ ہے جو بیان کا محتاج ہو

وکل ماجئتہ من زلۃ فبما — اصبحت فی ثقۃ من ذلک الکرم
اور میری یہ سب لغزش اس لیے ہے کہ — میں تیرے کرم پہ بھروسا رکھتی ہوں

بی بی ست الملک

مصر کے چھٹے فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ کی بہن تھی۔ بڑی عالمہ اور مدبر خاتون تھی ۴۱۱ھ میں الحاکم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابو الحسن علی الظاہر نابالغ تھا اور سلطنت کی حالت بہت سقیم تھی لیکن ست الملک نے بھتیجے کے سنِ بلوغ کو پہنچنے تک حالات کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا اور نہایت بیدار مغزی سے کاروبارِ حکومت چلاتی رہی۔ (مشاہیر نسواں)

ملکہ ترکان خاتون (بیگم ملک شاہ سلجوقی)

ترکان خاتون الملقب بہ خاتونِ بزرگ وخاتون الجلالیہ تاریخ اسلام کے نامور فرمانروا سلطان ملک شاہ سلجوقی کی ملکہ تھی[۱] ــــ وہ عماد الدولہ طفغاج (یا تعنش) خان ابوالمظفر ابراہیم بن نصر ایلک کی بیٹی تھی، جو ماوراء النہر کے مغربی علاقے کا حکمران تھا۔ اس کی شادی ملک شاہ سے ۴۵۶ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت ملک شاہ کا والد سلطان الپ ارسلان زندہ تھا اور اسی نے اپنے بیٹے کی شادی کے لیے خان ابوالمظفر ابراہیم کی بیٹی کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا مقصد خوانینِ ماوراء النہر سے اپنے تعلقات استوار کرنا تھا۔

میر خواند نے "روضۃ الصفا" میں لکھا ہے کہ خانِ اعظم نے اپنی بیٹی کا

---

[۱] جلال الدولہ ابوالفتح ملک شاہ دولتِ سلجوقیہ کا تیسرا فرمانروا تھا۔ اس نے ۴۶۵ھ سے ۴۸۵ھ تک حکومت کی۔ سلجوقی فرمانرواؤں میں سلطان طغرل بیگ (۴۲۹ھ تا ۴۵۵ھ) اور سلطان الپ ارسلان (۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ) بھی کچھ کم مرتبے کے فرمانروا نہیں تھے لیکن مسلمان مؤرخین نے سلطان ملک شاہ کے عہد کو سلجوقی فرمانرواؤں میں ہار کے درمیان بڑا موتی قرار دیا ہے کیونکہ اس کے عہد میں دولتِ سلجوقیہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی تھی۔ علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

"ملک شاہ کی سلطنت نے وہ وسعت حاصل کی کہ کوئی سلطنت اس حد تک نہیں پہنچی۔ اس کی سلطنت طول میں کاشغر سے لے کر جو ترکستان کا سب سے اخیر شہر ہے اور جس کی سرحد چین سے ملتی ہے، بیت المقدس تک اور عرض میں قسطنطنیہ سے لے کر بحرِ خزر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے تمام ملک

(باقی اگلے صفحہ پر)

ڈولہ بڑی شان وشوکت سے نیشاپور روانہ کیا۔ جب دلہن شہر میں داخل ہوئی تو تمام شہر آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک ہزار ترکی غلام ڈولہ کی جلو میں تھے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک نادر تحفہ ترکستان کا تھا۔ مشک وعنبر اور کافور کی گولیاں جلوس پر نثار کی جاتی تھیں۔

ترکان خاتون کا شمار تاریخ عالم کی مشہور خواتین میں ہوتا ہے۔ وہ بڑی آن بان کی عورت تھی اور اس کے رعب جلال کا یہ عالم تھا کہ اس کے سامنے بڑے بڑے امراء و وزراء کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ سلطان ملک شاہ کے نزدیک اس کی یہ قدر ومنزلت تھی کہ وہ سلطنت کے ہر معاملے میں اس سے ضرور مشورہ کرتا تھا۔

سنہ ۴۷۴ھ میں عباسی خلیفہ مقتدی بامر اللہ نے سلطان ملک شاہ کو اس کی بیٹی کے لیے پیغام بھیجا۔ سلطان نے خلیفہ کا پیغام سن کر کہا کہ اس معاملہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں سرائیں بنوائیں، دریاؤں اور نہروں پر پل تعمیر کرائے اور ہر قسم کے محصول معاف کر دیئے۔ اس کے زمانہ میں امن وامان کی یہ حالت تھی کہ ترکستان سے لے کر شام کی اخیر سرحد تک قافلے بغیر کسی حفاظت اور بدرقہ کے سفر کرتے تھے۔"

تاریخ اسلام کا شہرۂ آفاق وزیر خواجہ نظام الملک طوسی، سلطان ملک شاہ سلجوقی ہی کا وزیر اعظم تھا۔ سلطان ملک شاہ نے بارہ مرتبہ اپنی وسیع سلطنت کا دورہ کیا اور ہر صوبہ کی حالت بچشم خود دیکھ کر اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی بقول سیّد امیر علی ملک شاہ کی حکومت بلحاظ عظمت وشوکت اور لوگوں کی خوش حالی کے رومی یا عربی حکومت کے بہترین زمانہ سے کم نہ تھی اس کے زمانے میں تجارت اور صنعت وحرفت کو زبردست فروغ حاصل ہوا اور علوم وفنون نے بے مثال ترقی کی۔

شہزادی کی والدہ ترکان خاتون ہی کوئی جواب دے سکتی ہے۔ یہ پیغام خلیفہ مقتدی کا ایک انتہائی قابلِ اعتماد اور معزز امیر ابونصر محمد بن جہیر لایا تھا۔ سلطان نے اس سے کہا کہ آپ خواجہ نظام الملک کے ہمراہ ملکہ ترکان خاتون کے پاس جائیں اور عرضِ مدعا کریں۔

دوسرے دن فخر الدولہ اور خواجہ نظام الملک دونوں خاتونِ بزرگ ترکان خاتون کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے احسن انداز میں خلیفہ کے پیام کا ذکر کیا۔ ترکان خاتون نے جواب دیا کہ شاہِ غزنین اور ماوراء النہر کے کئی خوانین اپنے اپنے فرزندوں کے لیے شہزادی کا رشتہ مانگ رہے ہیں اور وہ چار لاکھ نقد مہر دینے کو تیار ہیں اگر خلیفہ مقتدی اتنا مہر دینے پر آمادہ ہو تو میں اس کو دوسرے تمام پیغام بھیجنے والوں پر ترجیح دوں گی۔

سلطان کی پھوپھی ارسلان خاتون کو ترکان خاتون کے جواب کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئی کیونکہ وہ اس رشتہ کی دل سے خواہاں تھی۔ اس نے پہلے فخر الدولہ اور خواجہ نظام الملک سے مشورہ کیا، پھر خود ترکان خاتون کے پاس گئی اور اس کو سمجھایا کہ خاندانِ خلافت میں رشتہ کرنا ہمارے لیے باعثِ فخر و مباہات ہے۔ دوسرے لوگ خواہ کتنے ہی ذی حشم ہوں، ان کو خلیفہ سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی وہ تو خلیفہ کے غلاموں اور خدمت گاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ خلیفہ امیر المؤمنین ہے۔ اس کے سامنے مال کا ذکر کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

بڑی بحث و تمحیص کے بعد ترکان خاتون ان شرطوں پر خلیفہ سے شہزادی کا عقد کرنے پر رضامند ہو گئی:

① پچاس ہزار دینار مہر معجل ہو گا۔

② میری لڑکی کے سوا خلیفہ کے پاس کوئی بیوی یا لونڈی نہ ہو گی اور نہ وہ میری لڑکی کی خواب گاہ کے سوا کسی اور جگہ شب باش ہو گا۔

فخرالدولہ نے خلیفہ کی طرف سے ان شرطوں کو منظور کرنے کی ہامی بھرلی اور صفر ۴۷۵ھ میں بغداد واپس آگیا۔ خلیفہ مقتدی نے ان شرطوں کو منظور کرلیا اور عقد ہوگیا لیکن شہزادی کی رخصتی پانچ سال بعد ۴۸۰ھ میں ہوئی دلہن جس شان سے (اصفہان سے) بغداد کی طرف روانہ ہوئی مؤرخین نے اس کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

جہیز کا سامان ایک سو تیس اونٹوں اور چہتّر خچروں پر لدا ہوا تھا اونٹوں پر دیبائے رومی کی جھولیں تھیں جن پر سونے اور چاندی کا (سنہرا روپہلا) کام کیا ہوا تھا۔ خچروں پر دیبائے ملکی کی جھولیں لٹک رہی تھیں اونٹوں پر تمام سامان سونے اور چاندی کا تھا اور خچروں پر دوسرا بیش قیمت سامان تھا۔ ان کے علاوہ چھتّے خچروں پر قیمتی جواہرات اور زیورات سے بھرے ہوئے صندوق لدے ہوئے تھے۔ اس قطار کے آگے مرصّع زینوں والے اصیل گھوڑوں پر تینتیس ۳۳ سوار تھے اور تین عماریاں تھیں جو صنعت اور لاگت کے اعتبار سے بے مثل تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بہت بڑا سنہری فرش تھا۔ اس جلوس کے پیچھے دلہن کا محفّہ تھا۔ اس کے بعد ملکہ ترکان خاتون اور دوسری معزز خواتینِ بغداد کے محفّے تھے۔ ان کے ساتھ تین سو کنیزوں کی پالکیاں تھیں اور خواجہ سراؤں کی تعداد کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ جدھر جدھر سے جلوس گزرتا لوگ اس پر دینار اور قیمتی کپڑے نچھاور کرتے تھے۔ اس جلوس کی نگرانی خواجہ نظام الملک طوسی اور امیر سعدالدولہ گوہر آئین (امیر بربق) کے سپرد تھی۔

جس دن یہ جلوس بغداد پہنچا، سارے شہر میں بڑے اہتمام سے چراغاں کیا گیا تھا اور بغداد کا کوچہ کوچہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ خلیفہ نے اپنے وزیر ابوشجاع اور کئی دوسرے سرکردہ امراء کو تین سو مشعل برداروں کی معیت میں جلوس کے استقبال کے لیے بھیجا۔ ابوشجاع نے ترکان خاتون کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ سیّدنا و مولانا امیرالمؤمنین نے پیغام بھیجا ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا۔ (﴿﴾)

(بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کے سپرد کر دو)

ترکان خاتون نے جواب دیا: "بسر و چشم"

چنانچہ جلوس حریم خلافت کی طرف روانہ ہوا۔ خواجہ نظام الملک دوسرے اعیانِ سلطنت کے ہمراہ آگے چل رہا تھا۔ اُن کے ساتھ سینکڑوں شمعیں اور مشعلیں روشن تھیں، ان کے بعد امرائے دولت کی خواتین کے محفّے تھے جن کے ارد گرد ہزاروں خدام اور مشعل بردار تھے۔ ان کے پیچھے دلہن کا خاص محفّہ تھا جس کے گرد دو سو ترکی لونڈیاں زرق برق ملبوسات میں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ قصرِ خلافت میں شاہی خاندان اور ارکانِ دولت کی خواتین نے ترکان خاتون کا استقبال کیا۔ تمام مہمان خواتین کو محفّوں سے اتارا اور دلہن کو حجلۂ عروسی میں مسند پر جا بٹھایا۔

دوسرے دن خلیفہ مقتدی بامر اللہ نے ترکان خاتون اور ان تمام خواتین کو جو اس کے ساتھ آئی تھیں، بیش قیمت خلعت بھیجے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شاندار دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔ اس میں تمام سردارانِ لشکر، امرار دولت، رؤسائے شہر، چھوٹے بڑے تمام ملازموں، اہلِ خدمت اور غربا و مساکین کو کھانا کھلایا گیا۔ جس شان کی یہ دعوت تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف شکر اس میں چالیس ہزار من صرف ہوئی۔ دعوتِ ولیمہ کے بعد خلیفہ نے تمام سردارانِ لشکر اور اعیانِ سلطنت کو خلعت عنایت کیے۔ اس طرح نہایت پُرمسرت ماحول میں یہ تقریب ختم ہو گئی۔

علامہ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ اہلِ بغداد نے اس شان کی شادی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

سلطان ملک شاہ کے آخری زمانے میں ترکان خاتون وزیر اعظم خواجہ نظام الملک طوسی سے اس بنا پر ناراض ہو گئی کہ وہ اس کے نابالغ بیٹے محمود کے بجائے شاہزادہ برکیا روق کو ولی عہد بنانے کا حامی تھا جو ملک شاہ

کی دوسری بیگم زبیدہ بنتِ یاقوتی بن داؤد کے بطن سے تھا۔ اس کی یہی ناراضی خواجہ نظام الملک کی معزولی پر منتج ہوئی۔

شوال ۴۸۵ھ میں سلطان ملک شاہ نے قیامِ بغداد کے دوران میں وفات پائی تو ملکہ ترکان خاتون نے اس کی موت کو مخفی رکھا اور اس کی میت نہایت خاموشی سے اصفہان روانہ کر دی جہاں اس کو مدرسۂ اعظم میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ترکان خاتون خود بھی اصفہان پہنچ گئی اور اپنے بیٹے محمود کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ساتھ ہی شہزادہ برکیارُوق کو اپنے آدمی بھیج کر گرفتار کر لیا لیکن برکیارُوق اپنے چند ہواخواہوں کی مدد سے اصفہان کے قید خانے سے فرار ہو گیا۔ اس کے بعد برکیارُوق اور محمود (یا دوسرے لفظوں میں ترکان خاتون) کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ۴۸۷ھ تک ملک کی یہ کیفیت تھی کہ دارالسلطنت اصفہان اور اس کے متعلقات پر ترکان خاتون کا قبضہ تھا اور باقی سلطنت کے بیشتر علاقے برکیارُوق کے زیرِ اقتدار تھے۔ اسی اثناء میں ترکان خاتون کا وقتِ آخر آ پہنچا اور اس نے رمضان ۴۸۷ھ میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اس کے ایک ماہ بعد اس کا چہیتا بیٹا محمود بن ملک شاہ بھی چیچک میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ (نظام الملک طوسی۔ مشاہیر نسواں وغیرہ)

بی بی اَمَۃُ العزیزؒ

ان کا شمار پانچویں صدی ہجری کے علماءِ عصر اور فقہائے دہر میں ہوتا ہے۔ اَنْدُلُس (ہسپانیہ) کی رہنے والی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی اولاد سے تھیں۔ اپنے حسب و نسب اور علم و فضل کی بنا پر "الشریفۃ" کے معزز لقب سے مشہور تھیں۔ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھیں۔

علامہ مقری نے "نفح الطیب" میں ابوالخطاب بن دحیہ کی کتاب "کتاب المطرب" کے حوالے سے ان کے کچھ شعر بھی نقل کیے ہیں۔ (سید امیر علی)

بی بی صفیہ بنتِ نظام الملکؒ

عہدِ سلاجقہ کے نامور وزیر خواجہ نظام الملک[1] طوسیؒ (المتوفی سنہ ۴۸۶ھ) کی دخترِ نیک اختر تھی۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام زبیدہ لکھا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک صحیح نام صفیہ ہی ہے۔ فاضل باپ نے اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی اس لیے وہ علم و فضل کے اعتبار سے یگانۂ روزگار ہو گئی۔

---

[1] اس کا نام حسن کنیت ابوعلی اور لقب نظام الملک قوام الدین تھا۔ تاریخِ اسلام میں اس سے بڑا مدبّر اور علم دوست وزیر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ سنہ ۴۰۸ھ میں نوقان (طوس۔ ایران) میں پیدا ہوا اور علومِ متداولہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد داؤد بن میکائیل سلجوقی کے پاس چلا گیا، اس نے اس کو اپنے فرزند الپ ارسلان کا اتالیق مقرر کر دیا۔ سنہ ۴۵۵ھ میں الپ ارسلان تختِ حکومت پر بیٹھا تو اس نے نظام الملک کو اپنا وزیر بنا لیا۔ دس برس کے بعد جب الپ ارسلان نے شہادت پائی تو نظام الملک کی تائید و حمایت سے اس کا فرزند ملک شاہ تخت و تاج کا مالک بنا۔ اس نے سلطنت کا تمام کاروبار نظام الملک کے سپرد کر دیا اور وہ دولتِ سلجوقیہ کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔ اس نے اپنے حسنِ انتظام سے سلجوقی سلطنت کو ایک مثالی حکومت بنا دیا۔

وہ نہایت متدیّن، پابندِ شریعت، نیک طینت اور علم دوست انسان تھا۔ اذان کی آواز کان میں پڑتی تو خواہ کیسے ہی اہم کام میں مشغول ہوتا اس کو چھوڑ کر نماز کی طرف لپکتا تھا۔ اس نے تمام عملداری میں بے شمار مدارس و مکاتب قائم کیے اور ان کے اخراجات کے لیے نہ صرف شاہی خزانے سے چھ لاکھ دینار کی رقم مقرر کی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ علمی قابلیت کے اعتبار سے اپنے عہد کی خواتین میں خاص امتیاز رکھتی تھی۔ اس کی شادی خلیفہ مقتدی کے وزیر عمید الدولہ ابو منصور محمد بن فخر الدولہ بن جہیر سے ۴۶۲ھ ہجری میں ہوئی۔ اس نیک بی بی نے اپنے والد کے سامنے ہی ۴۷۰ھ میں وفات پائی۔

(امیر علی۔ نظام الملک طوسی)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بلکہ خاص اپنی جاگیروں کی آمدنی کا دسواں حصہ بھی ان کے لیے وقف کر دیا۔ نیشاپور کا مدرسۂ نظامیہ اس کی علمی فیاضی کا پہلا دیباچہ تھا۔ ۴۵۹ھ میں اس نے بغداد میں ایک عظیم الشان دارالعلوم یا یونیورسٹی قائم کی اور اس میں دور دراز ملکوں سے نامور علماء کو بلا کر گرانقدر مشاہروں پر تعلیم و تدریس پر مامور کیا۔ یہ دارالعلوم نظامیۂ بغداد کے نام سے مشہور ہوا اور اس کا نصابِ تعلیم "درسِ نظامی" صدیوں تک تمام دنیائے اسلام کے مدارس میں مروج رہا۔ (پاک و ہند کے دینی مدارس میں جو درسِ نظامی مروج ہے اس کا تعلق مدرسۂ نظامیہ بغداد کے نصاب سے نہیں ہے بلکہ اس کو ملا نظام الدین سہالی المتوفی ۱۱۶۱ھ کے اسمِ گرامی سے نسبت ہے) نظامیۂ بغداد کی شاخیں ہرات، موصل، اصفہان اور کئی دوسرے شہروں میں بھی قائم ہو گئیں۔ خواجہ نظام الملک نے اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں جو کام کیا وہ اس کا دنیائے اسلام پر ایسا احسان ہے، جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں نظام الملک نے سیاست نامہ کے نام سے قانونِ سلطنت مرتب کیا اس کو پڑھ کر خواجہ کے بے مثال تدبر کا لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کے اس نامور فرزند کو رمضان المبارک ۴۸۵ھ میں ایک باطنی فدائی نے شہید کر ڈالا۔ (نظام الملک طوسی از منشی عبدالرزاق)

بی بی اُمّ الخیر حجازیہ

حجازِ مقدس کی رہنے والی تھیں لیکن وہاں سے مصر آکر مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں ان کا شمار فاطمیین کے دورِ حکومت کی یگانۂ روزگار عالمات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ۴۱۵ھ میں مسجد قاہرہ میں اپنی درسگاہ قائم کی تھی جس سے ہزاروں تشنگانِ علم نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ان کو وعظ و خطابت میں بھی کمال حاصل تھا۔ ایسا پُرتاثیر وعظ کرتی تھیں کہ لوگوں کے دل پگھل جاتے تھے۔ (بنات الاسلام کی دینی و علمی خدمات)

بی بی فاطمہ بنتِ الاقرع

حسن بن علی العطار کی بیٹی تھی جس کو غالباً اس کے سر پر بال نہ ہونے کی وجہ سے "الاقرع" کہا جاتا تھا اس لیے یہ بھی بنت الاقرع کے نام سے مشہور ہوئی۔ بغداد کی رہنے والی تھی۔ اس کا شمار پانچویں صدی ہجری کی شہرۂ آفاق خوش نویس خواتین میں ہوتا ہے۔ فن کتابت میں وہ اپنے تمام ہم عصر مردوں اور عورتوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی اور وہ سب اس کی تقلید کرنے پر مجبور تھے۔ فرمانروایانِ وقت بھی اس کے کمالِ فن کے معترف اور قدردان تھے اور دوسرے ممالک کے فرمانرواؤں کو جو اہم خطوط اور صلح نامے بھیجتے تھے وہ فاطمہ بنت الاقرع ہی سے کتابت کرواتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے اپنی کتابت کا ایک صفحہ وزیرِ مملکت

ابونصر عمید الملک کندری[1] کی خدمت میں پیش کیا وہ اس کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے بنت الاقرع کو ایک ہزار دینار انعام دیئے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ کتابت کا یہ صفحہ در اصل ایک صلحنامہ تھا اس کی رو سے اس وقت کے سلجوقی حکمران اور شاہِ روم کے درمیان صلح کا عہد و پیمان ہوا تھا۔ شاہِ روم کے پاس یہ صلحنامہ گیا تو اس کو بھی اس کی کتابت اس قدر پسند آئی کہ اس نے اسے محفوظ کر لیا۔ (معجم البلدان)

---

[1] ابونصر محمد بن منصور ملقب بہ عمید الملک کندری آٹھ سال تک سلطان طغرل بیگ سلجوقی (۴۲۹ھ تا ۴۵۵ھ) کا وزیر رہا۔ بڑا عالم فاضل آدمی تھا اور عربی و فارسی ادب و انشاء پر مشاقانہ قدرت رکھتا تھا محض اپنی ذاتی قابلیت اور محنت کی بدولت معمولی حیثیت سے درجۂ وزارت تک پہنچا۔ مؤرخین نے اس کے فضل کمال اور جود و سخا کی بڑی تعریف کی ہے لیکن ساتھ ہی لکھا ہے کہ مذہبی معاملات میں بعض اوقات بہت متشدد ہو جاتا تھا۔ پہلے اس نے سلطان طغرل بیگ سے اہلِ تشیع پر خطبوں میں لعنت بھیجنے کا حکم جاری کرایا۔ پھر اشعریوں پر لعنت بھیجنے کا فرمان حاصل کیا۔ اس کے اس رویئے کے خلاف لوگوں میں بے چینی پھیل گئی اور امام ابوالقاسم قشیریؒ اور امام الحرمین جوینیؒ جیسے فضلائے زمانہ دوسرے بیسیوں علماء کے ساتھ نیشاپور سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔

سلطان طغرل بیگ کے انتقال (۴۵۵ھ) کے بعد عمید الملک نے در پردہ الپ ارسلان کے مقابلے میں سلیمان کی حمایت کی اس سے الپ ارسلان کے دل میں اس کے خلاف کھٹک پیدا ہو گئی چنانچہ تخت نشین ہونے کے کچھ عرصہ بعد الپ ارسلان نے اس کو وزارت سے معزول کر کے قید کر دیا اور ایک سال بعد ۱۶ ذی الحجہ ۴۵۶ھ کو قتل کروا دیا۔ قتل کے وقت اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب جلاد تلوار لے کر اس کے سر پر کھڑا ہوا تو اس نے الپ ارسلان کو پیغام بھیجا کہ تیرے چچا (طغرل بیگ جو لاولد فوت ہوا تھا) نے مجھے وزیر بنایا اور تو شہادت کے مرتبے پر فائز کر رہا ہے اس کا مجھے آخرت میں اجر ملے گا۔ (نظام الملک طوسی)

بی بی کریمہ بنتِ احمد مروزیؒ

ان کا شمار پانچویں صدی ہجری کی شہرۂ آفاق عالمات میں ہوتا ہے ——
احمد بن محمدؐ بن ابی حاتم کی صاجزادی تھیں۔ ایران کے شہر مرو (MERV) میں پیدا ہوئیں۔ سالہا سال تک دینی علوم کی تحصیل کرتی رہیں۔ کئی یگانۂ روزگار علماء سے حدیث کا سماع کیا اور ان سے اجازہ حاصل کیا پھر مکہ معظمہ چلی گئیں اور وہیں حدیث کا درس دیا کرتی تھیں۔ اَندلس کے مشہور محدث ابوبکر محمد بن سابق صقلیؒ، بی بی کریمہ مروزیؒ ہی کے شاگرد تھے۔ وہ صقلیہ (سسلی) میں دولتِ اسلامی کے زوال کے بعد مشرق روانہ ہوئے اور مکہ معظمہ میں بی بی کریمہؒ سے حدیث کی تحصیل کی پھر وہاں سے اَندلس پہنچے اور اہلِ غرناطہ کو اپنی ان احادیث سے فیض یاب کیا جن کی تحصیل مشرق میں کی تھی۔

ابن بشکوال لکھتا ہے:

روی عن کریمۃ بنت احمد المروزی وغیرھا وقدم الاندلس واخذ عنہ اھل غرناطہ۔

یعنی (ابوبکر محمدؒ نے) کریمہ بنت احمد مروزی وغیرہا سے روایت کی۔ وہ اندلس آئے اور ان سے اہلِ غرناطہ نے تحصیل کی۔

علامہ خطیب بغدادیؒ نے تاریخِ بغداد میں لکھا ہے کہ میں نے ۴۶۳ھ کے ایامِ حج میں کریمہؒ سے صحیح بخاری کا سماع کیا۔

محدثہ کریمہؒ کی مجالسِ درس میں سینکڑوں لوگ شریک ہوتے تھے اور مقدور بھر فیض اٹھاتے تھے۔ ان سے کسبِ فیض کرنے والوں میں محدث ابوبکر محمدؐ بن سابق صقلیؒ، علامہ خطیب بغدادیؒ اور علامہ ابو طالب زینبیؒ کے علاوہ

متعدد دوسرے بلند پایہ اربابِ فضل و کمال شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بی بی کریمہؒ حدیث اور دوسرے علوم مروجہ میں کمال رکھنے کے علاوہ رموزِ معرفت سے بھی خوب آشنا تھیں۔ انہوں نے باختلافِ روایت سنہ ۴۶۳ھ یا سنہ ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔ (خزینۃ الاصفیاؒ۔ تاریخِ صقلیہ)

بی بی زلیخاؒ بنتِ علی

خواجہ نظام الملک طوسی (المتوفی سنہ ۴۸۵ھ) کی لائق بہن تھی۔ نہایت عالمہ فاضلہ تھی۔ اپنے عظیم بھائی کی طرح بے حد معارف پرور اور اہلِ علم کی قدردان تھی۔ اس کا شمار پانچویں صدی ہجری کی بلند پایہ عالمات اور اہلِ ہنر و کمال خواتین میں ہوتا ہے۔ بعض مؤرخین نے ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ وہ حسنِ صورت و سیرت، دانش و بصیرت اور علم و فضل کے اعتبار سے اپنی عہد عصر خواتین کی سرتاج تھیں۔ (سید امیر علی)

بی بی نزہون

شہر غرناطہ (اندلس) کی رہنے والی تھی۔ والد کا نام ابوبکر غسانی تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں تمام دنیائے اسلام میں اس کے کمالاتِ علمی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ علمِ ادب، علمِ تاریخ اور علمِ امثال میں دست گاہِ کامل رکھتی تھی اس کے علاوہ بہت اونچے درجے کی شاعرہ بھی تھی۔ اس نے تمام علوم ابوبکر مخزومیؒ سے حاصل کیے تھے جو ایک نابینا عالم تھے۔

علامہ مقری نے "نفح الطیب" میں اس کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔

(نفح الطیب)

بی بی اسماء

یمن کے حکمران ابوکامل علی بن محمد صلیحی (۴۲۹ھ تا ۴۷۳ھ) کی اہلیہ تھی۔ (بنو صلیح یا صلیحی ایک شیعی خاندان تھا جو یمن پر ۴۲۹ھ سے ۴۹۲ھ تک حکمران رہا۔ صلیحی حکمرانوں کا پایہ تخت صنعاء تھا۔)

اسماء حسن و جمال، تدبیر و دانش، علم و فضل اور شجاعت میں بے مثال تھی۔ وہ اپنے شوہر کی بنتِ عم تھی۔ علی بن محمد کو دشمنوں سے جو معرکے پیش آئے اسماء ان سب میں اس کی دست و بازو بنی رہی۔ ایک دفعہ جب وہ اپنے شوہر کی معیت میں مکہ معظمہ جا رہی تھی کہ اچانک دشمنوں نے چھاپہ مارا۔ علی بن محمد کے ساتھ آدمی کم تھے۔ اس کو شکست ہوئی اور اسماء دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئی۔ وہ ایک عرصہ تک ان کے پاس قید رہی۔ اس پر سخت پہرہ رہتا تھا لیکن اس نے اپنی رہائی کے لیے ایک عجیب ترکیب کی۔ ایک قاصد کو جو ایک گداگر کی صورت میں تھا اس نے روٹی کے اندر ایک خط رکھ کر اپنے بیٹے المکرم احمد کے پاس روانہ کیا۔ اس خط میں ضروری ہدایات درج تھیں۔ یہ خط ملتے ہی مکرم ایک بھاری فوج لے کر دشمن پر حملہ آور ہوا اور اپنی ماں کو آزاد کرا لیا۔ اسماء نے ۴۷۹ھ میں وفات پائی۔ (خواتینِ اسلام کی بہادری بحوالہ تاریخ عمارۃ یمنی)

بی بی سیدہ

علی بن محمد صلیحی اور اسماء کے بیٹے المکرم احمد کی بیوی تھی۔ اس کی پرورش اور تربیت اسماء ہی نے کی تھی۔ المکرم احمد ۴۷۳ھ میں یمن کے تختِ حکومت پر بیٹھا۔ وہ بڑا آرام طلب آدمی تھا اور عیش و عشرت کی زندگی کا عادی تھا۔ سیدہ بڑی لائق اور دانا خاتون تھی۔ اس نے شوہر کے یہ لچھن دیکھے تو کاروبارِ حکومت اپنے ہاتھ میں

لے لیا اور نظمِ سلطنت میں کسی قسم کا خلل نہ پڑنے دیا۔ اس نے کئی شہر آباد کیے، بہت سی نئی عمارتیں بنوائیں۔ دشمنوں سے معرکہ آرائیاں کیں اور اپنی تدبیر و شجاعت سے ان کو زیر کیا۔ مصر کی دولتِ فاطمیہ بھی اس کی مرتبہ شناس تھی۔ چنانچہ فاطمی خلیفہ کی طرف سے حکومتِ یمن کے نام جو مراسلے آتے تھے ان میں سیدہ کے لیے بڑے بڑے القابِ شاہی استعمال کیے جاتے تھے۔ (خواتینِ اسلام کی بہادری بحوالہ تاریخ عمارۃ یمنی)

بی بی اعتماد رامقیہ

پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں اَندلُس میں بنو اُمیّہ کا آفتابِ اقبال غروب ہو گیا تو ملک میں ہر طرف افراتفری پھیل گئی اور مختلف علاقوں اور شہروں میں بیس کے قریب چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے ہر ایک کا حکمران امیر المؤمنین کہلاتا تھا۔ ان ریاستوں میں اشبیلیہ کی ریاست کو دوسری تمام ریاستوں میں ممتاز حیثیت حاصل تھی اور آخری حکمران المعتمد علی اللہ (ابو القاسم محمدؐ بن عباد) تھا۔ اس نے ۴۶۱ھ ہجری سے ۴۸۴ھ ہجری تک اشبیلیہ پر حکومت کی۔ وہ نہایت اونچے درجے کا عالم اور شاعر تھا، اس کے ساتھ ہی نہایت بہادر اور فیاض بھی تھا۔ اعتماد رامقیہ اسی کی ملکہ تھی۔

وہ بلدہ رامقہ (واقع اسپین) کی رہنے والی تھی اسی لیے رامقیہ کہلاتی تھی۔ اعتماد بڑی عالمہ اور فاضلہ بی بی تھی اور اس کا شمار ادیبانِ وقت میں کیا جاتا تھا۔ علم و ادب سے اس کے شغف کے کئی دلچسپ واقعات مشہور ہیں۔ (سید امیر علی)

چھٹی صدی ہجری

۱۔ بی بی فاطمہؒ بنتِ المثنّیٰ (عارفہ)
۲۔ بی بی فاطمہؒ بنتِ حسینؒ (عارفہ، واعظہ)
۳۔ بی بی فاطمہ بنتِ محمد سلجوقی (عالمہ، ادیبہ، انشاپرداز)
۴۔ ربیعہ خاتونؒ (عالمہ، فاضلہ، مخیّر)
۵۔ بی بی شمس الضحیٰ (عالمہ، عارفہ)
۶۔ ملکہ رضیع خاتون (مومنہ صالحہ، معارف پرور)
۷۔ بی بی اسماء اندلسیہ (شاعرہ، خطاطہ)
۸۔ بی بی فاطمہ بنتِ نصرؒ (عارفہ)
۹۔ بی بی بنت الکفیریؒ (عالمہ)
۱۰۔ بی بی زینبؒ بنتِ عبدالرحمٰن (عالمہ معلّمہ)
۱۱۔ عصمۃ خاتونؒ (علم دوست، مخیّر، خیرخواہ خلق)
۱۲۔ زمرّد خاتون (علم دوست، فیاض)
۱۳۔ بی بی مَن میلؒ (عارفہ)
۱۴۔ بی بی حفصۃ الرکینۃ (عالمہ، خطیبہ، مجاہدہ)
۱۵۔ بی بی صفیہ بنتِ عبدالملک (طبیبہ، ماہر امراض نسواں)
۱۶۔ بنتِ زُہر (طبیبہ، ماہر امراض نسواں)
۱۷۔ بی بی زینب بنتِ عمروؒ (عالمہ، مخیّر)
۱۸۔ بی بی حفصہ اندلسیہ (عالمہ شاعرہ)
۱۹۔ بی بی اُمّ الہناؒ (عالمہ، شاعرہ، مصنفہ)
۲۰۔ بی بی ستّ العلماء شامیہؒ (عالمہ، واعظہ)
۲۱۔ فخر النساء شہدہؒ (محدثہ، کاتبہ، معلّمہ)
۲۲۔ بی بی سفریؒ (محدثہ)
۲۳۔ ملکہ ترکان خاتون (مدبرہ، قوی دل)
۲۴۔ بی بی جوہرہؒ (عالمہ، واعظہ)
۲۵۔ بی بی بارہ اُمِّ عباس (دانا، مخیّر)
۲۶۔ بی بی تقیہ شامیہ (عالمہ، شاعرہ)

بی بی فاطمہؒ بنت المثنیٰ

چھٹی / ساتویں صدی ہجری میں بہت خدا رسیدہ خاتون گزری ہیں۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی نے سالہا سال ان کی خدمت کی اور اُن سے اکتساب فیض کیا۔ [1] انہوں نے اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں لکھا ہے:-

"میں نے سالہا سال حضرت فاطمہ کی خدمت کی ہے اُس وقت ان کا سن ۹۵ سال سے بھی اوپر تھا لیکن مجھ کو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے سے شرم محسوس ہوتی تھی کیونکہ ان کی صحت ایسی عمدہ تھی کہ چہرے کی تروتازگی کے باعث وہ چودہ سال کی دوشیزہ معلوم ہوتی تھیں۔"

ابن عربی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ فاطمہؒ مجھ سے مخاطب ہوئیں اور فرمایا:

"میں حیران ہوں کہ لوگ خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور پھر روتے ہیں۔ اللہ سے قربت اور محبت تو یہ ہے کہ وہ جس حال میں رکھے اس میں خوش رہیں، رونا کیسا، کیوں بیٹا تیرا کیا خیال ہے؟

میں نے عرض کیا، آپ کا فرمانا بجا اور درست ہے۔

---

[1] شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کا پورا نام ابو بکر محمد بن علی محی الدین الحاتمی الطائی ہے۔ ۵۶۰ھ میں اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں اشبیلیہ چلے گئے جو اس زمانے میں ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ وہ پورے تیس سال اس شہر میں مقیم رہے اور اس دوران میں وہاں کے مشہور علماء اور صوفیہ سے علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایک دن ایک عورت بی بی فاطمہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ میرا شوہر یہاں سے بہت دور ایک شہر میں ہے اگر وہ زیادہ عرصہ وہاں رہا تو

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کی۔ اس کے بعد ۵۹۸ھ میں وہ مشرقی ممالک کی سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور مصر، بغداد، مکہ معظمہ، حلب، بیت المقدس وغیرہ گئے۔ اخیر میں وہ مستقل طور پر دمشق میں مقیم ہو گئے اور وہیں ۶۳۸ھ میں وفات پائی۔ ابنِ عربی تصوف اور بعض دوسرے موضوعات پر اپنی تصنیفات کے عظیم ذخیرے کی بنا پر تاریخ اسلام کی بڑی اہم شخصیت ہیں لیکن اُن کے مقام اور مرتبہ کے بارے میں اربابِ علم میں شدید اختلاف ہے۔ اس اختلاف کو اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"بعض لوگوں کی رائے میں وہ ولی کامل تھے، قطبِ زماں تھے اور علمِ باطنی میں ایسی سند تھے جس میں کلام ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف ایک ایسا گروہ تھا جس کے نزدیک وہ بدترین قسم کے مُلحد تھے۔ آپ کے بہت سے مداح جلیل القدر علما بھی تھے جنہوں نے آپ کے عقائد کی حمایت میں کتابیں لکھیں۔ مثال کے طور پر مجد الدین فیروز آبادی، سراج الدین المخزومی، الفخر الرازی، الجلال السیوطی اور عبد الرزاق الکاسانی کا ذکر کیا جاتا ہے، متاخرین میں سے عبد الوہاب الشعرانی کے نام کا اضافہ کر لینا کافی ہے آپ کے بعض مشہور و ممتاز مخالفین میں رضی الدین بن الخیاط، الذہبی، ابن تیمیہ، ابن ایاس، علی القاری اور جمال الدین محمد بن نور الدین صاحب "کشف الغمۃ عن ہذہ الامۃ" شامل تھے۔ آج بھی ابن العربی کی تصنیفات کے بارے میں اس قسم کا متضاد رویّہ اختیار کیا جاتا ہے یعنی بعض مسلمان انہیں بڑی قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور طریق تصوف میں قدم رکھنے والے ہر شخص کو ان کے مطالعے کی تلقین کرتے ہیں لیکن بعض ان کی مذمت کرتے

(باقی اگلے صفحہ پر)

مجھے ڈر ہے کہ دوسرا نکاح کر لے گا۔ آپ دعا کریں کہ وہ یہاں آ جائے۔"
بی بی فاطمہؓ نے کہا "بہت اچھا" یہ کہہ کر انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہیں اور اپنے پیروؤں کو ان کی تصنیفات پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ محی الدین ابنِ عربی کی تمام تر شہرت ان کے نظریہ "وحدت الوجود" کی وجہ سے ہے جسے انہوں نے بڑی آب و تاب سے پیش کیا ہے۔ لیکن نظریۂ "وحدت الوجود" یا "ہمہ اوست" کے بارے میں علماء و صوفیہ میں سخت اختلافِ رائے ہے بعض تو اس کو من و عن قبول کرتے ہیں اور بعض اس کو سراسر گمراہی قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے بجائے نظریۂ وحدتِ شہود یا ہمہ از دست کے علمبردار ہیں۔

ابنِ عربی کی چند مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) الفتوحات المکیہ
(۲) فصوص الحکم
(۳) الاربعون صحیفہ من الاحادیث القدسیۃ۔
(۴) تاج الرسائل و منہاج الوسائل
(۵) انشاء الدوائر
(۶) الصلوٰۃ الاکبریہ
(۷) مختصر فی مصطلحات صوفیہ
(۸) مفاتیح الغیب
(۹) مجموع الرسائل الالہیۃ
(۱۰) محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار فی الادبیات والنوادر والاخبار
(۱۱) ذخائر الاعلاق
(۱۲) روح القدس

(باقی اگلے صفحہ پر)

شروع کر دی۔ ابنِ عربی بھی ان کے پاس موجود تھے کہ ایک صورت فاطمہ کے سامنے آئی انہوں نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"فلاں شہر میں جا اور اس عورت کے خاوند کو یہاں لے آ۔"

ابنِ عربی کہتے ہیں کہ تھوڑی ہی مدت کے بعد اس عورت کا خاوند واپس آ گیا حضرت فاطمہؒ کے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور اس شخص کے آنے میں صرف اتنی دیر لگی جتنی کہ اس مسافت کو معمولاً طے کرنے میں لگتی تھی۔ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ذریعے کئی مؤکلات حضرت فاطمہؒ کے تابع تھے۔

(مشاہیر نسواں وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

(۱۳) شجرۃ الکون

(۱۴) قصیدہ المعشرات

(۱۵) مواقع النجوم ومطالع اھلۃ الاسرار والعلوم

(۱۶) القرعۃ المبارکۃ المیمونۃ والدرۃ الثمینۃ المصونۃ

(۱۷) قرعۃ الطیور لاستخراج الفال والضمیر

(۱۸) تحفۃ السفرہ الیٰ حضرۃ البررۃ

(۱۹) رد المعانی الآیات المتشابہات الی معانی الآیات المحکمات

(۲۰) تفسیر

(۲۱) دیوان

بی بی فاطمہؒ بنتِ حسین

حسین بن حسن کی صاحبزادی تھیں ۔ بڑی باکمال اور خدارسیدہ خاتون ہوئی ہیں۔ نہایت فصیح و بلیغ اور پُرتاثیر وعظ کہا کرتی تھیں۔ ان کی مجالسِ وعظ میں خواتین کا بہت بڑا مجمع ہوا کرتا تھا اور اکثر گمراہ بیبیاں ان کے وعظ کی تاثیر سے راہِ ہدایت پر گامزن ہو جاتی تھیں ۔

بی بی فاطمہؒ نے سنہ ۵۲۱ ہجری میں وفات پائی ۔

(خزینۃ الاصفیاء)

بی بی فاطمہؒ بنت محمدؒ سلجوقی

سلطان غیاث الدین ابو شجاع محمدؒ سلجوقی (۴۹۸ھ تا ۵۱۱ھ) بن سلطان ملک شاہ سلجوقی کی دخترِ نیک اختر تھی۔ اس کی شادی اکتسویں عباسی خلیفہ ابو عبداللہ المکتفی لامراللہ (۵۳۰ھ تا ۵۵۵ھ) بن مستظہر باللہ کے ساتھ ہوئی۔ نہایت عالمہ فاضلہ اور مہذب خاتون تھی۔ نہ صرف خانگی آداب میں بلکہ ملکی معاملات میں بھی اعلیٰ بصیرت رکھتی تھی۔ وہ اکثر اپنے شوہر (المکتفی لامراللہ) کے لیے فرامین و مراسلات لکھتی اور پڑھتی تھی۔ سیاسی امور میں اس کی رائے نہایت صائب ہوا کرتی تھی۔ اس کی بے نظیر صلاحیتوں کی وجہ سے اس کی اقامت گاہ " درگاہ خاتون " کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی ۔

فاطمہؒ بنتِ محمدؒ نے سنہ ۵۴۲ھ میں وفات پائی۔ (سید امیر علی)

ربیعہ خاتونؒ

نجم الدین ایوب کی بیٹی اور مجاہدِ اعظم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ فاتح بیت المقدس کی بہن تھی۔ بڑی عالمہ فاضلہ اور مخیر خاتون تھی۔ اس نے دمشق (شام) کے مقام جبل قاسیون میں ایک عظیم الشان دینی مدرسہ تعمیر کروایا جو "مدرسہ خاتونیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ربیعہ خاتون نے اس مدرسہ کے لیے ایک بڑی جائداد وقف کی جس کی آمدنی سے اس مدرسہ کے تمام اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ ربیعہ خاتون کی وفات کے بعد اس کی آخری آرام گاہ اسی مدرسہ کے اندر بنائی گئی۔ یہ مدرسہ کسی نہ کسی صورت میں اب بھی قائم ہے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مدرسہ کے علاوہ ربیعہ خاتون نے دمشق میں ایک خانقاہ بھی بنوائی تھی جو خانقاہِ خاتونیہ کے نام سے مشہور تھی۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی شمس الضحیٰؒ

ان کا شمار چھٹی صدی ہجری کی نامور عالمات و عارفات میں ہوتا ہے۔ شیخ محمد بن عبد الجلیلؒ کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے پہلے علمِ حدیث کی تحصیل بڑی محنت سے کی اس کے بعد ان کا رجحانِ طبع زہد و تصوف کی طرف ہو گیا چنانچہ شیخ الطریقت ضیاء الدین ابو النجیب سہروردیؒ (المتوفی ۵۶۳ھ) سے تصوف کی تعلیم و تربیت حاصل کی پھر بیشمار خواتین کو اپنے فیوض و برکات سے بہرہ ور کیا۔ زہد و اتقا اور علم و فضل میں اپنی مثال آپ تھیں۔

(خواتینِ اسلام کی دینی اور علمی خدمات)

رضیع خاتون

معین الدین انار[1] کی بیٹی اور سلطان نورالدین محمود زنگیؒ[2] کی بیگم تھی۔

"دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں ہے کہ اس کا اصل نام "خاتون" تھا لیکن بعض مؤرخین نے وثوق کے ساتھ اس کا نام رضیع خاتون لکھا ہے۔ سلطان نورالدین محمودؒ

---

[1] معین الدین انار دمشق کے خاندانِ بورمین کے آخری فرمانروا مجیر الدین ایبک کا وزیر اعظم تھا۔ مجیر الدین ایبک نے سلطنت کے سیاہ و سپید کا مالک اسی کو بنا رکھا تھا۔ وہ بورمین کا دل و جان سے بہی خواہ تھا۔ ۵۴۳ھ میں اس نے کئی ماہ تک صلیبی حملہ آوروں کا بڑی استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ سلطان نورالدینؒ کو خبر ہوئی تو وہ ایک بھاری لشکر لے کر اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ صلیبیوں نے اس کی پیشقدمی کی خبر سنی تو دمشق کا محاصرہ اٹھا کر یروشلم کی طرف چلے گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد معین الدین انار نے وفات پائی۔

[2] الملک العادل سلطان نورالدین محمود زنگیؒ نامور فرمانروایانِ اسلام کی سلکِ مروارید کا ایک دُرِ بے بہا تھا۔ بعض مؤرخین نے خلفائے راشدینؓ کے بعد اس کو تمام فرمانروایانِ اسلام میں سب سے بہتر قرار دیا ہے۔ وہ صلیبیوں کے سب سے بڑے حریف عماد الدین زنگی شہیدؒ (المتوفی ۵۴۱ھ) والیِ موصل کا فرزند تھا۔ ۱۷ شوال ۵۱۱ھ کو پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ اپنے اوصاف و محاسن کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ خشیتِ الٰہی، زہد و تقویٰ، جود و سخا، شوقِ جہاد، علم و فضل، عدل و انصاف، خدمتِ خلق، پابندیٔ شریعت، تبلیغِ حق اور اشاعتِ تعلیم کی بدولت اولیاء اللہ کی صف میں شامل کیے جانے کا مستحق ہے۔ اس کی راتیں مصلّے پر اور دن میدانِ جہاد میں گزرتے تھے۔ اپنے مجاہد والد کی شہادت کے بعد اس نے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے اس کی شادی ۵۴۱ھ/۱۱۴۷ء میں ہوئی۔ وہ نہایت اعلیٰ سیرت اور کردار کی مالک تھی۔ گھر کا سارا کام کاج اپنے ہاتھ سے کرتی تھی اور سلطان جو معمولی رقم اسے دیتا اسی سے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے سلطان سے کہا کہ آپ جو کچھ مجھے دیتے ہیں اس سے گھر کا خرچ بمشکل پورا ہوتا ہے اس لیے میرے نفقہ میں کچھ اضافہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

عنانِ حکومت سنبھالی تو صلیبیوں پر پے در پے ایسی ضربیں لگائیں کہ وہ اپنے شہر اور قلعے اس کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسری صلیبی جنگ میں صلیبی جنونیوں (CRUSADERS) نے دمشق کا محاصرہ کیا تو وہ ایک جرار لشکر لے کر دمشق کے محصور مسلمانوں کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی پیش قدمی کی اطلاع ملتے ہی صلیبی محاصرہ اٹھا کر فلسطین کی طرف بھاگ گئے۔ اس کے بعد سلطان مصر کی طرف متوجہ ہوا جو صلیبیوں کی سازشوں اور حملوں کا ہدف بنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سپہ سالار شیر کوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین کو ایک زبردست فوج دے کر مصر بھیجا۔ انہوں نے عیسائیوں کو شکست دے کر مصر سے نکال دیا۔ اس کے بعد شیر کوہ نے فاطمی خلیفہ العاضد کا وزیر بن کر مصر کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے وفات پائی تو صلاح الدین اس کا جانشین بنا۔ اس نے ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں فاطمی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح مصر بھی سلطان نور الدین کے زیر نگین ہو گیا اور وہ شام اور مصر دونوں ملکوں کا فرمانروا بن گیا۔

سلطان نور الدین کی سب سے بڑی تمنا تھی کہ بیت المقدس کو صلیبیوں کے پنجے سے چھڑائے لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں یہ تمنا دل میں لیے ہوئے فوت ہو گیا۔ سلطان نور الدین محمودؒ نے اپنی زندگی میں تمام دشمن طاقتوں کو لوہے کے چنے چبوا دیئے۔ اس کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو دی اور چند سال بعد اس نے بیت المقدس پر پرچم اسلام بلند کر دیا۔ (حیاتِ نور الدین محمودؒ)

کر دیجئے۔ سلطان نے خشمگین ہو کر جواب دیا:

"میرے پاس تین دکانوں کے کرایہ کی آمدنی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تم کو اسی قدر آمدنی پر گزر اوقات کرنی ہوگی۔ خدا کی قسم میں تمہاری خاطر اپنے پیٹ کو دوزخ کی آگ سے نہیں بھروں گا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میرے قبضے میں بڑے بڑے ملک اور ان کے خزانے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ سب کچھ عام مسلمانوں کا ہے میں تو صرف ان کا خزانچی ہوں۔ مجھے مطلق اختیار نہیں ہے کہ سرکاری خزانہ کو اپنی ذات یا اپنے اہل و عیال پر صرف کروں۔ یہ مال دشمنانِ خدا کے خلاف جہاد یا مسلمانوں کی بہبود کے کاموں کے لیے وقف ہے۔ حمص کی تین دکانیں میں تمہیں ہبہ کرتا ہوں۔ تمہیں اختیار ہے کہ خواہ ان کو فروخت کر ڈالو یا ان کا کرایہ وصول کرتی رہو۔"

بیگم بھی بڑی باخدا خاتون تھی، سلطان کا جواب سن کر خاموش ہو گئی اور پھر زندگی بھر اس سے اپنے نفقہ میں اضافہ کا مطالبہ نہ کیا۔

رضیع خاتون کے بطن سے سلطان نورالدین کے صرف دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام اسمٰعیل تھا اور لڑکی کا نام شمس النسّاء۔ سلطان نورالدین ملکہ رضیع خاتون کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اس کے سوا کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کی۔ اس کی وفات (۵۶۹ھ / 1173ء) کے تین سال بعد ۵۷۲ھ / 1176ء میں رضیع خاتون نے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ سے نکاح ثانی کر لیا۔

رضیع خاتون بہت مخیّر اور معارف پرور بی بی تھی۔ اگرچہ اس کے گھریلو اخراجات محدود تھے لیکن رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے اس کو سرکاری خزانے سے رقم مل جاتی تھی چنانچہ اس نے دمشق میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا جو اس کے نام کی نسبت سے خاتونیہ کہلایا۔ یہ مدرسہ بعد میں حوادث زمانہ کی نذر ہو گیا۔ دمشق کے باب النصر کے باہر اس نے ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی۔ اس نیک بی بی نے محرم ۵۸۱ھ / 1185ء میں وفات پائی۔ (حیاتِ نورالدین محمود۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

بی بی اسماء اندلسیہ

چھٹی صدی ہجری میں بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون گزری ہے۔ اندلس کے شہر اشبیلیہ کی رہنے والی تھی۔ اس کا تعلق قبیلہ بنی عامر سے تھا۔ شعر و شاعری اور فن کتابت میں بھی بہت اونچا مقام رکھتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے مراکش اور اندلس کے فرمانروا اور موحدین کے سردار عبدالمؤمن (المتوفی ۵۵۸ھ ہجری) کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو اپنی شکستہ حالی سے آگاہ کیا۔ اس قصیدے کے دو شعر یہ تھے

عرفنا النصر والفتح المبینا	ہم نے نصر اور فتح مبین کو پہچان لیا'
لسیدنا امیر المؤمنینا	اپنے آقا و سردار امیرالمؤمنین کے لیے
اذا کان الحدیث عن المعالی	جب بھی اعلیٰ مراتب و معالی کے بارے میں گفتگو ہوگی تو
رایت حدیثکم فیہا شجونا	دیکھے گا کہ تمہاری باتوں کی حیثیت ان باتوں کی

سی ہوگی جو تمہیں غم و اندوہ میں مبتلا کرتی ہیں۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی فاطمہؒ بنتِ نصر

نصر بن عطار کی صاحبزادی تھیں۔ زہد و عبادت میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ عرصہ تک مجاہدات میں مشغول رہیں اور ایک خدا رسیدہ خاتون کی حیثیت سے شہرت پائی۔ لوگوں میں ان کی کرامات کا بہت چرچا تھا۔ ان کو پردہ کا خاص اہتمام تھا۔ ساری عمر میں صرف تین مرتبہ گھر سے باہر قدم نکالا۔

یہ عارفہ باکمال ۵۷۳ھ ہجری میں اس عالم فانی سے رخصت ہوئیں۔ (خزینۃ الاصفیا)

بنت الکنیزیؒ

ان کا شمار چھٹی صدی ہجری کی نامور عالمات میں ہوتا ہے۔ مدینۃ الاسلام بغداد کے مشرقی حصے میں رہتی تھیں۔ یوں تو وہ سارے علوم مروجہ میں دسترس رکھتی تھیں لیکن علمِ نحو اور علم لغت میں ان کو درجۂ کمال حاصل تھا۔ ان دونوں علوم میں انہوں نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن کی بناء پر بہت مشہور ہو گئی تھیں۔ (معجم اہل الادب۔ یاقوت حموی)

بی بی زینبؒ بنتِ عبدالرحمٰن

ان کی کنیت ام المؤید تھی۔ انہیں حرہ بھی کہا جاتا ہے۔ والد کا نام ابوالقاسم عبدالرحمٰن (ابن حسن بن احمد بن سہل بن احمد بن عبدوس مرجانی تھا) ۵۲۴ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ سنِ شعور کو پہنچ کر ہمہ تن تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئیں اور اپنے عہد کے نامی گرامی فقہاء سے سندِ فضیلت حاصل کی۔ علم و فضل کے اعتبار سے وہ اپنے دور کے چوٹی کے علماء کی ہم پلہ تھیں۔ بالخصوص علم فقہ میں خاص امتیاز رکھتی تھیں۔ ان کے تبحرِ علمی اور فضل و کمال کے وہ علماء و فقہاء بھی معترف تھے جن کو اپنے وقت کا امام کہا جاتا تھا۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ بی بی زینبؒ نے کسی شخص کی استدعا پر اجازہ بھی لکھا تھا۔ عباسی خلفاء نے ان کو اجازت دے رکھی تھی کہ نہ صرف بغداد بلکہ عباسی سلطنت میں کسی بھی جگہ اپنی درسگاہ قائم کریں اور وہاں فقہ کا درس دیا کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے فیضانِ علمی سے بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

بی بی زینبؒ نے ۶۱۵ھ ہجری میں وفات پائی (ابن خلکان)

عصمۃ خاتون

الملک الناصر سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی[1] کی بیگم تھی۔ بعض نے اس کا نام عصمیہ خاتون لکھا ہے۔ نہایت نیک فطرت، دانشمند، علم دوست اور مخیر خاتون تھی۔ اپنے اولوالعزم اور صاحبِ خیر شوہر کی طرح رفاہِ عامؒ کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔

عہدِ صلاح الدین کا نامور مؤرخ اور ادیب عماد کاتب (عماد الدین محمد بن محمد الکاتب اصفہانی المتوفی سن ۵۹۰ھ ہجری) عصمۃ خاتون کے ذکر میں

---

[1] سلطان صلاح الدین یوسف ایوبیؒ ہماری تاریخ کا وہ بطلِ جلیل ہے جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ وہ سنہ ۵۳۲ھ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ نجم الدین ایوب اور چچا اسد الدین شیرکوہ سلطان نورالدین محمود زنگیؒ کے سرکردہ امراء میں سے تھے۔ اپنے اوصاف و خصائل کی بناء پر صلاح الدین نے بھی سلطان نورالدینؒ کا تقرب حاصل کر لیا۔ سنہ ۵۵۶ھ میں سلطان نورالدین نے شیرکوہ اور صلاح الدین کو مصر بھیجا جہاں فاطمی خلیفہ العاضد کے وزیروں کے درمیان خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے اس خانہ جنگی کا خاتمہ کیا اور العاضد نے شیرکوہ کو اپنا وزیر مقرر کیا مگر وہ جلد ہی فوت ہو گیا اور سنہ ۵۶۴ھ میں اس کی جگہ صلاح الدین وزیر بنا۔ محرم سنہ ۵۶۷ھ میں العاضد کی وفات کے بعد صلاح الدین نے سلطان نورالدین کی طرف سے مصر پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۵۶۹ ہجری میں سلطان نورالدین فوت ہوا تو اس کا گیارہ سالہ فرزند صالح اسمٰعیل مسندِ حکومت پر بیٹھا مگر اس کے عمائدِ سلطنت نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ صلاح الدین کو یہ خبریں ملیں تو اس نے ان جھگڑوں کو نمٹانے کی کوشش کی لیکن اس کی نصیحتوں کا ان پر کوئی اثر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لکھتا ہے : ـــــــ

"وہ فیاضی میں نہایت دلیر تھی۔ فقراء کے مواجب مقرر کر رکھے تھے۔ فقیہوں اور زاہدوں کے لیے مہمان سرائیں اور مدرسے جاری کیے۔ معلمین کی تنخواہیں مقرر کیں۔ طلباء کو کھانا اور لباس اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ز ہوا اُٹھا انہوں نے ملک صالح کو بھی صلاح الدین کے خلاف کر دیا۔ آخر وہ ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گیا اور اس طرح لڑا کہ کوئی مخالف مقابلے پر نہ ٹھہر سکا۔ چنانچہ مصر کے ساتھ شام کی حکومت بھی اس کے قبضے میں آگئی۔ عباسی خلیفہ نے اسے سلطان کا خطاب دیا اور خلعت کے ساتھ حکومت کی سند بھی بھیجی۔ سلطان صلاح الدین نے ملک صالح کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا اور حلب اور اس کے آس پاس کا علاقہ اسے دے دیا۔ ملک صالح نے ۵۷۷ھ ہجری میں وفات پائی تو ترک امیروں کی باہمی دشمنیوں نے پھر سر ابھارا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے مسلمانوں کی سرحدوں پر دھاوا بول دیا۔ سلطان صلاح الدینؒ نے طبریہ کی جھیل کے کنارے انہیں عبرت ناک شکست دی۔ اس کے بعد اس نے رملہ، قیساریہ، یافہ، بیروت، نابلس، عسقلان وغیرہ کو فتح کیا اور پھر ۵۸۳ھ ہجری میں یروشلم (بیت المقدس) کی طرف بڑھا جس پر پچھلے نوّے سال سے صلیبی قابض چلے آ رہے تھے۔ کچھ عرصہ تو صلیبیوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن پھر مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان شہر میں داخل ہوا تو اس نے شہر کے سب باشندوں کو امان دے دی حالانکہ صلیبیوں نے یروشلم پر قبضہ کرتے وقت نہایت بے دردی سے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔

یروشلم کی فتح کی خبر یورپ پہنچی تو ہر طرف آگ سی لگ گئی۔ جرمنی، فرانس اور انگلستان وغیرہ کے فرمانروا اپنی اپنی فوجیں لے کر ارضِ فلسطین پر چڑھ دوڑے لیکن مجاہدِ اعظم صلاح الدینؒ نے انہیں تباہ کن شکست دی اور وہ خائب و خاسر واپس گئے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے ہاں سے ملتا تھا۔ دمشق میں حمام سر کسی کے پاس محلہ حجر الذہب میں مشہور درس گاہ اور بڑی سرائے باب النصر کے باہر مہمان خانہ اسی نیک خاتون کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے وقف کیے ہوئے مکانات اور انعامات سے مدت دراز تک لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔"

اس نیک بی بی نے اپنے صرف سے کئی مسجدیں بھی تعمیر کرائیں جو آج تک اس کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ (حیاتِ صلاح الدین)

زمرّد خاتون

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی بہن تھی۔ عام طور پر ست الشام (شام کی ملکہ) کے لقب سے مشہور ہے۔ نہایت نیک، علم دوست اور فیاض خاتون تھی۔ اس نے دمشق میں ایک عظیم الشان دار العلوم بنوایا اور اس دور کے ایک نامور فقیہ شیخ عثمان بن عبدالرحمٰن بن الصلاح شہرزوری کو بلا کر اس کا پرنسپل (صدرِ اساتذہ) مقرر کیا — یہ دار العلوم شہر کی تمام درس گاہوں میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ (دائرۃ المعارف)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ۔ اسلام کے اس بطلِ جلیل نے ۲۷ صفر ۵۸۹ھ ہجری کو وفات پائی۔ وہ بڑا دیندار، عادل، فیاض، خدا ترس اور معارف پرور حکمران تھا۔ اس کے عدل و انصاف نیکی اور سخاوت کے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ خود یورپ کے لوگ بھی اس کی عظمتِ کردار کا اعتراف کرتے ہیں اور اسے "صلاح الدین اعظم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (حیاتِ صلاح الدین۔ تاریخِ اسلام۔ وغیرہ)

بی بی مَن میلؒ

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ کے خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (المتوفی ۶۳۳ھ) کی دایہ تھیں اور انہوں نے خواجہ بختیار کاکیؒ کو ان کے زمانۂ طفولیت میں اپنا دودھ پلایا تھا۔ اس نسبت سے وہ خواجہ صاحبؒ کی رضاعی ماں تھیں۔ ان کا تعلق ماوراء النہر (وسط ایشیا) کے ایک شہر اوش کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ خواجہ بختیار کاکیؒ اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ بی بی من میل کا مکان خواجہ صاحبؒ کے والدین کے پڑوس میں تھا۔ وہ بڑی نیک سیرت اور خداترس خاتون تھیں۔ اپنا بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں گزارتی تھیں۔ اصل نام کچھ اور ہوگا مگر ہندوستان میں وہ مَن میل (دلوں کو جوڑنے والی) کے لقب یا نام سے مشہور ہوئیں۔

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ عنفوانِ شباب میں حضرت خواجہ اجمیریؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہوگئے اور اُن سے خرقۂ خلافت حاصل کیا، پھر طویل عرصہ ریاضت و مجاہدہ اور سیاحت میں گزارا۔ اس اثناء میں خواجہ اجمیریؒ ہندوستان تشریف لا چکے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ بھی مرشدِ گرامی کی خدمت میں ہندوستان پہنچ گئے۔ حضرت خواجۂ خواجگانؒ نے تو اجمیر میں مستقل اقامت اختیار کی اور حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کو اپنا خلیفۂ اعظم بنا کر دہلی بھیج دیا۔ وہ دہلی اور اس کے نواحی علاقے میں تبلیغِ اسلام اور سلسلہ چشتیہ کے فروغ کے ذمہ دار تھے۔ بی بی من میل اس وقت حیات تھیں۔ خواجہ بختیار کاکیؒ ان کے مرتبہ شناس تھے۔ انہوں نے ان کو اوش سے دہلی بلا لیا اور خرقۂ خلافت دے کر دہلی کی مستورات کی ہدایت کے لیے مامور فرمایا۔ انہوں نے اپنے فرائض بڑی تندہی سے انجام دیئے اور ہزارہا خواتین ان سے کسبِ فیض کر کے صاحبِ کمال ہوگئیں۔ حضرت بختیار کاکیؒ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور اپنے گھر کا سارا انتظام ان کے سپرد کر رکھا تھا۔ بی بی من میلؒ

پردہ کی سخت پابند تھیں۔ وہ نہ کبھی گھر سے باہر نکلتی تھیں اور نہ کبھی گھر کے مردانہ حصے میں قدم رکھتی تھیں۔

بی بی من میںؒ نے غالباً ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں وفات پائی۔ ان کا مزار دہلی میں خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار سے متصل مسجدِ کہنہ کے مقابل واقع ہے۔

(تذکرہ اولیائے ہند)

حفصۃ الرکینہ

اندلس یا ہسپانیہ (سپین و پرتگال) کو مسلمانوں نے پہلے پہل ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں فتح کیا تھا۔ ۹۲ھ (۷۱۱ء) سے ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) تک اس پر ۱۹ گورنروں نے حکومت کی۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد جب بنو عباس برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے اموی خاندان کے سربرآوردہ لوگوں کو چن چن کر مار ڈالا البتہ ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن بن معاویہ کسی طرح جان بچا کر مصر ہوتا ہوا شمالی افریقہ جا پہنچا اور بنو امیہ کے ہوا خواہوں کی مدد سے ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) میں اندلس کا فرمانروا بن گیا۔ اموی خاندان نے اندلس پر ۴۲۲ھ (۱۰۳۱ء) تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس کے بعد ان کی ہوا اکھڑ گئی اور ملک طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ اس صورتِ حال کو شمالی افریقہ کے عظیم مرابطی فرمانروا یوسف بن تاشفین نے ۴۹۰ھ (۱۰۹۶ء) میں ختم کیا اور اندلس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مرابطین کے زوال کے بعد ۵۴۱ھ (۱۱۴۶ء) میں اندلس پر مُوحّدین کا قبضہ ہو گیا۔ پہلے مُوحّد فرمانروا عبدالمومن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابو یعقوب یوسف ۵۵۸ھ (۱۱۶۳ء) میں مراکش میں تخت نشین ہوا۔ ۵۶۷ھ (۱۱۷۲ء) میں وہ اندلس کے مغربی اضلاع کو عیسائی باغیوں کے قبضے سے چھڑانے کے لیے اندلس آیا اور باغیوں کو پے بہ پے شکستیں دے کر تمام ملک پر اسلامی اقتدار بحال کر دیا۔ ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں وہ باغیوں کی سرکوبی

کے لیے دوبارہ اندلس آیا اور عیسائیوں کے ایک اہم قلعے شنمرین کا محاصرہ کرلیا! اثنائے محاصرہ میں وہ شدید زخمی ہو کر فوت ہو گیا۔ اس کی لاش مراکش لے جا کر دفن کی گئی اور اس کی جگہ ابو یوسف یعقوب المنصور تخت نشین ہوا۔ ادھر اندلس میں ابو یعقوب یوسف کی شہادت کے بعد عیسائیوں نے بڑی طاقت پکڑ لی اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ وہ مسلمانوں کی بستیوں پر آئے دن ڈاکے ڈالتے تھے اور مسلمان آبادی کو بے دریغ قتل کر ڈالتے تھے۔ اسی زمانے میں اشبیلیہ کی ایک مسلم خاتون نے مسلمانوں کی غیرت اور حمیت کو جھنجوڑا اور ان کو تلقین کی کہ متحد ہو کر عیسائی غارت گروں کے مقابلے پر ڈٹ جاؤ۔ یہ خاتون حفصۃ المرکینہ تھیں۔ وہ بڑی عالمہ فاضلہ دیندار فیاض اور بہادر بی بی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جوہر خطابت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے پُرجوش خطبوں سے اندلسی مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دی اور صلیبی جنونیوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونے کے بجائے ان کے دلوں میں شوقِ جہاد و شہادت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اب وہ ہر مقام پر عیسائیوں کا زبردست مقابلہ کرنے لگے لیکن ان کی کثیر تعداد اور بے پناہ ساز و سامان کی وجہ سے مسلمانوں پر شدید دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حفصۃ المرکینہ نے سلطان یعقوب المنصور کو ایک خط لکھا جس میں اندلسی مسلمانوں پر عیسائیوں کے مظالم کے واقعات تفصیل سے بیان کیے اور سلطان سے اندلس پہنچنے کی درخواست کی۔ یہ خط ملتے ہی سلطان یعقوب المنصور سنہ ۵۸۶ھ (۱۱۹۰ء) میں ایک جرار لشکر کے ساتھ مراکش سے اندلس پہنچ گیا اور غارت گر عیسائی حکمرانوں اور صلیبی جنونیوں کو تابڑ توڑ شکستیں دے کر ان کا کچومر نکال دیا۔ پھر مسلمانوں کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کر کے مراکش کو مراجعت کی۔ سنہ ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) سے سنہ ۵۸۶ھ (۱۱۹۰ء) تک کے پُرآشوب دور میں بی بی حفصۃ المرکینہ نے جس ہمت اور پامردی سے مسلمانوں میں جذبۂ جہاد بیدار کیا اس نے اُن کا نام زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ (اخبار الاندلس۔ خلاصۃ موحدین۔ شرف النساء)

بی بی صفیہ بنتِ عبدالملک

اندلس (Spain) کے نامور طبیب ابومروان عبدالملک بن ابی العلاء زُہر[1] کی صاحبزادی تھی۔ وہ علم طب (بالخصوص امراض نسواں) میں بڑی ماہر تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس نے قابلہ گری یعنی وضع حمل کرانے (Obstetrics) کی خصوصی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا بھائی ابوبکر محمد بن عبدالملک (جو الحفید کے لقب سے مشہور ہے) دولتِ موحدین کے تیسرے فرمانروا یعقوب المنصور باللہ (۵۸۰ھ تا ۵۹۵ھ)[2] کا طبیبِ خاص تھا۔ صفیہ اکثر اپنے

---

[1] ابومروان عبدالملک کے خاندان کا مورث اعلیٰ زُہر نامی ایک شخص تھا۔ اسی زُہر کی نسل سے یکے بعد دیگرے کئی ایسے نامور اطباء پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے علم وفضل اور مہارت فن سے دنیا میں غلغلہ ڈال دیا۔ ابومروان عبدالملک کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابومروان عبدالملک بن ابی العلاء زہر بن ابومروان عبدالملک بن ابوبکر محمد بن مروان بن زُہر۔ سب اپنے دور کے نامور اطباء تھے اور علم وفضل سے بھی بہرہ ور تھے۔ مورخین جب کسی تخصیص کے بغیر "ابن زُہر" کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی مراد ابومروان عبدالملک بن ابی العلاء زُہر سے ہوتی ہے۔ مستشرقین نے ان کو Abhomeron Avenzoar یا مختصر Avenzoar کا نام دیا ہے۔ وہ ۴۸۴ھ اور ۴۸۶ھ کے درمیان کسی وقت پیدا ہوئے اور ۵۵۷ھ میں وفات پائی۔ اپنے دور کے سر آمدِ روزگار طبیب تھے۔ مرابطین کے دورِ حکومت میں اندلس سے مراکش چلے گئے۔ پہلے موحد فرمانروا عبدالمومن نے انہیں اپنا طبیب خاص اور وزیر مقرر کر دیا تھا۔ وہ پہلے عرب طبیب ہیں جنہوں نے سانس کی نالی پر عمل جراحی (Tracheotomy) کیا اور حلقوم اور حقنہ کے ذریعے پیٹ کے اندر مصنوعی طریقے سے غذا پہنچانے کا تجربہ کیا۔ ("نگار" علماء اسلام نمبر، مسلمان اور سائنس کی تحقیق)

[2] یعقوب المنصور باللہ کا عہد حکومت دولتِ موحدین کے انتہائی عروج (باقی اگلے صفحہ پر)

بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ خلیفہ یعقوب المنصور باللہ کے حرم میں کوئی خاتون بیمار ہو جاتی یا زچگی میں ہوتی تو بی بی صفیہ ہی کو علاج معالجہ کے لیے بلایا جاتا کیونکہ خلیفہ اپنے گھر میں کسی اور کا معالجہ پسند نہ کرتا تھا۔

ابن ابی اصیبعہ[1] نے "طبقات الاطباء" میں لکھا ہے کہ:

"صفیہ، الحفید کی ہمشیرہ، صناعتِ طب اور معالجاتِ نسواں میں بڑی مہارت رکھتی تھی اور خلیفہ کے گھر کی عورتوں کا علاج کیا کرتی تھی۔"

(یعقوب المنصور باللہ، مسلمان اور سائنس کی تحقیق)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کا زمانہ ہے اس کی شوکت و سطوت، معارف پروری اور جہاد کے معرکوں میں اس کی کامیابیوں کے حالات تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ اگر ایک طرف افریقہ میں اس کے اقتدار کا پھریرا، مراکش، تیونس، الجزائر اور لیبیا وغیرہ پر لہرا رہا تھا تو دوسری طرف اس کا پرچم اقبال اسپین اور پرتگال پر لہرا رہا تھا۔ اس نے سال ۵۹۱ھ میں مراکش سے اندلس جا کر معرکۂ الارک میں الفانسو ہشتم کو ایسی عبرت ناک شکست دی کہ اس نے اپنی ماں اور گھر کی بیٹیوں کو خلیفہ کے پاس بھیج کر اس کا جذبۂ رحم بیدار کیا اور اپنی جان بخشی کرائی۔ معرکۂ الارک کا شمار دنیا کی مشہور لڑائیوں میں ہوتا ہے۔

[1] ابن ابی اصیبعہ موفق الدین ابو العباس احمد بن القاسم السعدی الخزرجی دمشق میں سنہ ۶۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۶۶۹ھ میں وفات پائی۔ مشہور طبیب اور مورخ نگار تھے۔ علمِ طب میں وہ ابن البیطار کے شاگرد تھے۔ نامور اطبا کے حالات میں ان کی کتاب "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" بہت مشہور ہے۔

(یعقوب المنصور باللہ)

بنتِ زُہر

بعض روایات کے مطابق یہ ابوبکر محمدؒ (الحفید)[1] بن عبدالملک (ابنِ زُہر) کی بیٹی تھی اور بعض کے مطابق خواہر زادی (بھانجی)۔ وہ بھی امراضِ نسواں کے علاج میں بڑی مہارت رکھتی تھی۔ قابلہ گری کی تعلیم اس نے بطورِ خاص حاصل کی تھی۔ وہ بھی بی بی صفیہ (والدہ یا پھوپھی) کے ساتھ محلاتِ شاہی میں خواتین کے علاج کے لیے جایا کرتی تھی۔ ابنِ ابی اصیبعہ نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں ایک

---

[1] ابوبکر محمد (الحفید) اس خاتون کے والد تھے یا ماموں، بہر صورت وہ ابنِ زُہر" ہی کے خاندان کی ایک فرد تھیں۔ الحفید (سالِ ولادت ۵۰۴ھ) پر خلیفہ یعقوب المنصور باللہ بہت مہربان تھا۔ وہ ان کے تبحرِ علمی اور کمالِ فن کا معترف تھا اور اس نے انہیں اندلس سے مراکش بلا کر اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا تھا۔ وہ اُن کو اکثر انعام واکرام سے نوازتا رہتا تھا۔ بدقسمتی سے خلیفہ کے وزیر ابو زید عبدالرحمٰن بن موسٰی بن یوجان نہتانی کو "الحفید" سے یہ دیکھ کر حسد پیدا ہوگیا کہ خلیفہ ان کا حد سے زیادہ اعزاز و اکرام کرتا ہے اور ان کے خاندان کی خواتین کی محلاتِ شاہی میں آمدورفت کی وجہ سے ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے ابوبکر محمد (الحفید) اور ان کی بیٹی (یا بھانجی) کو زہر دلوا دیا جس کے اثر سے دونوں فوت ہوگئے۔ مؤرخین نے یہ تصریح نہیں کی کہ یہ سانحہ کس سال پیش آیا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جگہ لکھا ہے :

"صفیہ، ابوبکر کی بہن اور بھانجی دونوں طب میں ماہر تھیں اور معالجۂ نسوانی سے متعلق علوم پر ان کو وقوف حاصل تھا۔ یہ دونوں منصور کے حرم میں علاج کے لیے جایا کرتی تھیں۔" (مشاہیر نسواں)

بی بی زینب بنتِ عمرو

عمرو بن کندی کی بیٹی تھیں۔ چھٹی صدی ہجری میں ان کے علم و فضل اور جود و سخا کی تمام دنیائے اسلام میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ اللہ نے انہیں علم کے ساتھ مال بھی دیا تھا۔ وہ اس مال کو بے دریغ راہِ خدا میں صرف کرتی رہتی تھیں۔ انہوں نے بہت سے غریب خانے بنوائے اور انہیں راہِ خدا میں وقف کر دیا۔ (مشاہیر النساء)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

خلیفہ یعقوب المنصور باللہ کو ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ اس نے الحفید کی نمازِ جنازہ خود پڑھائی اور انہیں ایک شاندار باغ میں دفن کیا۔

ابوبکر محمد (الحفید) نے کئی تصنیفات بھی اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے "طب العیون" اور "ذکر الترياق الخمسين" نے بڑی شہرت پائی۔

(یعقوب المنصور باللہ، مسلمان اور سائنس کی تحقیق)

بی بی حفصہ اندلسیہ

شہر رکونہ (اسپین) کی رہنے والی تھی۔ حسن وجمال، حسب ونسب، دانش وحکمت اور علم وفضل میں شہرۂ آفاق تھی۔ ایک دفعہ وہ عسرت میں مبتلا ہوگئی تو دولتِ موحدین کے نامور فرمانروا عبدالمومن (سنہ ۵۲۴ ہجری تا سنہ ۵۵۸ ہجری) کے دربار میں گئی[1] اور اس کے

---

[1] عبدالمومن بن علی کا شمار تاریخِ عالم کے ان فرمانرواؤں میں ہوتا ہے جو معمولی حیثیت سے اٹھ کر تختِ شاہی پر متمکن ہوئے اور اپنی فاتحانہ یلغار سے بحروبر کو ہلا ڈالا۔ وہ دولتِ موحدین کا پہلا فرمانروا تھا، اور ابنِ تومرت المہدی المغربی (ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن تومرت) بانی دولتِ موحدین کا شاگرد اور خلیفہ تھا۔ ابنِ تومرت ایک درویش منش آدمی تھا، اس نے اپنی تبلیغی مساعی سے اپنے مریدوں کی بہت بڑی جمعیت تیار کرلی اور پھر اپنی عسکری سرگرمیوں کے ذریعے دولتِ مرابطین کی بنیادیں ہلا دیں۔ سنہ ۵۲۴ ہجری میں وہ فوت ہوا تو مراکش کے ایک وسیع علاقے پر موحدین (ابنِ تومرت کے مریدین) کا استیلا تھا۔ (بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابنِ تومرت نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے ایسا دعویٰ کیا یا نہیں، اس سے قطع نظر اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ ایک انتہائی پرہیزگار، پابندِ شریعت اور عابد و زاہد آدمی تھا) اس کے بعد اس کا مریدِ خاص عبدالمومن مسندِ حکومت پر بیٹھا اور دو سال کی مدت میں فاس، اوران، سبتہ، تلمسان، اغمات وغیرہ فتح کر لیے پھر سنہ ۵۴۱ ہجری میں خاص دارالحکومت مراکش پر قبضہ کرکے آخری مرابطی فرمانروا اسحاق بن علی بن یوسف کا چراغِ حیات گل کردیا۔ اب وہ بلاشرکتِ غیرے مراکش کا فرمانروا بن گیا۔ سنہ ۵۴۸ ہجری میں اس نے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سامنے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے :

یا سید الناس یا من	یومل الناس رفدہ
امنن علی بطرس	یکون للدھر عدہ
تخط یمناک فیہ	الحمد للہ وحدہ

یعنی اے لوگوں کے سردار تیری عنایت لوگوں کو امیدوار کرتی ہے
مجھے ایک فرمان عطا کر تاکہ زمانے کی ضرورتوں میں کام آئے
اور دائیں ہاتھ سے اس میں لکھ ———— الحمد للہ وحدہٗ
یہ اشعار سن کر سلطان عبدالمؤمن پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے فوراً بی بی حفصہ کی حاجت پوری کر دی۔

(دائرۃ المعارف)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اندلس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس سے پہلے ۵۴۷ھ ہجری میں اس نے الجزائر اور سسلی (صقلیہ) کو بھی فتح کر لیا تھا۔ ۵۵۲-۵۵۱ھ ہجری میں اس نے تیونس سے نارمن غاصبوں کو نکال باہر کیا۔ اس کے بعد طرابلس الغرب کو مسخر کر لیا یہاں تک کہ مصر سے لے کر تمام سواحلِ اٹلانٹک اور اندلس پر اس کا پرچم اقتدار لہرانے لگا۔ عبدالمؤمن نے ۵۵۸ھ میں وفات پائی۔

وہ ایک نہایت عالم و فاضل شخص تھا اور اہلِ علم و ہنر کی قدر افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ شجاعت، تدبر، ذہانت اور معاملہ فہمی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں علم و ہنر کو بڑی ترقی ہوئی۔ سید امیر علی کا بیان ہے کہ اس نے مراکش میں متعدد مدرسے اور دارالعلوم قائم کیے۔

بی بی اُمّ الہناءؒ

چھٹی صدی ہجری کے اَندلُس میں نہایت باکمال خاتون گزری ہیں۔ قرطبہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں پرورش پائی۔ قاضی ابو محمدؒ عبدالحق بن عطیہ کی بیٹی تھیں وہ اپنے دَور کے بہت بڑے فقیہ تھے۔ بیٹی کی تعلیم و تربیت خاص توجہ سے کی اور تمام علوم خصوصاً فقہ میں ان کو طاق کر دیا۔

اُمّ الہناء ایک بلند پایہ شاعرہ بھی تھیں اور کچھ کتابیں بھی انہوں نے تالیف کی تھیں۔ جب ان کے والد قاضی ابو محمد عبدالحق کو حکومت کی طرف شہر مریہ کا حاکم مقرر کیا گیا اور وہ قرطبہ سے چلنے لگے تو ام الہناء شفیق والد کی جدائی کے خیال سے سخت ملول و محزوں ہوئیں، اور آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا:۔

یا عین صار الدمع عندكِ عادة
بتكين فى فرح و فى احزان

(اے میری آنکھ رونا تو تیری عادت بن گئی ہے۔ تو تو روتی ہی رہتی ہے خوشی کی حالت ہو یا غم کی)

اُمّ الہناء نے چھٹی صدی ہجری کے آخیر میں وفات پائی اور قرطبہ کے نواح میں دفن ہوئیں۔ (نفح الطیب۔ امیر علی)

بی بی سِتّ العلماء شامیہ

چھٹی صدی ہجری کے آخر میں مشہور واعظہ گزری ہیں۔ شام کی رہنے والی تھیں جملہ علوم دینی پر گہرا عبور رکھتی تھیں۔ نہایت خوش الحان اور شیریں بیان تھیں اس لیے وعظ سُننے والے ان کو بُلبل کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ (مشاہیر نسواں)

فخر النّساء شہدہؒ محدّثہ وکاتبہ

چھٹی صدی ہجری میں شہرۂ آفاق محدّثہ وکاتبہ ہوئی ہیں۔
والد کا نام ابو نصر احمد بن عمر الابری تھا۔ وہ اپنے دَور کے ایک ممتاز عالمِ دین تھے۔
شہدہؒ ۴۸۴ھ ہجری میں ایران کے شہر دینور میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ فنِ خوشنویسی (کتابت) بھی انہی سے سیکھا اور اس میں ایسی مہارت حاصل کی کہ اُس دَور کے بڑے بڑے خوشنویس ان کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے تھے۔ والد نے حدیث اور دوسرے علوم کی اعلیٰ تعلیم انہیں اس دَور کے کئی نامور علماء ابوعبداللہ حسین بن احمد نعمانی، ابوبکر محمدؒ بن احمد الشاشی، احمد بن عبدالقادر بن یوسف اور ابوالحسینی وغیرہ سے دلوائی اس طرح جملہ عُلوم میں انہیں درجۂ تبحّر حاصل ہوگیا۔ ان کے والد خود ہی یا عباسی خلیفہ کے بُلانے پر دینور سے نقلِ سکونت کرکے بغداد آ گئے تھے اس لیے شہدہ نے عمر کا زیادہ حصہ بغداد ہی میں گزارا۔ والد نے ان کی شادی اپنے ایک سعادت مند شاگرد علی بن محمدؒ سے کر دی۔ وہ اگرچہ غریب تھے لیکن بہت نیک اور لائق تھے اسی لیے میاں بیوی کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار تھی۔ شہدہؒ کو علمِ حدیث میں اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ تشنگانِ علم دُور دُور سے جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے خوانِ علم سے ریزہ چینی کرنا اپنے لیے سعادت اور فخر کا باعث سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے درس میں بڑے بڑے شیوخ و ائمہ حاضر ہوتے تھے اور ان سے سندِ عالی حاصل کرتے تھے۔ شہدہؒ حدیث کے علاوہ تاریخ اور زبانُ ادب

پر بھی ایسی عمدہ تقریریں کرتی تھیں کہ سننے والوں کے دلوں پر نقش ہو جاتی تھیں۔
اپنے علم وفضل، خوشنویسی اور خطیبانہ صلاحیتوں کی بنا پر وہ لوگوں میں "فخر النساء" کے معزز لقب سے مشہور ہو گئی تھیں۔ شادی کے پینتالیس برس بعد ان کے شوہر نے وفات پائی۔ انہوں نے یہ صدمہ بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن درس وتدریس کے لیے وقف کر دیا۔ خلیفہ مستضی بامر اللہ عباسی (۵۶۶ھ ہجری تا ۵۷۵ھ ہجری) نے ان کے فضل وکمال کی شہرت سنی تو ان کو ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ اشاعت تعلیم میں مشغول رہ سکیں۔ شہدہؒ نے اس کی آمدنی سے دریائے دجلہ کے کنارے ایک عظیم الشان درس گاہ بنوائی جس میں سیکڑوں طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے تمام اخراجات شہدہ خود برداشت کرتی تھیں۔
شہدہ آخری دم تک درس وتدریس میں مشغول رہیں اور ۵۷۴ھ ہجری میں نوّے سال سے زیادہ عمر پاکر بغداد میں اس عالم ناپائدار سے رحلت کی۔ نمازِ جنازہ "جامع القصر" بغداد میں ادا کی گئی۔ جنازہ میں لوگوں کے علاوہ بڑے بڑے علماء اور عمائدِ سلطنت بھی جنازے میں شریک ہوئے ـــــ محدث ابنِ جوزیؒ کہتے ہیں "شہدہؒ بڑی صالح اور عبادت گزار خاتون تھیں" (ابنِ خلکان۔ سید امیر علی وغیرہ)

بی بی سفریؒ

چھٹی صدی ہجری میں نادرۂ روزگار محدثہ ہوئی ہیں۔ قاضی یعقوب بن سلیمانؒ کی صاحبزادی تھیں۔ اپنے دادا اور اپنے بھائی سے علمِ حدیث حاصل کیا اور پھر طویل مدت تک لوگوں کو حدیث کا درس دیتی رہیں۔ (مشاہیر نسواں)

ملکہ ترکان خاتون

قدر خان والیٔ قفچاق کی بیٹی تھی اور سلطان تکوش (تکش) والیٔ خیوا کی بیوی تھی۔ بڑی روشن دماغ، مدبر اور قوی دل خاتون تھی۔ اپنے خاندان کے کسی فرد کی بے راہروی برداشت نہ کرتی تھی یہاں تک کہ اپنے شوہر کی بدعنوانی بھی اس کو گوارا نہ تھی۔ ایک دفعہ اسے معلوم ہوا کہ سلطان نے کسی لونڈی سے تعلق پیدا کر لیا ہے۔ اس پر وہ سخت غضبناک ہوئی اور اپنے خاص ملازموں کے ذریعے سلطان کو ایک گرم حمام میں بند کرا دیا۔ وہاں اس قدر حرارت تھی کہ سلطان کی جان پہ آبنی۔ دربار کے کچھ بڑے بڑے امیروں کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے حمام کا دروازہ توڑ کر سلطان کو باہر نکالا۔ اس وقت اس کا سارا جسم بلبلا ہو گیا تھا اور ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ سلطان نے ۵۹۶ھ ہجری میں وفات پائی تو اس کا فرزند علاؤالدین محمدؒ خوارزم شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے اکیس سالہ دورِ حکومت میں ترکان خاتون کو بڑا اقتدار حاصل رہا۔ کیونکہ محمدؒ خوارزم شاہ ماں کا بے حد فرمانبردار تھا۔ اسی زمانے میں اس کو "خداوندِ جہاں" کا خطاب دیا گیا۔ وہ سیاسی امور میں کمال درجے کی مہارت اور سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ ۶۱۷ھ ہجری میں علاؤالدین محمدؒ کی وفات کے بعد جلال الدین اس کا تخت نشین ہوا۔ اس کی بے تدبیری کی وجہ سے تاتاری تمام قلمرو پر چھا گئے اور ۶۱۹ھ ہجری میں تولی بن چنگیز خان کے اشارے سے ملکہ ترکان خاتون کو قتل کر دیا گیا۔

(میجر راورٹی بر طبقاتِ ناصری)

بی بی جوہرہؒ

ہبتہ اللہ حسن بن علی بن حسن بن الدوامی کی صاحبزادی تھیں چھٹی صدی ہجری میں بغداد کی مشہور واعظہ ہوئی ہیں۔ انہوں نے شیخ ابوالنجیبؒ اور شیخ ابوالوقت جیسے متبحر علماء سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ ان کی شادی شیخ عبدالرحیم بن شیخ عبدالنجیبؒ سے ہوئی۔ اولاد میں صرف ایک لڑکی کا پتہ چلتا ہے۔

بی بی جوہرہؒ بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔ وہ اکثر بغداد کی خواتین کو جمع کرتیں اور ان کے سامنے نہایت فصیح و بلیغ وعظ کہتیں۔

۵۶۳ھ ہجری میں ایک دن انہوں نے نماز کا ارادہ کیا تھا اور وضو کرنے کو تھیں کہ پیغامِ اجل آ پہنچا اور وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ (تذکرۃ الخواتین)

بلادہ اُمِّ عباس

مصر کے فاطمی حکمرانوں کے دور میں عباس بن ابوالفتوح صنہاجی ایک مشہور وزیر گزرا ہے۔ بلادہ اسی عباس کی والدہ تھی۔

بڑی دانشمند اور مخیر خاتون تھی۔ اس نے ۵۴۷ھ میں ایک عظیم الشان مسجد شہر قاہرہ میں بنوائی جو اس کے نام سے "مسجد اُمِّ عباس" مشہور ہوئی۔ مؤرخ ابوالفداء کا بیان ہے کہ بلادہ کے شوہر ابوالفتوح نے وفات پائی تو ایک اور امیر عادل بن سالار نے اس سے شادی کر لی اور وزیر بن گیا لیکن ابوالفتوح کے بیٹے عباس نے اس سے یہ عہدہ چھین لیا اور بلادہ جو پہلے وزیر بیگم تھی "اُمُّ الوزیر" کے لقب سے مشہور ہوئی۔ (مشاہیرِ نسواں)

بی بی تقیہ شامیہ

ان کی کنیت اُمِّ علی تھی۔ چھٹی صدی ہجری میں شام کی نامی گرامی شاعرہ اور عالمہ ہوئی ہیں۔ شہر دمشق میں صفر ۵۰۵ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ باپ کا نام ابو الفرج تھا۔ بی بی تقیہ نے تمام علوم متداولہ خصوصاً علم حدیث میں کامل دسترس حاصل کی۔ انہوں نے وطن سے باہر جاکر بھی کئی فضلاءِ زمانہ سے استفاضہ کیا۔ ان میں علامہ ابو طاہر احمد بن محمد سلفی اصفہانی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ وہ نہایت باعصمت اور پاکدامن خاتون تھیں۔ اور ان کی پاکدامنی کا عام چرچا تھا۔ سالہا سال تک لوگوں کو حدیث کا درس دیتی رہیں۔ شعر و شاعری میں ان کو درجۂ کمال حاصل تھا۔ بہت سے شعراء وقت کے ساتھ ان کے شاعرانہ مناظرے ہوئے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے (سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے بھتیجے) ملک مظفر تقی الدین عمر کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ یہ قصیدہ خمریہ تھا یعنی اس میں شراب سے متعلق بہت سے تلازمات و نکات تھے۔ ملک مظفر نے قصیدہ سن کر طنزیہ کہا، معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بی کو ان سب باتوں کی بچپن سے خبر ہے۔ بی بی تقیہ کو ملک مظفر کی بات کا علم ہوا تو انہوں نے ایک اور قصیدہ لکھا۔ یہ قصیدہ حربیہ تھا یعنی اس میں لڑائی سے متعلق تلازمات و نکات تھے۔ پھر انہوں نے ملک مظفر کو کہلا بھیجا کہ میں ایک علم والی شاعرہ ہوں، مجھ کو شراب کے بارے میں ویسا ہی علم ہے جیسا لڑائی کے بارے میں (اس لیے کوئی قصیدہ پڑھ کر یہ گمان نہ کیجئے کہ میرا علم اس قصیدہ تک ہی محدود ہے)۔ بی بی تقیہ نے ۵۷۹ھ ہجری میں وفات پائی۔

(ابنِ خلکان)

ساتویں صدی ہجری

۱۔ بی بی عائشہؒ المنوبیہؒ (عارفہ)

۲۔ بی بی عائشہؒ بنتِ مسلم حرانی (عالمہ، محدثہ)

۳۔ بی بی فاطمہؒ بنت عباس (عالمہ، معلّمہ)

۴۔ بی بی ست الاملؒ (عالمہ، عارفہ)

۵۔ بی بی ضیفہ خاتون (مدبرہ، مخیّرہ، علم دوست)

۶۔ بی بی خدیجہؒ بنت عبدالوہاب (عالمہ
ادیبہ، عارفہ)

۷۔ خاتون بنتِ ملک الاشرف موسیٰ
(صالحہ، علم دوست، مخیّرہ)

۸۔ بی بی ستارہ بانو (عالمہ، شاعرہ)

۹۔ بی بی زینب بنتِ عبدالرحمٰنؒ (محدثہ)

۱۰۔ بی بی خدیجہؒ بنت تیمؒ (عالمہ، ادیبہ، واعظہ، معلّمہ)

۱۱۔ بی بی زین العربؒ (محدثہ)

۱۲۔ بی بی پادشاہ خاتون (عالمہ، شاعرہ، مخیّرہ، معارف پرور)

۱۳۔ بی بی خدیجہؒ بنتِ عبدالرحمٰن (عالمہ، محدثہ)

۱۴۔ ملکہ شجرۃُ الدر (حکمران)

۱۵۔ ملکہ ترکان خاتون (مدبرہ)

۱۶۔ بی بی شہدہ بنت عمرؒ (عالمہ، محدثہ، معلّمہ)

۱۷۔ ملکہ سلیمہ سلطانؒ (صالحہ، قناعت پسند)

۱۸۔ بی بی فاطمہؒ بنتِ خشاب (عالمہ، شاعرہ)

۱۹۔ ملکہ رضیہ سلطان "سلطانہ" (عالمہ،
شاعرہ، فنونِ حرب میں ماہر، حکمران)

۲۰۔ بی بی حافظہ جمالؒ (عابدہ، زاہدہ، عارفہ)

۲۱۔ بی بی مونسہؒ (عالمہ فاضلہ)

۲۲۔ ملکہ شہزادہ گردوں چینؒ (صالحہ،
انصاف پسند، خیر خواہ خلق)

۲۳۔ بی بی شیرینؒ بنت عبداللہ ہندیہ (عالمہ، محدثہ)

۲۴۔ بی بی ست الامناءؒ (محدثہ)

۲۵۔ بی بی فاطمہ صائمہؒ (عارفہ)

۲۶۔ ملکہ قتلغ خاتون (زیرک، بیدار مغز، حکمران)

۲۷۔ بی بی اسماء شامیہ (محدثہ، مخیّرہ)

۲۸۔ بی بی اولیاءؒ (عارفہ)

۲۹۔ بی بی فاطمہ بنتِ خداویردی (کاتبہ)

۳۰۔ بی بی بنتِ خداویردی (کاتبہ)

۳۱۔ بی بی قرسم خاتونؒ (مومنہ، صالحہ)

۳۲۔ بی بی شریفہؒ (عارفہ)

۳۳۔ بی بی زمرد (محدثہ)

۳۴۔ بی بی فاطمہ سامؒ (عارفہ، مخیّرہ)

۳۵۔ بی بی راستیؒ (عارفہ، حافظہ)

۳۶۔ بی بی سارہؒ (عارفہ)

۳۷۔ بی بی فاطمہؒ بنت جمال الدین (محدثہ)

۳۸۔ بی بی زلیخاؒ (عابدہ، زاہدہ، عارفہ)

۳۹۔ بی بی ام الخیر جمال النساء (عالمہ، محدثہ)

بی بی عائشۃ المنوبیہ

عائشۃ المنوبیہ تیونس (TUNIS) کی ایک پاکباز زاہدہ کا نام ہے جو ساتویں صدی ہجری میں گزری ہیں۔ ان کا پورا نام عائشہ بنتِ عمران بن الحجاج سلیمان تھا۔ وہ تیونس سے مغرب کی جانب پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ایک گاؤں منوبہ کی رہنے والی تھیں۔ اسی نسبت سے منوبیہ کہلاتی ہیں۔

وہ تیونس میں عام طور پر " السیدہ " کے لقب سے مشہور تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ صغر سنی ہی میں ان سے چند ایسی کرامات کا ظہور ہوا کہ لوگوں کو ان سے عقیدت ہو گئی۔ جب وہ سنِ رُشد کو پہنچیں تو ان کے والدین نے ان کی شادی ان کے حقیقی عم زاد سے کرنی چاہی لیکن وہ دنیا کے دھندوں میں نہیں پڑنا چاہتی تھیں اس لیے شادی سے انکار کر دیا اور تیونس جا کر ایک قیسریہ (ایک قسم کی کارواں سرائے) میں مقیم ہو گئیں۔ یہ قیسریہ شہر کے جنوب مشرق میں باب الفلاق کے باہر واقع تھی۔ (باب الفلاق بعد میں باب الگرجانی کے نام سے مشہور ہوا)۔ ایک مشہور روایت کے مطابق بی بی عائشہ منوبیہ نے تصوف کی تعلیم مشہور صوفی شیخ ابوالحسن شاذلیؒ سے حاصل کی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی تیونس کی اسی قیسریہ میں گزار دی۔ وقت کا بیشتر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزارتی تھیں اور اپنی روزی کپڑا بُن کر کماتی تھیں۔ انہوں نے طویل عمر پا کر باختلافِ روایت ۱۶ شوال ۶۵۳ھ ہجری یا ۲۱ رجب ۶۵۵ھ ہجری کو وفات پائی اور باب الگرجانی کے قبرستان میں مدفون ہوئیں۔ اُس زمانے میں اس قبرستان کا نام " باب الشرف " تھا۔

السیدہ عائشۃ المنوبیۃ کے مزار کو تیونس کی خواتین میں ایک مقدس زیارت گاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس قیسریۃ میں انہوں نے اپنی زندگی گزاری، ان کی معتقد خواتین اس سے بڑی عقیدت رکھتی ہیں اس کا نام اب تک "المنوبیۃ" چلا آتا ہے۔ یہ مقام الگرجانی کے قبرستان سے جنوب مشرق کی جانب کوئی تین سو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ قدیم قیسریۃ کے ارد گرد آہستہ آہستہ ایک محلہ آباد ہوگیا جس میں ایک عبادت گاہ، زائروں کے لیے بہت سے حجرے، لوگوں کے ذاتی مکانات اور بہت سی دکانیں تعمیر ہوگئیں۔ خاص منوبہ کے گاؤں میں وہ گھر بھی جہاں السیدہ عائشہ پیدا ہوئیں، بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اب وہاں بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں جہاں زائرین جاکر قیام کرتے ہیں۔ السیدہ عائشۃ المنوبیۃ کی شان میں عوامی زبان میں بہت سی نظمیں کہی گئی ہیں جو ان کے عقیدت مند بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ (دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۲)

بی بی عائشہ بنت مسلم حرّانی رح

حرّان کی رہنے والی تھیں۔ سنہ ۶۲۷ھ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اللہ نے ذہنِ رسا سے بھی نوازا تھا۔ والد نے حوصلہ افزائی کی اور ان کو اپنے دور کے بڑے بڑے علماء سے تعلیم دلائی۔ انہوں نے اپنے ذہنِ رسا کی بدولت فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ پیدا کی اور پھر سالہا سال تک درس وتدریس میں مشغول رہ کر خلقِ خدا کو فائدہ پہنچایا۔ خود ان کے ایک بھائی محمد حسن بن مسلم نے ان سے علم حدیث سیکھا اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے بی بی عائشہ رح کو بہت اچھی صحت سے نوازا تھا۔ انہوں نے نوے سال کی عمر پائی اور سنہ ۷۳۰ ہجری میں فوت ہوئیں۔ (مشاہیر النساء)

بی بی فاطمہ بنتِ عباسؒ

فاطمہ نام تھا اور اُمِّ زینب کنیت تھی۔ والد کا نام عباس بغدادی تھا۔ بغداد میں پیدا ہوئیں اور وہیں سنِ شعور کو پہنچیں۔ والد نے بڑے اہتمام سے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ چنانچہ وہ جملہ علوم و فنون میں طاق ہو گئیں خصوصاً علمِ فقہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ مصر چلی گئیں۔ وہاں کے فرمانروا کی بیٹی تذکار خاتون نے دل و جان سے ان کی پذیرائی کی اور ۶۸۴ھ میں ان کے لیے ایک خانقاہ "رباط البغدادیہ" کے نام سے بنوائی۔ اُمِّ زینبؒ نے اس خانقاہ کو اپنا مسکن اور درسگاہ بنالیا۔ وہ قلیل معاش پر قناعت کرتی تھیں اور اپنا بیشتر وقت درس و تدریس اور وعظ و ہدایت میں گزارتی تھیں۔

مصر اور شام کی بے شمار خواتین ان کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتی تھیں۔ جس کو بھی ان کی چند روزہ صحبت نصیب ہو جاتی تھی وہ عمر بھر کے لیے اس کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتی تھی۔

اُمِّ زینب فاطمہؒ نے ۷۱۴ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مقریزی)

بی بی ستّ الاہلؒ

علوان بن سعید بن علوان بن کامل کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا شمار ساتویں صدی ہجری کی نامور عالمات و عارفات میں ہوتا ہے۔ بعلبک کی رہنے والی تھیں۔ حنبلی مسلک رکھتی تھیں۔ انہوں نے مولانا بہاء الدین مقدسیؒ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ۷۰۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

ضیفہ خاتون

الملک الناصر سلطان صلاح الدین یوسف ایوبیؒ فاتح بیت المقدس کے بھائی الملک العادل سیف الدین ابی بکر بن ایوب کی صاحبزادی تھی۔ بعض نے اس کا نام صَفیّہ بھی لکھا ہے لیکن عام طور پر وہ ضیفہ خاتون ہی کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ سنہ ۵۸۱ھ ہجری یا سنہ ۵۸۲ھ ہجری میں جب وہ پیدا ہوئی تو اس کے والد کے پاس کوئی بڑی شخصیت مہمان کے طور پر قیام پذیر تھی۔ مہمان کو عربی میں ضَیف کہا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے نومولود بچی کا نام ضیفہ رکھ دیا گیا۔ اس زمانے میں الملک العادل قلعۂ حلب کا حکمران تھا جو فتح کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اس کے سپرد کیا تھا۔ بعد میں سلطان نے الملک العادل کی جگہ اپنے بیٹے الملک الظاہر غیاث الدین غازی کو حلب کا حکمران مقرر کیا۔ اسی الملک الظاہر غازی سے ضیفہ خاتون کی شادی ہوئی۔ یہ الملک الظاہر غازی کی دوسری شادی تھی اس سے پہلے اس کی شادی ضیفہ خاتون کی ایک بہن غازیہ سے ہوئی تھی اس کی وفات کے بعد ضیفہ خاتون الملک الظاہر غازی کے عقدِ نکاح میں آئی۔ اس طرح وہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی بہو بن گئی۔

الملک الظاہر سنہ ۶۱۳ھ ہجری میں فوت ہو گیا اور اس کی جگہ الملک العزیز غیاث الدین محمدؒ حلب کا حکمران بنا۔ سنہ ۶۳۴ھ ہجری میں ضیفہ خاتون کے فرزند الملک العزیز غیاث الدین محمد نے وفات پائی تو اس کی جگہ الملک الناصر صلاح الدین یوسف (ثانی) تخت کا وارث قرار پایا۔ اس وقت اس کی

عمر صرف سات برس کی تھی، اس لیے ضیفہ خاتون نابالغ وارثِ تخت کی جگہ حلب کی حکمران قرار پائی۔

وہ بڑی نیک دل مخیّر اور مدبر خاتون تھی — اور المَلِکَۃُ الرَّحِیمَۃُ، عِصْمَۃُ الدِّینِ وَالدُّنیا (مہربان ملکہ، دین و دنیا کی عصمت) کے القاب سے یاد کی جاتی تھی۔ اس نے حکومت کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے چلایا اور بہت سے رفاہی ادارے بھی قائم کیے۔ ان میں سے ایک مدرسہ، ایک مسجد، اور ایک خانقاہ آج تک حلب میں اس کی یادگار موجود ہیں۔ مؤرخین نے اس کے آثارِ باقیہ میں مدرسۃ الفردوس اور خانقاہ فرافِرَۃ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

ملکہ ضیفہ خاتون نے ۱۱ جمادی الاولیٰ ۶۴۰ھ ہجری کو وفات پائی۔ اسے قلعہ حلب کے اندر اس کے بیٹے الملک العزیز غیاث الدین محمدؒ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ (اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جلد ۱۲)

خدیجہؒ بنتِ عبدالوہابؒ

شیخ عبدالوہابؒ بن شیخ ہبتہ اللہ صوفی (المتوفی ۶۶۲ھ) کی صاحبزادی تھیں۔ علوم ادبیہ اور معارفِ حقانیہ میں بڑا رتبہ رکھتی تھیں۔ اپنے خدارسیدہ والد کی طرح وہ بھی اولیاء اللہ میں شمار ہوتی تھیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب "مسامرات" میں ان سے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔

(مشاہیر نسواں)

خاتون بنت ملک الاشرف موسیٰ

الملک الاشرف الموسیٰ بن الملک العادل سیف الدین ابوبکر بن ایوب والیٔ مصر کی صاحبزادی تھی۔ (فاتح اعظم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اس کے دادا کا حقیقی بھائی تھا)۔ اس کی شادی الملک المنصور محمود بن صالح سے ہوئی تھی۔ بڑی نیک سیرت، علم دوست اور مخیّرہ بی بی تھی۔ اس نے دمشق میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔

خاتون نے ۶۹۴ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر النساء۔ تذکرۃ الخواتین)

ستارہ بانو

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ[1] کی صاحبزادی تھیں۔ عالمہ فاضلہ

---

[1] اصل نام مشرف الدین تھا۔ مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا۔ (بعض نے ان کے والد کا نام مصلح الدین لکھا ہے) تقریباً ۵۸۰ھ ہجری میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ انہوں نے تعلیم بغداد کے شہرۂ آفاق مدرسہ نظامیہ میں حاصل کی اور مراحلِ تصوف پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگرانی میں طے کیے۔ انہوں نے کم از کم چودہ بار حج کیا۔ تقریباً ایک سو دو سال کی عمر پائی۔ اپنی طویل زندگی کے پہلے تیس سال تعلیم میں، دوسرے تیس سال سیر و سیاحت میں اور شعر گوئی میں، تیسرے تیس سال ریاضت و مجاہدہ اور اپنے کلام کی ترتیب و تکمیل میں اور آخری بارہ سال تصوف کی تلقین و اشاعت اور غرباء و مساکین کی خدمت اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خاتون تھیں ۔ اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ فنِ شعر میں بھی کامل تھیں کوکب تخلص تھا یہ مطلع انہی کا ہے ؎

عشق بازاں رو بسوئے قبلہ آں کو کنند
ہر کجا محراب ابروئیش نماید رو کنند

(مشاہیر نسواں بحوالہ اختر تاباں)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

حاجت روائی میں صرف کیے ۔ انہوں نے مصر، افریقہ، عراق، حجاز، شام، بلخ، غزنی، بعلبک وغیرہ کی خالصتاً درویشانہ انداز میں سیاحت کی ہر طرح کے لوگوں سے ملے اور ان کی معاشرت سے آگاہی حاصل کی ۔ انہوں نے ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء میں وفات پائی ۔ مزار شیراز میں ہے ۔

شیخ سعدیؒ نے فردوسی اور حافظ شیرازی کی طرح عالمگیر شہرت حاصل کی ۔ نظم اور نثر دونوں پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی ۔ ان کو غزل کا امام تسلیم کیا جاتا ہے ۔ گلستان اور بوستان ان کی دو کتابیں دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں اور ان کی بنا پر انہیں "دانائے مشرق" کہا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ انہوں نے غزلیات کا دیوان (کلیات) کچھ قصائد اور چند نظموں کے مجموعے بصورت طیبات اور ہزلیات بھی لکھے ۔ ان کے کچھ قصائد اور نظمیں عربی میں بھی ہیں ۔ بعض تذکروں میں ان کی کچھ اور تصانیف (تاریخ عباسیہ ۔ جزائر افریقہ، کتاب ہیئت، تصوف میں چند رسائل) کا سراغ بھی ملتا ہے لیکن یہ سب نایاب ہیں ۔

شیخ سعدیؒ کی متاہلانہ زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں ۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۱ ۔ حیاتِ سعدی وغیرہ)

بی بی زینبؒ بنتِ عبدالرحمٰن

بیت المقدس کی رہنے والی تھیں۔ نسب نامہ یہ ہے۔

زینبؒ بنتِ عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالملک بن عثمان بن عبداللہ بن سعد بن مُفلح بن ہبیۃ اللہ بن نمیر۔

اپنے دَور کی نامور محدثہ تھیں۔ انہوں نے علامہ ابراہیم بن خلیلؒ اور بعض دوسرے محدثین سے حدیث کی اجازت لی اور پھر طویل مدت تک خود درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ ان کے شاگردوں میں علامہ صلاح الدین الصفدی[1] کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ بی بی زینبؒ نے سنہ ۸۱۰ ہجری میں وفات پائی۔

(مشاہیرِ النساء)

---

[1] علامہ صلاح الدین ابو الصفا خلیل بن ایبک بن عبداللہ کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے شہرۂ آفاق علماء، شعراء، مؤرخین اور کُتاب میں ہوتا ہے۔ ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ۷۶۴ھ / ۱۳۶۲ء میں بمقام دمشق وفات پائی۔ انہوں نے اپنی تصنیفات کی ایک کثیر تعداد اپنی یادگار چھوڑی۔ اپنے خود نوشت سوانح حیات کے مطابق ان کی تصانیف پانچ سو جلدوں میں ہیں اور جو کچھ انہوں نے بحیثیت کاتب (خوشنویس) لکھا وہ اس سے دگنا ہے۔ ان کی بیشتر تصانیف استدادِ زمانہ سے نایاب ہو چکی ہیں جو مکمل یا غیر مکمل حالت میں دستیاب ہیں ان کی تعداد تیس سے کچھ اوپر ہے۔ یہ سب تقریباً گزشتہ مصنفین سے اقتباس شدہ تالیفات ہیں جس کا الصفدی خود بھی اعتراف کرتے ہیں۔ ان تالیفات میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: — اعیان العصر و اعوان النصر، کتاب الادب، الوافی بالوفیات، منشآت، کتاب الشعور بالعور، تاریخ الوافی، التذکرۃ الصلاحیۃ، مسالک الابصار و ممالک الامصار، اختراع الخراع، غوامض الصحاح، جنان الجناس فی علم البدیع۔

(حبیب السیر خواندمیر۔ الدرر الکامنۃ ابن حجرؒ)

بی بی خدیجہؒ بنتِ قیمؒ

ساتویں صدی ہجری میں، بغداد میں ایک نامور فاضلہ گزری ہیں۔ ۶۰۸ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ والد نے ان کے شوق اور علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے حصولِ علم میں ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ بی بی خدیجہؒ نے بہت جلد کتابت (خوشنویسی) اور قرأت میں درجۂ کمال حاصل کر لیا۔ بغداد میں وہ کریمہ محدثہ اور ابن شیرازی کی مجالسِ درس میں شریک ہوئیں۔ پھر مصر جا کر ابن الخمیزیؒ اور علی بن المختار عامریؒ سے تمام مروجہ علوم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد انہوں نے خود مسندِ درس بچھائی اور برسوں درس و تدریس اور وعظ و ہدیت میں مشغول رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بے شمار خواتین ان کی درسگاہ میں آتیں اور وہ ان کے سامنے نہایت فصیح و بلیغ وعظ کہتیں۔ کئی سال تک تبوک اور دمشق میں بھی مقیم رہیں اور لوگوں کو حدیث کا درس دیتی رہیں۔ ادبیات میں بھی ان کو خاص امتیاز حاصل تھا چنانچہ مقاماتِ حریری کی تشریح ایسی عمدگی سے کرتی تھیں کہ بڑے بڑے علما ان سے استفاضہ کرتے تھے اور یہ کتاب پڑھنے کے لیے بطورِ خاص ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ۹۱ سال کی شاندار زندگی گزارنے کے بعد بی بی خدیجہؒ نے ۶۹۹ھ ہجری میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی زین العربؒ

دمشق کی نامی گرامی محدثہ ہوئی ہیں۔ والد کا نام تاج الدین عبدالرحمٰن بن عمر بن حسن بن عبد السلمی تھا۔ انہوں نے اپنے عہد کے بڑے بڑے بزرگانِ دین سے اکتسابِ علم کیا اور اجازت لی۔ پھر دوسرے لوگوں کو طویل مدت تک درس دیتی رہیں۔ ۷۰۴ھ میں انتقال کیا۔ (مشاہیر النساء)

پادشاہ خاتون

قطب الدین محمد (قتلغ خانی) شاہِ کرمان (سن ۶۵۰ھ تا ۶۵۵ھ) کی بیٹی تھی۔ نہایت عالمہ فاضلہ انصاف پسند اور حسین وجمیل خاتون تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے قرآنِ پاک اور دوسری کتابیں لکھا کرتی تھی۔ شعروسخن کا بھی شوق تھا۔ یہ دو رباعیاں اس کا نمونۂ کلام ہیں:

درونِ پردۂ عصمت کہ تکیہ گاہِ منست
مسافرانِ ہوا را گزر بدشوار یست
نسیم بادمزن سربزیر مقنعۂ او!
کہ تارِ پودِ وے از عصمت ونکو کاریست

ہر لعل کہ دید ہرگز از مشک رقم
یا غالیہ بر نوش کجا کردستم
جانا اثر خال سیہ برلبِ تو
تاریکی و آبِ زندگانی ست بہم

سن ۶۵۵ھ میں قطب الدین محمد کی وفات کے بعد اس کی بیوہ (پادشاہ خاتون کی والدہ) قتلغ (ترکان) خاتون کرمان کے تختِ حکومت پر بیٹھی اور چھبیس سال تک بڑی قابلیت کے ساتھ حکومت کی۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں رفاہِ عام کے بہت سے کام کیے۔ ان میں ایک عظیم الشان دینی مدرسے کا قیام بھی تھا۔
اس کے بعد سن ۶۸۱ھ میں جلال الدین سیورغتمش کرمان کا فرمانروا بنا۔ سیورغتمش

کے بعد باختلاف روایت ۶۹۱ھ یا ۶۹۳ھ میں پادشاہ خاتون صفوۃ الدین کے لقب کے ساتھ کرمان کے تخت پر جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ اکثر امرائے سلطنت کو یہ شبہ تھا کہ اپنے لائق بھائی کے قتل میں اس کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ وہ اس سے بگڑ بیٹھے اور ۶۹۳ھ یا ۶۹۴ھ میں اس کو معزول کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا پہلے اسے اس کے مسکن میں دفن کیا گیا پھر اس کی نعش وہاں سے اس مدرسے میں منتقل کر دی گئی جو اس کی والدہ قتلغ (ترکان) خاتون نے بنوایا تھا۔

پادشاہ خاتون نہ صرف خود علم و فضل کے اعتبار سے یکتائے زمانہ تھی بلکہ وہ ارباب علم کی بھی بے حد قدردان تھی اور کھلے دل کے ساتھ ان کی سرپرستی کرتی تھی۔ (روضۃ الصفا وغیرہ)

بی بی خدیجہؒ بنت عبد الرحمٰنؒ

ساتویں صدی ہجری کے ایک مشہور فقیہ ابوالقاسم عبد الرحمٰن بن الحسن بن عبد اللہ النوری کی صاحبزادی تھیں۔ مولانا ابوالقاسم عبد الرحمٰن کو تعلیم و تعلم کے ساتھ جہاد کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ ۶۴۸ھ ہجری میں جنگ دمیاط میں اسلامی فوج کے ایک مجاہد کی حیثیت سے صلیبی لشکر کے خلاف سر بکف ہو کر لڑے اور اسی معرکے میں شہادت پائی۔ بی بی خدیجہؒ نے اسی مجاہد باپ کے زیر سایہ تربیت پائی۔ وہ تمام مروجہ علوم بالخصوص حدیث میں درجۂ تبحر رکھتی تھیں اور ایک زمانہ ان کے علم و فضل کا معترف تھا۔ ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے لوگ ان کو اُمّ الفضل کہہ کر پکارتے تھے اور یہی ان کی کنیت مشہور ہو گئی تھی۔ بی بی خدیجہؒ نے اپنی تمام زندگی مصر میں گزاری اور وہیں سفر آخرت اختیار کیا۔

(تذکرۃ الخواتین)

ملکہ شجرۃُ الدُّر یا شجر الدُّر

شجرۃ الدُّر مصر کے ایوبی فرمانروا الملک الصالح نجم الدین ایوب کی ملکہ تھی۔ الملک الصالح جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل کا پوتا تھا، ۶۳۷ھ/۱۲۴۰ء میں مسندِ حکومت پر بیٹھا۔ شجرۃ الدُّر پہلے ایک کنیز تھی۔ اس کے حسنِ صورت و سیرت کو دیکھ کر الملک الصالح نے اس سے شادی کرلی۔ الملک الصالح نے شعبان ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء میں وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا توران شاہ تختِ حکومت پر بیٹھا (یہ ملکہ شجرۃ الدُّر کا سوتیلا بیٹا تھا۔ وہ الملک الصالح کی ایک اور بیوی کے بطن سے تھا) اس نے بہت سے مصری حاکموں اور امیروں کو جو "ممالیکِ بحری" سے تعلق رکھتے تھے، معزول کردیا۔ اس پر ممالیکِ بحری اس سے ناراض ہوگئے۔ ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء میں انہوں نے توران شاہ کو قتل کرکے ملکہ شجرۃ الدُّر کو "المستعصمۃ الصالحۃ الملکۃ المسلمین عصمت الدنیا والدین ام الملک المنصور خلیل" کا خطاب دے کر مصر کے تختِ حکومت پر بٹھا دیا (شجرۃ الدُّر کا ایک لڑکا خلیل نامی چھ سال کی عمر کا ہو کر فوت ہوگیا تھا اسی کے نام کی نسبت سے اس کی کنیت اُمِّ خلیل تھی۔) ملکہ شجرۃ الدُّر اسّی دن تک مصر پر بلا شرکتِ غیرے حکمران رہی۔ اس دوران میں اس نے غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور کاروبارِ حکومت کو نہایت عمدگی سے چلایا لیکن عباسی خلیفہ بغداد المستعصم باللہ نے عورت کی حکومت کو پسند نہ کیا اور مملوک سرداروں کو پیغام بھیجا کہ کسی مرد کو اپنا حاکم بنائیں۔ چنانچہ ممالیکِ بحری نے جمادی الاولیٰ ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء میں ملکہ شجرۃ الدُّر کو معزول کردیا اور رئیس العساکر (سپہ سالار) المعز عزّ الدین ایبک کو ایک نوعمر ایوبی شہزادے الملک الاشرف موسیٰ کا شریکِ کار

بنا کر تختِ حکومت پر بٹھا دیا۔ شجرۃ الدُر نے باختلافِ روایت اسی سال (۶۴۸ھ ۱۲۵۰ء) یا ۶۵۲ھ ۱۲۵۴ء میں) المعزّ عزالدین ایبک سے نکاح کر لیا۔

المعزّ اور الملک الاشرف کی مشترکہ حکومت چار سال تک چلتی رہی۔ اس کے بعد (۶۵۲ھ ۱۲۵۴ء میں) الملک الاشرف موسیٰ حکومت سے تعلق توڑ کر یمن چلا گیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ الملک الاشرف موسیٰ ایوبی خاندان کا آخری حکمران تھا جس کے نام کا خطبہ مصر میں پڑھا گیا اس کے بعد وہاں خالص مملوک حکومت قائم ہو گئی اور پہلے بحری اور پھر برجی مملوکوں نے مجموعی طور پر پونے تین سو سال اس شان سے حکمرانی کی کہ مشرق و مغرب کا کوئی حکمران ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

المعزّ کا تعلق بحری مملوکوں سے تھا۔ مسندِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد اس نے الملک المعزّ جہانگیر کا لقب اختیار کیا اور اپنی داد و دہش سے مملوک فوج کو مکمل طور پر اپنے قابو میں رکھا لیکن اس کو زیادہ عرصہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے امیر موصل کی بیٹی شہزادی ٹوٹو سے نکاح کر لیا۔ اس پر ملکہ شجرۃ الدُر سخت ناراض ہوئی اور ایک دن جب المعزّ حمام میں غسل کر رہا تھا، اس نے اپنی لونڈیوں کے ذریعے اسے قتل کرا دیا۔ جونہی یہ خبر ملکہ ٹوٹو اور مملوک امراء کو معلوم ہوئی وہ سخت غضب ناک ہوئے اور ملکہ شجرۃ الدُر کو گرفتار کر کے قلعہ قاہرہ کے قید خانے میں ڈال دیا۔ ایک دن ملکہ ٹوٹو کے اشارے سے اس کی چند لونڈیاں قید خانے میں گئیں اور لکڑی کے جوتوں سے مار مار کر شجرۃ الدُر کو ختم کر ڈالا پھر اس کی لاش قلعہ کے نیچے خندق میں پھینک دی۔ مملوک امراء نے مقتول ملکہ کی لاش کو اس کی تعمیر کردہ ایک مسجد کے احاطے میں دفن کرا دیا۔

یہ تمام واقعات ۶۵۵ھ مطابق ۱۲۵۷ء میں پیش آئے۔ (تاریخ اسلام، تاریخ مصر وغیرہ)

ملکہ ترکان

شیراز (فارس) کے سلغری حکمران اتابک ابوبکر بن سعد (سنہ ٦٢٣ھ/١٢٢٦ء تا سنہ ٦٥٨ھ/١٢٦٠ء) کی ملکہ تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ وہ بڑی بیدار مغز اور مدبر خاتون تھی۔ سنہ ٦٥٨ھ/١٢٦٠ء میں اس کا شوہر ابوبکر بن سعد فوت ہوا تو اس کا بیٹا محمد اتابک بہت کمسن تھا۔ اس لیے سلطنت کی بقا کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس وقت ملکہ ترکان نے بڑے عزم اور حوصلے سے کام لیا اور اپنے صغیر السن فرزند محمد اتابک کو تخت نشین کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس سے دو سال پہلے ہلاکو خان بغداد کی عباسی خلافت کا خاتمہ کر چکا تھا اگرچہ وہ بغداد کو تباہ و برباد کر کے اپنے وطن واپس آگیا تھا لیکن عالمِ اسلام کے لیے بدستور خطرہ بنا ہوا تھا۔ ملکہ ترکان نے صورتِ حال کا جائزہ لے کر سمجھ لیا کہ اس خطرے سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہلاکو خان سے دوستانہ تعلقات استوار کر لیے جائیں۔ چنانچہ اس نے ایک عظیم الشان سفارت مرتب کی اور اسے بہت سے تحائف دے کر ہلاکو خان کے پاس بھیجا۔ ہلاکو خان یہ تحائف پا کر خوش ہو گیا اور اس نے ملکہ ترکان کے فرزند محمد اتابک کو سلطنتِ فارس کا حکمران تسلیم کر لیا۔ ملکہ نے تاتاریوں کے خطرے سے مطمئن ہو کر سلطنت کا نظم و نسق بڑی خوش اسلوبی سے چلایا مگر ع

تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

بدقسمتی سے دو سال بعد اس کا فرزند محمد اتابک بالاخانے سے گر کر فوت ہو گیا۔ ملکہ نے اس جانکاہ صدمے کو بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کیا اور تمام عمائدِ سلطنت کو ہموار کر کے اپنے داماد محمد شاہ اتابک کو تختِ شیراز پر بٹھا دیا۔ یہ سنہ ٦٦٠ھ/١٢٦٢ء کا واقعہ ہے محمد شاہ بادشاہ بن کر کھل کھیلا اور ہر وقت عیش و عشرت

میں مشغول رہنے لگا۔ ملکہ ترکان نے اس کو بہت کچھ نصیحت کی لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ناچار ملکہ نے پھر عمائدِ سلطنت کو اپنے اعتماد میں لیا اور چند ماہ بعد محمد شاہ کو معزول کر کے اس کے بھائی سلجوق شاہ آتابک کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ بدبخت اپنے بھائی سے بھی زیادہ نالائق نکلا۔ جب ملکہ ترکان نے اس کو سرزنش کی تو وہ محسن کشی پر تُل گیا اور اپنے ایک غلام کے ذریعے اپنی ولیۂ نعمت ملکہ ترکان کو مروا ڈالا۔ مگر اس کو زیادہ عرصہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔

سنہ ۶۶۲ھ (۱۲۶۳ء) میں ہلاگو خان کا لشکر قہرِ خدا بن کر شیراز پر آ نازل ہوا۔ سلجوق شاہ مارا گیا اور ہلاگو خان نے سلغری خاندان کی ایک شہزادی عَبش سے اپنے بیٹے منگو تیمور کی شادی کر کے شیراز کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔

(مشاہیرِ نسواں: "نگار" فرمانروایانِ اسلام نمبر)

بی بی شہدہؒ بنتِ عمر

عمر بن احمد بن ہبۃ اللہ احمد بن یحییٰ کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا شمار ساتویں صدی ہجری کی نادرۂ روزگار عالمات میں ہوتا ہے۔ وہ سنہ ۶۲۰ہجری میں اُس دور کے ایک نامور محدث علامہ فاضل کاشغریؒ کے درس میں حاضر ہوئیں پھر ثابت بن شرفؒ اور اس عہد کے بعض دوسرے علمائے کبار سے حدیث کی اجازت لی اور بے شمار بندگانِ خدا کو اپنے درس و تدریس سے مستفیض کیا۔ ان سے کسبِ فیض کرنے والوں میں اُس دور کے کئی نامور علماء بھی شامل تھے۔

(مشاہیرِ نسواں)

ملکہ سلیمہ سلطان

خاندانِ غلاماں کے آٹھویں فرمانروائے ہند سلطان ناصر الدین محمود (۶۴۳ھ/۱۲۴۶ء تا ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) کی بیگم تھی۔ سلطان مذکور بڑا پرہیزگار اور درویش خو بادشاہ تھا۔ وہ اپنی روزی فالتو وقت میں قرآن مجید لکھ کر کماتا تھا اور اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیے سرکاری خزانے سے کچھ نہیں لیتا تھا قرآن مجید کی کتابت کی آمدنی کچھ زیادہ نہیں ہوتی تھی اس لیے اس کی گھریلو زندگی بڑی غریبانہ تھی۔ اس کے گھر میں کوئی خادمہ یا باورچن نہیں تھی اور گھر کا سارا کام کاج اس کی ملکہ کو خود کرنا پڑتا تھا۔ سلیمہ سلطان ایک بڑے سردار الغ خان (غیاث الدین بلبن) کی بیٹی تھی جو آگے چل کر خود ہندوستان کا بادشاہ بنا اور ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء سے لے کر ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء تک حکومت کی۔ تخت حکومت پر بیٹھنے سے پہلے بھی اس کے دبدبہ حشمت اور شان و شوکت کی کوئی حد نہ تھی۔ چنانچہ سلیمہ سلطان نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی مگر اپنے درویش صفت شوہر کی پرہیزگاری اور قناعت کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی طبیعت کو بھی اسی سانچے میں ڈھال لیا۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کو اپنا ماضی یاد آجاتا تھا۔ ایک دن اس نے شوہر سے کہا:

"میں نے اپنے گھر میں کبھی روٹی نہیں پکائی تھی لیکن یہاں مجھے خود روٹی پکانی پڑتی ہے۔ کئی دفعہ میرے ہاتھ جل جاتے ہیں اور ان میں چھالے پڑ جاتے ہیں آپ میرے لیے ایک خادمہ کا بندوبست کر دیں۔"

ملکہ کی بات سن کر بادشاہ رونے لگا پھر اس نے کہا:

"بیگم! یہ دنیا گزر جانے والی ہے یہاں اس تکلیف کو برداشت کر کے صبر کرو۔ قیامت کے دن اللہ تم کو اس کا اچھا بدلہ دے گا۔ میری آمدنی بہت معمولی ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں اس لیے تمہارے لیے کسی خادمہ کا انتظام کرنا ممکن نہیں۔ رہا سرکاری خزانہ تو اس پر رعایا کا حق ہے میں اس کا مالک نہیں۔"

سلیمہ سلطان شوہر کی بات سن کر خاموش ہو گئیں اور عمر بھر گھر کا سارا کام ہنسی خوشی کرتی رہی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی۔

(طبقاتِ ناصری)
(ہندوستان کی بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں وغیرہ)

بی بی فاطمہؒ بنتِ خشاب

ملک شام کی ایک نامور فاضلہ اور شاعرہ کا نام ہے۔

علامہ صلاح الدین صفدی (المتوفی ۷۶۴ھ / ۱۳۶۲ء) نے اپنی کتاب "اعیان العصر و اعوان النصر" میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایک مرتبہ قاضی شہاب الدین نے فاطمہؒ بنتِ خشاب کو امتحاناً تین قصائد لکھ کر بھیجے۔ انہوں نے ہر ایک کا برجستہ اور فصیح و بلیغ جواب لکھا۔

بی بی فاطمہ بنتِ خشاب نے ۷۱۹ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

ملکہ رضیہ سُلطان (سلطانہ)

رضیہ سلطانہ جسے رضیہ سلطان بھی کہا جاتا ہے پہلی اور آخری مسلمان خاتون ہے جو دلّی کے تخت پر بیٹھی اور سنہ ۶۳۴ھ (۱۲۳۶) سے سنہ ۶۳۷ھ (۱۲۴۰) تک ہندوستان پر حکومت کی۔ وہ خاندانِ غلاماں کے تیسرے فرمانروا سلطان شمس الدین التمش (سنہ ۶۰۷ھ (۱۲۱۰) تا سنہ ۶۳۳ھ (۱۲۳۶)) کی بیٹی اور اسی خاندان کے پہلے فرمانروا سلطان قطب الدین ایبک (سنہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۶) تا سنہ ۶۰۷ھ (۱۲۱۰)) کی نواسی تھی۔ بچپن ہی سے بڑی ذہین و فطین تھی۔ علم دوست والد نے اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ رضیہ نے ابتداء میں قرآنِ پاک پڑھا، پھر اونچے درجے کے علماء سے مروجہ علوم کی تعلیم پائی۔ اس کے ساتھ ہی عربی فارسی اور ترکی میں اعلیٰ دستگاہ حاصل کی۔ علاوہ ازیں اس نے فنونِ حرب و ضرب بھی سیکھے اور شہسواری، شمشیر زنی، اور نشانہ بازی میں بھی طاق ہو گئی۔ اس کے اعلیٰ اوصاف و خصائل کی بنا پر التمش اس کو بے حد عزیز جانتا تھا۔ وہ اس کو کاروبارِ حکومت چلانے کے گُر بھی بتاتا رہتا تھا اور وقتاً فوقتاً امورِ مملکت میں اس سے مشورہ بھی لیتا تھا۔ اگر کسی مہم کے سلسلے میں اسے دارالحکومت سے باہر جانا پڑتا تو بیٹوں کی موجودگی کے باوجود وہ رضیہ ہی کو اپنا جانشین بنا کر جاتا۔ وہ اس کی غیر حاضری میں حکومت کے تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی اور نظم و نسق میں کسی قسم کا خلل نہ پڑنے دیتی۔ اس طرح اس کو التمش کی زندگی ہی میں حکومت سنبھالنے اور انتظامی اُمور سے نبٹنے کی عملی تربیت مل گئی تھی۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے جو محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا، اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ـــــ "رضیہ مردانہ لباس میں تمام ہتھیار لگا کر

گھوڑے پر سوار باہر نکلتی تھی، ہندوستان کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ جب وہ
شکار کو جاتے تھے تو اپنے ساتھ حرم کی خواتین کو بھی لے جاتے تھے ۔ ایک مرتبہ
التتمش شیر کے شکار کو گیا ۔ خواتین پیچھے تھیں کہ ایک شیر جنگل سے نکل کر بادشاہ
پر جھپٹا، عین اس وقت رضیہ برق رفتاری سے لپک کر وہاں پہنچی اور تلوار کا
ایسا بھرپور وار شیر پر کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا ۔ اگر وہ نہ پہنچ گئی ہوتی تو بادشاہ
بری طرح زخمی ہوگیا ہوتا ۔" اس واقعہ کے بعد التتمش کی نظر میں رضیہ کی
وقعت دو چند ہوگئی ۔

"فتوح السلاطین" کے مصنف عصامی کا بیان ہے کہ :۔۔۔۔۔

"رضیہ کو ذہانت اور خوبصورتی باپ سے ورثے میں ملی تھی ۔ شہزادگی ہی
کے زمانے میں اس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا ۔ بڑے بڑے جہاندیدہ
مدبر اس کی ذہانت اور لیاقت کا برملا اعتراف کرتے تھے ۔ اگرچہ رضیہ کے بھائی
موجود تھے لیکن سلطان التتمش کو جب بھی سرکشوں کی سرکوبی کرنے کے لیے دارالحکومت
سے باہر جانا پڑتا، وہ دلی میں رضیہ ہی کو اپنا نائب بنا کر جاتا ۔ اس کو اس بات کا
احساس تھا کہ عورت کی حکمرانی اس کے عمائدِ سلطنت کو ناگوار گزرے گی چنانچہ ایک
مرتبہ اس نے اپنے اقدام کے جواز میں امراءِ حکومت کے سامنے یہ تقریر کی کہ "یہ
درست ہے کہ میری بیٹی رضیہ عورت ہے مگر اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ اس کا
دل و دماغ مردوں جیسا ہے اور جتنا میرے سارے بیٹوں کا حوصلہ اور دماغ
ہے اس سے کہیں بڑھ کر رضیہ علم و دانش ہمت اور دلاوری سے بہرہ مند ہے ۔"

سلطان التتمش کے آٹھ بیٹے تھے ۔ ایک بیٹا اس کی زندگی ہی میں انتقال
کر گیا باقی سات پر قابلیت اور حسنِ سیرت کے اعتبار سے وہ رضیہ کو ترجیح دیتا تھا ۔
چنانچہ وفات سے پہلے اس نے رضیہ ہی کو اپنا جانشین نامزد کیا ۔ ایک روایت
یہ بھی ہے کہ اس نے بسترِ مرگ پر اپنے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو تاج و تخت سونپ
دیا لیکن بیشتر مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کی خواہش یہی تھی کہ اس کے بعد رضیہ

ہی تخت حکومت پر بیٹھے ۔ التتمش نے وفات پائی تو امرائے دربار نے عورت کی حکمرانی کو ناپسند کرتے ہوئے اس کے ایک بیٹے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ پرلے درجے کا عیاش اور اوباش نوجوان تھا ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا تھا اور سلطنت کا انتظام اس کی ماں شاہ ترکان چلاتی تھی ۔ وہ بڑی سنگدل عورت تھی اس کے مظالم سے لوگوں میں سخت بے چینی پھیل گئی ۔ آخر ۶۳۴ھ میں دلی کے عوام اور فوج کے ایک حصے کی جانب سے رکن الدین فیروز کو معزول کر کے رضیہ کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا ـــــ وہ رضیہ سلطان کا لقب اختیار کر کے بڑی شان وشوکت سے تختِ شاہی پر متمکن ہوئی اور عامۃ الناس سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی فلاح وبہبود کے لیے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہے کرے گی ۔ رضیہ سلطان کے اوصافِ حمیدہ کے باوجود، وزیرِ سلطنت نظام الملک محمد جنیدی اور متعدد دوسرے عمائدِ سلطنت ، ملک علاء الدین شیر خانی ، ملک سیف الدین کوچی ، ملک عز الدین کبیر خانی وغیرہ نے اس کو ملکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف بغاوت کی تیاری میں مشغول ہو گئے لیکن رضیہ سلطان نے تنہا اپنی تدبیر و شجاعت سے ان میں پھوٹ ڈلوا دی اور پھر ان کو ایسا زچ کیا کہ وہ ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے مگر کہیں پناہ نہیں ملتی تھی ۔

رضیہ سلطان نے ان تمام قوانین وضوابط کو جو اس کے والد کے عہد میں نافذ تھے اور رکن الدین فیروز کے زمانے میں منسوخ کر دیے گئے تھے از سرِ نو قائم کیا اور مختلف عہدوں پر ایسے لوگوں کا تقرر کیا جو بڑے قابل اور با صلاحیت تھے ۔ "تاریخ فرشتہ" میں ہے کہ "سلطان رضیہ ایسے تمام اوصاف سے مزین تھی جو ایک عاقل اور صاحب رائے بادشاہ کے لیے ضروری ہیں ۔ اصحابِ نظر اس میں سوائے اس کے کہ وہ عورت تھی، کوئی اور عیب نہیں پاتے تھے ۔ وہ قرآن مجید پورے آداب کے

ساتھ پڑھا کرتی تھی اور دوسرے علوم سے بھی آگاہی رکھتی تھی۔ اپنے باپ کے زمانہ ہی سے ملکی معاملات میں دخل دیا کرتی تھی اور فرمانروائی کیا کرتی تھی سلطان اس کی عقل و فراست اور فرزانگی دیکھ کر مانع نہ ہوتا۔"

رضیہ سلطان کا نظامِ حکومت نہایت عادلانہ تھا۔ وہ امیر غریب مسلم اور غیر مسلم ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتی تھی۔ مظلوموں کی فریاد سنتی اور ظالموں کو سزا دیتی تھی۔ شاہی ملازمین میں سے کسی کو رشوت لینے کی مجال نہ تھی۔ وہ مردانہ لباس پہنتی اور قبا و کلاہ کے ساتھ دربار کیا کرتی تھی۔ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی تھی لیکن گھوڑے کی سواری اُسے بہت پسند تھی۔ جنگ کے وقت فوج کو خود مرتب کرتی تھی اور اپنے سپاہیوں کے دوش بدوش میدانِ رزم میں دادِ شجاعت دیتی تھی۔ اپنے دورِ حکومت کے آخر میں اس نے پردہ ترک کر دیا تھا اور بلا نقاب دربار میں آتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک پردہ سلطنت کے کام کاج میں حارج ہوتا تھا۔ اس نے قاضی کبیر الدین، قاضی نصیر الدین، قاضی سعید الدین اور قاضی جلال الدین پر مشتمل ایک مجلسِ قضاۃ قائم کی جس کے مشورے سے جملہ احکام صادر کیے جاتے تھے۔

رضیہ سلطان نے نظامِ سلطنت کو کامیابی سے چلانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا لیکن اس کو امن چین سے بیٹھنا بہت کم نصیب ہوا کیونکہ متعدد امراء اس کے خلاف سازشوں میں برابر مصروف رہے۔ ان کی مخالفت کے مختلف اسباب تھے جن میں سے کچھ یہ تھے۔

(۱) وہ عورت کی حکمرانی کو پسند نہیں کرتے تھے اور اسے اپنے لیے باعث توہین سمجھتے تھے۔

(۲) اس کے مردانہ لباس پہننے اور بے نقاب دربار میں آنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔

(۳) ملکہ نے ایک حبشی غلام ملک جمال الدین یاقوت کو جو شاہی اصطبل کا

مہتمم تھا، ترقی دے کر میرِ شکار کے عہدے پر فائز کر دیا اور ساتھ ہی اس کو امیر الامراء کا خطاب دیا۔ اس عنایتِ خسروانہ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک لڑائی میں اس نے ملکہ کی جان بچائی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یاقوت ایک قابل اور با صلاحیت آدمی تھا اسی لیے ملکہ نے اس کو ترقی کا مستحق سمجھا لیکن ترک امراء نے اس کو غلط معنی پہنائے، اس کی ترقی کو انہوں نے اپنی توہین سمجھا اور ملکہ پر تہمت طرازی کی۔

مخالف امراء کی سازشوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ پہلے لاہور کے حاکم ملک عزیز الدین نے عَلَمِ بغاوت بلند کیا۔ ملکہ اس کی سرکوبی کے لیے فوج لے کر خود روانہ ہوئی حاکمِ لاہور کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے بغیر جنگ کے اطاعت قبول کر لی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ملک اختیار الدین التونیہ حاکم بھٹنڈہ نے عَلَمِ بغاوت بلند کیا۔ ملکہ اس کی سرکوبی کے لیے لشکر لے کر دلّی سے چلی۔ ایک روایت کے مطابق اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لی گئی۔ دوسری روایت کے مطابق سازشیوں نے اس کے خیمے پر شب خون مارا اور اسے گرفتار کر کے ملک التونیہ کے سپرد کر دیا۔ دوسری طرف دِلّی میں مخالف ترک امراء نے یاقوت کو قتل کر کے رضیہ سلطان کے بھائی معز الدین بہرام کو تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔ یہ واقعہ رمضان ۶۳۶ھ کا ہے۔ اُدھر ملک التونیہ نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی۔ پھر دونوں لشکر لے کر کھوئے ہوئے تخت کی بازیابی کے لیے دِلّی کی طرف روانہ ہوئے مگر کیتھل کے قریب معز الدین بہرام شاہ کی فوج سے شکست کھائی۔ دوسرے دن اس کے حکم سے ملک التونیہ اور رضیہ دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ (۲۷ رمضان المبارک سنہ ۶۳۷ھ) اور وہیں دفن کر دیا گیا۔ بعد میں رضیہ سلطان کے چھوٹے بھائی سلطان ناصر الدین محمود نے دونوں کی قبروں پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کرایا جو آج بھی کیتھل (ضلع کرنال مشرقی پنجاب بھارت) میں کھنڈر

کی صورت میں موجود ہے۔ اس سے ملحق ایک مسجد کے بھی کچھ آثار باقی ہیں۔

رضیہ سلطان کی موت کا ایک اور قصہ بھی بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ ملک التونیہ تو قتل کر دیا گیا لیکن رضیہ جان بچا کر جنگل میں چھپ گئی۔ جب بھوک پیاس نے تنگ کیا تو ایک دہقان سے کھانے کو کچھ مانگا۔ تھوڑی سی روٹی کھا کر وہ ایک درخت کے سائے میں لیٹ کر سو گئی۔ اس وقت مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی لیکن نیند کی حالت میں کپڑے اِدھر اُدھر کھسکے تو دہقان کو معلوم ہو گیا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے، اس نے زیوروں کے لالچ میں اسے سوتے میں قتل کر ڈالا اور وہیں دفن کر دیا۔ جب وہ زیورات فروخت کرنے شہر گیا تو پکڑا گیا۔ پوچھ گچھ پر اس نے سارا واقعہ بتا دیا۔ چنانچہ ملکہ کی نعش کو وہاں سے نکال کر دلی کے قریب دریائے جمنا کے کنارے دفن کیا گیا۔ یہ قبر اب بھی موجود ہے اور لوگ اسے "رجی کی درگاہ" کہتے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

ملکہ رضیہ سلطان کا دورِ حکومت صرف تین سال اور تین ماہ پر محیط ہے! اس مُدت کا بیشتر حصہ انتشار کی حالت میں گزرا پھر بھی اس کے دورِ حکومت کے کئی خوشگوار واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ مُورّخین نے لکھا ہے کہ وہ بڑی با تدبیر، زیرک، بہادر، انصاف پسند، خوش اخلاق، اور علم دوست خاتون تھی۔ حنفی المسلک اور علماء و صوفیہ کی بڑی عقیدت مند اور قدردان تھی۔ اس نے متعدد مدرسے قائم کیے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلفاء کی تبلیغِ اسلام میں اعانت کی۔ اس نے مہرولی میں اپنے والد کا شاندار مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔

طبقاتِ ناصری کے مُصنف مولانا منہاج سراج نے اس کو "عالم نواز" (یعنی علماء و فُضلاء کی قدردان) کا خطاب دیا ہے۔

ملکہ رضیہ سلطان کو شعر و سخن کا بھی عمدہ ذوق تھا وہ فارسی کی نغز گو شاعرہ تھی اور شیریں تخلص کرتی تھی۔ تذکروں میں اس کے یہ چند اشعار محفوظ ہیں:

غلطیدنِ نورِ رُخِ خورشید ازیں چہ
بسمل شدۂ تیغ نگاہِ غضب ماست
ازماست کہ برماست چہ تقصیرِ دلِ زار
آں کشتۂ اندازِ غم بے سببِ ماست

در دہانِ خود دارم عندلیبِ خوش الحال
پیشِ من سخن گویاں زاغ در دہن دارند

کنم بحرکتِ پا چرخ تختِ سلطانی   دہم ببالِ ہُما خدمتِ مگس رانی

باز آ شیریں، منہ در راہِ الفت گامِ خویش
ہاں وے نشنیدہ باشی قصۂ فرہاد را

(طبقاتِ ناصری - مشاہیرِ نسواں - ناموران عالم
دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۰،
• نگار، لکھنؤ پاکستان نمبر جنوری فروری ۱۹۴۸ء،
سیارہ ڈائجسٹ لاہور مارچ ۱۹۸۸ء،
خواتینِ اسلام کی بہادری)

بی بی حافظہ جمالؒ

حضرت خواجۂ خواجگان معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیریؒ[لہ] (وفات ۶۳۳ھ)
کی دختر نیک اختر تھیں۔ وہ بی بی امۃ اللہؒ کے بطن سے تھیں۔ بی بی حافظہ جمالؒ
نہایت پارسا، دائم الصوم اور قائم اللیل خاتون تھیں۔ وہ اپنے والدِ گرامی
کی مرید تھیں۔ ان کو خواجۂ خواجگانؒ نے خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور ہدایت فرمائی
کہ خواتین کی اصلاح و ہدایت پر توجہ دیں۔ چنانچہ بی بی حافظہ جمالؒ اپنے وقت
کا بیشتر حصہ خواتین کو تعلیم دینے میں صرف کرتی تھیں ان کی وجہ سے ہزاروں

لہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ برِ کوچک پاک و ہند
میں سلسلۂ چشتیہ کے موسس ہیں۔ نجیب الطرفین سید تھے۔ ۵۳۷ھ ہجری
میں قصبہ سجز (خراسان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والدین سے حاصل کی ۔۔۔ ابھی
عنفوانِ شباب تھا کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ وراثت میں معقول جائداد ملی لیکن
ایک بزرگ ابراہیم قندوزیؒ کی توجہ سے دنیا کے مال و متاع سے بے نیاز ہو گئے اور اس دور
کے ایک عالم مولانا حسام الدین بخاریؒ سے جملہ علوم دینی کی تعلیم حاصل کی ساتھ ہی قرآن مجید
حفظ کیا۔ اس کے بعد خواجہ عثمان ہارونیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی بیعت کی۔ کچھ
مدت ان کے پاس رہے جب انہوں نے خرقۂ خلافت عطا کیا تو کئی سال تک مختلف ممالک کی
سیر و سیاحت میں مشغول رہے۔ ۵۶۱ھ میں اجمیر تشریف لائے وہیں باقی ساری عمر تبلیغ
اسلام کرتے ہوئے گزار دی۔ ان کی تبلیغی مساعی سے لاکھوں لوگوں کی ہدایت نصیب ہوئی۔
۶۳۳ھ میں وفات پائی۔ اجمیر میں ان کا عظیم الشان مزار اور اس سے متعلقہ عمارتیں
تعمیری نقطۂ نگاہ سے منفرد حیثیت کی حامل ہیں۔

خواتین کو نہ صرف ہدایت نصیب ہوئی بلکہ ان میں سے بہت سی بیبیوں نے اللہ سے لو لگا کر عارفات میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا ۔

بی بی صاحبہؒ کی شادی شیخ رضی الدینؒ سے ہوئی ۔ وہ مدت العمر اجمیر میں رہیں اور وہیں وفات پائی ۔ ان کا مزار خواجۂ خواجگانؒ کے مزار کے قریب ہے ۔ (تذکرہ اولیائے ہند)

بی بی مونسہؒ

مصر کے فرمانروا الملک العادل (برادر سلطان صلاح الدین ایوبی متوفی ۵۸۹ھ) کی صاحبزادی تھی ۔ نہایت عالمہ اور فاضلہ تھی ۔ اس کی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے دنیائے اسلام میں اسے "جلیلہ سلطانیہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا ۔

(مشاہیر النساء)

خانزادہ گردوں چین

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ (۶۱۷ھ تا ۶۲۹ھ) کی بیوی تھی ۔ بڑی انصاف پسند اور مخیر خاتون تھی ۔ خود بھی خدا پرست اور خدا شناس تھی اور لوگوں کو بھی نیک بننے اور ہمیشہ اللہ کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کیا کرتی تھی ۔ بلادِ فارس میں اس نے بے شمار مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں اور صوامع تعمیر کرائے اور رعایا کے ہر طبقے کی بلا تفریق مذہب ملت خدمت کی ۔ (روضۃ الصفا)

بی بی شیریںؒ بنتِ عبداللہ ہندیہ

چھٹی / ساتویں ہجری کے ایک نامور محدث امام ابنِ ہندیجیؒ کی مولاۃ تھیں۔ وطنِ مالوف ہند تھا۔ وہ اپنے محدثانہ اور عالمانہ جاہ وجلال کی وجہ سے موالی وممالیک علماء میں ممتاز مقام ومرتبہ رکھتی ہیں۔ ایک زبردست محدث کی مولاۃ ہونے کی بنا پر علم وفضل سے خاص نسبت رکھتی تھیں۔ انہوں نے بڑی محنت سے علمِ حدیث کی تحصیل کی ـــــ اور عبدالمنعم بن کلیب سے حدیث کی سماعت کی۔ پھر خود مسندِ درس بچھائی اور بے شمار لوگوں کو اپنے فیضانِ علمی سے بہرہ یاب کیا۔

ان کے ارشد تلامذہ میں علامہ ابرقوہیؒ اور ابوالفتح مُرتضٰیؒ حاجب کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ ابرقوہیؒ ان کے خاص الخاص شاگرد تھے اس لیے وہ "شیخۃ الابرقوہیؒ" کے لقب سے مشہور ہوئیں۔

بی بی شیریںؒ نے سنہ ۶۴۰ھ ہجری میں وفات پائی۔

(خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان
از قاضی اطہر مبارکپوری
بحوالہ حاشیہ الاکمال ج ۴ ص ۱۲)

بی بی ستُّ الامناءؒ

شیخ سعدالدین اسعد بن عثمان بن اسعد بن منجاح کی صاحبزادی تھیں۔ علمِ حدیث میں یگانۂ روزگار تھیں۔ انہوں نے یہ علم اپنے جدِ بزرگوار سے حاصل کیا تھا۔

سنہ ۰۰۰ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی فاطمہ صائمہؒ

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ[1] کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھیں اور شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ (مرید و خلیفہ خواجہ بختیار کاکیؒ) کی دینی بہن تھیں۔ نہایت عابدہ و زاہدہ تھیں۔ روزے بہت کثرت سے رکھتی تھیں اس لیے صائمہ (روزے رکھنے والی) مشہور ہو گئی تھیں۔ اپنی بیٹی کی طرح بابا فریدؒ ان کی بابت بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر عورت خلافت کی اہل ہوتی تو میں فاطمہ صائمہ کو اپنی خلافت دیتا۔ وہ سوت کات کر اپنی روزی پیدا کرتی تھیں۔ انہوں نے سوت کات کر اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار کا غلاف تیار کیا تھا۔ یہ غلاف اب تک محفوظ ہے اور عیدالبقر کے دن خواجہ صاحبؒ کے مزار پر چڑھایا جاتا ہے۔

۱۸ شعبان ۶۹۶ھ ہجری کو وفات پائی۔ مزار پرانی دلی میں ہے۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

---

[1] حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی رحمۃ اللہ علیہ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں ماوراء النہر کے ایک قصبے اوش میں پیدا ہوئے۔ ابھی ڈیڑھ برس کے تھے کہ والد ماجد سید کمال الدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ نے نہایت محبت اور توجہ سے ان کی پرورش کی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو ان کو مولانا حفصؒ کا شاگرد بنا دیا۔ انہوں نے چند سال کے اندر اندر ہونہار شاگرد کو ایک جید عالم بنا دیا۔ سترہ سال کی عمر میں خواجہ قطب الدین نے حضرت خواجہ اجمیریؒ کی بیعت کی اور عرصہ تک ان کی خدمت میں رہ کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ پھر بہت سے ملکوں کی سیر و سیاحت کی۔ جب مرشد کے ہندوستان چلے جانے کی خبر سنی تو وہ بھی ہندوستان آ گئے اور مرشد کے حکم کے مطابق دہلی میں مستقل قیام فرمایا اور دمِ آخر تک ہدایتِ خلق میں مشغول رہے۔

۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ ہجری کو وفات پائی۔ ان کا مزار دلی کی مشہور زیارت گاہوں میں ہے۔

لقب کاکیؒ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ سخت عسرت کے دنوں میں انہوں نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ حجرہ کے طاق میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر ہاتھ ڈالا کرو وہاں سے تمہیں بقدرِ ضرورت کاک (میٹھی روٹیاں) مل جایا کریں گی۔ چنانچہ مدت تک خواجہ صاحبؒ کا کنبہ اسی عطائے خداوندی پر بسر اوقات کرتا رہا۔

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے چند مشہور خلفاء کے نام یہ ہیں: بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ، سلطان التمش، شیخ بدرالدین غزنوی، قاضی حمیدالدین ناگوری، شیخ بہاؤالدین غزنوی، شیخ نجم الدین قلندر، شیخ صوفی بدھنی، مولانا برہان الدین حلوائی۔

ملکہ قُتلُغ خاتون

کرمان کے تیسرے قُتلُغ خانی حکمران قطب الدین محمد (۶۵۰ھ تا ۶۵۵ھ) کی بیگم تھی[1]۔ بڑی زیرک اور بیدار مغز خاتون تھی۔ رموزِ سلطنت پر اس کو ماہرانہ عبور حاصل تھا۔ ۶۵۵ھ میں اس کے شوہر قطب الدین محمد نے وفات پائی تو عمائدِ سلطنت نے بالاتفاق اس کو شوہر کی جگہ کرمان کے تختِ حکومت پر بٹھایا۔ اس نے ۶۵۵ھ سے ۶۸۱ھ تک پورے چھبیس سال تک کرمان پر بالاستقلال حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد ۶۸۱ھ میں جلال الدین سیورغاتمش اس کا جانشین ہوا۔ (سٹینلے لین پول)

---

[1] قُتلُغ خانی خاندان کرمان پر ۶۱۹ھ (۱۲۲۲ء) سے ۷۰۳ھ (۱۳۰۳ء) تک پورے ۸۵ سال حکمران رہا۔ اس کا بانی براق حاجب تھا۔ وہ قرہ خطائی کا رہنے والا تھا اور علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ھ تا ۶۱۷ھ) کی فوج میں افسر تھا۔ جب چنگیز خان کے حملہ کے بعد خوارزم شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو براق حاجب نے ۶۱۹ھ میں کرمان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اسے تاتاری فرمانرواؤں نے بھی تسلیم کر لیا، اور براق حاجب کو قتلغ خان کا خطاب عطا کیا۔ اس خاندان کی حدودِ حکومت کرمان سے آگے نہ بڑھ سکیں اور وہ ہمیشہ فارس کے مغلوں کا تابع رہا۔ براق حاجب قُتلُغ خان نے تیرہ سال حکومت کی اس کے بعد رکن الدین خوجۃ الحق تخت نشین ہوا۔ اس کی وفات (۶۵۰ھ) کے بعد قطب الدین محمد نے حکومت سنبھالی۔ ("نگار" فرمانروایانِ اسلام نمبر)

بی بی اسماء شامیہؒ

دمشق کے ایک نامور سردار محمدؒ بن حصری کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے اپنے وقت کے کئی نامور علماء سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ نامور محدث مکی بن علان سے بھی حدیث کی چند کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد خود مسندِ درس پر بیٹھیں اور مدتِ دراز تک درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ زندگی میں بار بار حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ دستِ سخاوت بہت کشادہ تھا۔ اپنا مال بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتی رہتی تھیں۔

ذی الحجہ ۶۳۲ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے ایک بھائی اور ایک بیٹے کا شمار بھی شام کے مشاہیر میں ہوتا تھا۔

ایک مشہور شاعر ابن الوردی نے بی بی اسماءؒ کی شان میں یہ شعر کہے ہیں:

کذا الملک فلتکن اخت بن حصری	اے ابن حصری کی بہن
تفوق علی النسا صبیی و شیبا	تو طفولیت اور بڑھاپے میں عورتوں پر سبقت لے گئی۔
طراز القوم انثی مثل ھذا	ایسی ہی عورت قوم کا زیور ہوتی ہے۔ اور
وما التانیث لاسم الشمس عیبا	آفتاب (شمس) میں تانیث کوئی عیب نہیں۔

(تذکرۃ الخواتین)

بی بی اولیاؒ

یہ عارفہ خاتون ساتویں صدی ہجری میں گزری ہیں۔ ان کا مسکن شہر دلی تھا۔ نہایت عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ اکثر چالیس چالیس دن مسلسل اپنے حجرے کے اندر مصروفِ عبادت رہتی تھیں اور اس عرصے میں نہایت قلیل غذا پر گزارہ کرتی تھیں۔ بادشاہِ وقت سلطان محمدؒ تغلق ان کا عقیدتمند تھا۔ (خزینۃ الاصفیا)

بی بی فاطمہؒ بنتِ ابراہیمؒ

ساتویں صدی ہجری کی سرآمدِ روزگار فاضلہ ہوئی ہیں۔ سنہ ۶۴۵ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ابراہیم بن محمود بن جوہر نہایت دانا اور فاضل آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو نہایت اعلیٰ تعلیم دلائی اور ان کو اس دَور کے بڑے بڑے علمار سے استفادہ کا موقع بہم پہنچایا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر بی بی فاطمہؒ نے خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چند ہی سالوں میں مشرق سے مغرب تک ان کے کمالاتِ علمی کی شہرت ہو گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ علامہ شیخ تقی الدین سبکیؒ، ابنِ ابی المحشؒ، ابنِ لکویکؒ اور شیخ ذہبیؒ جیسے فضلائے زمانہ ان کی درسگاہ میں حاضر ہوئے اور ان سے احادیث سُنیں۔

بی بی فاطمہؒ بنتِ ابراہیم نے سنہ ۷۱۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بنتِ خداویردی

ساتویں صدی ہجری میں بے مثل کاتبہ ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بغیر ہاتھوں کے پیدا کیا تھا لیکن پیدائشی لنجی ہونے کے باوجود اس نے اپنے پاؤں سے کتابت سیکھی اور اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ لوگ اس کی خوش خطی کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتے تھے۔ سنہ ۶۲۴ھ ہجری میں اسکندریہ آئی تو لوگ اس کے کمالِ فن کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے اور اس کو مالا مال کر دیا۔ وزیرِ مصر نے بھی اس کو ملاقات کے لیے بُلایا اور اس کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس باکمال خاتون کا مقبرہ ابھی تک اسکندریہ میں موجود ہے اور اس کے ساتھ کچھ زمین بھی وقف ہے۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی قرسم خاتونؒ

مولانا وجیہ الدین خجوندیؒ کی صاحبزادی، شیخ جمال الدین سلیمانؒ کی اہلیہ اور شیخ الشیوخ عالم حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ[1] کی والدہ ماجدہ تھیں۔ نہایت عابدہ زاہدہ اور مستجاب الدعوات خاتون تھیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ کثرتِ عبادت کی بدولت ان کو درجۂ ولایت حاصل ہوگیا تھا۔ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رات کو بی بی قرسم خاتون نمازِ تہجد میں مشغول تھیں کہ ایک چور گھر میں گھس آیا۔ بی بی صاحبہؒ کی نظر اس پر پڑی تو وہ فوراً نورِ بصارت سے محروم ہوگیا۔ اب اس نے گریہ وزاری شروع کردی اور کہنے لگا، جس نیک بخت کی دہشت اور بد دعا سے میری بینائی سلب ہوئی ہے، میں اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میری بینائی پھر واپس آ

---

[1] حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ برّ کوچک پاک وہند میں سلسلۂ چشتیہ کے مؤسسِ ثانی اور پنجاب میں مؤسسِ اوّل ہیں۔ وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ سلسلۂ نسب بیس واسطوں سے سیدنا حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ ۵۶۹ھ سے ۵۸۴ھ کے درمیان کسی وقت قصبہ کھوتوال (چاولے مشائخ) میں پیدا ہوئے۔ جملہ دینی علوم کی تحصیل وتکمیل ملتان جا کر وہاں کے اکابر علماء سے کی۔ اس کے بعد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ پھر مرشد گرامی کے ارشاد کے مطابق طویل عرصے تک مختلف دیار وامصار کی سیاحت میں مشغول رہے۔ اثنائے سیاحت میں اس دور کے بہت سے اکابر اولیاء و علماء سے ملاقات کی اور ان سے کسب فیض کیا۔ سیاحت سے واپس آکر مرشد گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آجائے تو میں عمر بھر چوری نہ کروں گا۔

بی بی صاحبہؒ کو اس کی گریہ وزاری اور فریاد پر رحم آگیا۔ انہوں نے اس کی بینائی کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور چور کی بصارت عود کر آئی۔ اسی وقت بی بی صاحبہؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ معافی کا خواستگار ہوا اور توبہ کر کے رخصت ہوا۔ صبح کو اپنے اہل وعیال کے ہمراہ بی بی صاحبہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مع اہل وعیال سمیت مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ بی بی صاحبہؒ نے اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا۔ اس نے قبولِ اسلام کے بعد کثرتِ مجاہدات و ریاضات کی بدولت درجۂ ولایت حاصل کیا۔ اسے بی بی صاحبہؒ کے خاندان کی طرف سے چادلے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

خرقۂ خلافت عنایت فرمایا اور حکم دیا کہ ہانسی جا کر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرو۔ چنانچہ بابا صاحب ہانسی تشریف لے گئے۔ مرشدؒ کی وفات (سنہ ۶۳۳ھ) کے بعد دہلی پہنچے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے پھر ہانسی چلے گئے۔ ایک دن خواب یا مراقبہ کی حالت میں مرشد کی طرف سے اجودھن (پاک پتن) میں مستقل قیام کرنے کا اشارہ ہوا۔ چنانچہ وہ اجودھن تشریف لائے اور باقی ساری زندگی اسی قصبے میں گزار دی۔ ان کی تبلیغی مساعی سے لاکھوں بندگانِ خدا کو ہدایت نصیب ہوئی اور اجودھن (پاک پتن) کی سرزمین رشکِ آسمان بن گئی۔

حضرت بابا صاحبؒ نے باختلافِ روایت سنہ ۶۶۰ھ اور سنہ ۶۷۰ھ کے درمیان کسی وقت وفات پائی۔ ان کا عظیم الشان مزار پاک پتن میں واقع ہے۔ بابا صاحبؒ کے چند مشہور خلفاء کے اسماء گرامی یہ ہیں:—

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ۔ شیخ جمال الدین ہانسویؒ۔ خواجہ بدر الدین اسحاقؒ۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ۔ مخدوم علاؤ الدین احمد صابر کلیریؒ۔ امام علی الحق سیالکوٹیؒ۔ شیخ ذکریا سندھیؒ۔ شیخ منتجب الدین زری زر بخشؒ۔ شیخ علی شکر ریزؒ۔ شیخ برہان الدین محمودؒ۔ شیخ شہاب الدین بلخیؒ۔ شیخ جمال کابلیؒ۔

مشائخ کا لقب عطا ہوا اور قصبہ کھوتوال (شیخ جمال الدین سلیمانؒ کی جائے سکونت) اسی کے نام پر چاولے مشائخ مشہور ہو گیا۔

بی بی قرسم خاتونؒ کے بچے ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے شوہر نے وفات پائی۔ بی بی صاحبہ نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ شیخ فریدالدین مسعودؒ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ ماجد سے حاصل کر چکے تھے۔ والدہ نے مزید تعلیم کے لیے ملتان بھیج دیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کھوتوال واپس آئے تو بی بی قرسم خاتونؒ بیحد خوش ہوئیں اور انہیں بہت دعائیں دیں۔

حضرت بابا فریدالدینؒ نے جب اجودھن (پاک پتن) میں توطن اختیار کیا تو کچھ عرصہ بعد انہوں نے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل[1] کو وہاں

---

[1] حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے حقیقی برادر خُرد تھے۔ وہ بابا صاحبؒ ہی کے مرید تھے اور انہی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ خرقۂ خلافت پانے کے بعد مرشدِ گرامیؒ کے حکم سے دہلی جا کر قیام پذیر ہو گئے اور مخلوقِ خدا کی اصلاح و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ کبھی کبھی بابا صاحبؒ کی زیارت کے لیے پاک پتن بھی چلے جاتے تھے۔ عبادت و ریاضت میں کمال انہماک تھا۔ اکثر ایک بند حجرے میں یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ جلد ہی ان کے کمالات کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور مخلوقِ خدا کسبِ فیض کے لیے ان کے آستانے پر ٹوٹ پڑی۔ زہد و قناعت کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی دن گھر میں چولھا نہ جلتا تھا اور وہ محض پانی پی کر وقت گزار لیتے تھے۔

شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے دہلی ہی میں وفات پائی اور وہیں ان کی ابدی آرام گاہ بنی۔ اس وقت بابا صاحبؒ حیات تھے۔ تاریخِ وفات کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔

سے کھوتوال بھیجا کہ والدہ ماجدہ کو اجودھن لے آئیں۔ وہ کھوتوال پہنچے اور بی بی صاحبہ کو اجودھن جانے کے لیے رضامند کر لیا ــــ چنانچہ انہوں نے ضعیف العمر والدہ کو گھوڑی پر بٹھایا اور خود پا پیادہ اجودھن کی طرف روانہ ہوئے۔ کھوتوال اور اجودھن کے راستے میں ایک مہیب جنگل تھا جس میں شیر چیتے اور دوسرے خونخوار جانور بکثرت تھے۔ جب شیخ نجیب الدینؒ اس جنگل کو عبور کر رہے تھے، والدہ محترمہ کو سخت پیاس لگی۔ شیخ نے انہیں ایک درخت کے نیچے بٹھایا اور خود پانی کی تلاش میں نکلے۔ بہت دیر کے بعد پانی لے کر واپس آئے تو اس درخت کے نیچے کچھ بھی نہ تھا۔ دیوانہ وار والدہ ماجدہ کو آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پریشان ہو کر ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگے لیکن والدہ کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر نہایت مغموم و محزون بابا صاحبؒ کی خدمت میں اجودھن پہنچے اور سارا ماجرا آپ کو سنایا۔ انہوں نے چند آدمی شیخ نجیب الدینؒ کے ساتھ والدہ ماجدہ کی تلاش کے لیے جنگل میں بھیجے لیکن وہ بھی مایوس واپس آئے۔ اب بابا صاحبؒ رضائے الٰہی پر شاکر ہو گئے اور فرمایا:

"مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور فقراء کو صدقہ دو۔"

یہ واقعہ ۶۲۳ھ ہجری کا ہے۔

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے روایت ہے کہ اس سانحہ کے بعد شیخ نجیب الدین متوکلؒ پھر اس جنگل میں گئے تو ان کو ایک جگہ کچھ انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملیں۔ یہ جگہ اس درخت کے نواح میں تھی جس کے نیچے وہ والدہ مخدومہ کو بٹھا کر گئے تھے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ کسی درندے نے والدہ محترمہ کو شہید کر ڈالا اور یہ ہڈیاں انہیں کی ہیں۔ چنانچہ یہ ساری ہڈیاں جمع کر کے اپنے خریطے میں ڈال لیں اور بابا صاحبؒ کی خدمت میں پہنچ کر ان ہڈیوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا:

"یہ ہڈیاں میرے مصلے پر ڈال دو۔"

شیخ نجیب الدینؒ نے خریطہ کھولا تو اس میں سے کوئی ہڈی برآمد نہ ہوئی حالانکہ اس سارے عرصہ میں انہوں نے خریطے کو اپنے پاس بحفاظتِ تمام رکھا تھا۔ سب نے اس کو اللہ تعالیٰ کا بھید سمجھا اور شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کیا۔ (تاریخ فرشتہ، تذکرہ اولیائے ہند، خزینۃ الاصفیا)

بی بی شریفہؒ

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری صاحبزادی تھیں۔ نہایت عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن ہمیشہ راضی برضائے الٰہی رہیں۔ بعض تذکروں میں ہے کہ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے جوانی میں وفات پائی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ بی بی شریفہؒ باباصاحبؒ کے بھانجے مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ کے نکاح میں تھیں۔ باباصاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر عورت خلافت کی اہل ہوتی تو بی بی شریفہؒ اس کی مستحق تھی اور میں خلافت وسجادہ اسی کو دیتا۔ (تذکرہ اولیائے ہند۔ اخبار الاخیار)

بی بی زمرّد محدّثہؒ

ساتویں صدی ہجری میں مشہور محدّثہ گزری ہیں۔ ان کے تبحّرِ علمی کی سارے مصر، عراق، شام اور حجاز میں شہرت تھی۔ ان کے شوہر اُس دور کے نامور عالمِ دین مولانا اثیر الدینؒ تھے۔ (مشاہیر النساء)

بی بی فاطمہ سامؒ

بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی ہم عصر تھیں۔ انہوں نے بابا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو اپنا منہ بولا بھائی بنا رکھا تھا۔ بہت عابدہ زاہدہ اور مخیرّ خاتون تھیں۔ انہیں جب کبھی معلوم ہوتا کہ شیخ نجیب الدین متوکل پر پیغمبری وقت آن پڑا ہے اور ان پر فاقے گزر رہے ہیں تو وہ ایک من کلچے پکواتیں اور ان کے گھر بھجوا دیتی تھیں۔ وہ اس تحفہ کو بمنت قبول فرماتے تھے۔ بابا فریدالدین مسعودؒ فرمایا کرتے تھے کہ فاطمہ سام گو عورت ہے لیکن دو مرد ولیوں کے برابر ہے۔

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا بیان ہے کہ میں نے بی بی فاطمہ کو دیکھا ہے نہایت پاک دامن اور ضعیف العمر خاتون تھیں، اکثر اشعار حسب حال کہتی تھیں۔ چنانچہ یہ ایک شعر ان کا مجھے یاد ہے ؎

ہم عشق طلب کنی وہم جاں خواہی
ہر دو طلبی ولے میسّر نشود

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "اخبار الاخیار" میں لکھا ہے کہ:

"فاطمہ سامؒ اپنے زمانے کی صالحات، قانتات اور عارفات میں تھیں۔"

بی بی فاطمہ سامؒ نے ۶۴۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ مزار دہلی میں ہے۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے ۶۷۱ھ ہجری میں وفات پائی تو ان کو اپنی منہ بولی بہن بی بی فاطمہ سامؒ کی قبر کے پاس ہی دفن کیا گیا۔

(اخبار الاخیار۔ خزینۃ الاصفیا۔ تذکرہ اولیائے ہند)

بی بی راستیؒ

حضرت شیخ بہاء الحق بہاؤ الدین زکریا[1] ملتانیؒ کے فرزند حضرت شیخ صدر الدین[2] عارفؒ کی اہلیہ اور حضرت شیخ ابو الفتح رکنِ عالم رکن الدین[3]ؒ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ ان کا شمار اپنے دَور کی عارفاتِ کاملہ میں ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی حافظہ اور بے حد عبادت گزار تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ ہر

---

[1] حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کا شمار چھٹی / ساتویں ہجری کے عظیم المرتبت اولیائے سہروردیہ میں ہوتا ہے۔ وہ برّ کوچک پاک و ہند میں سلسلۂ سہروردیہ کے موسس ہیں۔ سلسلۂ نسب صاحبِ رسول حضرت ہبار[؟]بن اسود قرشی تک منتہی ہوتا ہے۔ ولادت باسعادت ۵۷۸ھ ہجری میں ہوئی۔ ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل خراسان و بخارا میں کی اس کے بعد حج کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے اور پانچ سال تک روضۂ نبویؐ کی مجاوری کی۔ اس دوران میں شیخ کمال الدین یمنیؒ سے علمِ حدیث پڑھا اور ان سے اجازہ لے کر بیت المقدس سے ہوتے ہوئے بغداد پہنچے۔ وہاں شیخ الشیوخ خواجہ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی بیعت کی۔ سترہ دن کے بعد انھوں نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور ملتان جانے کا حکم دیا۔ مرشدِ گرامی کے حکم کی تعمیل میں ملتان تشریف لائے اور یہیں ساری زندگی تبلیغِ اسلام میں گزار دی۔ سنہ ۶۶۶ھ ہجری میں وفات پائی۔ مزار ملتان میں زیارت گاہِ خلائق ہے۔

[2] حضرت شیخ صدر الدین عارف، مخدوم بہاؤ الدین زکریاؒ کے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ سنہ ۶۱۲ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور سنہ ۶۸۴ھ ہجری میں وفات پائی۔ اپنے والدِ ماجد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ بڑے عالم و فاضل عبادت گزار اور

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

روز ایک بار قرآن پاک ختم کرتیں۔ اپنے خسر حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کے مریدانِ خاص میں سے تھیں اور اُن سے غیر معمولی عقیدت رکھتی تھیں۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کسبِ فیض کرتی تھیں۔

۶۹۵ھ ہجری میں وفات پائی۔ مزار ملتان میں ہے۔ عام طور پر مردوں کو اس کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

(خزینۃ الاصفیا)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

سخی تھے۔ اپنے زمانے کے جلیل القدر اولیاء اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔

۳ حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین رکن عالمؒ، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے صاحبزادے تھے۔ ولادت باسعادت ۶۴۷ھ میں ہوئی اور وفات ۷۳۵ھ میں علوم ظاہری کی تعلیم اپنے والدِ ماجد سے حاصل کی اور خرقہ خلافت اپنے دادا جان حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ سے حاصل کیا۔ ۳۶ سال کی عمر میں اپنے والدِ گرامی کی مسندِ رُشد و ہدایت پر رونق افروز ہوئے اور باون سال تک مخلوقِ خدا کو فیض یاب کرتے رہے۔ ان کا مزار قلعہ کہنہ میں اپنے دادا جان اور والدِ ماجد کے مزار کے نزدیک واقع ہے۔ یہ مزار افغان طرزِ تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ اس کی بلندی ۱۰۰ فٹ کے قریب ہے۔ اسے سلطان محمد تغلق نے بنوایا تھا

بی بی سارہؒ

حضرت شیخ نظام الدینؒ ابوالمویدؒ (المتوفی ۶۷۳ ہجری [ا]) کی والدہ تھیں۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بہت عقیدت رکھتی تھیں۔ انہوں نے ان کو اپنی منہ بولی بہن بنا رکھا تھا۔ وہ صرف عارفہ ہی نہیں تھیں بلکہ بڑی عالمہ فاضلہ بھی تھیں اور علم فقہ میں درجہ تبحر رکھتی تھیں۔ ایک دفعہ خشک سالی کی وجہ سے دلی میں قحط پڑ گیا اور غلہ اس قدر مہنگا ہو گیا کہ کسی غریب کے لیے اس کا خریدنا ممکن نہ رہا۔ دلی کے لوگ جمع ہو کر شیخ نظام الدینؒ ابوالموید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بارش کے لیے دعا کی درخواست کی۔ شیخ منبر پر کھڑے ہوئے اور اپنی آستین سے کپڑے کا ایک ٹکڑا نکالا۔ ایک تار اس میں سے جدا کیا۔ اور پھر اس تار کو آسمان کی طرف کر کے کہا:

"الٰہی یہ تار اس بزرگ خاتون کے کپڑے کا ہے جس نے ساری عمر کسی نامحرم مرد کی طرف نہیں دیکھا، اس کے طفیل اور بحرمت اس جذبہ عبودیت کے جو وہ تیرے ساتھ رکھتی تھی

[ا] شیخ نظام الدین ابوالمود کا شمار ساتویں صدی ہجری کے مشہور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ وہ حضرت خواجہ قطب بختیار کاکیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ فضائل صوری و معنوی سے آراستہ تھے۔ شیخ احمد غزنویؒ اور شیخ عبدالواحدؒ سے بھی کسب فیض کیا۔ ان کے مواعظ و خطبات بہت پر تاثیر ہوتے تھے۔ لوگ انہیں سن کر از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ ۶۷۳ھ میں وفات پائی۔

ہمیں بارانِ رحمت سے نوازو ورنہ میں جنگلوں میں زندگی بسر کروں گا اور پھر کبھی آبادی میں قدم نہ رکھوں گا۔"

اللہ نے ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا، اسی وقت آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے اور اس قدر بارش ہوئی کہ میدان اور جنگل پانی سے بھر گئے اور سیلاب کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

لوگوں نے شیخ نظام الدین ابوالمؤیدؒ سے پوچھا: —— "حضرت یہ کپڑا کس کا تھا اور کیسا تھا کہ جس کے تار کا واسطہ دے کر آپ نے اللہ سے دعا کی؟"

انہوں نے فرمایا: —— "یہ کپڑا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے دامن کا ہے جو انہوں نے میری والدہ کو عنایت فرمایا تھا۔ وہ اس کو اپنے سر پر رکھ کر عبادت کیا کرتی تھیں۔"

بی بی سارہؒ نے ۶۴۳ھ ہجری میں اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ ان کا مزار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار (واقع دہلی) کے متصل ہے۔

(خزینۃ الاصفیا۔ تذکرہ اولیائے ہند)

بی بی فاطمہؒ بنتِ جمال الدینؒ

ان کی کنیت اُمِ عبداللہ تھی۔ شیخ امام المقری المحدث جمال الدینؒ بن سلیمان بن عبدالکریم بن عبدالرحمٰن انصاریؒ کی صاحبزادی تھیں۔ دمشق اُن کا وطنِ مالوف تھا۔ اپنے نامور والد کی طرح انہوں نے بھی علمِ حدیث میں بڑا بلند مقام حاصل کیا اور اپنی الگ مجلسِ درس قائم کی۔ ۷۰۳ھ ہجری میں وفات پائی۔

(مشاہیر النساء)

بی بی زلیخاؒ

سلطان المشائخ حضرت خواجہ محمد نظام الدین اولیاءؒ محبوب الٰہی کی [1] والدہ ماجدہ تھیں۔ غالباً بدایوں کی رہنے والی تھیں۔ سلطان المشائخؒ نے ابھی عمر کی پانچ ہی بہاریں دیکھی تھیں کہ ان کے والدِ ماجد سید احمد رحمۃ اللہ علیہ فوت ہوگئے۔ بی بی زلیخاؒ نے اپنے سر تاج کی وفات پر بڑے صبر اور حوصلہ سے کام لیا اور سوت کات کات کر اپنے لختِ جگر کی پرورش کرنے لگیں۔ وہ بڑی جلیل القدر خاتون تھیں اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے اپنے وقت کی رابعہ بصریؒ تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد ان پر پیغمبری وقت آپڑا لیکن انہوں نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا گوارا نہ کیا۔ سوت کی فروخت سے معمولی آمدنی ہوتی تھی۔ ماں بیٹے اسی میں صبر و شکر سے گزارا کر لیتے تھے لیکن کبھی کبھی ان پر فاقہ بھی آجاتا۔ اُس دن بی بی زلیخاؒ سعادت مند بیٹے سے فرماتیں:

"بابا محمد! آج ہم لوگ خدا کے مہمان ہیں۔"

شروع شروع میں تو عمر فرزند والدہ کے ارشاد کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ جب سمجھے تو اس میں لذت محسوس کرنے لگے۔ خود فرماتے ہیں کہ میں کئی کئی دن

---

[1] سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا شمار برکوچک پاک و ہند کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔ اسم گرامی محمد تھا سلطان المشائخ، نظام الدین اور محبوب الٰہی القاب ہیں۔ باختلاف روایت ۶۳۶ھ یا ۶۳۱ھ یا ۶۳۴ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ سال کے تھے کہ والدِ گرامی سید احمدؒ بن سید علیؒ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ نے نہایت نامساعد حالات میں ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ پہلے

(باقی اگلے صفحہ پر)

فاقہ کے انتظار میں رہتا کہ اس دن والدہ صاحبہ مجھ سے فرمائیں:

"بابا محمد ہم لوگ آج خدا کے مہمان ہیں"

بی بی زلیخاؒ نے صاحبزادے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور ان کو تعلیم کے لیے بدایوں کے نامور عالم مولانا سید علاؤالدین اصولیؒ کے سپرد کیا۔ انہوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ کا

بدایوں میں پھر اجودھن (پاک پتن) جا کر حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی بیعت کی اور سالہا سال تک ان کی خدمت میں رہ کر کسبِ فیض کیا۔ جب ان کی تربیت پوری ہو گئی تو بابا صاحبؒ نے سندِ خلافت عطا فرمائی اور دلی جانے کا حکم دیا۔ مرشدِ گرامی کے ارشاد کی تعمیل میں وہ دلی گئے اور شہر سے باہر غیاث پور میں مستقل اقامت اختیار فرمائی۔ یہی جگہ اب بستی نظام الدین اولیاء کہلاتی ہے۔ اس بستی میں محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ منبعِ رشد و ہدایت بن گئی اور ان کی تبلیغی مساعی سے ہزاروں کفار اور فساق و فجار کو ہدایت نصیب ہوئی۔ ان برکات و فیوض کی بدولت شراب خوری، دروغ گوئی، جوئے بازی، کم تولنے، ملاوٹ کرنے اور اس طرح کی دوسری برائیوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ عوام الناس کا رجحان دین کی طرف ہو گیا اور سلسلۂ چشتیہ کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

سلطان المشائخؒ کی خانقاہ کے لنگر سے بے شمار لوگ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے اور خانقاہ میں ہر وقت قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخ ساری عمر کسی بادشاہ یا امیر کے آستانے پر نہیں گئے۔ فی الحقیقت وہ اپنے دور کے جنیدؒ اور بایزیدؒ تھے۔ سلطان المشائخؒ نے ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں وفات پائی۔ نماز جنازہ شیخ ابوالفتح رکن الدین سہروردی ملتانیؒ نے پڑھائی۔ مزار بستی نظام الدین اولیاءؒ میں مرجع خواص و عوام ہے۔

نے بڑی توجہ اور محبت سے سلطان المشائخ کو تعلیم دی۔ چند سال بعد جب وہ فارغ التحصیل ہو گئے تو بی بی زلیخاؒ نے شہر کے علماء و مشائخ کو بلا کر جلسۂ دستار بندی منعقد فرمایا۔ کچھ عرصہ بعد وہ مزید تعلیم کے لیے والدۂ ماجدہ کو ساتھ لے کر دلی تشریف لے گئے۔ دلی میں انہوں نے مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ان سے سندِ فضیلت حاصل کر لی۔ بعض روایات کے مطابق دلی میں مولانا کمال الدین زاہدؒ سے بھی استفاضہ کیا اور ان سے "مشارق الانوار" کا درس لیا۔

بی بی زلیخاؒ اپنے پیارے فرزند کا تحصیلِ علم میں انہماک دیکھتی تھیں تو خوش ہو ہو کر انہیں دعائیں دیتی تھیں۔ وہ صاحبِ نسبت اور مستجاب الدعوات خاتون تھیں۔ خشیتِ الٰہی کے غلبہ سے ہر وقت روتی رہتی تھیں۔ ابھی سلطان المشائخؒ نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی تھی کہ بیمار ہو گئیں۔ بیماری نے اتنی شدت اختیار کی کہ کھانا پینا چھوٹ گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آیا ہی چاہتا ہے۔ سلطان المشائخؒ جمادی الاخریٰ کا چاند دیکھ کر سلام کے لیے والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بی بی صاحبہؒ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا:

"میرے بچے آئندہ ماہ کس کے سلام کو آؤ گے اور کس سے دعائیں لو گے۔"

سلطان المشائخؒ بے تاب ہو گئے اور رو کر کہا:

"اماں جان! ہم آپ کے بغیر کیسے جئیں گے"

بی بی صاحبہؒ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا:

"اس وقت جا کر سو رہو، صبح آنا۔"

سلطان المشائخؒ نے رات نہایت بے چینی سے گزاری۔ علی الصباح والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنے محبوب فرزند کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا:

"الٰہی یہ بے کس یتیم اب تیرے حوالے ہے۔" یہ کہا اور جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

یہ واقعہ جمادی الاخری ۶۳۸ھ ہجری کا ہے۔ ان کا مزار دلی میں شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے مزار کے قریب موجود ہے۔

سلطان المشائخؒ اپنی والدہ کی جلالتِ قدر کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کو زندگی میں جب بھی کوئی مہم پیش آتی تو اس کا انجام کار ان کو خواب میں کھل جاتا تھا۔

(خزینۃ الاصفیا)

بی بی اُمُّ الخیرؒ ــــ جمال النّساء

بغداد میں پیدا ہوئیں اور علم وفضل کے اعتبار سے آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکیں۔ ان کے تبحرِ علمی کی وجہ سے لوگ ان کو "جمال النّساء" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ انہوں نے ابن البطیؒ، ابوالمظفر کاغذی اور شجاع الحربی جیسے بلند پایہ علماء سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ پھر خود مسندِ درس بچھائی اور سینکڑوں لوگوں کو حدیث کی تعلیم دی۔

ان سے کسبِ فیض کرنے والوں میں فاطمہؒ بنتِ سلیمان، ابن شحنہؒ، ابن سعدہؒ، اسمٰعیل بن عساکرؒ اور قاضی تقی الدین سلیمانؒ جیسے نامور محدثین کے نام شامل ہیں۔

فضل وکمال کے علاوہ بی بی اُمُّ الخیرؒ زہد و اتقا میں بھی بڑی شہرت رکھتی تھیں۔ انہوں نے حج کے لیے بارہا مکہ معظمہ کا سفر کیا۔ ۶۲۰ھ ہجری میں وفات پائی۔

(تذکرۃ الخواتین)

آٹھویں صدی ہجری

۱۔ بی بی حبیبہ محدثہؒ (محدثہ)
۲۔ بی بی فاطمہؒ بنتِ ابراہیم (محدثہ)
۳۔ ملکہ دلشاد خاتون (صاحبِ تدبیر، مخیّر)
۴۔ بی بی سارہؒ (محدثہ)
۵۔ بی بی فاطمہؒ بنتِ احمد (محدثہ)
۶۔ بی بی اُم یوسف فاطمہؒ (محدثہ)
۷۔ بی بی حفصہ بنتِ شیریںؒ (عارفہ)
۸۔ تمسن آغا بیگم (سخی، خیر خواہ خلق)
۹۔ شہزادی شقراہ (خیر خواہ خلق)
۱۰۔ نیلوفر خاتون (مخیّر نیک نہاد)
۱۱۔ بی بی ملکہؒ زر (محدثہ)
۱۲۔ بی بی قتلق آغاؒ (سخی، زیرک)
۱۳۔ بی بی ست العربؒ (عالمہ، معلّمہ)
۱۴۔ بی بی جہان خاتون (شاعرہ)
۱۵۔ بی بی حیات (شاعرہ)
۱۶۔ بی بی ست الفقہاءؒ (محدثہ، عارفہ)
۱۷۔ بی بی زینبؒ بنتِ عبدالرحمٰن (محدثہ، عالمہ، معلّمہ)
۱۸۔ بی بی فضہؒ (عارفہ)
۱۹۔ بی بی آمنہ بنتِ علیؒ (محدثہ)
۲۰۔ بی بی فاطمہؒ بنتِ احمد (محدثہ)
۲۱۔ بی بی فاطمہؒ بنتِ عمر (محدثہ)
۲۲۔ بغداد خاتون (مدبّرہ)
۲۳۔ بنتِ حدق (دیندار، مخیّر)
۲۴۔ بی بی فاطمہؒ بنت علم الدین البرزالی (محدثہ)
۲۵۔ بی بی ام عمرؒ (محدثہ)
۲۶۔ بی بی صفیہؒ بنتِ احمد (محدثہ)
۲۷۔ بی بی خدیجہؒ بنتِ احمد (محدثہ)
۲۸۔ بی بی زینبؒ بنتِ احمد کمال الدین (محدثہ)
۲۹۔ بی بی زینب شامیہؒ (محدثہ)
۳۰۔ بی بی تتمیؒ (عارفہ)
۳۱۔ بی بی جیو ندیؒ (عارفہ)
۳۲۔ بی بی عائشہ بنتِ محمدؒ (محدثہ)
۳۳۔ بی بی عائشہ عسقلانیؒ (عالمہ، خطاطہ)
۳۴۔ بی بی عائشہؒ بنتِ شمس الدین (محدثہ)
۳۵۔ بی بی آمنہ ملکؒ (محدثہ)
۳۶۔ للہ عارفہ (عارفہ، شاعرہ)
۳۷۔ بی بی اُم الحسنؒ (محدثہ)

بی بی حبیبہ محدثہؒ

حبیبہؒ بنتِ عبدالرحمٰن بن محمد بن ابراہیم بن احمد بن عبدالرحمٰن بن اسمٰعیل بن منصور مقدسی۔ آٹھویں صدی ہجری میں یگانۂ روزگار محدثہ گزری ہیں۔ علم حدیث انہوں نے شیخ تقی الدینؒ بن ابی الفہم البلدانی اور خطیب مروان سے حاصل کیا اور دوسرے علوم متداولہ ابراہیم بن خلیلؒ سے حاصل کیے۔ مذکورہ اساتذہ کے علاوہ انہوں نے اسکندریہ کے محدث سبط حافظ سلفیؒ بغداد کے محدث ابراہیم بن ابی بکر الزغبیؒ اور فضل اللہ بن عبدالرزاقؒ سے بھی اجازہ حاصل کیا۔ تحصیلِ علم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی مقدس کام میں گزرا۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا سیکڑوں حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ ان سے بڑے بڑے علماء نے حدیث کا علم حاصل کیا۔ ان میں علامہ صلاح الدین الصفدیؒ جیسے شہرۂ آفاق عالم بھی شامل تھے۔ انہوں نے ۷۲۸ھ میں بی بی حبیبہؒ سے حدیث کا اجازہ حاصل کیا تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی تصنیف "اعیان العصر واعوان النصر" میں بھی کیا ہے۔

بی بی حبیبہؒ نے شعبان ۷۳۳ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی فاطمہؒ بنتِ ابراہیم

بی بی فاطمہؒ بنتِ ابراہیم آٹھویں صدی ہجری میں نامور محدثہ گزری ہیں۔ علم و فضل اور زہد و عبادت میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔

۷۴۱ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

ملکہ دلشاد خاتون

تمرتاش بن امیر چوپان کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی فارس وعراق کے الک خانی (جلیری) حکمران شیخ حسن ایلکانی معروف بہ شیخ حسن بزرگ (۷۳۶ھ تا ۷۵۷ھ) سے ہوئی۔ اس کا بیٹا شیخ اویس (۷۵۷ھ تا ۷۷۶ھ) مشہور بادشاہ ہوا ہے۔ تبریز، آذربائیجان، موصل اور دیار بکر جو اس کے والد کی سلطنت میں شامل نہیں تھے وہ بھی اس نے فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ مشہور شاعر خواجہ سلمان ساوجی نے اس کی مدح میں کئی قصائد منظم کیے ہیں۔

دلشاد خاتون کو اپنے شوہر شیخ بزرگ کے زمانے میں بڑا اقتدار حاصل تھا۔ وہ بڑی صاحبِ تدبیر اور دانا خاتون تھی اور ملک کے تمام انتظامی وسیاسی امور پر پوری طرح حاوی تھی۔ رعایا کی بے حد خیر خواہ تھی اور غریبوں مسکینوں کی دل کھول کر مدد کرتی تھی اسی لیے اس کا نام بڑی عزت و احترام سے لیا جاتا تھا۔

اس نیک دل ملکہ نے ۷۵۲ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ اس کی نعش کو نجفِ اشرف لے جا کر دفن کیا گیا۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی سارہؒ

آٹھویں صدی ہجری میں شہرۂ آفاق محدثہ گزری ہیں۔ شیخ تقی الدین السبکی کی صاحبزادی تھیں۔ مشہور محدثہ رجب بنتِ شہاب الدین احمد قلیجی (ولادت ۸۰۰ھ وفات ۸۶۹ھ) ان کی پوتی اور شاگرد تھیں۔ (ان کے حالات الگ بیان کیے گئے ہیں) (مشاہیرِ نسواں)

بی بی فاطمہؒ بنتِ احمدؒ

شہاب الدین احمدؒ بن قاسم بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الجزائری کی صاجزادی تھیں۔ علمِ حدیث میں یگانۂ روزگار تھیں۔ خود ان کے بھائی مصطفی الدین نے جو اپنے عہد کے بے مثل عالم تھا، ان سے اکتسابِ فیض کیا اور عرصہ تک ان کے درس میں شریک ہوئے۔ بی بی فاطمہؒ نے ۸۰۳ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر النساء)

اُمِّ یوسف فاطمہؒ

بی بی اُمِّ یوسف فاطمہؒ شام کی نامور محدثہ ہوئی ہیں۔ محمدؒ بن عبدالھادی بن عبدالحمید کی صاجزادی تھیں۔ انہوں نے "صالحیہ" میں اپنی درسگاہ قائم کی تھی۔ اس میں ابنِ محرزؒ جیسے عالم اور فاضل اصحاب حاضر ہوئے اور اُمِّ یوسفؒ سے حدیث کے سبق پڑھے۔ (سالِ وفات کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔) (مشاہیر النسا)

بی بی حفصہؒ بنتِ شیریںؒ

حضرت خواجہ محمدؒ شیریںؒ المتوفی ۱۱۰ھ کی ہمشیرہ تھیں جس طرح خواجہ محمدؒ شیریںؒ کا شمار اپنے دور کے مشہور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے اسی طرح بی بی حفصہؒ بھی اپنے زمانے کی عارفاتِ کاملہ میں شمار ہوتی ہیں۔ نہایت عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چراغ جلا کر نماز کے لیے کھڑی ہوتیں تو بہت رات گئے تک بستر پر نہ جاتیں اس اثنا میں چراغ تو گل ہو جاتا لیکن ان کے گھر میں صبح تک روشنی بدستور رہتی۔ اسی طرح ان سے اور بھی بہت سی کرامات منسوب ہیں۔

(مشاہیر نسواں)

تمن آغا بیگم

امیر تیمور گورگان[1] کی بیگم تھی۔ بہت نیک دل اور مخیر خاتون تھی جس زمانے میں اس کا شوہر اسلامی ممالک کو زیر و زبر کرنے اور خلقِ خدا کا قتلِ عام کرنے میں مصروف تھا، یہ نیک خاتون سمرقند میں مقیم تھی اور اس نے اپنے آپ کو مخلوقِ خدا کی خدمت اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں ہمہ تن وقف کر

---

[1] امیر تیمور لنگ یا تمرلنگ کا شمار دنیا کے بہت بڑے فاتحین اور کشور کشاؤں میں ہوتا ہے۔ وہ ترکوں کے برلاس قبیلے کی ایک شاخ گورگان سے تعلق رکھتا تھا۔ ۷۳۶ھ میں اس قبیلے کے سردار کے گھر پیدا ہوا۔ ہوش سنبھالا تو پہلے ایک دو طاقتور مغل سرداروں کی ملازمت کی پھر آہستہ آہستہ ترقی کرکے ماوراء النہر کی حکومت پر قبضہ کر لیا، جلد ہی خوارزم (خیوا) پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ ۷۸۲ھ میں اس نے خراسان، فارس، سیستان، جرجان، مازندران، آذربائیجان، کردستان اور افغانستان کو مسخر کر لیا۔ ۷۹۵ھ میں بغداد، عراق، گرجستان، آرمینیا اور ماسکو کو فتح کیا۔ تین برس کے بعد ہندوستان پر دھاوا بول دیا اور دہلی فتح کرکے وہاں کے باشندوں کا قتلِ عام کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ حلب، حماۃ، حمص اور بعلبک کو روندتا ہوا دمشق پر جا چڑھا اور اسے فتح کر لیا۔ وہاں سے اس نے ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور دو سال بعد عثمانی فرمانروا سلطان بایزید (اوّل) یلدرم کو انگورہ کے میدان میں شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ مفتوح سلطان کو اس نے لوہے کے ایک بڑے پنجرے میں قید کر دیا۔ جہاں وہ آٹھ ماہ بعد فوت ہو گیا۔ پھر اس نے عیسائیوں کے ایک بڑے مرکز سمرنا (ازمیر) کو تباہ کیا۔ سمرنا سے وہ اپنے علاقے کی طرف پلٹا اور چین پر یلغار کرنے کا ارادہ کیا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رکھا تھا۔ اس کا دستِ سخاوت بہت کشادہ تھا، اور بے شمار غربا و مساکین اس کے دسترخوان پر پرورش پاتے تھے۔ اس نے سمرقند میں ایک عالی شان بیمارستان (ہسپتال) تعمیر کرایا جس میں ہر حیثیت کے مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ دواؤں اور خوراک وغیرہ پر اٹھنے والا تمام خرچ تمن آغا بیگم کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے ایک بہت بڑا لنگرخانہ (غریب خانہ یا محتاج گھر POOR HOUSE) بھی سمرقند میں بنوایا۔ اس میں سینکڑوں غریبوں اور محتاجوں کی نگہداشت اور پرورش کی جاتی تھی۔

۱۹ شعبان ۸۰۱ھ ہجری کو امیر تیمور اپنی مہمات سے فارغ ہو کر سمرقند واپس آیا تو اس نے ان دونوں عمارتوں کا معائنہ کیا۔

تمن آغا بیگم کا سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔

(روضۃ الصفا)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لیکن اس مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ ۸۰۷ھ میں اوترار کے مقام پر انتقال کر گیا۔ تیمور کی فتوحات نے ماوراء النہر کو بہت بڑی سلطنت بنا دیا تھا جس کا دارالحکومت سمرقند تھا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ وسیع سلطنت متعدد خود مختار ریاستوں میں بٹ گئی۔

تیمور کے ہاتھوں عالمِ اسلام کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ اس نے بایزید یلدرم جیسے مجاہد فرمانروا کو شکست دے کر یورپ کے عیسائی بادشاہوں کے ہاتھ مضبوط کر دیئے۔ اگر وہ سلطنتِ عثمانیہ کو پامال نہ کرتا تو بہت جلد سارا یورپ اس سلطنت کا باجگزار بن جاتا اور دنیا کی تاریخ کسی اور انداز میں لکھی جاتی۔

شہزادی شقراء

سلطانِ مصر الملک الناصر ناصر الدین حسن (۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء تا ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء اور دوبارہ ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء تا ۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء) کی صاحبزادی اور امیر ادمُس کی بیگم تھی۔ عوام کی خیراندیشی اور جذبۂ خیر کی بدولت اس نے مصر میں بڑا نام پایا۔ عامۃ الناس کی فلاح وبہبود کے لیے اس نے متعدد کام کیے ان میں کئی عمارتوں کی تعمیر بھی شامل تھی۔ اب اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں صرف ایک محل نما عمارت باقی رہ گئی ہے جو دارالست شقراء کے نام سے مشہور ہے۔ شہزادی شقراء نے ۷۹۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

نیلوفر خاتون

سلطنتِ عثمانیہ کے دوسرے فرمانروا سلطان اورخان (۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء تا ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء) کی بیوی اور سلطان مراد اول (۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء تا ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء) کی والدہ تھی۔ نہایت مخیّر اور نیک نہاد خاتون تھی۔ رفاہِ عامہ کے کاموں سے اس کو خاص شغف تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کئی نہریں کھدوائیں، پل بنوائے، سڑکیں بنوائیں اور بہت سی دوسری عمارتیں بنوائیں۔ دوسری سب عمارتیں اور نہریں سڑکیں وغیرہ تو امتدادِ زمانہ کی نذر ہوگئیں البتہ بروصہ کے قریب ایک نہر اور اس پر بنوایا ہوا پل ابھی تک موجود ہے۔ یہ نہر آبِ "نیلوفر" کہلاتی ہے۔ (مشاہیرِ نسواں)

بی بی ملکہؒ

شرف الدین بن عبداللہ مقدسیؒ کی صاحبزادی تھیں۔ آٹھویں صدی ہجری میں نامور محدثہ گزری ہیں۔ مدت العمر درس و تدریس میں مشغول رہیں اور بے شمار لوگوں نے ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے امام ابن حجر عسقلانیؒ نے ان سے حدیث کی اجازت لی۔ بی بی ملکہؒ نے سنہ ۸۰۲ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی قتلق آغا

امیر تیمور گورگان کی سب سے بڑی بہن تھی۔ یہ خاتون بڑی زیرک، تعلیم یافتہ، دانا اور انصاف پسند تھی۔ اس کا دستِ سخاوت بے حد کشادہ تھا اور لاکھوں غربا اور مساکین اس کی فیاضی اور سخاوت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اپنے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز تھی اور لوگ اس کا نام بڑی عزت اور احترام کے ساتھ لیتے تھے۔ اس نیک بی بی نے سنہ ۷۹۰ھ ہجری میں وفات پائی اور سمرقند میں حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہما کے مزار کے پاس مدفون ہوئی۔ (روضۃ الصفا)

بی بی ست العربؒ

بیت المقدس میں نہایت نامور فاضلہ گزری ہیں۔ سیف الدین مقدسی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی درسگاہ تمام عالم میں مشہور تھی۔ علامہ علی بن عبدالدائمؒ مدت تک اس درسگاہ سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ بی بی ست العربؒ نے سنہ ۷۶۳ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

جہان خاتون

اس کا شمار آٹھویں صدی ہجری کی یگانۂ روزگار شاعرات میں ہوتا ہے۔ خواجہ حافظ شیرازیؒ[1] کی ہم عصر اور ہم وطن تھی۔ بے حد ذہین اور نکتہ سنج تھی۔ یہ شعر اسی کا ہے :

مصوّر است کہ صورت ز آب می سازد
ز ذرہ ذرۂ خاک آفتاب می سازد

خواجہ حافظ شیرازی اس کے بہت قدردان تھے اور بعض مرتبہ اس کو اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ خواجہ صاحب سے ملنے گئی تو انہوں نے اس کو اپنی ایک غزل سنائی، جس کا مطلع یہ ہے :

دردم از یار است و درماں نیز ہم
دل فدائے او شدہ جاں نیز ہم

جب اس شعر پر پہنچے

اعتمادے نیست بر کارِ جہاں
بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم

---

[1] خواجہ شمس الدین محمدؒ حافظ شیرازی کا شمار فارسی زبان کے نابغۂ روزگار شعراء میں ہوتا ہے۔ سنہ ۷۱۵ھ اور سنہ ۷۳۰ھ کے درمیان شیراز میں پیدا ہوئے۔ تفسیر، فقہ، اور دوسرے علوم میں استادانہ دستگاہ حاصل تھی۔ ۷۴۳ھ سے ۷۵۴ھ تک شاہی دربار سے وابستہ رہے لیکن کبھی کسی حکمران کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ درویشانہ اور زاہدانہ زندگی گزارتے تھے۔ بڑے فیاض اور سیر چشم تھے۔ ان کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تھا۔ اس نے اژدحام کا سبب پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ آج جہان خاتون کی شادی کا دن ہے اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ مکان کے اندر بیٹھی ہے۔ عبید ذکانی نے موقع کی مناسبت سے فوراً ایک قطعہ کہا جس کا ایک مصرعہ یہ ہے ؏

خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست

پھر اس نے یہ قطعہ ایک کاغذ پر لکھ کر اندر بھیج دیا۔ دونوں میاں بیوی اس کو پڑھ کر پھڑک اٹھے اور عبید ذکانی کو انعام واکرام سے نوازا۔

عبید ذکانی کا یہ شعر جہان خاتون ہی کی تعریف میں ہے ؎

گر غزل ہائے جہاں خاتوں بہندوستاں فتد
روحِ خسرو ہم حسن گوید کہ ایں کس گفتہ است

جہاں خاتون کا سالِ وفات کسی تذکرے میں درج نہیں ہے۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی حیات

خواجہ قوام الدین شیرازی کی پہلی اہلیہ تھی اور خواجہ حافظ شیرازی (المتوفی ۷۹۲ھ) کی ہمعصر تھی۔ بہت اونچے درجے کی شاعرہ تھی جب اس کے شوہر خواجہ قوام الدین نے جہان خاتون سے دوسرا عقد کیا تو اس نے یہ شعر کہا ؎

ہر کہ غمِ جہاں خورد کے خورد از حیات بر
رو تو غمِ جہاں مخور تا زِ حیات برخوری

ایک اور روایت میں ہے کہ یہ شعر بھی اس نے اپنے شوہر کی دوسری شادی کے سلسلے میں کہا ؎

جہاں خوش است لیکن حیات می باید
اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

(مشاہیر نسواں)

بی بی ست الفقہاءؒ

آٹھویں صدی ہجری میں نامور محدثہ گزری ہیں۔ زہد و عبادت اور اعمالِ حسنہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھیں۔ انہوں نے جعفر ہمدانیؒ، احمد حرانیؒ، عبدالرحمٰن بن سلیمان اور عبداللطیف ابن قبطیؒ جیسے علمائے عصر سے علم حدیث حاصل کیا۔ اس کے علاوہ علم فقہ میں بھی دسترس حاصل کی۔ سندِ فراغت لینے کے بعد انہوں نے خود اپنی درسگاہ قائم کی اور ہزاروں تشنگانِ علم کو سیراب کیا۔ لوگ ان سے بطورِ خاص پہلے سنن ابن ماجہ کا اور پھر حدیث کی دوسری کتابوں کا درس لیا کرتے تھے۔

(مشاہیر النساء)

بی بی زینب بنتِ عبدالرحمٰنؒ

مشہور عالم علامہ عبدالرحمٰن بن محمدؒ بن احمد بن قدامہؒ کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے اپنے والد اور نیز علامہ ابن الدائمؒ وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا اور پھر اپنی درسگاہ قائم کر کے مدت العمر درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ ان کی درسگاہ میں لوگ دور دور سے آتے تھے اور اپنی علمی پیاس بجھا کر واپس جاتے تھے۔

بی بی زینبؒ نے ۷۲۹ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ (مشاہیر النساء)

بی بی فضۃؒ

یہ عارفہ اندلس میں اپنے زہد و عبادت اور کرامات کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ ساتویں / آٹھویں صدی ہجری میں ان کے زہد و اتقا کا عام چرچا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے "نفحات الانس" میں ان کو زمرۂ اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے۔ (نفحات الانس)

بی بی آمنہ بنتِ علیؒ

دمشق کے ایک بزرگ علی بن عبدالعزیزؒ کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے اپنے دور کی ایک نادرۂ روزگار محدثہ اسماءؒ بنتِ حصان اور ایک ایک سرآمدِ روزگار عالم عبداللہؒ بن ابی التائب سے علمِ حدیث حاصل کیا اور فراغ کے بعد خود عرصۂ دراز تک علمِ حدیث کا درس دیتی رہیں۔ شام کے ہزاروں لوگوں نے ان کے خوانِ علم سے ریزہ چینی کی۔

شروع ۷۹۲ھ ہجری میں اس دارِ فانی سے دارِ بقا کو رحلت کی۔

(تذکرۃ الخواتین)

بی بی فاطمہؒ بنتِ احمد

حلب (شام) کی رہنے والی تھیں۔ نسب نامہ یہ ہے: — فاطمہ بنتِ احمد بن محمد بن علی بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن زید الحلبی — سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتا ہے۔ ان کی کنیت اُمّ الحسن تھی۔ علمِ حدیث میں بہت بلند مقام رکھتی تھیں۔ وہ اپنے اجداد سے روایت کرتی ہیں۔ ۷۳۲ھ میں پیدا ہوئیں اور ۸۱۲ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر نسواں)

بی بی فاطمہؒ بنتِ عمر

آٹھویں صدی ہجری میں مصر کی ایک فاضل محدثہ گزری ہیں۔ عام طور پر "بنت الاعمی" کے نام سے مشہور ہیں۔ والد کا نام عمر بن یحیٰی المدنی تھا۔ ۷۹۳ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر نسواں)

بغداد خاتون

ایران کے ایلک خانی (ایلخانی) مغل حکمرانوں کے عہد کے مشہور امیرالامراء امیر چوپان کی بیٹی تھی۔ نہایت خوبرو اور زیرک خاتون تھی۔ اس کی شادی امیر حسن جلائری (جلیری) سے جو تاریخ میں شیخ حسن بزرگ کے نام سے مشہور ہے ۷۲۳ھ (۱۳۲۳ء) میں ہوئی۔ نویں ایلک خانی فرمانروا ابوسعید (۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء تا ۷۳۶ھ ۱۳۳۶ء) کو بغداد خاتون کے اوصاف وخصائل کا علم ہوا تو اس نے چاہا کہ امیر حسن اسے طلاق دے دے تاکہ وہ خود اس سے شادی کرے۔ یہ واقعہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کا ہے۔ لیکن بغداد خاتون کے والد امیر چوپان نے سلطان ابوسعید کی یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ اس پر سلطان ابوسعید امیر چوپان کا دشمن ہو گیا۔ ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں ابوسعید کی انگیخت پر ہرات کے کرت حکمران غیاث الدین (۷۰۸ھ ۱۳۰۸ء تا ۷۲۹ھ ۱۳۲۹ء) نے امیر چوپان کو دھوکے سے قتل کر دیا۔ اب امیر حسن نے مجبور ہو کر بغداد خاتون کو طلاق دے دی اور سلطان ابوسعید نے اس سے نکاح کر لیا۔ بغداد خاتون اپنے حسن لیاقت سے سلطان ابوسعید کے مزاج پر پوری طرح حاوی ہو گئی اور ایلک خانی سلطنت میں اس کو زبردست اثر و رسوخ حاصل ہو گیا یہاں تک کہ اس کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ اس کے رعب واقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ خواص وعوام اس کو خنگار (خداوندگار یعنی فرمانروا) کے لقب سے پکارتے تھے۔ ۷۳۲ھ (۱۳۳۲ء) میں بغداد خاتون کے بعض حاسدوں نے سلطان ابوسعید کے دل میں یہ شک ڈالا کہ امیر حسن نے اپنی سابقہ بیوی سے مل کر سلطان کو مروانے کی سازش کی ہے اس پر میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہو گئے لیکن اگلے سال تحقیق کے بعد یہ الزام جھوٹا ثابت ہوا اور بغداد خاتون کا اثر واقتدار بحال ہو گیا۔

۷۳۴ھ (۱۳۳۴ء) میں سلطان ابوسعید نے دلشاد خاتون سے نکاح کر لیا جو رشتہ

میں بغداد خاتون کی بھتیجی ہوتی تھی۔ سلطان کا یہ فعل بغداد خاتون کی کبیدہ خاطری کا باعث ہُوا، مگر وہ خاموش رہی۔ اگلے سال ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) میں سلطان ابو سعید اچانک فوت ہوگیا۔ اس کے جانشین ارپا خان اور بعض امرائے سلطنت نے بغداد خاتون پر تہمت لگائی کہ اس نے ابو سعید کو زہر کھلا کر ہلاک کیا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر اس کو قتل کرا دیا گیا۔ اس کے قتل کا ایک اور سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اردوئے زریں (التون اردو) کے فرمانروا اُزبک (۷۱۲ھ (۱۳۱۲ء) تا ۷۴۱ھ (۱۳۴۰ء)) کو خط لکھ کر ایران پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ (واللہ اعلم)

(روضۃ الصفا۔ مشاہیر نسواں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

ستِ حدق

الملک الناصر محمد بن قلاؤن مصر کے سلاطین بحری مملوک کے سلسلے کا مشہور فرمانروا ہُوا ہے۔ وہ تین بار تختِ حکومت پر بیٹھا۔ پہلی مرتبہ اس نے ۶۹۳ھ (۱۲۹۳ء) سے ۶۹۴ھ (۱۲۹۴ء) تک، دوسری مرتبہ ۶۹۸ھ (۱۲۹۸ء) سے ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) تک اور تیسری مرتبہ ۷۰۹ھ (۱۳۰۹ء) سے ۷۴۱ھ (۱۳۴۰ء) تک مصر پر حکومت کی۔ ستِ حدق اسی ملک الناصر محمد کی خالہ تھی۔ اس کو شاہی خاندان میں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا اور مصر میں ایک مقتدر شخصیت تسلیم کی جاتی تھی۔ اس دیندار اور مخیّر خاتون کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے بہت شغف تھا چنانچہ اس نے رفاہِ عامہ کے بے شمار کام کیے۔ امتدادِ زمانہ سے ان کاموں کے آثار مٹ چکے ہیں۔ البتہ قاہرہ میں ایک عالی شان جامع مسجد اس کی یادگار ابھی باقی ہے۔ یہ "جامع ستِ حدق" کے نام سے مشہور ہے۔

ستِ حدق نے ۷۴۳ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی فاطمہؒ بنتِ علم الدین البرزالیؒ

ملک شام کی مشہور محدثہ ہوئی ہیں۔ علامہ علم الدین البرزالی کی دُختر نیک اختر تھیں۔ علم حدیث میں درجۂ تبحر رکھتی تھیں۔ ان کی درسگاہ میں بڑے بڑے علماء شریک ہوتے تھے۔ علامہ صلاح الدین صفدی صاحب "عنوان النصر فی اعیان العصر" نے ان کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ ۷۳۱ھ ہجری میں انتقال کیا۔

(مشاہیر النساء)

بی بی اُمِ عمرؒ

حافظ تقی الدین محمد بن رافع السلامیؒ کی صاحبزادی تھیں۔ مشہور محدثہ ہوئی ہیں۔ انہوں نے علامہ عبدالرحیمؒ بن ابی الیسر اور کئی دوسرے علماء سے علم حدیث حاصل کیا اور بعد میں خود اپنی درسگاہ قائم کی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جیسے فاضلِ زمانہ بزرگوں نے ان سے اجازتِ حدیث حاصل کی۔

۸۰۵ھ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی صفیہؒ بنتِ احمدؒ

شرف الدین احمد بن احمد المقدسیؒ کی صاحبزادی تھیں۔ بیت المقدس کی رہنے والی تھیں۔ اپنے دور کی نامور محدثہ ہوئی ہیں۔ انہوں نے علم حدیث علامہ ابن الدائمؒ سے حاصل کیا اور تکمیل کی سند لینے کے بعد خود اپنی درسگاہ قائم کی۔ اس میں دُور دُور سے شائقین علم حاضر ہوتے تھے اور دولتِ علم سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔ بی بی صفیہؒ اکثر صحیح مسلم کا درس دیا کرتی تھیں۔

(مشاہیر النساء)

بی بی خدیجہ بنتِ احمدؒ

احمد بن الحنبلیہ کی صاحبزادی اور زین الدین عمر البالسی کی والدہ تھیں۔ علمِ حدیث میں یگانۂ روزگار تھیں۔ ان کے تلامذہ میں امام ابن حجر عسقلانیؒ کا نام بھی شامل ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ابناء میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۸۰۹ھ ہجری میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی زینبؒ بنتِ احمد کمال الدینؒ

ساتویں / آٹھویں صدی ہجری میں بیت المقدس میں نامور محدثہ ہوئی ہیں ۶۴۶ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ محمد بن عبداللہ، خطیب مراد، عبدالحمید بن عبدالہادی عبدالحمید بن ابی القاسم البلدانی اور ابراہیم بن ابی الخیر جیسے جلیل القدر علماء سے استماعِ حدیث کیا اور پھر طویل مدت تک خود درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ ۷۴۰ھ ہجری میں انتقال کیا۔ (مشاہیر النساء)

بی بی زینب شامیہؒ

آٹھویں صدی ہجری کی سرآمدِ روزگار محدثہ ہوئی ہیں۔ ملکِ شام کی رہنے والی تھیں۔ ان کے شاگردوں میں محدثہ امۃ العزیز نے بڑی شہرت پائی اور خواص و عوام سے "مسندۃ الشام" کا لقب پایا۔ بی بی زینب شامیہ نے ۷۴۹ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر النساء)

بی بی تگنیؒ

بی بی تگنیؒ، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے فرزند مخدوم سید ناصرالدین محمودؒ کی اہلیہ تھیں لہ۔ بڑی نیک اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ ان سے کئی کرامات

لہ جلال الحق والدین سید جلال الدین المعروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق سلسلۂ سہروردیہ سے تھا تاہم انہوں نے سلسلۂ چشتیہ میں بھی حضرت شیخ نصیرالدینؒ چراغ دہلی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ والد سید احمد کبیرؒ اور دادا حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ تھے وہ بھی اپنے دَور کے اکابر اولیاء میں سے تھے۔ مخدوم جہانیاںؒ ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۸۵ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ مصر، شام، حجاز، عراق، بلخ، بخارا، وغیرہ مختلف ممالک کی سیر و سیاحت میں گزارا، اسی لیے انہیں جہاں گشت کہا جاتا ہے۔ سیاحت سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اوچ میں مستقل قیام فرمایا اور آخری دم تک تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔ ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں بے شمار ہندو دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ پنجاب کے مشہور قبیلے کھرل اور نون بھی مخدوم جہانیاںؒ ہی کی تبلیغ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا مزار اوچ میں زیارت گاہِ خواص و عوام ہے۔

مخدوم سید ناصرالدین محمودؒ، مخدوم جہانیاںؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کی ولادت ۷۳۶ھ میں ہوئی اور وفات ۸۲۶ھ میں۔ نہایت عالم و فاضل اور صاحبِ کمال تھے۔ سخاوت میں بھی اپنی مثال آپ تھے اپنے

(باقی اگلے صفحہ پر)

منسوب ہیں ان کی قبر پنجاب کے مشہور تاریخی قصبے اوچ (اُچ شریف) میں آج بھی محفوظ ہے۔ یہ قبر ایک حجرے میں ہے اور اس میں صرف عورتیں داخل ہو سکتی ہیں۔ (تاریخ اوچ)

بی بی جیوندیؒ

بی بی جیوندی (یا جندوڈی) مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی اولاد سے تھیں۔ بڑی بزرگ اور مستجاب الدعوات خاتون تھیں۔ ان کا مقبرہ محمد دلشاد بادشاہ خراسان نے ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ نہایت عظیم الشان عمارت ہے اور حسن تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کا آدھا گنبد حوادث زمانہ کی نذر ہو چکا ہے لیکن عمارت قائم ہے۔ غالباً محکمہ آثار قدیمہ اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ (تاریخ اوچ)

بی بی عائشہؒ بنت محمد

دمشق (شام) کی نامور محدثہ ہوئی ہیں۔ محمد بن احمد بن عثمان کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی درسگاہ کی شہرت حجاز سے مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے پایۂ علمی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (متوفی ۸۵۲ھ) نے ان سے علم حدیث کے سبق پڑھے ہیں۔ بی بی عائشہؒ نے ۸۰۳ ہجری میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ کا)

دور کے جلیل القدر اولیاء اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔ خرقہ خلافت اپنے والد گرامی سے حاصل کیا تھا۔ اللہ نے انہیں بیس فرزند عطا کیے۔ ان کی اولاد پاکستان اور بھارت کے مختلف علاقوں اور شہروں میں ابھی تک موجود ہے۔

بی بی عائشہؒ عسقلانی (سِتّ العیش)

قاضی علاؤالدین حنبلی کی صاحبزادی تھیں۔ ۶۸ ے ھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا شمار مصر کی نامور عالمات میں ہوتا ہے۔ مولانا فتح الدین عسقلانیؒ ان کے دادا تھے اور وہ اکثر ان کی مجلس درس میں حاضر ہوا کرتی تھیں۔ جملہ علوم دینی کے علاوہ انہوں نے فن خوشنویسی میں بھی بڑا نام پیدا کیا۔

نویں صدی ہجری میں کسی وقت وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی عائشہؒ بنتِ شمس الدینؒ

ملک شام کی نہایت نامور محدثہ گزری ہیں۔ والد کا نام علی بن محمد تھا۔ اور حافظ شمس الدین حسینی کی اہلیہ تھیں۔ ساری عمر دمشق میں گزاری۔ وہ ابن الجناز وغیرہ محدثین سے روایت کرتی ہیں۔ ۸۶۱۰ھ ہجری وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی آملکؒ

آٹھویں صدی ہجری میں علم حدیث کی نامور عالمہ ہوئی ہیں۔ وہ ابراہیم بن خلیل بن محمود کی بیٹی اور شیخ جمال الدین کی بہن تھیں۔ ان دونوں کا تعلق طبقہ علماء سے تھا۔ ایک مرتبہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی ملاقات بی بی آملک سے ہوئی۔ انہوں نے ایسی عالمانہ گفتگو کی کہ حافظ ابن حجرؒ نے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ ربیع الآخر ۸۱۵ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ (مشاہیر نسواں)

للہ عارفہ

للہ عارفہ آٹھویں صدی ہجری میں، وادیٔ کشمیر میں ایک عجیب و غریب شخصیت گزری ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ خاتون ہندو تھی اور اس کا نام لَل ایشوری یا لَل یوگیشوری تھا مگر مسلمان کہتے ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرلیا تھا اور وہ ایک صوفی المسلک مجذوبہ تھی چنانچہ کشمیر کے مسلمان اس کو ازراہِ احترام لَل دَدی یا لَل ماجی (یعنی بزرگ ماں) کہتے ہیں۔ صوفیۂ کشمیر کے تذکروں میں اس کو مسلم اولیاء اللہ میں شمار کیا گیا ہے۔ عام طور پر وہ للہ نی کے نام سے مشہور ہے جو کشمیری زبان میں ایک پیار کا لفظ سمجھا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کشمیر کے ہندو اور مسلمان سب اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق اسے ایک قابلِ احترام شخصیت سمجھتے ہیں۔ اس کے اشعار اور اقوال بھی دونوں قوموں میں مقبول ہیں۔

للہ عارفہ ۷۳۵ھ / ۱۳۳۵ء میں کشمیر کے ایک گاؤں پنڈریٹھن (نزد سرینگر) میں پیدا ہوئی۔ ایک اور روایت میں اس کی جائے پیدائش کا نام سمپور بیان کیا گیا ہے۔ اس کے والدین متوسط درجے کے ہندو زمیندار تھے۔ انہوں نے نومولود بچی کا نام لَل ایشوری رکھا۔ وہ ابھی کمسن ہی تھی کہ والدین نے اس کی شادی پانپور کے ایک برہمن زادے سے کر دی۔ وہ گھر کا سارا کام کاج بڑی محنت سے انجام دیتی تھی لیکن اس کی ساس اس پر بہت سختیاں کرتی تھی۔ گالیاں دیتی، پھٹکارتی اور اس کے شوہر سے پٹواتی رہتی تھی۔ دکھ سہتے سہتے اس کی زندگی میں عجیب سا انقلاب آگیا۔ وہ اکثر گم صم رہنے لگی اور نفس کشی میں لذت محسوس کرنے لگی۔ اسی حالت میں اس نے اللہ

سے لو لگالی اور دنیا کو ہیچ سمجھنے لگی اسی زمانے میں اس سے چند خارقِ عادت باتیں ظہور میں آئیں جن کو دیکھ کر لوگ اس کو ایک دیوی سمجھنے لگے اور عورتیں دُور دُور سے اس کے درشن کے لیے آنے لگیں مگر وہ اپنے خیالوں میں مست رہتی اور لوگوں کے ہجوم سے بچنے کی کوشش کرتی۔ آخر ایک دن وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور دشت نوردی اختیار کرلی۔ کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا ورنہ بھوکی پیاسی ہی جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھانتی پھرتی یہ اس کی مجذوبیت کا دَور تھا جو کئی سالوں پر محیط ہے۔ ۷۷۳ھ (۱۳۷۱ء) میں مشہور ولی اللہ سید حسن سمنانیؒ کا وُرود کشمیر میں ہوا۔ ان کے روحانی کمالات نے للہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ان کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہوگئی اور پھر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر وقت کا بیشتر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزارنے لگی[1] اس وقت اس کی عمر ۳۸ برس کی تھی

ایک روایت کے مطابق اس سے پہلے جب سلسلۂ سہروردیہ کے شہرۂ آفاق بزرگ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں کشمیر تشریف لائے تھے، تو للہ نے ان سے بھی کسبِ فیض کیا تھا۔

۷۷۴ھ (۱۳۷۲ء) میں مشہور ولی اللہ اور مبلغ اسلامؒ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کشمیر تشریف لائے تو للہ اُن کے فیوض و برکات سے بھی متمتع ہوئی۔

اب وہ اپنوں اور بیگانوں سب کو برابر سمجھنے لگی اور رشتۂ انسانیت کو

---

[1] "مشاہیر نسواں" میں "خزینۃ الاصفیا" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ للہ کے والدین حضرت بلبل شاہ کشمیریؒ کی بدولت مسلمان ہوئے۔ للہ بھی اکثر والدین کے ہمراہ شاہ صاحب کی خدمت میں جاتی تھی۔ ان کی دعا سے اس نے وہ درجہ پایا کہ کشف القلوب، کشف القبور اور کرامات میں یگانۂ روزگار ہوئی۔ لیکن دوسرے تذکروں میں اس کے حالات اسی طرح بیان ہوئے ہیں جس طرح ہم نے یہاں بیان کیے ہیں۔ (طالب ہاشمی)

سب سے افضل قرار دینے لگی ۔ رنگ نسل وطن اور رسم و رواج کے امتیازات اس کے نزدیک باطل تھے ۔ وہ بت پرستی کی مخالف تھی اور فلسفۂ ہمہ اوست (وحدت الوجود) کی زبردست مبلغ تھی ۔

کشمیر کے نامور صوفی شیخ نورالدین ولیؒ (المتوفی ۸۴۲ھ) للہ عارفہ کے رضاعی فرزند اور عقیدت مند تھے اپنی ایک مناجات میں انہوں نے للہ کو ارباب معرفت میں شمار کیا ہے اور خدا سے دعا کی ہے کہ وہ انہیں لل ددی جیسا بنا دے ۔

للہ کشمیری زبان کی خوشگو شاعرہ بھی تھی ۔ بعض ارباب علم نے اس کو کشمیری شاعری کا بانی قرار دیا ہے ۔ اس کے اقوال بھی اہل کشمیر میں بہت مقبول ہیں ۔ ان کے چند مجموعے چھپ چکے ہیں ۔

للہ عارفہ کے اشعار اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں کہیں ان میں شیومت اور ہندومت کے یوگ فلسفے کی آمیزش ہے لیکن اکثر پر اسلامی تصوف کا رنگ غالب ہے ۔

علامہ عبداللہ یوسف علی مرحوم نے "تاریخ ہند" میں لکھا ہے کہ "وہ تحریک جس کے ذریعے شیومت سلسلۂ نقشبندیہ کے قریب ہوا، اس کا بہترین نمونہ للہ کشمیری کے گیتوں میں ملتا ہے ۔"

للہ عارفہ نے ۷۸۲ھ کے لگ بھگ بھاڑہ کے مقام پر وفات پائی ۔ اس کی قبر کا سراغ ۱۳۷۹ نہیں ملتا ۔

للہ عارفہ کے اشعار اور اقوال کا نمونہ یہ ہے :-

۱ - جب لا الٰہ کہا ، وسواس ہوا ، الا اللہ کہنے سے تسلی ہوئی ۔ سجدہ چھوڑ کے ساجد اور مسجود کو ایک جانا تو موجود پایا ۔ اب اس کیفیت سے لل کا مکان لامکان ہوا ۔

۲ - مورتی بھی پتھر ہے اور مندر بھی پتھر ہے دونوں اوپر سے نیچے تک

ایک ہی ہیں۔ پس اے نادان پنڈت پھر تو کس کی پوجا کرے گا۔

۳۔ کیا سورج ساری دنیا میں اجالا نہیں کرتا ؟ کیا وہ صرف خوبصورت آبادیوں ہی کو منور کرتا ہے ؟ کیا ہوا ہر گھر میں داخل نہیں ہوتی ؟ یہ ایک بھید ہے اس اصول کو سمجھ لو۔

۴۔ شیو (خدا) ہر جگہ حاضر ناظر ہے۔ تعصب اور تنگ نظری کو چھوڑ دو۔ اگر تم میں عقل اور بصارت ہے تو اس کا جلوہ ہر جگہ دیکھ سکتے ہو لیکن اللہ کی پہچان تبھی ہوگی جب اپنے آپ کو پہچان لوگے۔

۵۔ اے عابد! یہ تیری نظر کا قصور ہے کہ تو ایک کو دو دیکھ رہا ہے اور خدا کے وجود کو کبھی مرد اور کبھی عورت سمجھ رہا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تم جو کچھ دیکھتے ہو اور جس رنگ میں دیکھتے ہو سب اسی ایک اللہ کے نور کا ظہور ہے۔

(مشاہیر نسواں، خواتین کشمیر، دائرہ معارف اسلامیہ۔ المعارف لاہور جون ۱۹۷۲ء)

بی بی اُمّ الحسنؒ

اصل نام فاطمہ تھا۔ شام کی رہنے والی تھیں۔ نسب نامہ یہ ہے:۔

ام الحسن فاطمہؒ بنت احمد بن محمد بن علی بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن زید الحلبی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی اولاد سے تھیں۔ علم حدیث میں درجہ تبحر رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے اجداد سے روایت حدیث کی ہے۔

۷۳۲ھ ہجری میں پیدا ہوئیں اور ۸۱۳ھ ہجری میں وفات پائی۔

(مشاہیر النساء)

نویں صدی ہجری

۱۔ بی بی امۃ الخالقؒ (عالمہ، شاعرہ)

۲۔ بی بی صفیہ ابہریؒ (عارفہ)

۳۔ بی بی شاد بیگم (دلاور، ہنر مند، فنون سپہ گری میں طاق)

۴۔ بی بی تغلق نگار خانم (بہادر، نڈر، دانش مند)

۵۔ بی بی مہر انگیز بیگم (فنون سپہ گری میں طاق، ہنر مند)

۶۔ بی بی زینب (شاعرہ)

۷۔ بی بی رابعہؒ بنتِ احمدؒ (عالمہ، محدثہ)

۸۔ بی بی حنیفہؒ (عالمہ، محدثہ)

۹۔ قیصری بیگم (عالمہ)

۱۰۔ بی بی نجو (شاعرہ، ستارہ شناس)

۱۱۔ ملکہ بی بی راستی (مدبرہ معارف پرور، مخیر)

۱۲۔ بی بی مہری خاتون (شاعرہ، ادیبہ)

۱۳۔ ملکہ آفاق بیگم (باسلیقہ، دانشمند، نیک فطرت)

۱۴۔ بی بی بیگی (شاعرہ، علم دوست، مخیر)

۱۵۔ بی بی زینب بنت سلیمانؒ (محدثہ)

۱۶۔ بی بی زینب بنتِ عبداللہ الازہریؒ (محدثہ)

۱۷۔ بی بی عائشہ بنت شہاب الدین (عالمہ)

۱۸۔ گیتی آرا بیگم (بہادر، فنون سپہ گری میں طاق، ہمدرد، خلائق)

۱۹۔ بی بی اسماء بنت محمدؒ (عالمہ، محدثہ)

۲۰۔ ملکہ امۃ الحبیب (بہادر، بیباک، علم دوست)

۲۱۔ بی بی آسیہ بنتِ جاراللہؒ (عالمہ)

۲۲۔ بی بی فاطمہ بنتِ احمدؒ (محدثہ)

۲۳۔ بی بی دولت ایساں (صاحب الرائے، باہمت سیاست دان)

۲۴۔ بی بی رجبؒ (عالمہ محدثہ)

۲۵۔ ملکہ گوہر شاد آغا بیگم (عالمہ، معارف پرور، مخیر)

۲۶۔ بی بی خدیجہؒ بنت عبدالرحمٰن (محدثہ)

۲۷۔ بی بی ام ہانیؒ (عالمہ، فاضلہ)

۲۸۔ بی بی ام الفتحؒ (محدثہ)

۲۹۔ بی بی آمنہ بنت موسیٰؒ (محدثہ)

۳۰۔ بی بی صفیہؒ بنتِ یاقوت (محدثہ)

۳۱۔ بی بی زینبؒ بنتِ یاقوت (محدثہ)

۳۲۔ بی بی زینبؒ بنتِ احمد (عالمہ، محدثہ)

۳۳۔ بی بی مریم بنتِ علی (عالمہ فاضلہ، شاعرہ)

۳۴۔ بی بی ام البہاءؒ (محدثہ)

۳۵۔ بی بی بلقیس بنت محمدؒ (عارفہ)

۳۶۔ بی بی الف بنت جمالؒ (محدثہ)

۳۷۔ بی بی عائشہ ام محمدؒ (غیور، مجاہدہ)

۳۸۔ بی با تماتیم (محدثہ)

۳۹۔ بی بی خدیجہ بنت احمدؒ (عالمہ، محدثہ)

۴۰۔ بی بی الف بنتِ حسام الدینؒ (محدثہ)

۴۱۔ ملکہ مخدومہ جہاں (مدبرہ، بیدار مغز)

۴۲۔ بی بی سلمیٰؒ بنتِ شمس الدین (عالمہ)

بی بی امۃ الخالق رح

عبداللطیف بن صدقہ بن عوض المنادی العقبی کی صاحبزادی تھیں سنہ ۸۱۴ھ میں پیدا ہوئیں۔ زمانۂ تعلیم میں مسند احمد، معجم طبرانی، سیرۃ ابن ہشام، الفیہ، منہاج وغیرہ کتابیں پڑھیں اور بعض کو حفظ کر لیا۔ علامہ جمال الدین حنبلی رح کی مجلس درس میں شریک ہوئیں بعد میں خود طویل مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ ان سے کئی بڑے بڑے محدثین نے روایتیں لی ہیں۔

امام جلال الدین سیوطی رح نے بھی ان سے کسب فیض کیا ہے۔ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھیں۔ ذیل کے اشعار انہی کے ہیں:

ھی المقادیر قد عنی او تذر	مقدر ہے کبھی بلاتا ہے کبھی چھوڑ دیتا ہے
ان کنت اخطات فما اخطا القدر	اگرچہ میں خطا کروں لیکن مقدر خطا نہیں کرتا
اذا اراد اللہ امرا بامرء	اللہ جب بندے سے کوئی کام کرانا چاہتا ہے
وکان ذا عقل و سمع و بصر	بحالیکہ وہ عقل و سماعت و بصر رکھتا ہے
اعمی اذنیہ و اعما قلبہٗ	تو اس کو بہرا اور اس کے دل کو اندھا کر دیتا ہے
و سلہ من عقلہ سل الشعر	اور (دودھ میں سے) بال کی طرح عقل نکال لیتا ہے
حتی اذا انفذ فیہ حکمہٗ	یہاں تک کہ وہ شخص کام کر لیتا ہے
رد اللہ عقلہ لیعتبر	تو اس کی عقل واپس کی جاتی ہے تاکہ عبرت پکڑے

بی بی امۃ الخالق رح نے سنہ ۹۲۰ ہجری میں وفات پائی۔

(تذکرۃ الخواتین)

بی بی صفیہ ابہریؒ

ماوراء النہر کے فرمانروا سلطان ابوسعید (۸۵۵ ہجری تا ۸۷۳ ہجری) کے زمانے میں ایک مشہور عارفہ گزری ہیں۔ اُن کے روحانی کمالات کا اس قدر شہرہ تھا کہ دور دور سے لوگ ان کی زیارت کے لیے آتے تھے اور ان سے دعائے خواستگار رہتے تھے یہاں تک کہ شاہی خاندان کی خواتین بھی حصُولِ برکت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں اور ان کا جوٹھا پانی پینا اپنے لیے بہت بڑی سعادت کا باعث سمجھتی تھیں۔

بی بی صفیہؒ کا مستقل قیام شہر ابہر میں تھا اور سلطان ابوسعید کے زمانے میں وہ بہت سن رسیدہ ہو چکی تھیں۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ تذکرہ حسینی)

شاد بیگم

سلطان حسین مرزا (المتوفی ۹۱۱ھ) کی نواسی اور ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کی ممانی تھی۔ بڑی دلاور اور ہنرمند خاتون تھی۔ فنونِ سپہ گری سے خوب واقف تھی۔ اکثر مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتی تھی۔ نہایت اچھی تیرانداز تھی اور چوگان بازی میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔

(ہمایوں نامہ)

قتلق نگار خانم

یونس خاں چغتائی کی بیٹی اور عمر شیخ مرزا کی بڑی حرم تھی۔ بڑی بہادر، نڈر اور دانشمند خاتون تھی۔ خانزادہ اور (ظہیر الدین محمد) بابر (بادشاہ) اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ وہ طویل عرصہ تک اپنے فرزند بابر کے مصائب و آلام میں شریک رہی اور اس کی اکثر مہموں اور لڑائیوں میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ اس کی زندگی ہی میں بابر نے کابل پر قبضہ کر لیا تھا۔

قتلق نگار خانم نے محرم سنہ ۹۱۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں اس کی وفات کا حال اس طرح لکھا ہے:

"حضرت خانم کہ حضرت بادشاہ کی والدہ تھیں۔ چھ روز تک بخار میں مبتلا رہ کر عالم فانی سے دارالبقا کی طرف رحلت فرما گئیں۔ انہیں باغ نوروزی (کابل) میں دفن کیا گیا۔ باغ کے مالکوں کو بادشاہ (بابر) نے ایک ہزار مسکوک مثقال عطا کیے۔"

(ہمایوں نامہ۔ مشاہیر نسواں)

مہر انگیز بیگم

منظفر مرزا کی بیٹی تھی اور رشتے میں ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کی خالہ ہوتی تھی۔ گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

"لباس مردانہ می پوشیدند و بہ انواع ہنر آراستہ اہچو

زہگیر تراشی و چوگان بازی و تیر اندازی و اکثر سازہا می نواختند"
یعنی "(مہر انگیز خانم) مردانہ لباس پہنتی تھیں اور مختلف فنون
مثلاً زہگیر تراشی، چوگان بازی اور تیر اندازی میں مہارت رکھتی تھیں اور
اکثر آلاتِ موسیقی (باجے) بجالیتی تھیں۔" (ہمایوں نامہ)

بی بی زینب

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کی نامور تُرک شاعرہ تھی وہ
شہر اماسیہ (ترکی) کے قاضی کی بیٹی تھی۔ والد نے اس کی تعلیم و تربیت کا
خاص اہتمام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جُملہ عُلُوم دینی و دُنیوی میں طاق ہو
گئی۔ اس کا ذوقِ شعر و شاعری فطری تھا۔ عربی اور فارسی میں اس کا یدِ طولیٰ
رکھنا گویا سونے پر سہاگہ تھا۔ چنانچہ اس کے بلند پایہ کلام نے تمام ممالکِ
اسلامیہ میں اس کی شہرت کے جھنڈے گاڑ دیئے

ترکی مؤرخ کمال زادہ نے لکھا ہے کہ اس خاتون کی علمی قابلیت اور
شاعرانہ کمالات سب دنیا پر روشن ہیں۔

مؤرخ لطیفی کا بیان ہے کہ زینب نہایت بااخلاق اور باعصمت خاتون
تھی۔ علماء وقت اس کی قابلیت اور دانش و بصیرت پر عش عش کرتے تھے۔

اس خاتون نے ساری زندگی تجرّد کی حالت میں گزار دی۔

(مشاہیر نسواں)

بی بی رابعہؒ بنتِ احمدؒ

علامہ احمد بن علی بن محمد بن علی بن احمد شہاب الدین ابو الفضل الکنانی العسقلانی المصری المعروف بہ ابن حجر عسقلانی[1] کی صاحبزادی تھیں۔ بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔ سنہ ۸۱۵ ہجری میں مکہ معظمہ گئیں اور مشہور محدث شیخ زین الدین بالسیؒ کی مجلسِ درس میں شریک ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد مصر اور شام کے دوسرے بہت سے محدثین سے استفادہ کرکے اجازہ حاصل کیا۔ پھر اپنے چشمۂ علم سے تشنگانِ علم کو مدت تک سیراب کیا۔ ان کی شادی شیخ الشیوخ محب الدین ابن اشقر اس سے ہوئی تھی۔ سنہ ۸۳۲ھ میں اپنے والدِ گرامی کی حیات ہی میں دنیائے ناپائدار سے رخصت ہوئیں۔ (مشاہیر نسواں)

---

[1] امام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نہایت مشہور محدث، شافعی فقیہ، مؤرخ اور ادیب تھے سنہ ۷۷۳ھ میں بمقام قاہرہ پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا پھر فقہ میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد لمبا سال تک علم حدیث کی تحصیل میں مشغول رہے اور اس سلسلے میں مصر، حجاز، شام اور یمن کا سفر کیا اور اس دور کے علمائے عصر سے سندِ فضیلت حاصل کی۔ ساتھ ہی تجوید و لسانیات میں بھی مہارت پیدا کی۔ سنہ ۸۲۷ھ سے سنہ ۸۲۹ھ تک قاضی القضاۃ کے فرائض انجام دیتے رہے اور ساتھ ہی فقہ و حدیث کا درس بھی دیتے رہے۔ نظم و نثر دونوں پر قادر تھے اور ادبی حیثیت سے بھی بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے سنہ ۸۵۲ھ میں وفات پائی۔ تصانیف کی تعداد ۱۵۰ سے زیادہ ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: فتح الباری فی شرح البخاری، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، تہذیب التہذیب، غبطۃ الناظر، بلوغ المرام، الدرر الکامنہ، تعجیل المنفعۃ، نخبۃ الفکر، تاویل التاسیس۔

بی بی حنیفہؒ

شیخ عبدالرحمٰن بن احمد بن عمر بن القمنی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا شمار نویں صدی ہجری کی شہرہ آفاق عالمات اور محدثات میں ہوتا ہے۔ اپنے دور کے یگانۂ روزگار محدث علامہ کمال ابن خیرؒ سے علم حدیث حاصل کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود اپنی درسگاہ قائم کی۔ اس درسگاہ میں اس زمانے کے بڑے بڑے علماء نے بی بی حنیفہؒ سے کسب فیض کیا۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے انہیں بھی اپنے شیوخ کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ (تذکرۃ الخواتین)

قیصری بیگم

حیدرآباد دکن کی رہنے والی تھیں، اور مالوہ[1] کے فرمانروا سلطان غیاث شاہ خلجی (۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء تا ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء) کی کنیز تھیں۔ انہیں عربی زبان

---

[1] مالوہ نہایت قدیم راجپوت حکومت تھی اس کا دارالحکومت اجین تھا۔ اسے سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۳ھ / ۱۲۶۵ء تا ۶۶۶ھ / ۱۲۸۷ء) نے فتح کیا۔ امیر تیمور کے حملے (۸۰۰ھ / ۱۳۹۹ء) کے بعد دلی کی حکومت کمزور ہوگئی اور خاندانِ تغلق کا شیرازہ بکھر گیا تو دلاور خان غوری نے جو شاہِ دلی کی طرف سے مالوہ کا گورنر تھا۔ خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ۸۰۴ھ / ۱۴۰۱ء میں مالوہ میں ایک مستقل سلطنت قائم کی۔ ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء میں اس نے وفات پائی تو اس کا بیٹا ہوشنگ غوری مالوہ کا بادشاہ بنا۔ اس نے شہر مانڈو بسایا اور اسی کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اس کی وفات کے بعد ۸۳۸ھ / ۱۴۳۴ء میں اس کا فرزند محمد غوری تخت پر بیٹھا مگر اس کے وزیر محمود خلجی نے حکومت اس سے چھین لی اور ۸۳۹ھ / ۱۴۳۵ء میں خود مالوہ کا حکمران بن گیا۔ اس نے ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء تک حکومت کی سلطان غیاث شاہ خلجی اسی محمود خلجی کا بیٹا تھا۔ وہ سیرت و کردار کے لحاظ سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور جملہ علوم اسلامی میں درجۂ تبحر حاصل تھا۔ قرآن حکیم سے خاص شغف تھا۔ انہوں نے قرآن پاک کی آیات کو موضوع کے لحاظ سے مرتب کیا تھا اور اس کا نام تفہیم القرآن رکھا تھا۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی بیجہ

نویں صدی ہجری میں نامور شاعرہ اور ستارہ شناس گزری ہے۔ ہرات کی رہنے والی تھی اور مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی (المتوفی ۸۹۸ھ) کی ہم عصر تھی شعر و سخن میں مولانا جامی کے ساتھ اس کی اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ ہرات میں اس نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ اس کا شوہر فوت ہوا تو ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ تھا۔

کوکب بختم کہ بود از وے منور آسماں
بنگر اے ماہ کز فراقت در زمیں است ایں زماں

(مشاہیر نسواں)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ایک عابدِ شب بیدار، زاہدِ خشک اور خدا ترس بادشاہ تھا۔ اس کو عورتوں کی تعلیم و تربیت سے بڑی دلچسپی تھی اس نے دربارِ عام کی طرح اپنے محلسرا میں ایک شاہی دربار قائم کیا تھا جس میں عورتیں حکومت کے مختلف مناصب کے فرائض انجام دیتی تھیں اس کے علاوہ ان کو مختلف فنون اور ہنر سکھائے جاتے تھے مثلاً زرگری، آہن گری، محمل بافی، جامہ بافی، خیاطی، نجاری، کفش دوزی، تیرگری، کمان گری، برتن سازی وغیرہ۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق اس کے محل میں ایک ہزار کنیزیں حافظاتِ قرآن تھیں وہ اکثر تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتی تھیں۔ بادشاہ نے ان کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جس وقت وہ لباس تبدیل کر رہا ہو وہ سب مل کر پورا قرآن مجید ختم کر لیں۔ اس نے اپنے اہلِ حرم کو ہدایت دے رکھی تھی کہ نمازِ تہجد کے وقت اس کے منہ پر پانی چھڑک کر بیدار کر دیں اگر وہ نہ جاگے تو زور زور سے اس کو ہلائیں پھر بھی نہ جاگے تو ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی اس کو اٹھا دیں۔

(ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔ تاریخ فرشتہ)

ملکہ بی بی راجی

نویں صدی ہجری میں نہایت دانشمند، خدا ترس، دیندار، مخیّر اور علم دوست خاتون گزری ہے۔ وہ دلی کے فرمانروا خاندان سعادت سے تعلق رکھتی تھی اور اس خاندان کے بانی سید خضر خاں (۸۱۷ھ مطابق ۱۴۱۴ء تا ۸۲۴ھ مطابق ۱۴۲۰ء) کی پوتی تھی۔ سید خاندان کا تیسرا فرمانروا محمد شاہ (۸۳۷ھ مطابق ۱۴۳۰ء تا ۸۴۴ھ مطابق ۱۴۳۲ء) اس کا حقیقی بھائی تھا۔ [۱] اس کی شادی شاہان شرقی جونپور کے سلسلے کے چوتھے فرمانروا سلطان محمود شاہ سے ہوئی تھی جس نے مملکت جونپور پر ۸۴۴ھ مطابق ۱۴۴۰ء سے ۸۶۲ھ مطابق ۱۴۵۷ء تک حکومت کی۔ [۲]

---

[۱] خاندان تغلق جو ہندوستان پر ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۰ء سے ۸۱۴ھ مطابق ۱۴۱۱ء تک حکمران رہا اس کے زوال کے بعد سید خاندان دلی کے تاج و تخت کا مالک ہوا۔ اس خاندان کا بانی سید خضر خاں تھا جو سید سلیمان کا بیٹا تھا۔ سید سلیمان، فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء تا ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۸ء) کی طرف سے ملتان کا گورنر تھا۔ اس کی وفات کے بعد سید خضر خاں ملتان کا گورنر بنایا گیا۔ ۸۰۰ھ مطابق ۱۳۹۸ء میں تیمور کے ہندوستان پر حملے کے بعد تغلق حکومت کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ سید خضر خان نے اس خاندان کے آخری فرمانروا دولت خاں لودی کو زیر کر کے ۸۱۷ھ مطابق ۱۴۱۴ء میں دلی پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان کی حکومت سید خاندان میں منتقل ہو گئی۔ سید خضر خاں کے بعد اس کا بیٹا معز الدین مبارک شاہ ۸۲۴ھ مطابق ۱۴۲۰ء میں بادشاہ بنا۔ اس نے ۸۳۷ھ مطابق ۱۴۳۲ء میں وفات پائی تو اس کا بھتیجا سید محمد شاہ تخت حکومت پر بیٹھا۔ بی بی راجی اسی سید محمد شاہ کی بہن تھی۔ سید محمد شاہ کے عہد حکومت (۸۴۲ھ مطابق ۱۴۳۷ء) میں شمس الدین ابراہیم شاہ شرقی والی جونپور نے بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ دلی پر چڑھائی کر دی۔ سلطان سید محمد شاہ نے اپنے آپ کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

۸۵۵ھ مطابق ۱۴۵۱ء میں بہلول لودی نے دلی پر قبضہ کر لیا تو ملکہ بی بی راجی کو بہت دکھ ہوا کیونکہ وہ دلی کی سلطنت کو اپنی خاندانی وراثت سمجھتی تھی اس نے اپنے شوہر سلطان محمود شاہ شرقی کو دلی پر حملہ اور قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ سلطان محمود شاہ نے کچھ عرصہ تیاری میں گزارا اور ۸۶۲ھ مطابق ۱۴۵۷ء میں ایک زبردست فوج لے کر دلی کی طرف بڑھا۔ شمس آباد کے قریب بہلول لودی کا لشکر اس کے مقابل ہوا اور کئی دن تک دونوں فوجوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ابھی جنگ جاری تھی کہ محمود شاہ نے قضائے الٰہی سے وفات پائی۔ ملکہ بی بی راجی نے اس صورت حال کے پیش نظر بہلول لودی سے صلح کر لی اور اپنے بڑے بیٹے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کمزور محسوس کرتے ہوئے اس سے صلح کر لی اور اپنی بہن بی بی راجی کی منگنی اس کے فرزند شہزادہ محمود سے کر دی۔ کچھ مدت بعد شہزادہ محمود اور بی بی راجی کی شادی دلی میں بڑی شان و شوکت سے انجام پائی۔ محمد شاہ کی وفات (۸۴۷ھ مطابق ۱۴۴۳ء) کے بعد علاؤالدین عالم شاہ بادشاہ بنا لیکن آٹھ سال بعد وہ تاج و تخت سے دست بردار ہو گیا اور بہلول لودی ہندوستان کا فرمانروا بن گیا۔ (تاریخ ہند، "نگار" فرمانروایان اسلام نمبر)

۲ جونپور بھارت کے صوبہ اتر پردیش کا ایک شہر اور ضلع ہے۔ اس شہر کی بنیاد سلطان فیروز شاہ تغلق نے (۷۶۰ھ مطابق ۱۳۵۹ء) میں رکھی تھی ناصر الدین محمود شاہ تغلق کے عہد حکومت کے آغاز (۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۲ء) میں مشرقی اضلاع کے ہندوؤں نے سلطنت دلی سے سرکشی اختیار کر لی۔ (۷۹۶ھ مطابق ۱۳۹۳ء) میں محمود شاہ تغلق کے خواجہ سرا ملک سرور خواجہ جہاں نے بادشاہ سے سلطان الشرق کا خطاب حاصل کر کے مشرقی اضلاع پر یلغار کی اور کول (علی گڑھ) اٹاوہ، قنوج اور جونپور پر قبضہ کر کے ایک خود مختار بادشاہ بن کر بیٹھ گیا۔ اس بادشاہت کا دارالحکومت جونپور تھا۔ بعد میں اس نے بہار اڑیسہ اور روہیل کھنڈ کے کئی اور علاقے بھی اپنی سلطنت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھیکن خان کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ بھیکن خان ۸۶۲ھ / ۱۴۵۷ء میں محمد شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت حکومت پر بیٹھ گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بی بی راجی نے محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد اس کے اور بہلول لودی کے درمیان اس شرط پر صلح کرادی کہ دونوں بادشاہ اپنے اپنے ملک پر حکمران رہیں۔ بہر صورت دونوں مملکتوں میں صلح ہو گئی۔

محمد شاہ نے تخت نشینی کے فوراً بعد اپنے دو بھائیوں شہزادہ حسن خاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں شامل کر لیے اور یہ ایک طاقتور اور خوشحال مملکت بن گئی۔ خواجہ جہاں کی وفات (۸۰۲ھ / ۱۳۹۹ء) کے بعد جو بادشاہ جونپور کے تخت حکومت پر بیٹھے ان کے نام یہ ہیں: ــــــ

مبارک شاہ ــــــ ۸۰۲ھ / ۱۳۹۹ء

شمس الدین ابراہیم شاہ بن مبارک شاہ ــــــ ۸۰۳ھ / ۱۴۰۰ء

محمود شاہ بن ابراہیم شاہ ــــــ ۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء

محمد شاہ بن محمود شاہ ــــــ ۸۶۲ھ / ۱۴۵۷ء

حسین شاہ بن محمود شاہ ــــــ ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء

۸۸۱ھ / ۱۴۷۶ء میں لودی خاندان نے جونپور فتح کر کے اسے سلطنت دلی میں شامل کر لیا۔

شاہانِ شرقی کے عہدِ حکومت میں جونپور میں مختلف علوم و فنون کو زبردست فروغ حاصل ہوا اور اس عہد میں بڑے بڑے علماء، صلحاء، شعراء، ادباء، اطباء اور دوسرے اربابِ کمال پیدا ہوئے اسی لیے یہ شہر "شیراز ہند" کے لقب سے مشہور ہو گیا۔

("نگار" لکھنؤ فرمانروایان اسلام نمبر۔ تاریخ ہند۔ دائرہ معارف اسلامیہ۔ تذکرہ مشائخ شیراز ہند)

اور شہزادہ قطب خاں کو قید کر دیا (کیونکہ وہ ان کو تخت کے دعویدار سمجھتا تھا) پھر اس نے جونپور کے کوتوال کو حکم بھیجا کہ ان دونوں شہزادوں کو قید خانے میں قتل کر دو۔ بی بی راجی کو خبر ہوئی تو اس نے ایک طرف تو کوتوال کو اس حکم کی تعمیل کرنے سے منع کیا اور دوسری طرف محمد شاہ کو پیغام بھیجا کہ اپنے بھائیوں کے خون سے ہاتھ نہ رنگو اور اپنا حکم واپس لو۔

اس کے جواب میں محمد شاہ نے والدہ کو کہلا بھیجا کہ آپ خود مجھ سے آکر ملیں تاکہ باہمی صلاح و مشورہ سے سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اس پر بی بی راجی محمد شاہ سے ملاقات کے لیے جونپور سے چل پڑی لیکن ابھی وہ قنوج ہی پہنچی تھی کہ جونپور کے کوتوال نے شہزادہ حسن خاں کو قتل کرا دیا۔ (قیاس یہ ہے کہ محمد شاہ نے درپردہ کوتوال پر حسن خاں کو فوراً قتل کرنے کے لیے زور ڈالا کیونکہ وہ حسن خاں کے وجود کو اپنے تخت کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا تھا) حسن خاں کے قتل کی خبر بی بی راجی کے لیے سخت غم اور غصے کا باعث ہوئی۔ وہ بڑی جہاندیدہ خاتون تھی اور امور سیاست سے بخوبی آگاہ تھی۔ فوراً جونپور واپس آئی، اپنے دوسرے بیٹوں اور سلطنت کے قدیمی نمک خوار امراء کو جمع کیا اور اتفاق رائے سے محمد شاہ کی معزولی اور شہزادہ حسین خاں کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ محمد شاہ نے مقابلے کی تیاری کی لیکن اس کے بیشتر حامی اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور وہ راجگیر کے قریب اپنی حفاظت میں تنہا لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کا زمانۂ حکومت صرف پانچ ماہ ہے۔

اب حسین خاں نے حسین شاہ کا لقب اختیار کیا اور بی بی راجی کے تعاون سے طویل عرصے تک جونپور پر حکومت کرتا رہا۔

بی بی راجی نے ۸۸۳-۸۲ھ (۱۴۷۷) میں اٹاوہ کے مقام پر وفات پائی۔ اس وقت حسین شاہ کا آفتاب اقبال گہنا چکا تھا اور وہ بہلول لودی کے طالع بیدار کے سامنے بے بس ہو چکا تھا۔ اسی بے بسی نے اس کو جونپور چھوڑ کر بنگال

جانے پر مجبور کر دیا جہاں اس نے ۹۰۵ھ (۱۵۰۰ء) میں دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔
ملکہ بی بی راجی نے تعلیم اور رفاہِ عامہ کے میدان میں جو مہتم بالشان کارنامے انجام دیئے ان کی بنا دیر اس کو مملکتِ جونپور کے عوام (بالخصوص خواتین) کی محسنۂ اعظم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسے جس طرح دین سے گہرا لگاؤ تھا اسی طرح علم کی اشاعت سے بھی بے انتہا شغف تھا۔ اس نے نہ صرف شہر جونپور میں عالیشان مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں وغیرہ تعمیر کروائیں بلکہ مملکت کے دوسرے متعدد مقامات پر بھی مسجدیں، مدرسے، مہمان خانے اور پل وغیرہ بنوائے۔ ان کے علاوہ اس نے بعض بزرگوں کے مقبرے بھی تعمیر کروائے۔ اگرچہ اس کی بنوائی ہوئی بیشتر عمارتیں انقلاباتِ زمانہ کا شکار ہو چکی ہیں پھر بھی چند ایک ابھی تک باقی ہیں اور لوگوں کو اس کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مسجد لال دروازہ جونپور —— یہ شہر کے موجودہ محلہ بیگم گنج (لال دروازہ) میں ہے۔ اسے بی بی راجی نے ۸۵۱ھ (۱۴۴۷ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ اسے فنِ تعمیر کا شاہکار مانا جاتا ہے، اس کا ایک وسطی برج اور باب معبد ہے اور اس کے عرضی حصے اونچے اور کھڑکیوں والے ہیں۔ اس کی درمیانی منزل میں وسطی کھانچے کے پہلو میں زنانہ غلام گردشیں ہیں جو اس غرض سے بنوائی گئیں کہ باپردہ خواتین ان میں بیٹھ کر وعظ و درس سن سکیں اور عبادت و ریاضت کر سکیں۔

۲۔ جونپور سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد جس کے قریب ایک ندی بہتی تھی۔ اس مسجد کو مسجد بی بی راجہ کہا جاتا ہے۔

۳۔ موضع سید علی پور —— یہ گاؤں بی بی راجی نے اپنے پیر و مرشد مخدوم سید علی داؤدؒ سے اظہارِ عقیدت کے طور پر بسایا تھا۔

۴۔ درگاہ سلیمان —— یہ جونپور کے مشہور صوفی بزرگ سید سلیمان شاہؒ

کا روضہ ہے جو بی بی راجی نے بڑی عقیدت اور محبت سے تعمیر کرایا۔ یہ ۶۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کا گنبد بہت بڑا اور عالی شان ہے۔

۵۔ بنارس کی ڈھائی کنگرہ مسجد جو ایک چوک میں بڑی بلندی پر واقع ہے۔

ان کے علاوہ بی بی راجی کی بنوائی ہوئی جو عمارتیں مٹ گئی ہیں ان میں سے جن کا ذکر مؤرخین نے صراحت کے ساتھ کیا ہے، وہ یہ ہیں:-

۱۔ خواتین کی تعلیم کے لیے ایک درسگاہ ـــــ اس درسگاہ میں تعلیم پانے والی خواتین کے لیے لال دروازہ مسجد کی درمیانی منزل میں زنانہ غلام گردشیں بنائی گئیں۔ یہ درسگاہ مسجد سے ملحق تھی۔

۲۔ محل نماز گاہ ـــــ اس کے ساتھ عام شائقینِ علم کے لیے ایک مدرسہ، ایک مہمان خانہ، ایک حوض اور ایک باغ بھی تھا۔

۳۔ محل بی بی راجی ـــــ یہ جامع مسجد جونپور کے قریب تھا۔ اس کا طول ۱۹۰ فٹ اور عرض ۱۳۰ فٹ تھا۔

۴۔ جونپور سے کچھ فاصلے پر ایک ندی کے کنارے ایک محل کے کچھ رہائشی کمرے، اور ندی پر پل۔

۵۔ مخدوم سید علی داؤد جونپوریؒ کے لیے ایک خانقاہ

یہ سب عمارتیں یا تو یکسر معدوم ہو چکی ہیں یا ان کے کھنڈر رہ گئے ہیں۔ سکندر لودی نے اپنے زمانے میں شاہانِ شرقی کی بنوائی ہوئی بے شمار عمارتیں (مساجد اور مقدس مقامات کو چھوڑ کر) مسمار کرادیں۔ ان میں سے کتنی ہی عمارتیں بی بی راجی کی بنوائی ہوئی تھیں۔ بی بی راجی علماء و فضلاء اور دوسرے اربابِ کمال کی بے حد قدردان تھی۔ وہ ان کو نہ صرف باقاعدگی سے معقول وظیفے دیتی تھی بلکہ گراں بہا انعامات بھی دیتی رہتی تھی۔ تحصیل علم کا شوق رکھنے والوں کی وہ نہایت فراخ دلی سے سرپرستی کرتی تھی۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں میں بے شمار طلبہ تعلیم پاتے تھے وہ ان کو وظیفے دیتی تھی اور دوسرے

اخراجات کی بھی کفالت کرتی تھی۔ وہ تعلیم نسواں کی بہت حامی تھی۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے بطورِ خاص ایک بڑی درسگاہ قائم کی اور ایسے اقدامات کیے کہ وہ باپردہ رہتے ہوئے بھی تمام علوم متداولہ (خصوصاً دینی علوم) کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

بی بی راجی نے خواتین کی سہولت کے لیے اسلامی مہینوں کے نئے نام بھی رائج کیے تاکہ اَن پڑھ اور کم تعلیم یافتہ عورتیں بھی قمری مہینوں کے مطابق حساب کر سکیں۔ ان ناموں کی تفصیل یہ ہے:

محرم کے لیے داہا	رجب کے لیے مہہ رجب
صفر کے لیے تیرہ تیزی	شعبان کے لیے شبرات
ربیع الاوّل کے لیے بارہ وفات	رمضان کے لیے روزہ
ربیع الآخر کے لیے بڑے پیر	شوال کے لیے عید
جمادی الاولیٰ کے لیے مدار	ذیقعدہ کے لیے خالی
جمادی الاخریٰ کے لیے خواجہ مدین	ذی الحجہ کے لیے بقرعید

بی بی راجی کے رائج کیے ہوئے کچھ مہینوں کے نام تو اتنے مقبول ہوئے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی رواج پا گئے مثلاً تیرہ تیزی، بارہ وفات، شبرات، عید، بقرعید۔

بی بی راجی بہت خوش عقیدہ خاتون تھی اور اہل اللہ سے بڑی عقیدت رکھتی تھی۔ اس نے اپنے دور کے ایک نامور صوفی بزرگ مخدوم سید علی داؤد جونپوری کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ وہ ان کا حد سے زیادہ ادب و احترام کرتی تھی اور ان کی خدمت کرنے کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈتی رہتی تھی۔

(مشاہیر نسواں، تاریخ فرشتہ، تذکرہ مشائخ شیراز ہند، "نگار" فرمانروایانِ اسلام نمبر، تاریخ لودی، دائرہ معارف اسلامیہ)

مہری خاتون

نویں صدی ہجری کی شہرہ آفاق ترک شاعرہ ہے۔ اصل نام مہرماہ تھا۔ وہ ایشیائے کوچک کے شہر اماسیہ کی رہنے والی تھی۔ تمام علوم متداولہ اور شعر وادب میں یدِطولیٰ رکھتی تھی۔ بڑے بڑے علماء، شعراء اور مدبرانِ ملک سے اس کی مراسلت ومکاتبت ہوتی رہتی تھی۔ سب اس کے کمالاتِ علمی اور دانش وحکمت کے معترف تھے۔ بڑے بڑے امراء و رؤسا نے اس کو نکاح کا پیغام بھیجا لیکن اس نے محض اس خیال سے منظور نہ کیا کہ اس کے علمی مشاغل میں حرج ہوگا۔ چنانچہ اس کی تمام زندگی تجرد میں گزر گئی۔ اگرچہ اس کی شاعری میں روایتی "گل وبلبل" کا رنگ پایا جاتا ہے اور کئی رومانی قصے بھی اس سے منسوب کیے جاتے ہیں لیکن تمام ترک سوانح نگاروں کا اس کی عفت اور پاک دامنی پر اتفاق ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے اندرونی جذبات کا بے روک ٹوک اظہار کرتی ہے اور اپنی نسوانیت کو دبانے کی مطلق کوشش نہیں کرتی۔ اس طرح اس نے اپنے کلام میں ایک عورت کی روح کو پوری طرح سمو دیا ہے۔ اس کا کلام فصاحت وبلاغت، اندازِ بیان، بے ساختگی اور برجستگی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا اور کوئی دوسری ترک شاعرہ اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ مہری خاتون نے ۹۱۲ھ ہجری میں وفات پائی۔ اماسیہ میں اس کا مقبرہ آج بھی موجود ہے اس میں فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کی بہت رونق رہتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک وہ ایک خدارسیدہ خاتون تھی۔ مہری خاتون نے ایک دیوان اور کئی منظوم رسائل اپنی یادگار چھوڑے۔ ایک روایت کے مطابق اس نے فقہ وفرائض پر بھی کچھ رسائل تصنیف کیے تھے۔

(مشاہیر نسواں، اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

آفاق بیگم

ماوراءالنہر کے بادشاہ سلطان مرزا ابوسعید گورگان (۸۵۲ھ تا ۸۷۳ھ)[1] کی بیٹی تھی اور سلطان حسین بالقیرا[2] کی پہلی بیوی۔ نہایت باسلیقہ، دانشمند اور باشعور خاتون تھی۔ عرصہ تک اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس نے اپنی ایک منہ بولی بہن سے اپنے شوہر کی دوسری شادی کرا دی۔ اس بیوی سے سلطان حسین بالیقرا کے نو لڑکے لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان سب کو آفاق بیگم نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور ان کی ایسی عمدہ تربیت کی کہ نہ حقیقی ماں سے ممکن تھی اور نہ کسی اور سے۔ سب اہلِ خاندان اور دوسرے لوگوں

---

[1] اس کا تعلق تیموری خاندان سے تھا۔ عراق فارس اور خراسان کا حکمران تھا۔ علم دوست انسان تھا۔ مولانا جامیؔ نے ایک مثنوی میں اس کی مدح اس طرح کی ہے:

شاہ سلطان ابوسعید کہ ہست	آسماں پیشِ قصر قدرش پست
پشت بر پشت شاہ و شاہ نشاں	چاؤ شائش ز جاہ شاہ وشاں

[2] مرزا ابوسعید گورگان کے بعد مشرقی ایران کے تختِ حکومت کا مالک سلطان حسین بالقرا ہوا۔ ایران کے حکمرانوں میں وہ بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ ہوا ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب امیرزادہ عمر شیخ کے واسطہ سے امیر تیمور تک پہنچتا ہے۔ ایران میں خاندانِ تیموریہ کا آخری بادشاہ تھا۔

مدتِ حکومت سینتیس برس ہے (۸۷۳ھ تا ۹۰۹ھ) وہ نہایت عدل گستر، رعیت پرور اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کا پایۂ تخت ہرات سلطان محمود غزنویؒ کے عہد کا غزنی بن گیا۔ سلطان کی داد و دہش اور معارف پروری

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے اُس کی اس کاوش اور ایثار کی تعریف وتحسین کی اور اس کو انتہائی احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ظہیر الدین محمدؒ بابر بادشاہ آفاق بیگم کا بھتیجا تھا۔ ایک دفعہ وہ اس سے ملنے گئی تو بابر نے اس کے سامنے دیدۂ ودل فرشِ راہ کر دیئے اور اس کی حد سے زیادہ خاطر تواضع کی۔ بابر اکثر آفاق بیگم کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کہا کہ "آفاق بیگم بڑی وفادار اور مہربان خاتون ہے۔" جب اس کا شوہر بیمار ہوا تو اس نے حرم کی تمام بیگمات سے بڑھ کر اس کی خدمت اور خبر گیری کی۔"

سلطان حسین بایقرا نے ۹۰۸ھ میں وفات پائی۔ آفاق بیگم اس کے بعد چھبیس برس تک حیات رہی اور ۹۳۴ھ میں فوت ہوئی۔ بابر نے اس وقت چندیری کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اسی محاصرے کے دوران میں اس کو آفاق بیگم کی وفات کی خبر ملی۔ (ہمایوں نامہ)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ملک کے گوشے گوشے سے علماء، شعراء اور دوسرے اہلِ کمال کو ہرات کھینچ لائی تھی۔ سلطان خود شعر و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتا تھا اور فارسی و ترکی دونوں زبانوں کا خوش گو شاعر تھا۔ فارسی میں حسینی تخلص کرتا تھا۔ اس نے مجالس العشاق کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس میں بہت سے نامور بزرگوں اور اربابِ کمال کے حالات شرح و بسط کے ساتھ تحریر کیے۔ مولانا جامیؒ نے اس کی مدح میں کئی قصائد لکھے ہیں۔ مولاناؒ نے ۸۹۸ھ میں وفات پائی تو سلطان جنازے میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوا۔

سلطان حسین بایقرا نے ۹۰۸ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

بی بی بیگی

امیر علی جلایر کی بیٹی اور امیر علی شیر[1] نوائی (المتوفی ۹۰۶ھ) کے بھائی امیر درویش علی کی اہلیہ تھی۔ نہایت علم دوست اور مخیر خاتون تھی۔ اس در کے بہت سے ارباب فضل و کمال اس سے وظیفہ پاتے تھے۔ وہ نقد کے علاوہ اناج کی صورت میں بھی ان کی مدد کرتی تھی۔ مشہور شاعر مُلّا آصفی شیرازی جو بی بی بیگی کے وظیفہ خواروں میں تھا، ایک دفعہ اس کو مقررہ غلہ نہ پہنچا تو اس نے بیگم بیگی کو یہ قطعہ لکھ بھیجا:

ایا عروس خطا بخش و جرم پوش بگو
کہ کے وظیفہ ما را قرار خواہی داد
بوقت غلہ مرا گفتہ کہ بار دہم
سرم فدائے درت چند بار خواہی داد

بی بی بیگی نے یہ قطعہ پڑھا تو خوش ہو کر آصفی شیرازی کو دوگنا غلہ عنایت کیا۔

---

[1] امیر علی شیر نوائی، سلطان حسین بایقرا (والی ایران شرقی) کے اکابر امراء میں سے تھا اور سلطان کی طرف سے اس کو رکن السلطنت، اعتماد الملک والدولہ اور مقرب حضرت السلطانی خطابات ملے ہوئے تھے۔ گویا اس کی حیثیت وزیر اعظم کی تھی۔ امیر موصوف نہ صرف خود عالم و فاضل تھا بلکہ ارباب علم و ہنر کی سرپرستی اور قدردانی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ وہ فارسی اور ترکی زبان کا نغز گو شاعر بھی تھا۔ ترکی میں نوائی اور فارسی میں فانی تخلص کرتا تھا۔ مولانا جامیؒ اس کے معاصر تھے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بی بی بیگی شعراء کی سرپرست ہی نہیں تھی بلکہ خود بھی ایک نغز گو شاعرہ تھی ۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

اشکے کہ سر ز گوشۂ چشمم بروں کند
بر روئے من نشیند و دعوای خوں کند

آہ ازاں زلفے کہ دارد رشتۂ جاں تاب ازو
وائے بر لعلے کہ ہر دم مے خورد خوں ناب ازو

آبے کہ فلک بہ لب چکاند مارا
سرگشتہ بہ بحر و بر دواند مارا
اے کاش بمنزلے رساند مارا
کز ہستی خود باز رہاند مارا

(مشاہیر نسواں بحوالہ جوہر العجائب)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اور وہ ان کا بے حد مداح اور قدر دان تھا ۔ سنہ ۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء میں ہرات میں پیدا ہوا اور سنہ ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء میں اسی شہر میں وفات پائی ۔
اس نے بہت سی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں :
تذکرۃ المجالس ۔ تاریخ ملوک العجم ۔ تاریخ انبیاء ۔ خمسۃ المتحیرین ، محبوب القلوب ، رسالہ عروضیہ ۔ مثنوی لسان الطیر ۔ مثنوی فرہاد و شیریں ۔ مثنوی سبعہ سیارہ

بی بی زینب بنتِ سلیمان رح

سلیمان بن ابراہیم بن رحمۃ الاشعریہ کی صاحبزادی تھیں۔ فن حدیث میں یکتائے روزگار تھیں۔ پہلے شام میں درس دیتی رہیں۔ پھر مصر چلی گئیں اور وہیں درس و تدریس میں زندگی گزار دی۔ ان کی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے لوگ انہیں " مستند الدمشقیہ " کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ (مشاہیر النساء)

بی بی زینب بنتِ عبداللہ الازہری رح

علم حدیث میں درجۂ تبحر رکھتی تھیں اور ان کے علم و فضل کی تمام عالمِ اسلام میں شہرت تھی۔ وہ ان خواتین میں سے ایک ہیں جن سے امام سیوطیؒ نے کسبِ فیض کیا۔

سنہ ۸۷۰ھ میں پیدا ہوئیں ــــــ سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔

(مشاہیر النساء)

بی بی عائشہ بنتِ شہاب الدین رح

اہلِ سیر نے ان کا ذکر بالعموم " بنت العجمی " کے نام سے کیا ہے۔ قاضی القضاۃ شہاب الدینؒ بن جعفر احمد العجمی کی صاحبزادی تھیں۔ سنہ ۸۱۰ھ میں پیدا ہوئیں اور علوم مروجہ میں ایسا کمال پیدا کیا کہ اپنے ہمعصروں پر گوئے سبقت لے گئیں۔ ان کی مجلسِ درس سے بڑے بڑے علماء و فضلاء فیض یاب ہوئے۔

(مشاہیر نسواں)

گیتی آرا بیگم

امیر تیمور (سنہ ۷۷۱ھ تا سنہ ۸۰۷ھ / ۱۳۶۹ء تا ۱۴۰۴ء) کے زمانے میں علی مردان خان زابلستان کا حکمران تھا۔ گیتی آرا بیگم اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ سنہ ۷۸۰ھ (۱۳۷۸ء) میں پیدا ہوئی۔ علی مردان خان نے گیتی آرا بیگم کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ وہ بڑی ذہین و فطین لڑکی تھی تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے تمام مروجہ علوم میں دسترس حاصل کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو مصوری کا بہت شوق تھا۔ اس نے یہ فن بھی بڑے شوق سے سیکھا اور بہترین مصورہ بن گئی۔ گیتی آرا بیگم کو مردانہ اور شجاعانہ کھیلوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے فن سپہ گری میں بڑی مہارت حاصل کر لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خواتین کے لیے ایک فوجی اسکول قائم کیا جس میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے بیس پچیس سال تک کی ناکتخدا خواتین کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا لازم قرار دیا گیا۔ چنانچہ چار ہزار کے قریب خواتین اس اسکول میں داخل ہو گئیں۔ شہزادی نے ان کے لیے بہترین اتالیق اور فوجی استاد مقرر کیے اور تمام طالبات کو ہر قسم کے اسلحہ سے لیس کر دیا گیا۔ اس طرح ایک اعلیٰ درجہ کی زنانہ فوج تیار ہو گئی۔ گیتی آرا بیگم کا ابھی عنفوانِ شباب تھا کہ علی مردان خان فوت ہو گیا۔ باپ کی موت نے شہزادی کو بڑی مشکل، صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ اس کے چچا نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ امرائے سلطنت اور مردانہ فوج نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ گیتی آرا بیگم نے چچا کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی زنانہ فوج کو ساتھ لے کر اس کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ فریقین میں گھمسان کا رن پڑا جس میں

بالآخر گیتی آرا بیگم کامیاب ہوئی۔ اس نے تخت حکومت پر بیٹھ کر بڑے تدبر سے کام لیا اور اپنے مخالفین کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا۔

اس زمانے میں امیر تیمور کا فرزند میراں شاہ سمرقند ترکستان اور ماوراءالنہر کے کئی علاقوں کا حکمران تھا اس نے گیتی آرا بیگم کی شجاعت اور دوسرے اوصاف حمیدہ کا ذکر سنا تو اس کو شادی کا پیغام بھیجا۔ گیتی آرا بیگم نے چند شرائط پیش کیں میراں شاہ نے یہ شرطیں بخوشی منظور کر لیں۔ چنانچہ دونوں کی شادی ہو گئی۔ گیتی آرا بیگم نے اپنی مملکت میں رفاہ عام کے لیے بے شمار کام کیے جن میں بہت سے مدرسوں کتب خانوں، پلوں اور سڑکوں کی تعمیر بھی شامل تھی۔ اس کے ساتھ اس نے ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرائے۔ محتاجوں، معذوروں، اور غریبوں کے لیے بہت سے لنگر خانے جاری کیے اور خواتین کی عام تعلیم کے لیے وسیع انتظامات کیے۔

گیتی آرا بیگم نے نویں صدی ہجری میں کسی وقت وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی متعدد تصویریں آج بھی عجائب خانہ ایران میں محفوظ ہیں۔

(باکمال مسلمان عورتیں۔ شرف النساء)

بی بی اسماء بنتِ محمدؒ

شیخ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن محدثؒ کی صاحبزادی اور علامہ شیخ تقی الدینؒ کی والدہ تھیں۔ رجب ۷۹۴ھ میں پیدا ہوئیں۔ مختلف دینی علوم بالخصوص علم حدیث میں درجۂ تبحر رکھتی تھیں۔ پہلے شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے علاؤ الدین مقریزی سے عقد کیا۔ مصر کی نامور عالمات میں شمار ہوتی ہیں۔ سالِ وفات معلوم نہیں۔

(تذکرۃ الخواتین)

ملکہ امۃ المجیب

امیر تیمور گورگان (سنہ ۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء تا سنہ ۸۰۷ھ/۱۴۰۴ء) کی بیگم تھی۔ والد کا نام یزدانی تھا جو چوتھے عثمانی فرمانروا سلطان بایزید اوّل (سنہ ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء تا سنہ ۸۰۵ھ/۱۴۰۳ء)[1] کی فوج کا ایک جرنیل تھا۔ امۃ المجیب ترکستان میں پیدا ہوئی۔ والد نے اس کو دوسرے علوم کے علاوہ شہسواری اور فنونِ سپہگری سکھانے کا بھی خاص اہتمام کیا چنانچہ جوان ہو کر وہ اپنے باپ کا دست و بازو بن گئی اور کئی فوجی مہموں میں اس کے ساتھ شریک ہوئی۔ سنہ ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں امیر تیمور نے سلطنتِ عثمانیہ پر یلغار کی تو سلطان بایزید نے انگورہ (ANKARA) کے مقام پر اس کا پُرجوش مقابلہ کیا۔ ترک فوج میں یزدانی بھی اپنی بیٹی امۃ المجیب کے ساتھ شامل تھا۔ ترک فوج کی جانبازی کے باوجود

---

[1] سلطان بایزید اوّل اپنے والد سلطان مراد اوّل کی شہادت کے بعد سنہ ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء میں تختِ حکومت پر بیٹھا۔ وہ بڑا بہادر آدمی تھا۔ اپنی دلاوری اور بے خوفی کی وجہ سے وہ لوگوں میں "یلدرم" (بجلی کا کڑکا) کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس نے بوسینا، سرویا، اور رومانیہ کو مسخر کیا۔ بوسینا، سرویا، رومانیہ اور ہنگری کی متحدہ فوجوں کو شکست دی، ایشیائے کوچک کی تمام ریاستوں کو پوری طرح مطیع کیا اس کے بعد اس کا ارادہ یورپ کے کئی ملکوں پر یلغار کرنے کا تھا کہ سنہ ۸۰۲ھ/۱۴۰۰ء میں امیر تیمور نے سلطنتِ عثمانیہ پر حملہ کر دیا۔ بایزید نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن فوج کی قلت اور کچھ تاتاری دستوں کی غداری کی وجہ سے شکست کھائی۔ تیمور نے بایزید کو گرفتار کر کے محبوس کر دیا اور آگے بڑھ کر بروصہ پر قبضہ کر لیا۔ سلطان بایزید نے آٹھ ماہ کے بعد قید ہی میں وفات پائی۔ اس کی موت پر یورپ کے عیسائی فرمانرواؤں نے بہت خوشیاں منائیں کیونکہ وہ اس کے وجود کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔

قسمت نے سلطان بایزید کا ساتھ نہ دیا اور اس نے شکست کھائی۔ امیر تیمور نے سلطان بایزید سمیت ترک فوج کے سینکڑوں سپاہیوں اور افسروں کو گرفتار کرلیا۔ امیر تیمور فطری طور پر بڑا سخت دل واقع ہوا تھا اس نے سلطان بایزید کو لوہے کے ایک بڑے پنجرے میں محبوس کر دیا اور دوسرے تمام قیدیوں کے قتل کا حکم صادر کیا۔ ان قیدیوں میں اَمتہُ المجیب بھی شامل تھی۔ اس وقت اس نے مردانہ فوجی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے امیر تیمور کے سامنے پہنچ گئی اور اس کے سامنے ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی جس میں اس کو آخرت کا خوف دلایا اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ نرم سلوک کرنے کی ترغیب دی۔ یہ تقریر کرنے کے بعد اس نے اپنا آہنی خود سر سے اتار کر زمین پر پٹک دیا اور امیر تیمور سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے بادشاہ! میری طرف دیکھ میں ایک عورت ہوں اور موت سے بالکل نہیں ڈرتی۔ مجھے اور میری قوم کے سپاہیوں کو قتل کر کے تیرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ جس قوم میں مجھ جیسی عورتیں ہوں وہ کبھی نہیں مر سکتی۔"

اَمتہُ المجیب کی تقریر ایسی مؤثر تھی کہ امیر تیمور جیسے شخص کا دل بھی موم ہو گیا۔ اس نے اَمتہُ المجیب اور دوسرے ترک قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا (البتہ بایزید کو اس نے رہا نہ کیا) رہا ہونے والے قیدیوں میں اَمتہُ المجیب کا باپ بھی تھا۔ امیر تیمور نے اس سے اَمتہُ المجیب کا رشتہ مانگ لیا جو اس نے منظور کر لیا اور یوں وہ بادشاہ بیگم بن گئی۔ امیر تیمور نے اس کو حمیدہ بانو بیگم کا خطاب دیا۔ اَمتہُ المجیب سے شادی کے بعد امیر تیمور صرف تین سال زندہ رہا اور ۸۰۷ھ میں فوت ہو گیا۔ اَمتہُ المجیب کے بطن سے اس کی جو اولاد ہوئی وہ زندہ نہ بچی۔ بیوہ ہونے کے بعد اس کے سوتیلے بیٹے نے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ آخر وہ سمرقند سے طفلس چلی گئی لیکن وہاں بھی حالات ناسازگار رہے۔ آخر اس نے

قسطنطنیہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی اور وہیں اکسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ اَمۃُ الحبیب بڑی دانا اور علم دوست خاتون تھی۔ وہ دنیا کی کئی زبانیں جانتی تھی مثلاً ترکی، عربی، فارسی اور چینی۔ وہ یہ زبانیں نہ صرف روانی سے بولتی تھی بلکہ ان میں لکھ بھی سکتی تھی۔ اس نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں لیکن یہ سب حوادثِ زمانہ کا شکار ہو گئیں۔

(تاریخ اسلام۔ خلافت عثمانیہ۔ شرف النساء، نگار لکھنؤ سالنامہ ۱۹۵۱ء، مسلمان خواتین کی علمی و ادبی خدمات)

بی بی آسیہؒ بنتِ جار اللہ

نویں صدی ہجری میں علمِ حدیث کی بہت بڑی عالمہ ہوئی ہیں۔ ۷۹۶ھ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام جار اللہ بن صالح بن ابی المنصور تھا۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے بی بی آسیہؒ کو بھی اپنے اشیاخ میں شمار کیا ہے۔ اس سے ان کے مرتبۂ علمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے فرزند محمد بن الضیا نے بھی ان سے کسبِ فیض کیا اور مدتوں مکہ کے قاضی رہے۔

سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی فاطمہؒ بنتِ احمد

احمد الحسینی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا شمار نویں صدی ہجری کی نامور عالماتِ حدیث میں ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی علمِ حدیث میں ان سے کسبِ فیض کیا ہے۔ (مشاہیرِ نسواں)

دولت ایساں

میر شیر علی بیگ توچین کی بیٹی اور ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کی نانی تھی۔ نہایت دانشمند، صائب الرائے اور باہمت خاتون تھی۔

سنہ ۸۵۹ھ میں اس کی شادی یونس خان چغتائی سے ہوئی۔ دولت ایساں سے اس کے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، مہر نگار خانم، قتلق نگار خانم اور خوب نگار خانم۔ اس کا خاوند مسلسل تیس سال تک دشمنوں کے ہاتھوں طرح طرح کے مصائب و آلام میں گرفتار رہا۔ وفادار اور نیک نہاد بیوی نے بڑے حوصلے اور استقلال کے ساتھ تمام مصیبتوں میں خاوند کا پورا پورا ساتھ دیا اور ہر مصیبت میں اس کی شریک و ہمدم رہی۔ ان مصیبتوں سے قدرے چھٹکارا ملا تو اللہ کی طرف سے ایک اور آزمائش آگئی وہ یہ کہ یونس خان پر فالج گرا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ اس کی طویل بیماری میں دولت ایساں نے اس کی خدمت اور خبر گیری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سنہ ۸۹۲ھ میں یونس خان نے وفات پائی تو دولت ایساں کو پہلے سے بھی زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں چار مرتبہ دشمنوں کے ہاتھ پڑ کے چھٹ چھٹ گئی۔ سنہ ۸۴۰ھ میں بمقام کاشغر، سنہ ۸۷۷ھ میں بمقام تاشقند، سنہ ۹۰۳ھ میں بمقام اندجان اور سنہ ۹۰۴ھ میں بمقام سمرقند ——— سنہ ۹۰۰ ہجری میں بابر نے اس کو اندجان کی والیہ بنا دیا۔ وہ وہاں کا نظم و نسق بڑی بیدار مغزی اور انصاف کے ساتھ چلاتی رہی۔ بابر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ کوئی عورت ہوشمندی، دور اندیشی اور اصابتِ رائے میں دولت ایساں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔

اکثر اہم معاملات صرف اسی کے مشورے سے انجام پاتے تھے۔
دولت ایساں نے بچپن سے جوانی تک کا زمانہ صحرا کی آزاد فضا میں گزارا تھا اور بعد میں بھی اس کو کئی بار صحرانوردی کرنی پڑی تھی اس لیے وہ شہری زندگی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنی دلبستگی کے لیے اندجان میں ایک وسیع باغ بنوایا تھا اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسی میں گزارتی تھی۔ دولت ایساں کی بیٹی قتلق نگار خانم عمر شیخ مرزا امیر انشاد سے بیاہی گئی تھی اسی کے بطن سے بابر بادشاہ پیدا ہوا۔ قتلق نگار خانم اپنے بیٹے کی اکثر لڑائیوں اور مہموں میں شریک رہی۔
دولت ایساں نے ۹۱۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ (ہمایوں نامہ)

بی بی رجبؒ

بی بی رجب رحمۃ اللہ علیہا نویں صدی ہجری میں بہت بڑی محدثہ گزری ہیں۔ والد کا نام شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر قلیجی تھا۔ ۸۰۰ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ والد نے ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ یہاں تک کہ جملہ علوم و فنون میں یگانۂ روزگار ہو گئیں بالخصوص علم حدیث میں بہت اونچا مقام حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ امام جلال الدین سیوطیؒ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے حدیث کا سبق لیا۔
بی بی رجبؒ نے ۸۶۹ھ ہجری میں وفات پائی۔
(تذکرۃ الخواتین)

ملکہ گوہر شاد آغا (بیگم)

ماوراء النہر کے نامور فرمانروا میرزا شاہ رُخ (۸۰۷ھ تا ۸۵۰ھ / ۱۴۰۴ء تا ۱۴۴۷ء) پسرِ امیر تیمور کی ملکہ تھی۔ والد کا نام امیر الکبیر غیاث الدین تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ تاریخ اور ادب سے اس کو خاص شغف تھا۔ اپنے شوہر کی طرح علم و فن کی نہایت قدردان تھی اور اربابِ کمال کی فراخدلی سے سرپرستی کرتی تھی۔ میرزا شاہ رُخ نے ۸۰۷ھ میں تختِ نشین ہو کر ہرات کو اپنا دار السلطنت مقرر کیا۔ جوں جوں اسے عروج حاصل ہوتا رہا ملکہ گوہر شاد آغا کا ستارۂ اقبال بھی بلند ہوتا رہا۔ دونوں میاں بیوی نے اپنی سلطنت میں مختلف علوم و فنون کی اشاعت میں خاص دلچسپی لی اور بہت سی مسجدیں اور مدرسے جن کو وحشی تاتاریوں نے تباہ و برباد کر ڈالا تھا، دوبارہ تعمیر کرائے۔ ان کے علاوہ متعدد نئی درسگاہیں اور مسجدیں بھی تیار کرائیں۔ ان میں مشہد کی جامع مسجد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ ملکہ گوہر شاد آغا نے یہ عالی شان جامع مسجد امام علی رضاؒ (المتوفی ۲۰۳ھ) بن سیدنا موسیٰ کاظمؒ کے قبّے کے نزدیک بڑے اہتمام سے بنوائی۔ اس مسجد کا شمار دنیا کی عمدہ ترین مسجدوں میں ہوتا ہے۔

میر علی شیر نوائی نے "مجالس النفائس" میں لکھا ہے کہ اس جامع مسجد کے خطیب ایک نامور سنی العقیدہ عالم مولانا حاجی تھے۔ اس جامع مسجد کے علاوہ ملکہ نے امام علی رضاؒ کے احاطۂ مزار میں دو بڑے ایوان بھی تعمیر کرائے جو "دار السیادت" اور "دار الحفاظ" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان ایوانوں کی دیواروں اور چھتوں پر نہایت نفیس اور دیدہ زیب کاشی کاری کی گئی ہے۔

ملکہ گوہر شاد آغا نے خاص دارالسلطنت ہرات میں بھی بہت سی عظیم الشان عمارتیں بنوائیں۔ مؤرخین نے ان عمارتوں میں سے ایک مدرسے، جامع مسجد اور بیت المغفرہ نامی مقبرے کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ عمارتیں جوئے انجیر کے کنارے ۸۲۰ھ ۱۴۱۷ء میں بننی شروع ہوئیں اور ۸۴۱ھ ۱۴۳۷ء میں مکمل ہوئیں البتہ مدرسے میں تعلیم و تدریس کا کام ۸۳۶ھ ۱۴۳۲ء ہی میں شروع ہو گیا اور ۸ صفر ۸۳۶ھ ۱۴۳۲ء کو میرزا شاہ رخ نے خود اس کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر فاضل دہر شیخ شہاب الدین بن شیخ رکن الدین بسطامی نے اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔ معارف پرور ملکہ نے مدرسے اور جامع مسجد کے مصارف کے لیے کثیر آمدنی کے اوقاف قائم کیے۔ میرخواند نے "روضۃ الصفا" میں لکھا ہے کہ ملکہ گوہر شاد آغا کے قائم کیے ہوئے اس مدرسے میں فخر علماء سید اصیل الدین واعظ ہر ہفتے جا کر پند و نصیحت کیا کرتے تھے (یعنی پند و نصائح پر مبنی خطبہ دیا کرتے تھے۔) اسی مدرسے میں مولانا کمال الدین مسعود شروانی (جو علم منطق و حکمیات میں اعلم علماء تھے) اور مولانا خلیل اشرف بن فاضل سمرقندی جیسے شہرۂ آفاق عالموں نے سالہا سال تک درس دیا۔ افسوس کہ یہ عالیشان جامع مسجد اور مدرسہ باقی نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے کوئی ایک صدی پہلے امیر عبدالرحمٰن والئ افغانستان نے ایک انگریز انجنیئر کے مشورے پر ان دونوں عمارتوں کو منہدم کرا دیا، البتہ ملکہ گوہر شاد آغا کا بنوایا ہوا مقبرہ بیت المغفرہ ابھی باقی ہے اس میں وہ خود، میرزا شاہ رخ اس کے بیٹے بایسنغر، محمد جوکی بہادر اور کچھ دوسرے تیموری شہزادے مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ چار منارے بھی جو ان عمارات سے متعلق تھے، ابھی باقی ہیں، ان کی بلندی ۱۲۰ تا ۱۵۰ قدم ہے۔

میرزا شاہ رخ نے ۸۵۰ھ میں وفات پائی تو اس نیک ملکہ کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کے پوتے میرزا عبداللطیف ابن میرزا الغ بیگ

نے اس کو محض اس بناء پر قید کر دیا کہ اس کی ہمدردیاں اس کے والد الغ بیگ کے بجائے اپنے دوسرے بیٹے میرزا علاؤالدولہ کے ساتھ ہیں۔ میرزا علاؤالدولہ نے مسلح جدوجہد کے ذریعے اپنی والدہ کو آزاد تو کرا لیا لیکن تخت حکومت پر میرزا الغ بیگ نے قبضہ کر لیا۔ ۸۵۵ھ میں میرزا ابوسعید تخت حکومت پر بیٹھا تو شروع شروع میں اس کے تعلقات ملکہ گوہر شاد آغا سے خوشگوار تھے لیکن بعد میں ملکہ کے مخالفوں نے اسے بہکایا کہ ملکہ اس کے دشمنوں سے ملی ہوئی ہے اور اس کے خلاف سازش کر رہی ہے۔ اس پر میرزا ابوسعید نے برافروختہ ہو کر ۹ رمضان المبارک ۸۶۱ھ (مطابق ۳۱ جولائی ۱۴۵۷ء) کو اس نامور خاتون کو قتل کرا دیا اور اس کا سارا اندوختہ لوٹ لیا۔

گیارہ سال بعد ۸۷۳ھ (۱۴۶۸ء) میں گوہر شاد آغا کے ایک پوتے میرزا یادگار محمد نے میرزا ابوسعید کو قتل کر کے اپنی جدہ کا انتقام لے لیا۔

(مشاہیر نسواں، روضۃ الصفا، تاریخ ایران براؤن۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۷)

بی بی خدیجہ بنت عبدالرحمٰنؒ

عبدالرحمٰنؒ بن احمد بن عبدالعزیز بن قاسم بن شہید الناطقؒ کی دختر نیک اختر تھیں۔ ۷۰۹ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء سے علم حدیث حاصل کیا اور فارغ التحصیل ہو کر خود مجلسِ درس قائم کی۔ بے شمار لوگ ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ ان میں سے بعض نے عالمِ حدیث کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔

بی بی خدیجہؒ ۸۰۳ھ میں رہگرائے عالمِ بقا ہوئیں۔ (مشاہیر النساء)

بی بی اُمِّ ہانیؒ

حافظ تقی الدین محمد بن محمد بن فہد ہاشمی کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ ۸ / ذیقعدہ سنہ ۸۱۶ھ کو پیدا ہوئیں۔ نہایت عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ ان سے کسبِ فیض کرنے والوں میں امام جلال الدین سیوطیؒ بھی شامل ہیں انہوں نے اُمِّ ہانیؒ سے استناد بھی کیا ہے۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی اُمِّ الفتحؒ

احمد بن کامل بن خلف بن شجرۃ بن منظور الشجری بغدادی کی صاحبزادی تھیں۔ علم حدیث میں یگانۂ روزگار تھیں۔ بغداد میں عرصۂ دراز تک حدیث کا درس دیتی رہیں۔ ہزاروں لوگ ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ انہوں نے طویل عمر کے بعد سنہ ۸۹۰ھ ہجری میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی آمنہ بنتِ موسیٰؒ

شرف الدین موسیٰؒ بن احمد بن محمد انصاری الدمھوجی محلی کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ ان کا وطن مصر تھا اور وہ نویں صدی ہجری میں علم حدیث کی یگانۂ روزگار عالمات میں شمار ہوتی تھیں۔ ان سے حدیث کا درس لینے والوں میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی صفیہؒ بنتِ یاقوت

نویں صدی ہجری میں مشہور محدثہ گزری ہیں۔ ۸۰۴ھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد یاقوت بن عبدالملک ایک حبشی النسل مسلمان تھے۔ بی بی صفیہ نے اپنے دور کے ایک یگانۂ روزگار عالمِ دین علامہ نورالدینؒ سے تعلیم حاصل کی اور تفسیر حدیث اور فقہ میں درجۂ کمال تک پہنچ گئیں۔ پھر انہوں نے اپنی درسگاہ قائم کی اور عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔

(مشاہیرِ نسواں)

بی بی زینبؒ بنتِ عبداللہ

عبداللہ الشوعی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی کنیت اُمِّ الخیر تھی۔ علمِ حدیث میں درجۂ کمال پر فائز تھیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ بھی کچھ عرصہ ان کے حلقۂ درس میں شامل رہے۔ ۸۷۹ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی زینبؒ بنتِ احمدؒ

مکہ معظمہ کی رہنے والی تھیں۔ والد کا نام احمد بن محمدؒ تھا۔ بی بی زینب کا شمار نویں صدی ہجری کی باکمال عالمات میں ہوتا ہے۔ علمِ حدیث میں خاص دسترس رکھتی تھیں۔ اس دور کے بڑے بڑے علماء نے ان سے حدیث کا درس لیا۔ ان کی کنیت اُمِّ حبیبہ تھی۔ (مشاہیر النساء)

بی بی مریمؒ بنتِ علیؒ

ان کی کنیت اُمِّ ہانی تھی۔

نور الدین ابو الحسن علیؒ بن قاضی القضاۃ تقی الدین عبد الرحمٰن بن عبد المومن ہورینی شافعی کی صاحبزادی اور علامہ سیف الدین حنفیؒ کی والدہ تھیں۔

باختلاف روایت سنہ ۷۷۰ھ یا سنہ ۷۷۸ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔

اوائل عمری میں علم و فضل کے آثار ان کی پیشانی سے ہویدا تھے۔ بچپن ہی میں انہوں نے قرآن حکیم اور نحو کی مشہور کتاب ملحہ اور فقہ شافعی کی مشہور کتاب مختصر ابی شجاع کو حفظ کر لیا اور رفتہ رفتہ نحو، فقہ اور حدیث میں یگانۂ روزگار ہو گئیں۔ پھر انہوں نے اپنی درسگاہ قائم کی اور مدت العمر علومِ دین کی اشاعت میں مشغول رہیں۔

ان کے تلامذہ میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ جیسے نابغۂ روزگار عالم کا نام بھی شامل ہے۔

شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھیں۔ عربی کے ایک مشہور شعر

انا کنت لا تدری و غیرک لا یدری
اذا جن لیل ھل تعیش الی الفجر

(یعنی میں تو نہیں جانتا اور تیرے سوا کوئی جانتا بھی نہیں (کہ) جب رات کی تاریکی چھا جائے گی تو صبح تک زندگی رہتی ہے یا نہیں۔)

پر انہوں نے یہ اشعار تضمین کیے ہیں:

فکن حامد اللہ شاکر وفضلہ	اللہ کی حمد اور اس کے فضل کا شکر کر
علی سائر الاحوال فی السرِ والجہر	ہر حال میں ظاہر میں اور باطن میں

وکن ساجد اللہ مادمت قادراً	جہاں تک ہو سکے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر
لعلک تحظی بالسیادۃ والفخر	شاید تجھ کو بزرگی اور فخر عنایت ہو
فیا ایھا الانسان لاتک جاھلا	اے انسان جہالت چھوڑ دے
واعلم بان اللہ ھو الکاشف الضر	اور سمجھ لے کہ اللہ ہی مصیبت دور کرتا ہے
حلیم کریم خالق الخلق کلھم	حلم و کرم والا سب کا پروردگار ہے
و رازقھم من غیرمل ولا ضجر	بلا تکلیف اور تنگی کے رزق دیتا ہے
وصل علی المختار اشرف خلقہ	اور درود بھیج اس کی مخلوقات کے سردار پر
علیہ سلام اللہ فی لیل والفجر	ان پر رات دن اللہ کی رحمت ہو۔

بی بی ام ہانی مریم نے ۸۹۱ھ ہجری میں وفات پائی۔

(تذکرۃ الخواتین۔ مشاہیر نسواں)

بی بی امّ البہاءؒ

فاطمہ نام " امّ البہاء " کنیت اور " ست القریش " لقب تھا۔ والد کا نام فہیم تھا۔ ۸۱۳ھ میں پیدا ہوئیں۔ وہ محدث مراغیؒ، احجار بن زہیر، امّ الحسن بنتِ خیر، معمر ابن جمیع اور شریف احمد بیہقیؒ جیسے باکمال علماء کی مجالس درس میں حاضر ہوئیں اور علمِ حدیث میں بڑا نام پیدا کیا۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی بلقیسؒ بنتِ محمدؒ

محمدؒ بن بدرالدین بلقینی بن سراج الدینؒ کی صاحبزادی تھیں۔ اندازاً ۸۰۰ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ ان کے پردادا علامہ سراج الدینؒ، حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کے استاد تھے۔ گو ان کے خاندان کے سب لوگ اہل علم و فضل تھے۔ مگر فضل و کمال میں جو شہرت بی بی بلقیسؒ کو حاصل ہوئی اور کسی کو نہ ہوئی۔ وہ علم و دانش اور زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھیں۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ:-

"یہ مقدس بی بی مشائخِ طریقت میں شمار کی جاتی ہیں۔"

عمر کے آخری چند سال انہوں نے اپنے آپ کو یکسر عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ عرصہ انہوں نے راہِ سلوک و ایقان اور طریق کے مقامات طے کرنے کے لیے سخت زہد و ریاضت میں گزارا۔ وہ تقریباً ساٹھ سال تک اس عالمِ ناپائدار میں رہیں اور ذی قعدہ ۸۶۱ھ میں فوت ہوئیں۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی الف بنتِ جمالؒ

نویں صدی ہجری میں بڑی مستند اور مشہور محدثہ گزری ہیں۔ والد کا نام الجمال الکنانی تھا۔ بے شمار لوگوں نے ان سے کسبِ فیض کیا۔ ان میں سے بعض اپنے وقت کے امام تسلیم کیے گئے۔ (مشاہیر نسواں)

ملکہ عائشہؒ اُمِّ محمدؐ

غرناطہ (اندلس) کے آخری بادشاہ ابوعبداللہ محمد یازدہم کی ماں کا نام ہے۔ بڑی نیک، غیرت مند اور بہادر خاتون تھیں۔ جب ابوعبداللہ نے سنہ ۸۹۷ھ میں غرناطہ کی حکومت عیسائیوں کے حوالے کر دی اور آہ وزاری کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا تو بی بی عائشہؒ نے جو ہمیشہ اپنے بیٹے کو عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ کرتی رہتی تھیں، اس کو ان الفاظ میں ملامت کی۔

"اے پست فطرت تو اس قابل نہ تھا کہ تیرا عرب کی شریف نسل سے تعلق ہوتا۔ افسوس کہ میرے ذریعے سے تجھے اس عظیم قوم کا فرد بننے کی عزت حاصل ہوئی۔ مجھے شرم آتی ہے کہ تجھ جیسے بے حس اور نامرد کو اپنا بیٹا کہوں۔ اگر میں تیری جگہ اینٹ پتھر جنتی تو اچھا ہوتا ——

اے بے شرم! اپنے اس وطنِ عزیز کے لیے گریہ وزاری کر جس کو تو مردوں کی طرح دشمنوں سے نہیں بچا سکتا ——

اے بے حیا بزدل خوب رو عورتوں کی طرح واویلا کر۔" (مشاہیر النساء)

بی بی عمائمؒ

مولانا حسام الدین بن محمد بن ایوب الحسینی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا شمار نویں صدی ہجری کی نامور عالماتِ حدیث میں ہوتا ہے۔ بہت سے اونچے درجے کے علماء نے اُن سے حدیث کا درس لیا۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی خدیجہؒ بنتِ احمدؒ

نویں صدی ہجری میں حدیث کی یگانۂ روزگار عالمہ ہوئی ہیں۔
شیخ شہاب الدین احمدؒ بن خلف بن عبدالعزیز بدران الحسنیؒ کی صاحبزادی تھیں۔ ۸۹۰ھ میں پیدا ہوئیں۔ ابھی دو برس کی بچی تھیں کہ والدین ان کو علامہ جوہریؒ اور علامہ منصفیؒ کے درس میں لے گئے۔ یہ دونوں اپنے دور کے بلند پایہ محدث تھے۔ اس زمانے میں لوگ بچوں کو اس طرح کے عالموں کی خدمت میں بھیجنا فخر و سعادت کا باعث سمجھتے تھے۔ ان دونوں نے بچی کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور اس کے لیے دعائے خیر و برکت کی۔
بی بی خدیجہؒ نے ذرا ہوش سنبھالا تو وہ ہمہ تن تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئیں۔ جلد ہی انہوں نے جملہ علومِ دینی بالخصوص علمِ حدیث میں درجۂ تبحر حاصل کر لیا۔ پھر اپنی درس گاہ قائم کی اور سالہا سال تک اپنے چشمۂ علم سے تشنگانِ علم کو سیراب کرتی رہیں۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ امام جلال الدین سیوطیؒ جیسے نابغۂ روزگار نے بھی ان سے حدیث کا درس لیا۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی الف بنتِ حسام الدین

سیدہ الفؒ سید حسام الدین بن الحسنؒ کی صاحبزادی تھیں۔ نویں صدی ہجری میں یگانۂ روزگار محدثہ گزری ہیں۔ سیدنا حضرت حسنؓ بن علی کرم اللہ وجہہٗ کی اولاد سے تھیں۔ ان کی درسگاہ میں بہت دور دور سے لوگ آتے تھے اور خوب فیض اٹھاتے تھے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے ان کو اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔
(مشاہیر نسواں)

ملکہ مخدومۂ جہاں

شمالی دکن (ہندوستان) کے گیارھویں بہمنی فرمانروا[1] علاؤالدین ہمایوں شاہ (۸۶۲ھ/۱۴۵۷ء تا ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء) کی ملکہ تھی۔ بڑی زیرک، معاملہ فہم، بیدار مغز اور مدبر خاتون تھی۔ شوہر کی وفات کے وقت اس کا بیٹا نظام شاہ کمسن تھا مگر علاؤالدین ہمایوں شاہ نے اسے ہی وارثِ تاج و تخت قرار دیا اور امرائے دربار

---

[1] بہمنی خاندان شمالی دکن پر ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء سے ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء تک حکمران رہا۔ اس دوران میں اس خاندان کے ۱۸ بادشاہ یکے بعد دیگرے تختِ حکومت پر بیٹھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ حسن گنگو (بہمن شاہ) علاؤالدین ظفر خان ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء
۲۔ محمد شاہ اول ـــــ ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء
۳۔ مجاہد شاہ ـــــ ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء
۴۔ داؤد شاہ ـــــ ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء
۵۔ محمود شاہ اول ـــــ ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء
۶۔ غیاث الدین ـــــ ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء
۷۔ شمس الدین ـــــ ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء
۸۔ تاج الدین فیروز شاہ ـــــ ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء
۹۔ احمد شاہ اول ـــــ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء
۱۰۔ علاؤالدین احمد شاہ ثانی ـــــ ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء
۱۱۔ علاؤالدین ہمایوں شاہ ـــــ ۸۶۲ھ/۱۴۵۷ء
۱۲۔ نظام شاہ ـــــ ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء
۱۳۔ محمد شاہ ثانی ـــــ ۸۶۷ھ/۱۴۶۳ء
۱۴۔ محمود شاہ ثانی ـــــ ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء
۱۵۔ احمد شاہ ثالث ـــــ ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء
۱۶۔ علاؤالدین شاہ ـــــ ۹۲۷ھ/۱۵۲۰ء
۱۷۔ ولی اللہ شاہ ـــــ ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء
۱۸۔ کلیم اللہ شاہ ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء تا ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء

اس خاندان کے بہمنی لقب پڑنے کی ایک وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کے بانی حسن گنگو کا مورثِ اعلیٰ فارس کا مشہور بادشاہ بہمن تھا اور دوسری یہ کہ ایک بہمن (برہمن) نے اس کے بادشاہ ہونے کی پیشینگوئی کی تھی۔ حسن گنگو محمد بن تغلق کی طرف سے دکن کا صوبیدار تھا اس کا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو وصیت کی کہ تمام امورِ سلطنت نظام شاہ کی والدہ مخدومۂ جہاں کے مشورے سے
انجام دیا۔ مخدومۂ جہاں نے خواجہ محمود گاواں[1] اور دوسرے امرا کی مدد سے
کاروبارِ سلطنت نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

خطاب ظفر خاں تھا۔ ۷۴۸ھ میں اس نے بغاوت کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر
لی۔ رفتہ رفتہ اس مملکت نے بڑی وسعت اختیار کر لی۔ یہی وسعت اس کے زوال کا باعث
بنی اور تقریباً دو سو سال بعد بہمنی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ بیجاپور میں عادل شاہی،
گولکنڈہ میں قطب شاہی، برار میں عماد شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی اور بیدر میں برید شاہی
حکومتیں قائم ہو گئیں۔

[1] خواجہ عماد الدین محمود گاواں بہمنی عہد کا نامور وزیر گزرا ہے۔ وہ ایران کے صوبہ
گیلان کے ایک گاؤں قاواں میں ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں پیدا ہوا۔ اسی گاؤں کے نام "قاواں" کی
نسبت سے وہ بعد میں "گاواں" مشہور ہوا۔ اس کے خاندان کے لوگ گیلان کی حکومت میں
اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ خواجہ محمود کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ عنفوانِ
شباب میں وہ حج کے لیے مکہ معظمہ گیا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کا خاندان ایرانی حکومت
کے زیرِ عتاب آ گیا۔ خواجہ محمود گاواں نے وطن واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور حجازِ مقدس
سے ہندوستان آ گیا۔ اس وقت بہمنی خاندان کے بادشاہ علاؤالدین احمد شاہ ثانی کی مردم شناسی
اور علم دوستی کا بڑا چرچا تھا۔ خواجہ محمود اس کے پاس بیدر چلا گیا۔ احمد شاہ ثانی کو اس کے
اوصاف و خصائل کا علم ہوا تو اس نے اس کی بہت عزت و تکریم کی اور اس کو ایک ہزاری
منصب پر فائز کر دیا۔ احمد شاہ ثانی کی وفات کے بعد ۸۶۲ھ میں علاؤالدین ہمایوں شاہ
بادشاہ بنا تو اس نے خواجہ محمود گاواں کو ملک التجار کا خطاب دے کر اس کا رتبہ اور بڑھا دیا۔
خواجہ موصوف بہمنی خاندان کا دل و جان سے خیر خواہ تھا۔ اس نے ہمایوں شاہ کے خلاف
کئی بغاوتیں فرو کیں۔ ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء میں ہمایوں شاہ نے وفات پائی اور اس کا خورد سال بیٹا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سرکردہ امراء پر مشتمل ایک "مجلس مدار المہام" بنا رکھی تھی۔ اس میں خواجہ محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک سب سے اہم حیثیت کے مالک تھے، اور ملکہ ان کے مشوروں کو خاص اہمیت دیتی تھی۔ ان کی مدد سے ملکہ نے تمام اندرونی اور بیرونی خطروں پر قابو پالیا۔ نظام شاہ ماں کا بے حد اطاعت گزار تھا۔ لیکن وہ بادشاہت کے تیسرے سال ہی ۸۶۷ھ مطابق ۱۴۶۳ء میں وفات پا گیا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ وہ بھی صغیر السن اور ملکہ کی سرپرستی کا محتاج تھا۔ مخدومۂ جہاں کو خواجہ محمود گاواں جیسا لائق وزیر مل گیا تھا اس کے بھرپور تعاون سے اس نے سلطنت پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دی۔ ۸۷۰ھ مطابق ۱۴۷۰ء میں مخدومۂ جہاں کو اطلاع ملی کہ خواجہ جہاں ترک نے سلطنت پر قبضہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

نظام شاہ تخت نشین ہوا تو مالوہ کے فرمانروا محمود خلجی (اول) نے بہمنی مملکت پر حملہ کر دیا۔ پہلے تو بہمنی افواج نے شکست کھائی لیکن محمود گاواں نے گجرات کے بادشاہ محمود شاہ بیگڑہ کی حمایت حاصل کر کے محمود خلجی کو شکست دی۔ نظام شاہ کی وفات کے بعد ۸۶۷ھ مطابق ۱۴۶۳ء میں محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی خواجہ محمود گاواں کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا اور اس کو خواجہ جہاں کا خطاب عطا کیا۔ خواجہ محمود نے بھی بہمنی سلطنت کی خیر خواہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ہمیشہ اپنے ولی نعمت کے دشمنوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔ اس سلسلے میں اس نے بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی بھی کی۔ بدقسمتی سے خواجہ محمود گاواں کے دشمنوں نے محمد شاہ کو اس کے خلاف بدظن کر دیا۔ اور ایک جعلی خط خواجہ موصوف سے منسوب کر کے بادشاہ کو یقین دلایا کہ خواجہ اس کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اشتعال میں آکر بہمنی سلطنت کے اس عظیم محسن کو ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۸۱ء میں قتل کرا دیا۔

خواجہ محمود گاواں بڑا عالم فاضل آدمی اور علماء و فضلا کی قدر دانی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس نے بیدر میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا جس میں سیکڑوں طلبہ اس کے خرچ پر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس نے اپنے پیچھے ایک عظیم الشان کتاب خانہ اپنی یادگار چھوڑا۔ "قواعد انشاء نویسی" نام کی ایک تصنیف بھی اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ (تاریخ فرشتہ، تاریخ بہمنی وغیرہ)

کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ملکہ نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ خواجہ جہاں ترک کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ خود مارا گیا۔ محمد شاہ ثانی ۱۴ برس کا ہوا تو مخدومہ جہاں نے ایک شریف شہزادی سے اس کی شادی کر دی اور پھر مہمات سلطنت محمد شاہ کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گئی۔ تاہم محمد شاہ تمام امور سلطنت میں اس سے برابر مشورے لیتا رہا۔ وہ ہر روز والدہ کے سلام کو جاتا تھا اور اس کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کرتا تھا گوشہ نشینی کے زمانے میں مخدومہ جہاں کا بیشتر وقت عبادت اور تلاوت قرآن میں گزرتا تھا۔ ۸۷۷ھ مطابق ۱۴۷۲ء میں حاکم تلگوان نے سرکشی اختیار کی۔ محمد شاہ کو اس کی سرکوبی کے لیے خود تلگوان جانا پڑا۔ مخدومہ جہاں بھی بیٹے سے دلی لگاؤ کی وجہ سے اس کے ساتھ ہولی۔ اثنائے سفر میں وہ مختصر علالت کے بعد فوت ہو گئی۔ اس کی نعش بیدر لائی گئی اور وہیں دفن کی گئی۔ (تاریخ فرشتہ، تاریخ بہمنی، مشاہیر نسواں)

بی بی سلمیٰؒ بنت شمس الدینؒ

ان کا شمار نویں صدی ہجری کی شہرۂ آفاق عالمات میں ہوتا ہے۔ امام القراء علامہ شمس الدین جزریؒ کی صاحبزادی تھیں۔ وہ اپنے وقت میں فنِ قرأت و تجوید کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی لختِ جگر سلمیٰ کو جملہ دینی علوم بالخصوص قرأت و تجوید کی تعلیم بڑی محنت اور توجہ سے دی یہاں تک کہ وہ اس فن میں یگانۂ روزگار ہو گئیں۔ ان کو نہ صرف سبعہ قرأت بلکہ عشرہ قرأت پر بھی عبور حاصل تھا۔ قرآن کریم کی حافظہ تھیں اور پورا قرآن پاک ہر قرأت کے مطابق سنا سکتی تھیں۔ کہا جاتا ہے ان کے والد کے بعد کوئی دوسرا قاری قرأت اور تجوید کے فن میں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ (مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

دسویں صدی ہجری

۱۔ بی بی عائشہؒ بنت یوسفؒ الباعونی (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ، مصنفہ)
۲۔ بدیعۃ الحجیۃؒ (عابدہ زاہدہ)
۳۔ بی بی فاطمہ بنت عبدالقادرؒ (عارفہ)
۴۔ خانزادہ بیگم (شاہی خاندان کی بزرگ اور شفیق خاتون)
۵۔ خونزہ ہمایوں (دانش مند، مدبرہ، دلاور)
۶۔ ملکہ ماہم بیگم (دانشمند، رعایا پرور)
۷۔ گلبدن بیگم (عالمہ، ادیبہ، شاعرہ)
۸۔ عائشہ سلطان خانم (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ)
۹۔ گل چہرہ بیگم (شاعرہ، ادیبہ)
۱۰۔ ملکہ نور بانو (دیندار، مخیر)
۱۱۔ ملکہ حمیدہ بانو بیگم (غیرتمند، باوفا، خدا ترس، پابند شریعت)
۱۲۔ ملکہ ماہ چوچک بیگم (مدبرہ)
۱۳۔ چوچک بیگم (باوفا بیوی)
۱۴۔ حبہ خاتون (شاعرہ)
۱۵۔ حرم بیگم (مدبرہ، ماہر سیاست، غیرتمند، بہادر)
۱۶۔ ماہم انگہ (دانش مند، باوفا، مخیر)
۱۷۔ بی بی کاملہ بیگم (شاعرہ)
۱۸۔ بی بی نہائی (شاعرہ)
۱۹۔ ملکہ سلیمہ سلطان بیگم مخفی (عالمہ فاضلہ شاعرہ)
۲۰۔ چاند بی بی (عالمہ، فنون سپہگری میں ماہر، دانا، بہادر)
۲۱۔ ملکہ پونجی خاتون (مدبرہ، بہادر)
۲۲۔ ملکہ آمنہ (دانشمند، باکمال، رفاہ عامہ سے شغف)
۲۳۔ ملکہ صفیہ (ماہر سیاست، مدبرہ، بیدار مغز)
۲۴۔ بی بی صدقی (شاعرہ)
۲۵۔ مہر ماہ سلطان (رفاہ عامہ سے شغف، مجاہدہ)
۲۶۔ ملکہ جانفدا اقادین (سیاست داں، خیر خواہ خلق)
۲۷۔ شہزادی فاطمہ خانم (ہمدرد خلائق، نیکوکار)
۲۸۔ شاہ سلطان (نیکوکار، مخیر)

بی بی عائشہ بنتِ یوسف الباعونیؒ[۱]

بی بی عائشہ الباعونیؒ کا شمار نویں/دسویں ہجری کی یگانۂ روزگار عالمات و فاضلات میں ہوتا ہے۔ ان کے والد یوسفؒ بن احمدؒ الباعونی (ولادت ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء وفات ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء) دمشق کے قاضی تھے۔ بڑے عالم فاضل اور متقی آدمی تھے۔ انتظامی امور میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے دمشق میں "مارستان (شفاخانہ) نور الدینؒ" کے نظم ونسق میں نہایت مفید اصلاحات کیں۔ اس کی عمارت میں نئے حصے تعمیر کرائے اور اس کے اوقات میں اضافہ کر دیا۔

قاضی یوسفؒ نظم ونثر دونوں پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں امام نوویؒ کی "منہاج" کو نظم کا جامہ پہنانا بھی شامل ہے۔

بی بی عائشہؒ اسی علامۂ دہر باپ کے گھر نویں صدی ہجری کے وسط میں بمقام دمشق پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے بے حد ذہین وفطین تھیں۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کر لیا اور فاضل باپ کے زیرِ سایہ نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت

---

[۱] باعون (باعونہ) عراق میں موصل کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔ قاضی یوسف الباعونیؒ کا دادا ناصر بن خلیفہ اس گاؤں میں پارچہ بافی کرتا تھا۔ اسی گاؤں کی نسبت سے وہ خود اور اس کی اولاد الباعونی کہلائی ـــــ ناصر بن خلیفہ بعد میں باعون کی سکونت ترک کر کے فلسطین کے شہر ناصرہ (NAZARETH) میں آباد ہو گیا۔ قاضی یوسفؒ کے والد احمد الباعونیؒ بھی بہت بڑے عالم تھے (ولادت ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء)۔ عرصہ تک مسجد بنی امیہ کے خطیب اور دمشق کے قاضی کے عہدے پر فائز رہے۔ کچھ عرصہ بیت المقدس میں مسجدِ اقصیٰ کے خطیب بھی رہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پائی۔ وہ قاہرہ میں عرصہ تک حدیث فقہ اور دوسرے علوم دینی کی تحصیل کرتی رہیں اور وہاں سے درس و افتاء کی باقاعدہ سند لی۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد وہ علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئیں اور جلد ہی ان کے علم و عرفان اور شعر و ادب میں دستگاہِ کامل کی سارے عالمِ اسلام میں دھوم مچ گئی۔ وہ ایک اونچے درجے کی عالمہ اور قادر الکلام شاعرہ تھیں۔ کوئی بڑے سے بڑا شاعر یا عالم ان کو شعر و سخن یا علم کے کسی شعبے میں مرعوب نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے آپ پر اس قدر اعتماد تھا کہ مصر کے ایک نامور عالم عبدالرحیم العباسی سے مدت تک نظم میں خط و کتابت کرتی رہیں۔

ان کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت اور عقیدت تھی چنانچہ حضورؐ کی شان میں ایک معرکہ آرا نعتیہ قصیدہ لکھا جس کا نام " الفتح المبین فی مدح الامین " رکھا۔ اس کی شرح بھی انہوں نے خود ہی لکھی۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات یہ ہیں:

(۱) کتاب اللامع الشریفۃ والآثار المنیفۃ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ عقائدِ اسلام کے باب میں ایک قصیدہ "العقیدہ" کے عنوان سے لکھا اور ابن زریق کی ایک نظم کی تخمیس بھی کی۔

قاضی احمدؒ نہ صرف ایک سحر البیان واعظ تھے بلکہ اعلیٰ درجے کی قابلیت بھی رکھتے تھے اور دیانت و امانت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

ایک دفعہ سلطان برقوق نے ان سے اوقاف کی رقم سے قرض طلب کیا۔ انہوں نے قرض دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر سلطان غضبناک ہوگیا اور ان کو معزول کر کے قید کر دیا۔ لیکن انہوں نے پروا نہ کی اور اپنی رائے پر قائم رہے۔

قاضی احمدؒ نے ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء میں بمقام دمشق وفات پائی۔ (اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ)

(۲) الفتح الخفی

(ان دونوں کتابوں کا موضوع تصوف ہے)

(۳) مولد النبیؐ (اس کا کچھ حصہ نظم میں اور کچھ نثر میں ہے)

(۴) الاشارات الخفیۃ فی منازل العلیۃ (الہروی کے رسالۂ تصوف "منازل السائرین" کا خلاصہ ہے)

(۵) خلاصۃ القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب۔ للسخاوی

(۶) المعجزات والخصائص النبویہ (منظوم) اصل کتاب امام سیوطیؒ کی ہے بی بی عائشہؒ نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔

بی بی عائشہؒ شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھیں۔ انہوں نے ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں بمقام دمشق وفات پائی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۲۔ مشاہیر نسواں)

بدیعۃ البجیہؒ

مکہ معظمہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کا زمانہ دسویں صدی ہجری کا ہے۔ زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ کسی چیز کے حرام یا مکروہ ہونے کے بارے میں شک پڑ جاتا تو اس کو چھوتی تک نہیں تھیں۔ ایک مرتبہ انہیں معلوم ہوا کہ مکہ میں بجیلہ (افریقہ) سے گوشت اور پھل درآمد کیے جاتے ہیں لیکن وہاں کے لوگ اپنی بیٹیوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی صریح نافرمانی کرتے ہیں۔ بی بی بدیعۃؒ نے یہ سن کر بجیلہ سے منگوائے جانے والے گوشت اور پھلوں کا استعمال بالکل ترک کر دیا۔ اس کے بعد وہ تیس سال زندہ رہیں لیکن ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ (مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی فاطمہ بنتِ عبدالقادرؒ

حضرت مخدوم میراں محمدؒ شاہ موج دریا بخاریؒ کی اہلیہ تھیں[1]۔ وہ حضرت بی بی کلاں کے لقب سے مشہور ہیں۔ بی بی فاطمہؒ پیرِ پیراں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

---

[1] حضرت مخدوم میراں محمدؒ شاہ موج دریا بخاریؒ کا شمار برِ کوچک پاک و ہند کے جلیل القدر اولیائے سہروردیہ میں ہوتا ہے لیکن وہ سلسلۂ سہروردیہ کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ بخاریہ حسینیہ یا بخاریہ جلالیہ سے بھی نسبت رکھتے تھے۔ سنہ ۹۴۰ ہجری میں اوچ (اوچ شریف) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب چھ واسطوں سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ (المتوفی سنہ ۷۸۵ھ) تک پہنچتا ہے۔ انہوں نے اپنے جامع شریعت و طریقت بزرگوں کے علاوہ اس دور کے کئی دوسرے متبحر علماء و صلحاء سے علم حاصل کیا اور منزلِ شباب تک پہنچتے پہنچتے علم و فضل کے بحرِ زخار بن گئے۔ پھر اپنے آباؤ اجداد کی مسندِ ہدایت و ارشاد پر متمکن ہو گئے۔ ان کی تبلیغی مساعی کی بدولت بے شمار غیر مسلموں بالخصوص ہندو راجپوتوں کو ہدایت نصیب ہوئی اور وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ سید موصوف سنہ ۹۷۵ھ اور سنہ ۹۸۰ھ کے درمیان کسی وقت اوچ سے نقل مکانی کر کے لاہور تشریف لائے اور یہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ لاہور میں ان کا دریائے فیض تقریباً چھتیس برس تک جاری رہا۔ اپنے بے مثال جذبۂ خیر، جود و سخا، معارف پروری اور خدمتِ خلق کی بناء پر انہوں نے "موج دریا" کے لقب سے شہرت پائی۔ فقر و استغنا، زہد و اتقا، رشد و ہدایت اور علم و عمل کے اس پیکرِ جمیل نے سنہ ۱۰۱۳ھ میں وفات پائی۔ ان کا عظیم الشان مقبرہ لاہور میں زیارت گاہِ خواص و عوام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقبرہ جلال الدین اکبر بادشاہ کے حکم سے تعمیر کیا گیا تھا۔

کی اولاد سے تھیں۔ ان کے دادا حضرت سید محمد غوث بالا پیر گیلانی تھے[1]۔ اور والد سید عبدالقادر گیلانی ثالث المعروف بہ سید جیون تھے[2] بی بی فاطمہ نہایت

---

[1] سید محمد غوث بالا پیر گیلانیؒ (بن سید زین العابدینؒ) کا شمار اپنے دور کے مشہور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق اوچ کے عظیم خانوادۂ گیلانیہ سے تھا۔ انہوں نے اپنے دادا سید عبدالقادر ثانیؒ سے علوم شریعت و طریقت حاصل کیے اور انہی سے خرقۂ خلافت پایا۔ والد سید زین العابدینؒ بنگال میں کفار سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ جب اوچ میں ان کے چچا زاد بھائی سید حامد گنج بخشؒ سجادہ نشین ہوئے تو سید محمد غوث بالا پیرؒ اوچ سے ستگھرہ تشریف لے گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ سالہا سال تک رشد و ہدایت میں مصروف رہنے کے بعد ۹۵۹ھ میں وفات پائی۔ ان سے متعدد کرامات اور خوارقِ عادات منسوب ہیں۔

[2] سید عبدالقادر ثالث گیلانی المعروف بہ سید جیونؒ اپنے وقت کے سرآمدِ روزگار اولیاء اللہ میں سے تھے۔ وہ بڑے عالم و فاضل شجاع، سخی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ علوم شریعت و طریقت کی تعلیم اپنے جلیل القدر والد سید محمد غوث بالا پیرؒ (ستگھرہ) سے حاصل کی۔ والدِ گرامی کی وفات کے بعد عرصہ تک مختلف ممالک و امصار کی سیاحت میں مشغول رہے اور اثنائے سیاحت میں بہت سے بزرگوں سے کسب فیض کیا۔ پھر لاہور تشریف لائے اور ایک نیا محلہ رسول پورہ آباد کیا۔ وہیں ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں وفات پائی اور اس مقام پر دفن ہوئے جہاں اب ان کے پوتے حضرت شاہ چراغؒ کا مزار ہے۔ تاریخ رحلت حسب ذیل ہے۔

عبدِ قادر چو شد ز دارِ فنا	یافت از حق بخلدِ والا جا
فیضِ اسلام گو بتاریخش (۱۰۲۲)	ہم بخواں عبدِ قادر اہلِ خدا (۱۰۲۲)

"شیخ عالی منقبت" سے عیسوی تاریخ ۱۶۱۳ء برآمد ہوتی ہے۔

عبادت گزار اور متقی خاتون تھیں۔ ان کا شمار اپنے وقت کی عارفات میں ہوتا ہے۔ مشہور مصنف پیر غلام دستگیر نامی مرحوم نے اپنی کتاب "بزرگانِ لاہور" میں لکھا ہے کہ ایک دن بی بی صاحبہ نے اپنی چادر دھو کر دھوپ میں ڈالنی چاہی لیکن عصر کا وقت تھا اور دھوپ گھر میں صرف بیری کے درخت کی چوٹی پر تھی۔ انہوں نے اس درخت سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے درخت! اپنی ٹہنیاں جھکا دے تاکہ میں اپنی چادر ان پر ڈال کر خشک کر سکوں۔"

ٹہنیاں فوراً نیچی ہو گئیں، بی بی صاحبہ نے اپنی چادر ان پر ڈال دی اور وہ پھر بلند ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد حضرت موج دریاؒ گھر تشریف لائے اور چادر کو درخت پر پڑا پایا تو سمجھے کہ بی بی صاحبہ نے درخت پر چڑھ کر یہ کام کیا ہے۔ انہوں نے غصہ میں آکر بی بی صاحبہؒ سے بازپرس کی تو انہوں نے قسم کھا کر بتایا کہ میں درخت پر نہیں چڑھی بلکہ خود درخت نے اپنی ٹہنیاں جھکا دیں۔ حضرت موج دریاؒ نے فرمایا تو پھر اسی طرح درخت سے چادر اتار دو۔ چنانچہ بی بی صاحبہ نے درخت سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے درخت اب اپنا سر جھکا لے تاکہ میں اپنی چادر اس سے اتار لوں۔"

درخت کی ٹہنیاں فوراً نیچی ہو گئیں اور بی بی صاحبہؒ نے اپنی چادر ان سے کھینچ لی۔

اس طرح اور بھی کئی کرامات بی بی صاحبہ سے منسوب ہیں۔ بی بی فاطمہؒ نے ۱۰۱۶ھ / ۱۶۰۷ء میں وفات پائی اور اپنے شوہر نامدار کے مزار سے کچھ فاصلے پر مدفون ہوئیں۔ لیک روڈ (لاہور) پر ان کی قبر اب بھی موجود ہے۔ بی بی فاطمہؒ کے بطن سے حضرت موج دریا بخاریؒ کے دو فرزند ہوئے سید صفی الدینؒ اور سید بہاؤالدینؒ۔ دونوں علم و فضل اور زہد و اتقا کے اعتبار سے درجۂ کمال پر فائز تھے۔

(تاریخ اوچ۔ نقوش لاہور نمبر)

خانزادہ بیگم

تیموری خاندان کی نہایت بلند مرتبہ خاتون ہوئی ہے۔ ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کی بڑی بہن تھی۔ بابر اس سے پانچ برس چھوٹا تھا۔ ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء میں وہ بابر کے پاس سمرقند میں تھی کہ ازبکوں کے سردار شیبانی خان[1] نے اس شہر کو فتح کر لیا اور بابر کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ لیکن جلد ہی بابر نے شہر کے باشندوں کی مدد سے سمرقند پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کی بدقسمتی سے یہ قبضہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ چند ماہ بعد شیبانی خان نے اس کو سرپل کے مقام پر تباہ کن شکست دی اور سمرقند کو گھیر لیا۔ بابر کو سخت افراتفری کے عالم میں سمرقند سے بھاگنا پڑا۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں لکھا ہے کہ جس وقت بابر سمرقند میں محصور تھا، شیبانی خان نے اس کو پیغام بھیجا کہ اگر تم اپنی بہن خانزادہ بیگم کی شادی میرے ساتھ کر دو تو میرے اور تمہارے درمیان صلح ہو سکتی ہے اور رابطۂ اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ مجبوراً بابر نے خانزادہ بیگم کی شادی شیبانی خان سے کر دی اور خود قلعہ سے نکل کر بدخشاں و کابل کا رخ کیا لیکن "تزکِ بابری" میں خود بابر نے سمرقند سے اپنے فرار کا حال جس طرح لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شادی میں اس کا ایما شامل نہیں تھا بلکہ جب وہ پریشانی کے عالم میں بھاگا تو خانزادہ بیگم کو

---

[1] ابوالفتح محمد شیبانی خان کو شاہی بیگ ازبک، شاہ بیگ خان ازبک اور شیبک کے ناموں سے بھی پکارا جاتا تھا۔ وہ ازبکوں کا خان تھا اور بڑا جنگجو اور دلیر آدمی تھا۔ اس نے ماوراءالنہر کو فتح کر کے اس پر ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء سے ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء تک حکومت کی۔ سمرقند کے لیے بابر سے اس کی معرکہ آرائیاں مشہور ہیں اگرچہ بابر دو مرتبہ اس کے مقابلے میں کامیاب رہا لیکن بالآخر شیبانی خان نے اس کو شکست دے کر سمرقند سے نکال دیا۔

ساتھ نہ لے جا سکا اور وہ سمرقند میں پیچھے رہ گئی۔ شیبانی خان نے سمرقند میں داخل ہوکر اس سے نکاح کر لیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ خانزادہ بیگم خود شیبانی خان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ بابر کو مجبوراً اس شادی کی اجازت دینی پڑی تاکہ وہ سمرقند سے نکل سکے مگر اس شادی کی راہ میں ایک رکاوٹ تھی وہ یہ کہ خانزادہ بیگم کی خالہ پہلے ہی اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے شیبانی خان نے اس کی خالہ کو طلاق دے دی اور خانزادہ بیگم سے نکاح کر لیا۔

اس سلسلے میں "ہمایوں نامہ" کی مترجم مسز اے بیورج ایک اور ہی تصویر پیش کرتی ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ خانزادہ بیگم نے صرف بابر کو بچانے کی خاطر اپنی قربانی دی اور شیبانی خان سے نکاح کر لیا۔ اگر وہ یہ قربانی نہ دیتی تو بابر کو شیبانی خان گرفتار کر لیتا یا قتل کر دیتا۔

شیبانی خان سے خانزادہ بیگم کا ایک لڑکا خاناں شاہ پیدا ہوا جسے بلخ کا گورنر مقرر کیا گیا مگر وہ اوائل عمر ہی میں فوت ہو گیا۔

شیبانی خان کے ساتھ خانزادہ بیگم کی شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی کیونکہ کچھ مدت بعد شیبانی خان نے محسوس کیا کہ خانزادہ بیگم اپنے بھائی بابر کی ہمدرد ہے اور مشکل وقت میں وہ اُسی کا ساتھ دے گی۔ چنانچہ اس نے خانزادہ بیگم کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد خانزادہ بیگم نے شیخ ہادی نامی ایک سید سے شادی کر لی۔ شیخ ہادی ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء میں مرو کی لڑائی میں مارا گیا۔ (شیبانی خان بھی اسی لڑائی میں شدید زخمی ہو کر فوت ہو گیا) اس لڑائی کے فاتح شاہ اسمٰعیل صفوی نے خانزادہ بیگم کو عزت و احترام کے ساتھ بابر کے پاس بھجوا دیا۔ یہ ۹۱۷ھ / ۱۵۱۱ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت بابر کابل کا حکمران تھا اور خانزادہ بیگم کی عمر ۳۳ برس کی تھی۔ خانزادہ بیگم کی تیسری شادی میرزا مہدی بیگ یا مہدی خواجہ سے ہوئی اس سے عمر بھر اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

بابر اس کے بیٹے بیٹیاں اور دوسرے اہلِ خاندان خانزادہ بیگم کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے اور وہ سارے شاہی خاندان میں "خاتونِ بزرگ" کی حیثیت رکھتی تھی۔ خود خانزادہ بیگم نے بھی بڑی نرم اور شفیق طبیعت پائی تھی اور وہ اپنے اہلِ خاندان سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اس کا مستقل قیام بابر کے ساتھ کابل میں رہا تاآنکہ بابر نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد اپنے اہلِ خاندان کو کابل سے ہندوستان بلا بھیجا۔

سنہ ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں خانزادہ بیگم شاہی خاندان کی متعدد دوسری مستورات کے ساتھ ہندوستان پہنچ گئی۔ بابر نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اسے آگرہ میں رہنے کے لیے مکان دیا۔ سنہ ۹۳۷ھ (۱۵۳۰ء) میں بابر نے وفات پائی تو خانزادہ بیگم کو شدید صدمہ ہوا۔ اس کا بھتیجا ہمایوں تختِ شاہی پر بیٹھا تو اس نے بزرگ پھوپھی کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس کو محبوب بھائی کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

چونکہ خانزادہ بیگم کے کوئی اولاد نہ تھی اس نے اپنے شوہر مہدی خواجہ کی دو سالہ بہن سلطانم بیگم کو اپنی بیٹی بنا لیا۔ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی جب وہ جوان ہوئی تو خانزادہ بیگم نے اس کی شادی اپنے بھتیجے میرزا ہندال (برادرِ ہمایوں بادشاہ) کے ساتھ کر دی۔ یہ تقریب اس نے بڑی شان و شوکت سے منعقد کی، اور اس پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اس نے سلطانم بیگم کو جہیز میں جو بیش بہا چیزیں دیں اور میرزا ہندال کو جو قیمتی تحائف دیئے۔ گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں ان کی ایک طویل فہرست دی ہے۔

جس زمانے میں ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر بھکر کے نواح میں خیمہ زن تھا۔ قندھار کے حاکم قراچہ خان نے خط لکھ کر اس کو قندھار آنے کی ترغیب دی۔ ہمایوں نے اپنی جگہ میرزا ہندال کو بھیج دیا۔ قراچہ خان نے فوراً قندھار اس کے سپرد کر دیا۔ میرزا کامران اس وقت کابل کا حاکم تھا اور میرزا عسکری غزنین میں تھا۔ میرزا کامران نے اس کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ قندھار میرزا ہندال سے چھین لیا جائے۔ ہمایوں کو علم ہوا تو وہ خانزادہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہوا

اور اس سے درخواست کی کہ آپ قندھار جا کر میرزا کامران اور میرزا ہندال دونوں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں کہ وہ اس مصیبت کے وقت آپس میں اتفاق رکھیں۔ چنانچہ خانزادہ بیگم قندھار چلی گئی۔ اس کے چار دن بعد میرزا کامران بھی کابل سے قندھار پہنچ گیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس کا اصرار تھا کہ خطبہ میں میرا نام پڑھا جائے لیکن ہندال میرزا اس پر تیار نہیں تھا بالآخر میرزا کامران نے خانزادہ بیگم کو پیغام بھیج کر اپنے پاس بلایا، وہ گئی تو میرزا کامران نے اس موضوع پر اس سے گفتگو کی۔ خانزادہ نے بلا دھڑک کہا کہ بابر نے اپنی جانشینی کا فیصلہ خود ہی کر دیا تھا اور ہمایوں کو بادشاہ نامزد کر دیا تھا۔ تم سب اس کے نام کا خطبہ پڑھتے رہے ہو اب بھی اسے بڑا سمجھ کر اس کی فرمانبرداری کرو اور اسی کے نام کا خطبہ جاری رکھو۔

میرزا کامران پر پھوپھی کی نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ چار ماہ کے محاصرے سے اہلِ قندھار تنگ آ چکے تھے۔ آخر اس بات پر فیصلہ ہوا کہ جب تک ہمایوں قندھار سے دور ہے میرزا کامران کے نام کا خطبہ پڑھ دیا جائے جب وہ قندھار آ جائے تو خطبہ اسی کے نام کا شروع کر دیا جائے۔ اس کے بعد میرزا کامران خانزادہ بیگم کو اپنے ساتھ کابل لے گیا۔

اُدھر ہمایوں نے سندھ سے قندھار کا عزم کیا۔ راستے میں شالِ مستان کے مقام پر خیمہ زن تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ میرزا عسکری دو ہزار سواروں کے ساتھ بُرے ارادے سے آ رہا ہے۔ ہمایوں بڑی عجلت کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ اس پریشانی میں ڈھائی سالہ اکبر پیچھے ہی رہ گیا۔ میرزا عسکری نے اسے اپنی بیوی کے سپرد کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد میرزا عسکری نے ننھے بھتیجے کو کامران کے پاس کابل بھیج دیا۔ کامران نے اسے خانزادہ کے سپرد کر دیا۔ گلبدن بیگم "ہمایوں نامہ" میں لکھتی ہے کہ خانزادہ بیگم اکبر سے بہت محبت کرتیں، اس کے ہاتھ پاؤں چومتی رہتیں اور کہتی رہتیں کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور خد و خال میرے مرحوم بھائی (بابر) سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔

جب ہمایوں قندھار پہنچ گیا تو میرزا کامران نے خانزادہ سے بڑی لجاجت کے ساتھ درخواست کی کہ وہ قندھار جا کر ہمایوں اور اس کے درمیان صلح کرا دے۔

خانزادہ بیگم نے اکبر کو میرزا کامران کی بیوی کے سپرد کیا اور خود عازمِ قندھار ہو گئی۔ قندھار پہنچ کر اس نے ہمایوں کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کی تو اس نے کہا ہم کابل جاتے ہیں کامران جو رویہ اختیار کرے گا اسی کے مطابق آئندہ طرزِ عمل کا فیصلہ ہو گا۔ چنانچہ اس نے خانزادہ بیگم کو ساتھ لیا اور لشکر لے کر کابل کی طرف روانہ ہو پڑا۔ جس وقت قبلچک (افغانستان) کے مقام پر پہنچا، تو خانزادہ بیگم کو بخار ہو گیا اور وہ تین دن تک برابر بیمار رہی۔ اطباء نے علاج معالجہ میں سر توڑ کوشش کی مگر بخار کی شدت میں کوئی کمی نہ ہوئی آخر چوتھے روز وہ خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئی۔ یہ ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء کا واقعہ ہے۔ "خاتونِ بزرگ" کو جائے وفات قبلچک ہی میں ایک تابوت میں ڈال کر دفن کر دیا گیا مگر تین ماہ بعد اس کا تابوت کابل لایا گیا اور بابر بادشاہ کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ (ہمایوں نامہ۔ دائرہ معارف اسلامیہ)

خونزہ ہمایوں

حسین نظام شاہ والیٔ احمد نگر (۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء تا ۹۷۲ھ) کی بیگم اور مرتضیٰ نظام شاہ والیٔ احمد نگر (۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء تا ۹۹۶ھ/۱۵۸۷ء) کی ماں تھی۔ نہایت دانش مند خاتون تھی۔ امورِ حکمرانی سے آگاہ اور جرأت و دلاوری میں یکتا تھی۔ چاند بی بی یا چاند سلطانہ (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) اسی خونزہ ہمایوں کی بیٹی تھی۔ حسین نظام شاہ نے ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء میں وفات پائی تو اس کا فرزند مرتضیٰ نظام شاہ وارثِ تخت قرار پایا لیکن وہ ابھی نابالغ تھا اس لیے اس کی ماں خونزہ ہمایوں چھ سال تک ولایتِ احمد نگر کی مدار المہام رہی۔ اس کے بعد امرائے حکومت اس بنا پر اس سے ناراض ہو گئے کہ اس نے اپنے بھائیوں کو بہت زیادہ اختیار دے دیے ہیں چنانچہ انہوں نے سازش کر کے خونزہ ہمایوں کو اقتدار سے محروم کر دیا۔

(تاریخ فرشتہ)

ماہم بیگم

ظہیر الدین محمدؒ بابر بادشاہ (سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء تا سنہ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء) کی بیگم تھی۔ اس کا تعلق خراسان کے ایک معزز خاندان سے تھا اور وہ شیخ احمد جامؒ (المتوفی سنہ ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء) کی نسل سے تھی۔ بابر نے سنہ ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء میں اس سے شادی کی۔ سنہ ۹۱۳ھ / ۱۵۰۷ء میں ہمایوں اس کے بطن سے پیدا ہوا۔ یہ خاتون نہایت دانشمند اور رعایا پرور تھی۔ بابر بادشاہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب وہ سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں کابل سے ہندوستان آئی تو بابر دو کوس تک پیادہ اس کے استقبال کو گیا۔ بیگم کی سواری سامنے آئی تو اس نے بابر کو پیادہ دیکھ کر سواری سے اترنا چاہا لیکن بابر نہ مانا اور بیگم کی سواری کے ساتھ ساتھ پیدل چل کر قیام گاہ تک آیا۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں اس واقعہ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

> "حضرت بادشاہ (بابر) خیال داشتند کہ تاکول جلالی پیشواز (استقبال) روند۔ نماز شام یکے آمدہ گفت کہ حضرت (ماہم بیگم) را در دو گروہی گزاشتہ آمدہ ام۔ حضرت بادشاہ بابام (بابر) تا اسپ آوردند تحمل نکردند و پیادہ رواں شدند و در پیش خانہ ننجیۂ ماہم در خوردند۔ آکام (یعنی ماہم بیگم) می خواستند کہ پیادہ شوند۔ بادشاہ بابام نماندند و خود در جلوی آکام تا خانۂ خود پیادہ آمدند۔"

ٹامس بیل نے مفتاح التواریخ میں لکھا ہے کہ ماہم بیگم نے دلی کے پرانے قلعے کے قریب ایک مدرسہ بنوایا جس کے ساتھ ایک شاندار مسجد بھی تھی لیکن سر سید احمد خان کا بیان ہے کہ اس مسجد اور مدرسہ کی تعمیر کا سہرا اکبر کی انگہ ماہم کے سر ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ مسجد اور مدرسہ کی تعمیر جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں ہوئی جبکہ

ماہم بیگم اپنے فرزند نصیر الدین محمد ہمایوں کے عہد میں وفات پا چکی تھی۔

ماہم بیگم کے بطن سے بابر کے جو بچے پیدا ہوئے، گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں ان کے یہ نام لکھے ہیں:-

ہمایوں، باربول میرزا، مہر جان بیگم، ایشان بیگم اور فاروق میرزا۔ اس کے کچھ بچے صغر سنی میں فوت بھی ہو گئے۔

ماہم بیگم بڑی نرم دل اور شفیق خاتون تھی۔ اس نے بابر کے دو بچوں ہندال میرزا اور گلبدن بیگم کو جو بابر کی ایک دوسری بیگم دلدار خانم کے بطن سے تھے اپنی گود لے لیا اور نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ ان کی پرورش اور تربیت کی۔

$\frac{۹۳۷}{۱۵۳۰}$ھ میں بابر نے وفات پائی تو ماہم بیگم کو بے انتہا صدمہ ہوا جب تک زندہ رہی بابر کے مزار کے متعلقین کے لیے بڑے اہتمام سے کھانا تیار کرواتی رہی۔ صبح کے وقت ایک گائے، دو بھیڑیں اور پانچ بکریاں ذبح کی جاتیں اور نماز فجر کے بعد پانچ بکریوں کے گوشت سے آش تیار کی جاتی۔ ہمایوں بادشاہ اپنی والدہ کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ماہ شعبان $\frac{۹۴۰}{۱۵۳۳}$ھ میں ماہم بیگم کو پیٹ کی کوئی بیماری لاحق ہوئی۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور وہ اسی مہینے کی ۱۳ تاریخ کو فوت ہو گئی۔

(ہمایوں نامہ۔ مشاہیر نسواں وغیرہ)

گلبدن بیگم

ظہیرالدین محمّد بابر بادشاہ کی بیٹی، نصیرالدین محمّد ہمایوں بادشاہ کی عَلّاتی بہن اور جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی پھوپھی تھی۔ والدہ کا نام صالحہ سلطان تھا لیکن وہ تاریخ میں دلدار بیگم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام اسے غالباً بابر (شوہر) نے دیا تھا۔ دلدار بیگم سمرقند کے حکمران سلطان محمود کی بیٹی تھی۔

گلبدن بیگم ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء میں کابل میں پیدا ہوئی۔ اس وقت بابر کو مصائب کے طوفان سے گزر کر کابل پر قبضہ کیے ہوئے انیس برس ہو چکے تھے اس دوران میں اس نے قندوز، بدخشاں، باجوڑ، سوات اور قندھار بھی فتح کر لیے تھے اور وہ فرغانہ کی چھوٹی سی ریاست کا والی ہونے کے بجائے ایک وسیع سلطنت کا بادشاہ بن چکا تھا۔

گلبدن بیگم دو سال کی ہوئی تو بابر کی بڑی بیگم "ماہم بیگم" نے اس کو اس کی حقیقی والدہ دلدار بیگم سے مانگ لیا اور نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ اس کی پرورش کی۔ گلبدن بیگم طبعاً بڑی ذہین اور روشن دماغ تھی۔ پھر اس کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ اس نے ترکی اور فارسی زبانوں کی ایک بلند پایہ ادیبہ اور نغز گو شاعرہ کا مقام حاصل کر لیا۔

گلبدن بیگم تقریباً تین برس کی تھی کہ بابر ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء اپنے اہل و عیال کو کابل میں چھوڑ کر ہندوستان کی تسخیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسی سال اس نے ابراہیم لودی اور رانا سانگا کو دو خونریز لڑائیوں میں شکست دے کر شمال مغربی ہندوستان پر پورا تسلط جما لیا۔ اس کے ایک سال بعد بابر نے ماہم بیگم کو کابل سے بُلا بھیجا تنھی گلبدن بیگم بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ آگرہ میں والد کی خدمت میں حاضر ہوئی تو

اس نے اپنی بچی کو سینے سے لگالیا اور خوب پیار کیا۔ چند دن بعد بابر کے دوسرے خاندان والے بھی کابل سے ہندوستان آگئے اور شاہی محلات میں خوب رونق ہوگئی۔ تقریباً پانچ برس گلبدن بیگم نے اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں بہت مزے سے گزارے۔ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں بابر نے وفات پائی، تو وہ آٹھ برس کی تھی۔ شعبان ۹۴۰ھ ۱۵۳۳ء میں ماہم بیگم بھی فوت ہوگئی تو وہ اپنی حقیقی والدہ دلدار بیگم کے پاس آگئی۔ ہمایوں بادشاہ نے اپنے تمام اہلِ خاندان کی نہایت مشفقانہ سرپرستی کی۔ گلبدن بیگم اور دوسری بہنوں سے تو وہ بے حد محبت کرتا تھا اور ان کی دلجوئی کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ گلبدن بیگم عمر بھر ہمایوں کی خیر اندیش اور جاں نثار رہی۔

گلبدن بیگم کی عمر سولہ سترہ برس کی ہوئی تو اس کی شادی چغتائی خاندان کے ایک معزز نوجوان خضر خواجہ خاں سے ہوگئی۔ خضر خواجہ خاں کے والد کا نام امین خواجہ تھا اور اس کا جدِ امجد چغتائیوں کا ایک نامور سردار یونس خاں تھا۔

جس زمانے میں ہمایوں اور شیر شاہ سوری میں معرکہ آرائیاں ہورہی تھیں اور شیر شاہ کا پلّہ بھاری نظر آرہا تھا کامران میرزا بارہ ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر لاہور چلا گیا۔ وہ بڑا اصرار کرکے گلبدن بیگم کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ جلد ہی ہمایوں بھی شیر شاہ سے شکست کھاکر لاہور پہنچ گیا۔ یہاں آئے ہوئے اسے چار پانچ ماہ ہی گزرے تھے کہ شیر شاہ سوری یلغار کرتا ہوا لاہور کے قریب آپہنچا۔ ہمایوں اور اس کے بھائیوں کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ شیر شاہ کا مقابلہ کرسکیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اہل و عیال اور بچے کھچے لشکر سمیت لاہور خالی کردیا، اور شمال کا رُخ کیا۔ جہلم سے کسی قدر مغرب کی طرف ہٹ کر جو سڑک خوشاب کو جاتی ہے وہ کوہستانِ نمک کی ایک بیرونی وادی سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہے، جہاں سے کابل اور سندھ کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ ہمایوں چاہتا تھا کہ کابل چلا جائے لیکن کامران میرزا نے اس کی زبردست مخالفت کی کیونکہ وہ خود کابل پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ اس کے پاس زیادہ فوج تھی اس لیے ہمایوں نے

مجبوراً سندھ جانے والا راستہ اختیار کیا اور کامران اپنی فوج کے ساتھ کابل روانہ ہوگیا۔ شاہی خاندان کی زیادہ تر خواتین بھی اس کے ساتھ ہولیں۔ ان میں گلبدن بیگم بھی تھی۔ چنانچہ وہ ۹۴۷ھ/۱۵۴۱ء سے ۹۵۱ھ/۱۵۴۵ء تک برابر کابل میں کامران کے پاس رہی، اسی دوران میں اس کی والدہ بھی اس کے پاس کابل پہنچ گئی تھی کابل میں اس کی اور بھی بہت سی رشتہ دار خواتین موجود تھیں۔ حمیدہ بیگم نے ہمایوں کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور اس کے ساتھ ہولی۔ وہ سندھ کے راستے بے پناہ مصائب جھیلتے ہوئے ایران پہنچ گئے اگرچہ انہیں قدم قدم پر سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اللہ نے ایک خوشی بھی ان کو نصیب کی وہ یہ کہ امرکوٹ (سندھ) کے مقام پر حمیدہ بیگم کے بطن سے اکبر پیدا ہوا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس سفر میں گلبدن بیگم بھی ہمایوں کے ساتھ تھی۔ انہی روایات پر بھروسا کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے ایک مقالے "ہمایوں نامہ گلبدن بیگم" میں لکھا ہے کہ :-

"ہمایوں جب ایران گیا تو حمیدہ بیگم (اکبر کی ماں) بھی ساتھ تھی اور محافہ میں سفر کرتی تھی لیکن ہمایوں کی بہن ہمیشہ گھوڑے پر سوار بادشاہ کے عقب میں چلتی تھی۔"

لیکن جدید تحقیق کے مطابق یہ صحیح نہیں ہے گلبدن بیگم ہمایوں کے ہمراہ ایران نہیں گئی بلکہ کابل ہی میں مقیم رہی۔ اس دوران میں گلبدن بیگم کا شوہر خضر خواجہ خاں کہاں رہا، اس کے بارے میں کسی مؤرخ نے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا البتہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ عسکری میرزا کے پاس قندھار میں تھا۔ ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی (۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء تا ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء) نے ہمایوں کی خاطر خواہ پذیرائی کی اور اس کی ہر ممکن مدد کی۔ کچھ مدت ایران میں قیام کے بعد ہمایوں قندھار پہنچا جس پر عسکری میرزا کا قبضہ تھا۔ عسکری میرزا کچھ عرصہ محصور رہ کر مزاحمت کرتا رہا لیکن بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہمایوں سے معافی کا خواستگار

ہوا۔ ہمایوں نے اُسے معاف کردیا اور قندھار شاہِ ایران کے بیٹے کے سپرد کردیا۔ وہ چند دن بعد فوت ہو گیا تو ہمایوں نے قندھار بیرم خان کے حوالے کردیا اور خود فوج لے کر کابل کو جا گھیرا۔ میرزا کامران تاب مقاومت نہ لاسکا اور کابل سے سندھ کی طرف فرار ہو گیا۔ ہمایوں کابل میں داخل ہوا تو گلبدن بیگم اپنی والدہ دلدار بیگم اور بہن گل چہرہ بیگم کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوئی پانچ سال کے بچھڑے ہوئے بہن بھائی بکمال مسرت ایک دوسرے سے ملے۔ اس کے بعد بھی گیارہ بارہ برس تک گلبدن بیگم کا قیام کابل میں رہا یہاں تک کہ ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان فتح کر کے کچھ عرصہ بعد وفات پائی اور اکبر تخت نشین ہوا (سنہ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء)۔

اکبر نے اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال سنہ ۹۶۴ھ / ۱۵۵۷ء میں خاندانِ شاہی کی خواتین کو کابل سے ہندوستان بُلا بھیجا۔ چنانچہ اس کی والدہ حمیدہ بیگم، پھوپھیاں، گلبدن بیگم اور گل چہرہ بیگم بہت سی دوسری خواتین کے ساتھ ہندوستان پہنچ گئیں اکبر ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ گلبدن بیگم کا شوہر خضر خواجہ خاں ہمایوں کے ساتھ پہلے ہی ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ سنہ ۹۷۰ھ / ۱۵۶۳ء میں اکبر زخمی ہوا تو خضر خواجہ خاں نے اس کی مرہم پٹی میں بڑی مدد کی اس کے بعد اسے امیر الامراء بننے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔

گلبدن بیگم کے بطن سے خضر خواجہ خاں کی جو اولاد ہوئی اس میں سے صرف ایک بیٹے سعادت یار اور ایک بیٹی کا ذکر مؤرخین نے صراحت کے ساتھ کیا ہے۔

سنہ ۹۸۳ھ / ۱۵۷۵ء میں گلبدن بیگم شاہی خاندان کی بہت سی خواتین کے ساتھ فتح پور سیکری سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئی۔ ان خواتین میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:——

سلیمہ سلطان بیگم (اکبر کی بیوی) سلطانم بیگم (بیوہ عسکری میرزا) حاجی بیگم و گلعذار بیگم (دختران کامران میرزا) اُمِ کلثوم (گلبدن بیگم کی پوتی) سلیمہ خانم (گلبدن کی بیٹی) گلنار آغاچہ (گلبدن کی سہیلی) سرو قد (بیوہ منعم خاں) صفیہ اور شمیم آغا (ہمایوں کی کنیزیں)۔ اس کاروانِ حج کا امیر گلبدن بیگم کا ایک محرم سلطان خواجہ تھا اور اس کی

نگرانی محمد باقی خاں کوکا اور رومی خاں الیپو کے سپرد تھی۔ یہ کاروان سورت پہنچ کر بعض مشکلات کی وجہ سے ایک سال تک رکا رہا۔ پھر بحری جہازوں پر سوار ہو کر بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ حجازِ مقدس میں گلبدن بیگم کا قیام ساڑھے تین سال رہا۔ اس دوران میں اس نے چار حج کیے اور مدینہ منورہ جا کر روضۂ نبوی کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا۔ سنہ ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء میں حجازِ مقدس سے واپسی کا آغاز ہوا۔ اب کی بار خواجہ یحییٰ امیرِ حج تھا جسے اکبر نے حکم دیا تھا کہ خواتین کو واپس لائے۔ بدقسمتی سے یہ کاروان جس جہاز میں سفر کر رہا تھا وہ عدن کے قریب ایک چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا، تاہم اللہ نے فضل کیا کہ مسافروں کی جانیں بچ گئیں۔ اس حادثہ کی وجہ سے گلبدن بیگم اور دوسری خواتین کو عدن میں تقریباً ڈیڑھ سال ٹھہرنا پڑا مگر عدن کے ترک گورنر نے ان خواتین کے ساتھ ان کے شایانِ شان سلوک نہ کیا۔ جب ترکی کے فرمانروا سلطان مراد ثالث کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے گورنر کو سخت سزا دی۔ آخر تھکا دینے والے انتظار کے بعد مصیبت زدہ خواتین کو جہاز مل گئے اور وہ ان پر سوار ہو کر سورت پہنچیں۔ وہاں سے سنہ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں فتحپور سیکری پہنچ گئیں۔ کچھ عرصہ بعد اکبر بادشاہ نے پھوپھی (گلبدن بیگم) سے درخواست کی کہ بابر بادشاہ اور ہمایوں بادشاہ کے بارے میں اسے جو کچھ معلوم ہے اس کو ضبطِ تحریر میں لائے۔ چنانچہ گلبدن بیگم نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ہمایوں نامہ" تالیف کی۔ تقریباً تین صدیوں تک یہ کتاب پردۂ خفا میں رہی۔ آخر یورپ کی ایک علم دوست خاتون " مسز اے بیورج " (MRS. A. BEVERIDGE) نے اسے بیسیوں کتب خانے کھنگال کر ڈھونڈ نکالا اور نہ صرف اس کو زیورِ طباعت سے آراستہ کیا بلکہ بقول علامہ شبلیؒ حسبِ ذیل باتوں کا اضافہ کیا۔

(۱) گلبدن بیگم کی نہایت مفصل سوانح عمری لکھی۔

(۲) کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا

(۳) ترکی الفاظ نہایت کثرت سے تھے ان کی تحقیق کی اور ان کو حل کیا۔

(۴) کتاب میں سینکڑوں شاہی خاندان کی بیگمات کے نام آ گئے تھے ان سب کے حالات لکھے۔

(۵) جس قدر نام کتاب میں آئے ہیں ان کی مفصل فہرست شامل کی۔

یہ کتاب ۱۹۰۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

فی الحقیقت "ہمایوں نامہ" گلبدن بیگم کے کمالِ انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں اُس نے اپنے عہد کی معاشرت اور زندگی کا حال ایسے البیلے انداز میں لکھا ہے کہ من وعن اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اُس دور کی خواتین (یعنی آج سے چار پانچ سو سال پہلے کی خواتین) کی تہذیب و معاشرت کے جو حالات اس کتاب سے معلوم ہوتے ہیں ان میں سے بعض قابلِ ذکر ہیں مثلاً یہ کہ عورتیں پردے کی سخت پابند تھیں۔ نامحرم کے سامنے ہونا بہت معیوب سمجھتی تھیں۔ نقاب یا برقع کے بغیر باہر نہ نکلتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ فنونِ سپہ گری سے واقف ہوتی تھیں؛ گھوڑے کی سواری کرتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر مردانہ لباس بھی پہن لیتی تھیں۔ عورتوں کو اپنی شادی اور نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل تھی۔ نکاح سے پہلے ان کی رضامندی حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ خواتین کا بے حد احترام کیا جاتا تھا اور بڑے گھرانوں میں ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

گلبدن بیگم شعر وسخن کا نہایت عمدہ مذاق رکھتی تھی لیکن افسوس کہ اس کا سارا کلام سوائے ایک شعر کے امتدادِ زمانہ سے ضائع ہو گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

ہر پری روئے کہ او با عاشقِ خود یار نیست
تو یقیں می داں کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

گلبدن بیگم نے ۶ ذوالحجہ ۱۰۱۱ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۶۰۳ء کو آگرے میں وفات پائی۔ اس وقت قمری سالوں کے حساب سے اس کی عمر ۸۲ سال کی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس پر نزع کا عالم طاری ہوا تو اس کی تیمار دار بیبیوں نے بڑی محبت اور رقت بھری آواز میں پکارا "بیگم جیو بیگم جیو" گلبدن نے آنکھیں

کھولیں اور نہایت نحیف آواز میں کلمہ طیبہ پڑھا۔ پھر اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے (جو ایک مکمل مصرعہ ہیں) ع :

من نار بمردم عمرت بادا ارزانی

(یعنی میں تو اس دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں تم جُگ جُگ جیو)

اکبر کو پھوپھی کی وفات کی خبر ملی تو اس کو سخت صدمہ پہنچا۔ با چشم گریاں دور تک اس کے جنازے کو کندھا دیا۔ اس کی تدفین کے بعد وہ دیر تک قبر پہ کھڑا رہا اور پھر بصد حسرت دیاس محل کو مراجعت کی۔

(اختر تاباں۔ ہمایوں نامہ۔ مقالات شبلی! اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

عائشہ سُلطان خانم

ماوراء النہر کے سلطان محمد خان کی بیٹی اور چغتائی خاندان کی ایک نامور خاتون کا نام ہے۔ سنہ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء کے ایک معرکے میں وہ اور اس کے خاندان کی کچھ اور خواتین شیبانی خان (سنہ ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء تا سنہ ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء) کے ہاتھ گرفتار ہو گئیں۔ شیبانی خان نے عائشہ سلطان بیگم سے نکاح کر لیا۔ اس تعلق سے ان کے ایک بیٹا محمد رحیم سلطان پیدا ہوا۔

عائشہ سلطان بیگم بڑی عالمہ فاضلہ اور شائستہ خاتون تھی۔ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھی اور ترکی زبان میں بہت عمدہ شعر کہہ لیتی تھی۔

(مشاہیر نسواں۔ ہمایوں نامہ)

گُل چہرہ بیگم

ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کی بیٹی تھی۔ صالحہ سلطان کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے اس کا نام گل رخ بیگم لکھا ہے اور اس کے ذوقِ شعروادب کی بڑی تعریف کی ہے۔ علی حسن خان نے تو اپنی کتاب "صبح گلشن" میں "گل رُخ" کی مناسبت سے یہاں تک لکھا ہے کہ "گل رخ بیگم، گل رُخی، شگفتہ روئی اور سلیقۂ شاعری کے لحاظ سے زمرۂ نسواں میں امتیازی درجہ رکھتی تھی اور بہت ہی لطیف اشعار کہتی تھی!" لیکن ابوالقاسم محتشم نے اپنی کتاب "اختر تاباں" میں اس کا نام گل چہرہ بیگم لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ہمایوں نامہ (مصنفہ گلبدن بیگم) کے مطابق گل رُخ بیگم بابر کی ایک بیگم کا نام تھا جس کے بطن سے بابر کے پانچ بچے کامران میرزا، عسکری میرزا، شاہ رُخ میرزا، سلطان احمد میرزا، اور گل عذار بیگم پیدا ہوئے۔

گل چہرہ بیگم، ایک دوسری بیگم صالحہ سلطان کے بطن سے تھی یہ وہی صالحہ سلطان ہے جو تاریخ میں دلدار بیگم کے نام سے مشہور ہے۔ دلدار بیگم کے بطن سے بابر کے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ گلرنگ بیگم، گُل چہرہ بیگم، ہندال میرزا، گلبدن بیگم اور الور میرزا۔ الور میرزا کمسنی ہی میں فوت ہوگیا۔ گلرنگ کی شادی ایسن تیمور سلطان سے، گل چہرہ بیگم کی توختہ بوغا سلطان سے اور گلبدن بیگم کی خضر خواجہ خان سے ہوئی۔ اول الذکر دونوں بہنوں کی شادی بابر نے اپنی وفات سے چند دن پہلے کر دی تھی۔ گلبدن بیگم کی شادی عہدِ ہمایوں میں ہوئی۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد گل چہرہ بیگم کا شوہر توختہ بوغا سلطان اودھ میں اچانک فوت ہوگیا۔ اس وقت گل چہرہ بیگم بھی اس کے پاس اودھ میں تھی۔ ہمایوں بادشاہ نے یہ خبر سنی تو گل چہرہ بیگم

کو اپنے پاس آگرہ بلالیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گل چہرہ بیگم کا نکاح ثانی میرزا نورالدین محمد سے ہوا کیونکہ تاریخوں میں اس کو بابر کا داماد بتایا گیا ہے۔ نورالدین محمد سلطان حسین بالقرا والیٔ ایران شرقی کا پوتا تھا۔

بعض تذکرہ نگاروں نے اکبر بادشاہ کی بیگم سلیمہ سلطان بیگم مخفی کو میرزا نورالدین محمد اور گل رخ بیگم کی بیٹی بتایا ہے لیکن ہمارے خیال میں وہ میرزا نورالدین محمد اور گل چہرہ بیگم کی بیٹی تھی۔

علی حسن خان نے "صبح گلشن" میں جو اوصاف گل رُخ بیگم سے منسوب کیے ہیں وہ اوصاف گل چہرہ بیگم کے تھے۔ افسوس کہ اس "سرآمد زمرۂ نسواں" کا تمام کلام سوائے اس شعر کے ضائع ہو چکا ہے:

ہیچ گہ کہ آں شوخ گل رخسار بے اغیار نیست!
راست بود است آں کہ در عالم گل بے خار نیست

(مشاہیر نسواں، ہمایوں نامہ، ہمدرد صحت ڈائجسٹ" اگست ۱۹۷[illegible]ء)

(اختر بلبال، "معارف" لاہور جنوری ۱۹۸[illegible]ء)

ملکہ نور بانو

ترکی کے عثمانی فرمانروا سلطان مراد ثالث (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء تا ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء) کی والدہ تھی۔ نہایت نیک سیرت، دیندار اور مخیّر خاتون تھی۔ رفاہِ عامہ کے کام کر کے اس کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ ایسے کاموں پر بے دریغ روپیہ لٹاتی رہتی تھی قسطنطنیہ میں آج بھی اس کی یادگار ایک عظیم الشان جامع مسجد موجود ہے جو "اسکی والدہ جامع" کہلاتی ہے۔ ملکہ نے یہ مسجد ۹۸۲ سنہ ہجری/۱۵۷۴ء میں تعمیر کرائی تھی اور اس کے ساتھ ایک مدرسہ اور ایک شفاخانہ بھی ملحق کیا تھا۔ (مشاہیر نسواں)

حمیدہ (بانو) بیگم

نصیرالدین محمد ہمایوں بادشاہ (سنہ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء تا ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء) کی بیگم تھی۔

گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں کہیں اس کا نام حمیدہ بانو بیگم لکھا ہے اور کہیں حمیدہ بیگم۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ اسی کے بطن سے پیدا ہوا۔ حمیدہ بانو بیگم کے والد میر بابا دوست ہمایوں کے علاتی بھائی مرزا ہندال (پسر حقیقی دلدار بیگم) کے استاد تھے۔ ہمایوں اکثر اپنی سوتیلی ماں (دلدار بیگم) کے محل میں جایا کرتا تھا وہیں اس نے حمیدہ بانو بیگم کو دیکھا اور ارادہ کر لیا کہ اس سے شادی کرے گا۔ حمیدہ بانو بیگم بڑی باوقار اور باحیا خاتون تھی اور پردہ کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ ہمایوں نے اسے اتفاقاً ہی دیکھ لیا تھا ورنہ وہ کبھی کسی نامحرم کے سامنے نہ ہوتی تھی البتہ جب ہمایوں تخت شاہی پر بیٹھا تو دستور کے مطابق وہ دوسری خواتین کے ساتھ بادشاہ کے سلام کو گئی لیکن اس کے بعد جب ہمایوں نے اس کو دوبارہ بلا بھیجا تو اس نے اس بناء پر جانے سے انکار کر دیا کہ آداب سلطنت کے لحاظ سے میں ایک مرتبہ بادشاہ کے سلام کو جا چکی ہوں، دوبارہ جانا نامحرم کے سامنے جانا ہے اور یہ شریعت میں جائز نہیں۔ (اس وقت تک حمیدہ بانو بیگم کا نکاح ہمایوں سے نہیں ہوا تھا) اس موقع پر حمیدہ بانو بیگم نے جو الفاظ کہے، گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں انہیں اس طرح نقل کیا ہے:-

دیدنِ بادشاہاں یک مرتبہ جائز است۔ دو مرتبہ دیگر نامحرم است۔ من نمی آیم

(یعنی بادشاہوں کا دیکھنا ایک مرتبہ جائز ہے۔ دوسری مرتبہ ان کی حیثیت نامحرم کی ہے۔ میں نہیں آتی)

اس کے بعد جب ہمایوں نے حمیدہ بیگم سے شادی کرنی چاہی تو وہ راضی نہیں ہوتی تھی۔

ایک مہینہ سے زیادہ جھگڑا رہا۔ بالآخر بڑی مشکلوں سے راضی ہوئی۔ "ہمایوں نامہ" میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے :

"غرضکہ تا چہل روز از جہت حمیدہ بانو بیگم مبالغہ و مناقشہ بود۔ بیگم راضی نشدند۔ آخر حضرت والدہ ام (دلدار بیگم) نصیحت کردند کہ آخر خود بہ کسے خواہی رسید، بہتر از بادشاہ کہ خواہد بود؟

بیگم گفتند کہ آرے بہ کسے خواہم رسید کہ دست من بگریبان او برسد نہ آنکہ بہ کسے برسم کہ دستِ من میدانم بہ دامنِ او نرسد۔"

(یعنی چالیس دن تک حمیدہ بانو بیگم برابر اپنے انکار پر جمی رہی اور راضی نہ ہوئی آخر میری والدہ (دلدار بیگم) نے اسے نصیحت کی کہ آخر تو کسی کے پلّے بندھے گی بادشاہ سے بہتر کون ہے؟ حمیدہ بانو بیگم نے کہا کہ ہاں اس کے پلّے بندھوں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے نہ اس سے کہ میرا ہاتھ اس کے دامن تک بھی نہ پہنچے۔)

خیر آخر کار ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کی شادی ہو گئی اس کے بعد حمیدہ بانو بیگم نے آخری دم تک ہمایوں کے ساتھ حقِ وفاداری نبایا اور ہر مشکل اور مصیبت میں اس کا دل و جان سے ساتھ دیا۔ ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگا تو اس پُر صعوبت سفر میں حمیدہ بانو بیگم بھی اس کے ساتھ تھی بلکہ سفر کے تمام مصائب و آلام اس نے بڑی ہمت اور حوصلے سے برداشت کیے۔ اسی سفر کے دوران میں امر کوٹ (سندھ) کے مقام پر اس کے بطن سے اکبر پیدا ہُوا —— حمیدہ بانو بیگم بڑی خدا ترس اور پابندِ شریعت خاتون تھی۔ اس کو حجِ بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی اور وہ حاجی بیگم کے لقب سے مشہور ہو گئی۔ اس نے ملک عرب سے تین سو عرب لاکر ۹۶۹ھ (۱۵۶۱ء) میں ایک موضع آباد کیا جو اب تک عرب سرائے کے نام سے مشہور ہے اور دلّی سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حمیدہ بانو بیگم نے اپنے بیٹے اکبر بادشاہ کے عہد میں ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) میں وفات پائی۔ اس کو مریم مکانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ (ہمایوں نامہ۔ منتخب التواریخ۔ طبقاتِ اکبری)

ملکہ ماہ چوچک بیگم

نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیگم تھی۔ ہمایوں سے اس کی شادی سنہ ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء میں ہوئی۔ اس کے بطن سے ہمایوں کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ان میں سے محمد حکیم میرزا نے تاریخ میں خاصی شہرت پائی۔ محمد حکیم مرزا سے ہمایوں کو بہت محبت تھی۔ چنانچہ جب وہ سنہ ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں ہندوستان کی دوبارہ تسخیر کے لیے کابل سے روانہ ہوا تو تین سالہ محمد حکیم میرزا کو کابل کا گورنر اور منعم خاں خانخاناں کو اس کا سرپرست مقرر کیا۔ ہندوستان پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد ہمایوں زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا اور سنہ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ اکبر تخت نشین ہوا تو کابل کا سابق انتظام بحال رکھا۔ سنہ ۹۶۸ھ/۱۵۶۱ء میں منعم خان خانخاناں کو دربار اکبری میں طلب کیا گیا تو اس نے اپنی جگہ اپنے بیٹے غنی خان کو کابل میں چھوڑا۔ غنی خان بہت نالائق شخص تھا اور اس میں حکومت کرنے کی مطلق اہلیت نہ تھی چنانچہ ماہ چوچک بیگم نے اس کو کابل سے نکال باہر کیا اور خود اپنے نابالغ بیٹے محمد حکیم میرزا کی سرپرست بن گئی —— دو بااثر امیروں مقابل بیگ اور ابوالفتح بیگ نے پہلے تو اس کی مدد کی لیکن بعد میں اس کے خلاف ہو گئے۔ ماہ چوچک بیگم نے دونوں کو مروا ڈالا اور اطمینان سے حکومت کرنے لگی۔ اُدھر غنی خان ہندوستان پہنچا تو اکبر نے منعم خان خانخاناں کو کچھ فوج دے کر کابل کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ ماہ چوچک بیگم اپنی فوج لے کر اس کے مقابلے کے لیے نکلی اور جلال آباد کے مقام پر اس کو شکست دے کر ہندوستان کی طرف بھگا دیا۔

سنہ ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں لاہور کا ایک سابق گورنر شاہ ابوالمعالی ترمذی ایک دوسرے امیر احمد بیگ کے قتل میں ماخوذ ہونے اور اکبر بادشاہ کی عدول حکمی کرنے

کی بنا پر) ہندوستان سے بھاگ کر کابل پہنچا اور ماہ چوچک بیگم سے پناہ طلب کی۔
اس سلسلے میں اس نے ملکہ کو جو عرضی بھیجی اس کے آخر میں یہ شعر تھا ؎

ما بدیں در نہ پئے عزت وجاہ آمدہ ایم　　　از بدِ حادثہ اینجا بہ پناہ آمدہ ایم

ماہ چوچک بیگم نے اس کی عرضی کے جواب میں لکھ بھیجا :۔

کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

ابوالمعالی جب دربار میں حاضر ہوا تو ماہ چوچک بیگم نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اس کی نہایت عزت وتکریم کی یہاں تک کہ اپنی ایک بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا لیکن ابوالمعالی نہایت کمینہ اور نمک حرام نکلا۔ اس نے کابل پر قبضہ کرنے کی خاطر ماہ چوچک بیگم اور چند دوسرے امراء کو قتل کر دیا۔ جب کابل کے لوگوں نے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا تو اس نے بہت سے لوگوں کو مار ڈالا۔ محمد حکیم میرزا کہیں روپوش ہو گیا اور یہ ساری داستان سلیمان میرزا والیٔ بدخشاں کو لکھ بھیجی۔ سلیمان مرزا اور اس کی اہلیہ حرم بیگم فوراً بدخشاں سے ایک زبردست فوج لے کر کابل کی طرف بڑھے اور غوربند کے مقام پر ابوالمعالی کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ پھر اسے محمد حکیم میرزا کے حوالے کر دیا جس نے اس محسن کُش نمک حرام کو قتل کر دیا۔ چند دن کے بعد سلیمان میرزا اور حرم بیگم کابل کی حکومت محمد حکیم میرزا کے سپرد کر کے واپس بدخشاں چلے گئے۔

(ہمایوں نامہ۔ مشاہیر نسواں۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ)

چوچک بیگم

سندھ کے حکمران حسین شاہ ارغون[۱] (سنہ ۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء تا سنہ ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء) کی بیٹی اور مرزا کامران (پسر بابر و برادر ہمایوں بادشاہ) کی بیوی تھی۔ سنہ ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات کے بعد ہمایوں تخت و تاج کا مالک بنا مگر اس کا بھائی مرزا کامران اس کے خلاف بار بار شورشیں برپا کرتا رہا۔ تاریخ کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کامران کی سرکشی کا بڑا سبب "کابل پر قبضہ" تھا۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ کابل پر "بلا شرکتِ غیرے حکمرانی" کرے۔ اگر ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ہندوستان سے نکلنے پر مجبور نہ ہو جاتا تو شاید مرزا کامران کابل کا مستقل والی بنا دیا جاتا لیکن ہندوستان کو ہاتھ سے کھو دینے کے بعد کابل پر قبضہ ہمایوں کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب اس نے سنہ ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء میں کابل کی طرف پیشقدمی

---

[۱] حسین شاہ ارغون جو مرزا شاہ حسن کے نام سے بھی مشہور تھا، سندھ پر ۳۴ سال تک حکمران رہا۔ وہ سنہ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں قندھار میں پیدا ہوا جو اس کے والد شاہ بیگ کے زیرِ نگین تھا۔ سنہ ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء میں بابر نے قندھار پر قبضہ کیا تو شاہ بیگ سندھ آ گیا جہاں اس نے شال اور سبی کے ملحقہ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء میں حسین شاہ اپنے باپ سے ناراض ہو کر بابر کے پاس چلا گیا اور دو سال اس کی ملازمت میں رہا پھر باپ سے صلح کر کے واپس سندھ آ گیا۔ سنہ ۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء میں اس کے والد نے وفات پائی اور وہ بالائی سندھ کا حکمران بن گیا۔ جلد ہی اس نے جام فیروز کو شکست دے کر ٹھٹھہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ سنہ ۹۳۱ھ/۱۵۲۴ء میں وہ سورائی، ماؤ اور اُچ کے قلعوں کو فتح کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا لیکن سلطان حسین لنگاہ دوم والیٔ ملتان نے اس سے صلح کر لی۔ اب حسین شاہ ارغون نے قلعہ دراوڑ (سابق ریاست بہاولپور)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی تو مرزا کامران۔ جو اس وقت کابل کا حکمران تھا۔ کابل سے بھاگ کر سندھ آگیا اس وقت حسین شاہ ارغون سندھ کا حکمران تھا۔ مرزا کامران نے اس کو پیغام بھیجا کہ مجھے اپنا فرزند (داماد) بنالیں۔ حسین شاہ نے اس کا پیغام قبول کرلیا اور اسے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا اور قلعے میں مدفون ایک بہت بڑا خزانہ اس کے ہاتھ آگیا۔ اگلے سال اس نے ملتان کا محاصرہ کرلیا۔ اہلِ ملتان ایک سال تک مقابلے پر ڈٹے رہے لیکن آخرکار شدید قحط کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔ حسین شاہ نے شہر میں داخل ہوکر اسے خوب لوٹا اور پھر فتح کا پھریرا اڑاتا بھکر واپس چلا گیا۔ ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ چلا آیا اور حسین شاہ ارغون سے مدد مانگی لیکن اس نے بوجوہ اس کو مدد دینے سے پہلوتہی کی اس پر ہمایوں نے بھکر کے قلعے پر قبضہ کرلیا بعد میں ہمایوں اور حسین شاہ میں مفاہمت ہوگئی اور ہمایوں قلعۂ بھکر اپنے ایک عزیز یادگار ناصر کے سپرد کرکے ایران کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی حسین شاہ نے یادگار ناصر سے قلعۂ بھکر چھین لیا۔ حسین شاہ ارغون کی زندگی کے آخری پانچ سال بڑی تکلیف میں گزرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو کوئی ایسا مرض لاحق ہوگیا تھا کہ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر نہ بیٹھ سکتا تھا اور ہمیشہ کشتی کے ذریعے سفر کرتا تھا۔ کشتی کے ذریعے سفر کرنے کا سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بیماری میں دریا کی آب و ہوا سے افاقہ ہوجاتا تھا اس لیے وہ اکثر دریا ہی کے ماحول میں رہتا تھا اور اس کی کشتی ہر وقت دریا کی سطح پر تیرتی رہتی۔ آخر ۱۲ ربیع الاول ۹۶۲ھ/ ۴ فروری ۱۵۵۵ء کو وہ فالج کے حملے سے فوت ہوگیا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حسین شاہ ارغون بڑا عالم فاضل آدمی تھا۔ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتا تھا، اور کبھی کبھی سپاہی تخلص سے فارسی زبان میں شعر بھی کہا کرتا تھا۔ وہ علماء و مشائخ کا قدردان تھا اور بہت سے اربابِ علم کو باقاعدہ وظیفے دیا کرتا تھا۔ (ہمایوں نامہ۔ دائرہ معارف اسلامیہ)

ضلع دادو کے ایک قصبے پاٹ میں ٹھہرایا اور وہیں اپنی بیٹی چوچک بیگم کی شادی بڑی شان وشوکت کے ساتھ مرزا کامران سے کر دی۔ مرزا کامران تین ماہ تک پاٹ میں ٹھہرا پھر اس کے دل میں کابل پر حکمرانی کے شوق نے چٹکی لی اور وہ کچھ فوج جمع کرکے کابل کی طرف روانہ ہوا۔ حسین شاہ نے بھی ایک ہزار مسلح سپاہی اس کے ساتھ کر دیئے۔ مرزا کامران غزنی کو فتح کرتا ہوا کابل پہنچا۔ ہمایوں اس وقت بدخشاں میں تھا اس لیے مرزا کامران نے شہر پر آسانی سے قبضہ کر لیا۔ ہمایوں کو خبر ہوئی تو وہ فوراً کابل پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ سات مہینے تک جاری رہا۔ بالآخر مرزا کامران کابل سے بھاگ کر کولاب کی طرف چلا گیا اور کچھ عرصہ اپنے ہوا خواہوں کے ساتھ ادھر ادھر پھرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے ایک دن ہمایوں کی فوج پر شب خون مارا جو اس وقت کابل سے دور "تنگی ہا" میں خیمہ زن تھی۔ اس شب خون میں ہمایوں کا نہایت پیارا اور وفادار بھائی مرزا ہندال مارا گیا۔ ہمایوں کو اس کی موت سے سخت صدمہ پہنچا مگر کامران کو بھی کچھ حاصل نہ ہوا اور وہ بھاگ کر شیر شاہ سوری کے فرزند اور جانشین سلیم شاہ سوری کے پاس ہندوستان چلا گیا مگر جلد ہی اس کو سلیم شاہ سوری سے بھی خطرہ محسوس ہوا اس لیے وہاں سے بھاگ کر بھیرہ اور خوشاب جا پہنچا پھر اس علاقے کے ایک نامور سردار آدم گکھر سے پناہ کا خواستگار ہوا مگر اس نے اسے گرفتار کرکے ہمایوں کے پاس بھیج دیا۔ ہمایوں تو اس سے نرمی کا برتاؤ کرنا چاہتا تھا لیکن تمام عمائد اور امرا نے مشورہ دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ ہمایوں نے ان کے اصرار سے مجبور ہو کر حکم دیا کہ مرزا کامران کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی جائے تاکہ آئندہ وہ کوئی فتنہ برپا نہ کر سکے چنانچہ مرزا کامران کی آنکھوں میں نشتر لگا کر اسے اندھا کر دیا گیا۔ نابینا ہونے کے بعد مرزا کامران محتاجی اور بیکسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ مصیبت کے ان ایام میں چوچک بیگم نے اپنے اندھے خاوند کا پورا پورا ساتھ دیا اور ناز و نعم میں پلی ہوئی شہزادی نے اس کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کچھ عرصہ بعد مرزا کامران نے ہمایوں سے حج پر جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے ہاں کر لی تو وہ ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں براہ سندھ حج کے لیے روانہ ہوا۔ جب سندھ میں وارد ہوا تو اس کے خسر

حسین شاہ ارغون نے اسے شاہ بیلہ میں ٹھہرایا جو سکھر اور روہڑی کے درمیان دریا میں ایک پُرفضا مقام ہے پھر اس کے قیام کے لیے فتح باغ مخصوص کر دیا اور پرگنہ میرپور شورو کی تمام آمدنی اس کے مطبخ کے خرچ کے لیے دے دی۔ چوچک بیگم برابر اس کے ساتھ رہی۔ چونکہ مرزا کامران نے صدقِ دل سے حج پر جانے کا ارادہ کیا تھا اس لیے شاہ بیلہ میں چند دن قیام کے بعد وہ سفرِ حج کے لیے تیار ہو گیا چوچک بیگم نے والد سے کہا کہ وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ جائے گی۔ حسین شاہ نے اپنی پیاری بیٹی کو سمجھایا کہ مرزا کامران کا مستقبل اب ختم ہو چکا ہے تم اس کا خیال چھوڑ دو اور اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالو۔ یہیں میرے پاس رہو اور عیش و راحت کی زندگی گزارو۔ مگر وفا شعار شہزادی اپنے ارادے پر چٹان کی طرح قائم رہی اور اپنے اندھے خاوند کو بے یار و مددگار چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ وہ بار بار یہی کہتی تھی میں اپنے شوہر کو ایسی حالت میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں جبکہ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ میرے سہارے کا محتاج ہے۔ آخر وہ باپ کی مرضی کے خلاف مرزا کامران کے ساتھ کشتی میں بیٹھ گئی۔ حسین شاہ ارغون خود کشتی میں آیا اور بیٹی کو روکنا چاہا تو اس نے کہا، ابا جان جب میرے شوہر کے بادشاہ بننے کی امید تھی اور اس کی آنکھیں اچھی تھیں، آپ نے میری شادی اس سے کر دی اب جبکہ وہ مصیبت کا شکار ہو گیا ہے، آپ کہتے ہیں کہ میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا میری غیرت اس بے وفائی کی اجازت نہیں دیتی اور پھر دنیا آپ کو کیا کہے گی کہ بیٹی کو اپنے معذور اور بے سہارا شوہر سے بے وفائی کرنے پر مجبور کیا ——— میں تو اب اپنے خاوند ہی کے ساتھ جیوں گی اور اسی کے ساتھ مروں گی۔ یہ سُن کر حسین شاہ پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے بیٹی اور داماد کو "خدا تمہارا نگہبان ہو" کہہ کر رخصت کر دیا۔ دونوں میاں بیوی اپنے ایک وفادار ملازم چلیمہ بیگ کے ساتھ بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

مرزا کامران نے چار بار حج کی سعادت حاصل کی (چوچک بیگم بھی یقیناً اس کے ساتھ رہی ہو گی) ۱۱ ذی الحجہ ۹۶۴ھ / ۵ اکتوبر ۱۵۵۷ء کو اس نے مکہ معظمہ ہی میں وفات پائی۔ چوچک بیگم شوہر کی وفات کے بعد صرف سات ماہ زندہ

رہی۔ یہ سارا عرصہ اس نے مکہ معظمہ ہی میں گزارا اور پھر اسی مقدس سرزمین میں پیوندِ خاک ہو گئی۔ (ہمایوں نامہ۔ دائرہ معارفِ اسلامیہ)

حبّہ خاتون

حبّہ خاتون کا شمار دسویں صدی ہجری کے کشمیر کی نامور خواتین میں ہوتا ہے۔ وہ کشمیری زبان کی ایک بلندپایہ شاعرہ تھی۔ غزل جو شاعری کی قدیم ترین اور مقبول ترین صنف ہے کشمیری زبان کی شاعری میں اس کی بنیاد حبّہ خاتون نے رکھی۔ اس کا اصل نام زونی (یعنی چاند) تھا لیکن اس نے حبّہ خاتون کے نام سے شہرت پائی۔ وہ ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء میں کشمیر کے ایک غیر معروف گاؤں چندہار میں پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کمال درجے کے حسن و جمال، غیر معمولی ذہانت و فطانت اور ذوقِ شاعری سے نوازا تھا۔ بچپن ہی میں شعر موزوں کرنے لگی یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ایک قادر الکلام شاعرہ بن گئی۔ اس کی پہلی شادی ایک خشک مزاج دیہاتی نوجوان سے ہوئی۔ ساس بھی اس پر بہت سختیاں کرتی تھی۔ ایک دن وہ اپنے کھیت میں بیٹھی ساس کی زیادتیوں کے خلاف گیت گا رہی تھی کہ کشمیر کے بادشاہ یوسف شاہ چک کا ادھر سے گزر ہوا، وہ اس کے پُرسوز گیت اور حسن و جمال سے بہت متاثر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے زونی کو اس کے شوہر سے طلاق دلوا کر اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اب وہ ملکۂ کشمیر بن کر حبّہ خاتون کے نام سے مشہور ہو گئی۔ حرمِ شاہی میں اس کی شاعری نے خوب جلا پائی۔ اس نے کشمیری شاعری میں عربی فارسی عروض کو رائج کیا۔ چند سال کے بعد مغل حکومت نے یوسف شاہ چک کو گرفتار کر کے قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا۔ حبّہ خاتون اب تارک الدنیا ہو گئی۔ اس زمانے میں اس نے شوہر کے فراق میں بڑے دردناک گیت کہے۔ وہ یہ گیت گاتے ہوئے وادی میں دیوانہ وار گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ اسی حالت میں اس نے سری نگر کے قریب ایک گاؤں میں سنہ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں وفات پائی۔ (خواتینِ کشمیر)

حرم بیگم

دسویں صدی ہجری میں تیموری خاندان کی بڑی نامور خاتون ہوئی ہے۔ وہ امیر تیمورؒ (المتوفی ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء) کی پڑپوتی اور سلیمان مرزا والیٔ بدخشاں کی بیگم تھی۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد دوم ص ۹۸۶) میں سلیمان مرزا کو ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کا چچیرا بھائی بتایا گیا ہے لیکن ہمایوں نامہ (گلبدن بیگم) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رشتے میں بابر کا بھتیجا ہوتا تھا کیونکہ اس کا والد میرزا خان بابر کا خالہ زاد بھائی تھا۔ میرزا خان اپنے قبیلے کا سردار تھا اور کچھ عرصہ بدخشاں کا والی بھی رہا تھا۔ اس کی وفات کے وقت سلیمان مرزا کمسن تھا، بابر نے اس کی ماں کی خواہش پر اس کو معقول جاگیر اور باپ کی وراثت عطا کی اور اپنے فرزند ہمایوں کو بدخشاں کا والی مقرر کر دیا لیکن کچھ مدت بعد اس نے بدخشاں کی ولایت سلیمان مرزا کو سونپ دی۔ بابر کے بعد ہمایوں نے بھی اس کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا۔

حرم بیگم بڑی ذہین، طباع، دانا اور دلیر خاتون تھی۔ وہ اپنے شوہر کی بھی نہایت وفادار تھی۔ ایک دفعہ بابر کے فرزند میرزا کامران نے ایک مکار عورت کے بہکاوے میں آکر حرم بیگم کو ایک عشقیہ خط لکھ مارا۔ یہ خط اور ایک رو پاک (منہ صاف کرنے والا رومال) اس نے ایک عورت بیگی آغا کے ہاتھ حرم بیگم کو بھیجا۔ حرم بیگم نے اس سے کہا کہ یہ خط اور روپاک ابھی اپنے پاس ہی رکھو جب میرزا سلیمان باہر سے آئے تو اس وقت یہ دونوں چیزیں لے آنا۔ بیگی آغا بہت روئی اور بڑی لجاجت اور عاجزی سے حرم بیگم سے کہا کہ میرزا کامران نے یہ خط اور روپاک آپ کو بھیجا ہے اور وہ بہت دنوں سے آپ سے ملاقات کرنے کی آرزو رکھتا ہے لیکن آپ بے مروتی سے کام لے رہی ہیں۔ حرم بیگم نے اس کو بہت جھڑکا اور اسی وقت

میرزا سلیمان اور اپنے فرزند میرزا ابراہیم کو بلا بھیجا، وہ آئے تو اس نے خط اور رو پاک ان کے سامنے پھینک دیا اور کہا کہ میرزا کامران تمہیں بزدل اور بے غیرت سمجھتا ہے، تبھی اس نے یہ اس طرح کا خط مجھے لکھا ہے۔ میرزا کامران تمہارا بڑا بھائی ہے اور میں اس کی بیٹیوں کے برابر ہوں لیکن اسے یہ خط مجھے بھیجتے ہوئے شرم نہ آئی۔ اب یہ خط لو اور اس عورت (بیگی آغا) کو ایسی سزا دو کہ دوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہو اور کوئی کسی کے اہلِ خانہ پر بُری نظر نہ ڈالے۔

میرزا سلیمان اور میرزا ابراہیم نے اسی وقت بیگی آغا کی گردن اڑا دی اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس دن کے بعد وہ میرزا کامران کے دشمن بن گئے (اور ہمیشہ ہمایوں کے ہوا خواہ رہے) اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد ہمایوں نے کابل سے نکل کر دشتِ قبچاق میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا کہ میرزا کامران نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں زخمی ہو گیا اور دشتِ قبچاق سے پسپا ہو کر اندر آب چلا گیا۔ میرزا سلیمان، میرزا ابراہیم اور میرزا ہندال فوراً اس کے پاس پہنچ گئے۔ جب ہمایوں کے زخم ٹھیک ہو گئے تو وہ ان کو ساتھ لے کر کابل کی طرف بڑھا۔ میرزا کامران بھی اپنی فوج لے کر مقابلے کے لیے کابل سے نکلا۔ ہمایوں نے حرم بیگم کو پیغام بھیجا کہ بدخشاں کی فوج جتنی جلدی ممکن ہو میرے پاس بھیج دو۔ حرم بیگم نے یہ پیغام ملتے ہی فوج جمع کرنی شروع کر دی اور چند دن کے اندر اندر ہزاروں جنگجو جمع کر کے انہیں گھوڑوں پر سوار کر دیا۔ پھر وہ اس فوج کو اپنی نگرانی میں تِرہ تک لائی۔ خود تو وہاں رک گئی اور فوج کو ضروری ہدایتیں دے کر آگے روانہ کر دیا۔

یہ فوج ہمایوں کے پاس پہنچی تو اس کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اس نے چارکاران یا قرا باغ کے مقام پر میرزا کامران کو شکست دے کر "تنگی ہا" کی طرف بھگا دیا، اور کابل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مسز انیٹ بیوریج جنہوں نے "ہمایوں نامہ" کو انگریزی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا لکھتی ہیں کہ وہ حرم بیگم نے جو فوج بھیجی بہت ممکن ہے کہ وہ کمکی فوج ہو۔ یہ فوج جس لڑائی میں شریک ہوئی اسے معرکہ اشتر گرام

کہا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ حرم بیگم فوج پر بڑا اثر رکھتی تھی اور وہ بدخشاں کی سب سے طاقتور خاتون تھی۔"

ہمایوں کے نزدیک حرم بیگم کی بڑی قدر و منزلت تھی چنانچہ اس نے اپنی بیٹی بخشی بانو کی شادی حرم بیگم کے بیٹے ابراہیم میرزا سے کر دی اور اپنے بیٹے محمد حکیم میرزا کی شادی حرم بیگم کی چھوٹی بیٹی سے کر دی۔

سنہ ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں (بعہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ) حرم بیگم اور سلیمان مرزا کو محمد حکیم میرزا والی کابل کی طرف سے پیغام ملا کہ اس کے بہنوئی ابو المعالی نے اس کی والدہ ماہ چوچک بیگم (اکبر کی سوتیلی والدہ) کو قتل کر کے کابل پر قبضہ کر لیا ہے وہ فوراً اس کی مدد کو پہنچیں۔ حرم بیگم نے یہ پیغام ملتے ہی بدخشاں کی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور خود اس کی قیادت کرتی ہوئی کابل کی طرف لپکی۔ سلیمان میرزا بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ابو المعالی نے گوربند وادی میں بدخشانی فوج کا مقابلہ کیا مگر بری طرح شکست کھائی اور پکڑا گیا۔ حرم بیگم نے اسے محمد حکیم میرزا کے حوالے کر دیا۔ اس نے نمک حرام ابو المعالی کی گردن اڑا دی۔ حرم بیگم اور سلیمان میرزا نے کابل کی کچھ جاگیریں بدخشانیوں میں بانٹ دیں اور کابل کی حکومت محمد حکیم میرزا کے سپرد کر کے بدخشاں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کابلیوں نے کابل میں مقیم بدخشانیوں کو خوب مارا۔ حرم بیگم اور سلیمان میرزا کو خبر ہوئی تو وہ فوج لے کر پھر کابل پہنچے۔ محمد حکیم مرزا کابل سے بھاگ کر ہندوستان پہنچا اور اپنے بڑے بھائی اکبر بادشاہ سے مدد کی درخواست کی اس نے ایک مضبوط فوج محمد حکیم مرزا کے ساتھ کر دی۔ جب یہ فوج کابل کے قریب پہنچی تو حرم بیگم اور سلیمان میرزا کابل خالی کر کے بدخشاں چلے گئے۔ جب تک حرم بیگم زندہ رہی وہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر بڑے ٹھاٹھ سے بدخشاں پر حکومت کرتی رہی مگر جونہی سنہ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں اس نے وفات پائی بدخشاں سلیمان میرزا کے ہاتھ سے چھن گیا۔ چھیننے والا اس کا پوتا شاہ رخ تھا! اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس کو سلیمان میرزا کا نواسہ بتایا گیا ہے لیکن انیٹے نے "ہمایوں نامہ" کی تعلیقات میں اس کو سلیمان میرزا کا پوتا بتایا ہے جو اس کے بیٹے ابراہیم میرزا کی دوسری بیوی محترمہ خانم چغتائی کے بطن سے تھا۔

(ہمایوں نامہ۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

ماہم انگہ

ندیم خاں کوکا کی بیوی تھی جو ہمایوں بادشاہ کا ایک وفادار خادم تھا۔ تیموریوں میں یہ دستور تھا کہ بادشاہ کو بچپن میں (ماں کے علاوہ) جو بی بی دودھ پلاتی تھی وہ انگہ کہلاتی تھی اور اس کا شوہر اتکہ خان کا خطاب پاتا تھا۔ انگہ کا جو بچہ شہزادے کا دودھ شریک ہوتا تھا وہ شہزادے کا کوکا کہلاتا تھا۔ ماہم نے چونکہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کو اس کے بچپن میں دودھ پلایا تھا اس لیے وہ ماہم انگہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اگرچہ اکبر کو کچھ اور عورتوں نے بھی دودھ پلایا تھا اور وہ بھی اس کی انگہ کہلاتی تھیں لیکن جو عروج اور اثر و اقتدار ماہم انگہ کو نصیب ہوا وہ کسی دوسری انگہ کے حصے میں نہیں آیا۔ ماہم انگہ کا شوہر ندیم خاں اتکہ خان کے بجائے کوکا کہلاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ندیم خان کی والدہ نے ہمایوں بادشاہ کو دودھ پلایا تھا اور وہ ہمایوں کا دودھ شریک بھائی تھا! اس لیے ہمایوں اور اکبر کے عہد میں اس نے "کوکا" ہی کے لقب کو اپنے لیے بزرگی اور افتخار کا باعث سمجھا۔ اس کا بیٹا ادھم خان بھی، جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا، بادشاہ کا کوکا کہلاتا تھا۔

ہمایوں بادشاہ ماہم انگہ کی بے حد عزت کرتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اکبر سے بے انتہا پیار کرتی تھی اور ایک دفعہ تو اس نے اس کی خاطر جان کی بازی لگا دی تھی۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب اکبر کمسن تھا اور اپنے چچا کامران کے پاس کابل میں تھا۔ کامران نے چونکہ ہمایوں سے سرکشی اختیار کی تھی اس لیے ہمایوں نے کابل کا محاصرہ کرکے اس پر گولہ باری شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن کامران نے ننھے اکبر کو شہر پناہ پر کھڑا کر دیا (یا کسی ایسی جگہ کھڑا کر دیا جس طرف ہمایوں کے سپاہیوں کی گولیاں آ رہی تھیں) ماہم انگہ بھی اس زمانے میں کابل میں تھی اسے پتہ چلا تو

دوڑی گئی اور اکبر کو اپنی پشت کے پیچھے کر کے گولیوں کی بارش کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہمایوں کی نظر پڑی تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس طرف گولی نہ چلائی جائے اور نہ کوئی گولہ پھینکا جائے۔ اس طرح اکبر اور ماہم انگہ کی جان بچ گئی۔ اس دن کے بعد ہمایوں کی نظر میں ماہم انگہ کی عزت دوچند ہو گئی۔

سنہ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی وفات کے بعد اکبر چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ وہ بھی ماہم انگہ کو اپنی ماں کے برابر سمجھتا تھا اور اس کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ اس طرح ماہم انگہ کو شاہی دربار میں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور وہ سلطنت کی نہایت طاقتور خاتون سمجھی جاتی تھی۔ اس کے لڑکے ادھم خان سے بھی اکبر کو بہت لگاؤ تھا۔ اسی بنا پر وہ بہت منہ زور ہو گیا تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ سنہ ۹۶۹ھ / ۱۵۶۲ء میں اکبر نے ادھم خان کو مالوہ کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ اس نے مالوہ تو فتح کر لیا لیکن تمام مالِ غنیمت خود دبا کر بیٹھ گیا۔ اس پر اکبر ناراض ہو گیا اور اس کو سزا دینے کے لیے ایک زبردست لشکر کے ساتھ مالوہ کے دارالحکومت سارنگ پور پہنچ گیا۔ دوسرے دن ماہم انگہ بھی سارنگ پور پہنچ گئی اور ادھم خان سے تمام مالِ غنیمت لے کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ساتھ ہی بیٹے کو بھی دست بستہ اکبر کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اس پر اکبر کی ناراضی کسی حد تک دور ہو گئی اور وہ واپس چلا گیا تاہم اس نے ماہم انگہ اور ادھم خان کے اختیارات اور اثر و رسوخ کم کرنے کی ٹھان لی۔ اس سلسلے میں اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ شمس الدین محمد اتکہ کو خانِ اعظم کا خطاب دے کر وکیلِ مطلق کے منصب پر فائز کر دیا۔ شمس الدین محمد بھی ہمایوں کے جاں نثاروں میں سے تھا اور اس کی بیوی نے بھی اکبر کو دودھ پلایا تھا۔ بیرم خان کی بغاوت پر بھی اسی نے قابو پایا تھا۔ اس لیے اکبر کے نزدیک وہ بھی بہت معزز و محترم تھا۔ ماہم انگہ اور اس کا بیٹا ادھم خان شمس الدین محمد اتکہ سے پہلے ہی خار کھاتے تھے اور چاہتے تھے کہ منعم خان خانخاناں کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز کیا جائے۔ اب جو اکبر نے شمس الدین محمد کو ایک ایسے منصب پر فائز کر دیا جو وزیرِ اعظم کے عہدے کے برابر تھا

تو ادھم خان انگہ خان اعظم کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ ۱۲ رمضان المبارک ۹۶۹ھ (۱۵۶۱ء) کو منعم خان اور شہاب خان دیوانِ عام کے ایک مکان میں بیٹھے مہماتِ سلطنت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ شمس الدین محمد بھی وہاں موجود تھا اور قرآنِ حکیم کی تلاوت کر رہا تھا کہ یکا یک ادھم خان اپنے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں نمودار ہوا۔ اس کے ایک ملازم خوشم ازبک نے آگے بڑھ کر شمس الدین محمد کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ شمس الدین محمد بوڑھا آدمی تھا اور روزے سے تھا۔ وہ خنجر کھا کر محلِ شاہی کی طرف بھاگا۔ ادھم خان کے ایک دوسرے ملازم خدا بردی نے تلوار کا ایک ہاتھ مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ شمس الدین محمد کے گرتے ہی دیوانِ عام میں غل مچ گیا۔ ادھم خان بادشاہی حرم سرا کی طرف بھاگا لیکن دربان نے صورتِ حال کو بھانپ کر حرم سرا کا دروازہ مقفل کر دیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور اکبر حرم سرا کے بالاخانے میں آرام کر رہا تھا اس نے شور سنا تو کوٹھے کی دیوار سے سر نکال کر پوچھا، کیا بات ہے؟ ایک ملازم نے خانِ اعظم کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ اکبر گھبرا کر باہر چلا، ایک حرم نے اس کے ہاتھ میں تلوار تھما دی۔ باہر نکلتے ہی اس کا سامنا ادھم خان سے ہو گیا، کڑک کر کہا ”او بے ہودہ لڑکے میرے انگہ کو کیوں مار ڈالا؟“ ادھم خان نے بادشاہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کہا کہ تحقیق کیجئے اور غور فرمائیے میں نے آپ کے اور سلطنت کے بدخواہ کو سزا دی ہے۔ اکبر سخت مشتعل تھا، کچھ دیر ادھم خان سے ساتھ اس کی دھکم پیل ہوتی رہی پھر اس نے اپنی تلوار پھینک کر ادھم خان کی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ اس نے خود تلوار کھینچنی چاہی تو اکبر نے اس کے کلے پر اس زور کا مکا مارا کہ وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ اب بادشاہ نے جھنجلا کر ملازمینِ شاہی سے کہا: چہ تماشا میکنید، بربندید ایں دیوانہ را (تماشا کیا دیکھ رہے ہو باندھ لو اس دیوانے کو) انہوں نے فوراً مشکیں کس لیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو دولت خانہ کے کوٹھے پر سے نیچے پھینک دو۔ ایوان مذکور بارہ گز بلند تھا۔ ملازمین ماہم انگہ سے بھی ڈرتے تھے انہوں نے کوٹھے پر سے اس طرح پھینکا کہ پاؤں کے بل گرا اور بچ گیا۔

اکبر نے حکم دیا کہ دوبارہ پھینکو اور سر کے بل پھینکو۔ اب انہوں نے اس طرح پھینکا، تو ادھم خان کا سر پاش پاش ہو گیا اور وہ اسی وقت ختم ہو گیا۔ اتنے میں شمس الدین محمد اتکہ کا بڑا بیٹا یوسف خاں اور دوسرے اتکہ خیل مسلح ہو کر انتقام کے لیے نکلے۔ اکبر نے خانِ اعظم کے بڑے بھائی کو بلا کر ادھم خان کی لاش دکھائی اور کہا کہ ہم نے قصاص لے لیا ہے اب میں فساد کی اجازت نہیں دوں گا۔

ماہم انگہ ان دنوں کچھ بیمار تھی اس کو کسی نے خبر دی کہ ادھم خان کو بادشاہ کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا ہے، دوڑی گئی کہ بیٹے کو چھڑا لائے۔ بادشاہ نے اسے دیکھتے ہی کہا، "ادہم آتکہ مارا کشتہ، ماہم اورا کشتیم" (ادہم نے ہمارے آتکہ کو قتل کیا ہم نے بھی اسے قتل کر ڈالا) پھر اسے تسلی دی کہ جو ہونا تھا ہو گیا اب صبر کرو۔ ماہم انگہ کا رنگ فق ہو گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ـــ "خوب کردید کہ آئینِ انصاف ہمیں بود" (اچھا کیا کہ انصاف کا تقاضا یہی تھا۔) پھر گرتی پڑتی گھر پہنچی اور صدمے کے مارے چارپائی سے لگ گئی! ادہم خان کے قتل کے چالیسویں دن اس نے بھی پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ اٹھا تو اکبر نے بھی اس کو کندھا دیا۔ لاش دِلّی بھیج دی گئی جہاں ادہم خان کی قبر کے پہلو میں اسے دفن کیا گیا پھر اکبر کے حکم سے دونوں قبروں پر مقبرہ بنا دیا گیا۔

ماہم انگہ نے سنہ ۹۶۹ھ (۱۵۶۱) میں دِلّی کے پرانے قلعے کے متصل ایک عالیشان مدرسہ بنوایا تھا جس کا نام "خیر المنازل" تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کروائی تھی جس میں طلبہ کے قیام کے لیے بہت سے حجرے بھی تھے۔ مدرسے کی عمارت کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے اور بقیہ خراب ہو رہا ہے۔ مسجد البتہ باقی ہے۔ بڑے کے صدر دروازے پر یہ کتبہ نصب ہے:

بدورانِ جلال الدین محمد | کہ باشد اکبر شاہانِ عادل
چو ماہم بیگم عصمت پناہی | بنا کرد ایں بناء بہرِ افاضل
وے شد ساعیِ ایں بقعۂ خیر | شہاب الدین احمد خاں باذل
زہے خیریت ایں بقعۂ خیر | کہ شد تاریخِ او خیر المنازل

(دربارِ اکبری ۔ ہمایوں نامہ)

بی بی کاملہ بیگم

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے زمانے (سنہ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء تا ۱۰۱۳ھ / ۱۶۰۵ء) میں فارسی کی نامور شاعرہ گزری ہے۔ دہلی کی رہنے والی تھی۔ اس کا سالِ وفات تو تذکروں میں درج نہیں ہے البتہ اتنا پتہ ضرور ملتا ہے کہ وہ سنہ ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء تک حیات تھی کیونکہ اُس نے ابوالفیض فیضی کی وفات (سنہ ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء) پر یہ رباعی کہی تھی :-

فیضی! مخور ایں غم کہ دلت تنگی کرد
یا پائے امید عمر تو لنگی کرد
می خواست کہ مرغ روح جنید رُخ دوست
زیں واسطہ از قفس شب آہنگی کرد[1]

("ہمدرد صحت ڈائجسٹ" کراچی اگست سنہ ۱۹۷۰ء)

بی بی نہانی

اکبر بادشاہ کے عہد میں مشہور شاعرہ ہوئی ہے۔ آگرے میں رہتی تھی۔ اس کا بیٹا محمد جعفر احدی کشمیر میں امیر البحر تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے کہ :" ہرچند شاعروں نے اس کی غزلوں کے جواب میں غزلیں کہیں لیکن کوئی بھی اس کی برابری نہ کر سکا۔"

نہانی کا یہ شعر تذکروں میں محفوظ ہے :

روزِ غم شب دردِ بے آرام پیدا کردہ ام　　دردمندی ہا دریں ایام پیدا کردہ ام

(منتخب التواریخ)

---

[1] بعض تذکروں میں یہ رباعی سلطان سلیمہ بیگم مخفی سے منسوب کی گئی ہے۔

سلیمہ سلطان بیگم مخفیؔ

مرزا نور الدین محمد اور گل چہرہ کی بیٹی، ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کی نواسی اور ہمایوں بادشاہ کی بھانجی تھی۔ پہلے اس کی شادی کمسنی میں بیرم خان خانخاناں سے ہوئی۔ مقصد اس رشتہ کا بیرم خان کا اعزاز اور سلطنت سے رشتہ مضبوط کرنا تھا۔ اس کے قتل (۹۶۸ھ) کے چودہ سال بعد اس کا نکاح ثانی (۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء) میں جلال الدین محمد اکبر بادشاہ سے ہوا۔ نہایت خوش مزاج، شیریں کلام، حاضر جواب، نیک سیرت، باسلیقہ، علم دوست، صاحب تدبیر، دیندار اور فیاض خاتون تھی۔ مختلف علوم و فنون سے آگاہ ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق بھی رکھتی تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا تخلص مخفیؔ لکھا ہے اور بعض نے مخلص۔ تذکروں میں اب اس کے صرف تین شعر محفوظ رہ گئے ہیں ؎

کاکلت را گر ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام[1]
مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

ملک الشعراء فیضی کی وفات پر اس نے یہ رباعی کہی:

فیضی مخور ایں غم کہ دلت تنگی کرد ۔۔۔ یا پائے امید عمر لنگی کرد
می خواست کہ مرغ روح بیند رخ دوست ۔۔۔ زیں واسطہ از قفس شب آہنگی کرد[2]

سلیمہ سلطان بیگم نے ملکہ ہو کر اپنی داد و دہش سے رعایا کو خوب خوش کیا۔ وہ اپنی زندگی میں چار مرتبہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گئی اور حج بیت اللہ و زیارت روضۂ نبوی کی سعادت حاصل کی۔ اس کو مطالعۂ کتب کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ

---

[1] بعض تذکروں میں یہ مصرعہ اس طرح درج ہے ؎ کاکلت را من بمستی رشتۂ جاں گفتہ ام

[2] بعض تذکروں میں یہ شعر ایک اور شاعرہ کاملہ بیگم سے منسوب کئے گئے ہیں۔

اس نے "سنگھاسن بتیسی" کا فارسی ترجمہ "نامۂ خرد افروز" مطالعہ کے لیے شاہی کتب خانے سے طلب کیا معلوم ہوا کہ یہ کتاب گم ہو چکی ہے۔ اس پر ملا عبدالقادر بدایونی کو، جو ان دنوں چھٹی لے کر اپنے وطن گئے ہوئے تھے، طلب کر کے ان سے اصل مسودہ حاصل کیا گیا۔ بیگم نے اپنا ایک ذاتی کتب خانہ بھی بنایا تھا جس میں بہت عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔ اس کتب خانے کی بعض کتابیں آج بھی دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مل جاتی ہیں۔ انقلابِ زمانہ سے کتب خانہ محفوظ نہ رہا اور اس کی کتابیں غیروں کے ہتھے چڑھ گئیں۔

سلیمہ سلطان بیگم ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں گلبدن بیگم اور شاہی خاندان کی دوسری خواتین کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئی۔ اس قافلے کو ایک سال سورت میں ٹھہرنا پڑا پھر یہ قافلہ بحری جہاز پر سوار ہو کر حجازِ مقدس پہنچ گیا۔ حجازِ مقدس میں اس کا قیام ساڑھے تین برس رہا۔ اس دوران میں سلیمہ سلطان بیگم نے چار حج کیے اور روضۂ نبوی کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا۔ ۹۸۶ھ/۱۵۷۹ء میں یہ قافلہ ایک بحری جہاز کے ذریعے حجازِ مقدس سے عازمِ وطن ہوا۔ بدقسمتی سے یہ جہاز عدن کے قریب ایک چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ بارے اللہ نے فضل کیا اور تمام خواتین کی جانیں بچ گئیں البتہ انہیں کافی عرصہ عدن میں قیام کرنا پڑا اور وہ کہیں ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں واپس فتح پور سیکری پہنچیں۔

سلیمہ سلطان بیگم نے ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں وفات پائی۔ جہانگیر بادشاہ نے اپنی تزک میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "وہ (سلیمہ سلطان بیگم) جمیع اوصافِ حسنہ سے آراستہ تھیں۔ خواتین میں اس درجے کا ہنر اور قابلیت کم جمع ہوتی ہے۔ وہ نہایت عمدہ شعر کہتی تھیں اور مخفی تخلص کرتی تھیں۔"

وفات کے وقت سلیمہ سلطان بیگم کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔

(مشاہیرِ نسواں۔ دربارِ اکبری۔ تذکرۃ الخواتین)

چاند بی یا چاند سلطانہ

(چاند سلطان)

یہ شیر دل خاتون حسین نظام شاہ والیٔ احمد نگر (دکن) کی بیٹی تھی۔ ماں کا نام خونزہ ہمایوں تھا۔ والدین نے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور نہایت لائق اور قابل استادوں کو اس کی تعلیم پر مامور کیا۔ چنانچہ چند سال کے اندر شہزادی جملہ علوم و فنون میں ماہر ہو گئی۔ خود بادشاہ چاند بی بی کو سپہ گری، شہسواری، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی تعلیم دیا کرتا تھا اور ملکی نظم و نسق سے متعلق اُمور بھی سمجھاتا۔ جب وہ جوان ہوئی تو اس کے اوصافِ حمیدہ کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ اس کے علم و دانش اور لیاقت کا حال بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ (۹۶۵ھ / ۱۵۵۸ء تا ۹۸۷ھ / ۱۵۸۰ء) نے سنا تو اس نے حسین نظام شاہ کو چاند بی بی کے لیے پیغام بھیجا جسے اس نے منظور کر لیا اور چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے ہو گئی۔

بیجاپور (سسرال) پہنچ کر چاند بی بی نے اپنی سلیقہ شعاری اور حسنِ لیاقت سے سسرال والوں کے دل اپنی مٹھی میں کر لیے، ساتھ ہی اپنی رعایا اور زیردستوں سے ایسا اچھا برتاؤ کیا کہ سب اس کے گُن گانے لگے۔ ایک دفعہ علی عادل کو خبر ملی کہ دربار کے کچھ امیر اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور اس کی جان لینے کے درپے ہیں۔ اس نے ان امیروں کے نام معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اب وہ ہر وقت اپنی جان کے خوف سے متفکر رہنے لگا۔ چاند بی بی نے شوہر کی بدلی ہوئی حالت دیکھی تو اس نے بڑا اصرار کر کے بادشاہ سے اس کا سبب دریافت کیا جب اس نے

بتایا کہ مجھے قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے تو بہادر چاند بی بی نے شوہر کو تسلی دی اور کہا کہ میرے جیتے جی آپ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ آج سے رات کو میں آپ کی حفاظت کیا کروں گی آپ اطمینان سے سویا کیجیے۔

چنانچہ اس دن سے چاند بی بی بذاتِ خود شاہی خواب گاہ کی نگہبانی کرنے لگی۔ ایک رات کو یکایک کسی کے بالاخانے پر کودنے کی آواز آئی۔ وہ پہرے داروں کو آواز دینے یا شوہر کو جگانے کے بجائے تن تنہا تلوار سونت کر بالاخانے پر چڑھ گئی۔ وہاں دو نقاب پوش ہاتھوں میں برہنہ تلواریں لیے کھڑے تھے۔ وہ دونوں چاند بی بی پر جھپٹے مگر وہ پھرتی سے پیچھے ہٹی اور پینترا بدل کر تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ ایک تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا آگے بڑھا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ شور سن کر علی عادل شاہ بھی جاگ اٹھا اور دوڑتا ہوا اوپر آیا، اس نے یہ منظر دیکھا تو اپنی بہادر ملکہ کی تلوار چوم لی اور بولا :-

"چاند بیگم اگر تمام دنیا بھی میری دشمن ہو جائے تو تیرے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ڈر نہیں۔"

ایک مرتبہ وہ پالکی میں سوار میکہ (احمد نگر) سے سسرال (بیجاپور) آ رہی تھی۔ چند مسلح سپاہی بھی ساتھ تھے۔ راستے میں ایک ویران مقام پر ڈاکوؤں کے ایک بڑے جتھے نے اس چھوٹے سے قافلے پر حملہ کر دیا۔ محافظ سپاہیوں نے جی توڑ کر ان کا مقابلہ کیا لیکن سب ایک ایک کر کے مارے گئے اور ملکہ چاند بی بی اکیلی رہ گئی۔ وہ گھبرانے یا خوفزدہ ہونے کے بجائے تلوار سونت کر پالکی سے اتری اور ڈاکوؤں کا اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ بہت سے اس کی تلوار کا لقمہ بن گئے اور باقی بھاگ گئے۔

۹۸۷ھ (۱۵۸۰ء) میں علی عادل شاہ کی وفات پر اس کا نابالغ بھتیجا ابراہیم عادل شاہ اس کا جانشین ہوا اور ملکہ چاند سلطانہ شوہر کی وصیت کے مطابق اس کی سرپرست مقرر ہوئی۔ وہ کئی سال تک یہ فرض نہایت حسن و خوبی سے

انجام دیتی رہی لیکن پھر کچھ وزیروں امیروں نے اس کے خلاف سازشیں شروع کردیں۔ چاند بی بی تنگ آ کر احمد نگر چلی گئی۔ اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد سازشی وزیروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ابراہیم عادل شاہ نے ان کی نااتفاقی کا فائدہ اٹھا کر سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا اور چاند بی بی کو واپس بلا بھیجا۔ وہ بیجا نگر آ تو گئی لیکن اب اس کا دل مردہ ہو چکا تھا اور وہ سیاسی جھمیلوں سے الگ رہ کر پُرسکون زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

چاند بی بی کے والد حسین نظام شاہ نے سنہ ۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء میں وفات پائی تو مرتضیٰ نظام شاہ اپنی ماں خونزہ ہمایوں کی سرپرستی میں باپ کی جگہ مسندِ حکومت پر بیٹھا۔ چھ سال تک تو ماں کاروبارِ حکومت چلاتی رہی اس کے بعد وزیروں نے اقتدار اس سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ محض نام کا بادشاہ تھا اور دیوانہ کہلاتا تھا۔ سنہ ۹۹۶ھ / ۱۵۸۸ء میں اس کی وفات کے بعد میراں حسین، اسمٰعیل اور برہان شاہ (ثانی) یکے بعد دیگرے تختِ حکومت پر بیٹھے۔ مؤخرالذکر نے سنہ ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء سے سنہ ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء تک حکومت کی۔ اس کے عہدِ حکومت میں اکبر بادشاہ نے شہزادہ مراد اور خانخاناں کو تسخیرِ دکن کے لیے روانہ کیا۔ برہان شاہ نے ان کو اپنی مملکت کے ایک صوبے برار کی پیشکش کر دی لیکن ابھی یہ معاملہ پوری طرح طے نہیں ہوا تھا کہ برہان شاہ فوت ہو گیا اور سنہ ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء میں اس کی جگہ ابراہیم شاہ تخت نشین ہوا وہ جلد ہی باغی امراء کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اب منجھو خان وکیلِ سلطنت، آہنگ خان اور اخلاص خان تین سرکردہ امراء میں تخت نشینی کے لیے کشمکش شروع ہو گئی اور مملکت کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ چاند بی بی کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بیجاپور سے احمد نگر آ گئی۔ اس اثناء میں شہزادہ مراد اور خانخاناں یلغار کرتے ہوئے احمد نگر کے قریب آ پہنچے۔ چاند بی بی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر صورت میں اپنی آبائی حکومت کو بچائے گی۔ اس نے پہلے تو مخالف امراء کو قلعہ سے باہر نکال دیا اور باقی

کو حسن تدبیر سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر اس نے محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور سے امداد طلب کی اور قلعہ کے حفاظتی انتظامات کو مستحکم کر کے شہزادہ مراد کو خط لکھا کہ اگر آپ دوست کی حیثیت سے احمد نگر آنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے تشریف لائیے آپ ہمیں حد سے زیادہ مہمان نواز پائیں گے لیکن اگر آپ کا ارادہ احمد نگر پر بزورِ شمشیر قبضہ کرنے کا ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ احمد نگر کا بچہ بچہ اپنے وطن کی حرمت پر قربان ہو جائے گا اور اپنے جیتے جی کسی کو اپنی سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا۔

شہزادہ مراد نے اس تنبیہ کی کچھ پروانہ کی اور ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵ء کو اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ احمد نگر کی طرف بڑھا۔ چاند بی بی کی فوج نے اس کی ذاتی نگرانی میں مغل فوج پر اپنی توپوں سے ایسی شدید گولہ باری کی کہ حملہ آور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ دوسرے دن مراد نے خانخاناں اور دوسرے سرداران فوج سے مشورہ کرنے کے بعد چاروں طرف سے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں مغل فوج نے کئی بار بڑے جوش و خروش سے قلعے پر حملے کیے لیکن ہر بار منہ کی کھائی۔

اُدھر چاند بی بی کی درخواست پر ابراہیم عادل شاہ نے پچیس ہزار سوار اور قطب شاہ نے پانچ چھ ہزار سوار اور کچھ پیادے چاند بی بی کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ شہزادہ مراد کو اس لشکر کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ امدادی لشکر کے پہنچنے سے پہلے قلعہ پر ہر صورت میں قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ چنانچہ قلعہ کے برج تک پانچ سرنگیں کھودی گئیں اور ان میں بارود بھر دی گئی تاکہ اسے آگ لگا کر قلعہ کو اڑا دیا جائے۔ مگر چاند بی بی غافل نہیں بیٹھی تھی بلکہ دشمن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھ رہی تھی اسے ان بارودی سرنگوں کا علم ہوا تو راتوں رات سرنگوں میں پانی بھروانا شروع کر دیا۔ ابھی دو یا تین سرنگیں بیکار ہوئی تھیں

کہ شہزادہ مراد نے سرنگوں کو آگ لگانے کا حکم دیا۔ اس زور کا دھماکا ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹ گئے اور قلعے کی دیوار میں پچاس گز چوڑا شگاف پڑ گیا۔ قلعے میں محصور سپاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن بہادر چاند بی بی ذرا نہ گھبرائی اور گھوڑے پر سوار ہاتھ میں تلوار علم کیے سراپردہ سے باہر نکل آئی اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ توپوں کو گھسیٹ کر شگاف میں کھڑی کر دو۔ فوج نے اسی کے مطابق عمل کیا اور پھر مغل فوج پر بے پناہ گولہ باری شروع کر دی۔ حملہ آور فوج نے آگے بڑھنے کی سرتوڑ کوشش کی اور بار بار قلعے پر خوفناک حملے کیے لیکن چاند بی بی نے اسے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ وہ اس ہمت اور استقلال سے اپنی فوج کو لڑاتی رہی کہ شام تک قلعہ کی خندق حملہ آور سپاہیوں کی لاشوں سے پٹ گئی اور شہزادہ مراد کو مایوس ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

(کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر چاند بی بی کی فوج کے پاس سیسہ کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ اس نے فوراً تانبے کی گولیاں ڈھالنے کا حکم دیا۔ جب وہ بھی ختم ہو گئیں تو سونے چاندی کی گولیاں تیار کرائیں اور اس مقصد کے لیے شاہی حرم سرا کے طلائی و نقرئی برتن، زیورات اور ہزاروں طلائی اور نقرئی روپے فوج کے حوالے کر دیئے لیکن شکست قبول نہ کی۔)

رات کو چاند بی بی نے اپنی نگرانی میں گری ہوئی دیوار کو دوبارہ بنوا دیا بلکہ اس کو پہلے سے تین گز بلند کر دیا۔ صبح کو شہزادہ مراد نے دیکھا تو شگاف کی جگہ پہلے سے بھی بلند دیوار اس کے راستے میں حائل تھی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ اس موقع کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موافق اور مخالف دونوں کے منہ سے چاند خاتون کی اس اولوالعزمی، استقلال اور بہادری پر صدائے تحسین بلند ہو گئی اور اسی وقت سے چاند خاتون کا لقب چاند سلطان ہو گیا۔ اس ناکامیابی سے شہزادہ مراد

کا دل چھوٹ گیا۔ امرائے اکبری میں مقابلہ کی قوت نہ رہی۔ ناچار صلح کرنی چاہی۔ اول تو چاند سلطان نے انکار کیا کہ غنیم بے دل ہو چکے ہیں، تھوڑی سی کوشش سے ان کو ہزیمت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ لوگ قلعہ بند رہ رہ کر گھبرا گئے تھے اس لیے چاند سلطان نے بھی آخر صلح منظور کرلی اور حسب قرار برار کا صوبہ شہزادہ مراد کے حوالے کر دیا۔" (خواتین اسلام کی بہادری)

شہزادہ مراد کی واپسی کے بعد چار سال تک احمد نگر کے لوگ امن چین سے زندگی بسر کرتے رہے لیکن پھر امراء میں خود غرضی اور نا اتفاقی نے سر ابھارا۔ اکبر اسی موقع کی تاک میں تھا اس نے ۱۰۰۸ھ / ۱۵۹۹ء میں شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں ایک جرار لشکر احمد نگر کی تسخیر کے لیے بھیج دیا۔

اب کی بار شاہی فوج کا پلہ بھاری تھا کیونکہ احمد نگر کی طاقت کو خانہ جنگیوں نے کمزور کر دیا تھا تاہم چاند سلطانہ اپنے جاں نثاروں کو لے کر مقابلہ کے لیے کمربستہ ہو گئی۔ اس نازک گھڑی میں چیتہ خان خواجہ سرا اور بعض دوسرے امیروں نے غداری کی۔ انہوں نے فوج کے سپاہیوں کو یہ کہہ کر ملکہ کے خلاف بھڑکا دیا کہ وہ تم سے دغا کر رہی ہے اور قلعہ کو دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ مشتعل سپاہی ان غدار امیروں کے ساتھ چاند سلطانہ کے کمرے میں گھس گئے اور اس کو قتل کر ڈالا۔ یوں اس بہادر خاتون کی زندگی کا افسوسناک طریقے سے خاتمہ ہو گیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ (نواب صدر یار جنگ) کے نام اپنے ایک خط (مورخہ اگست ۱۹۴۲ء) میں قلعۂ احمد نگر اور چاند بی بی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ

کی بہن[1] چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگارِ زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں ۔ ـــــ اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سِلوں سے اُتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کرلیا ہے ۔

بیفشاں جُرعہ بر خاک و حالِ اہلِ شوکت
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

(تاریخ فرشتہ ۔ مشاہیر نسواں
خواتینِ اسلام کی بہادری)

---

[1] چاند بی بی برہان نظام شاہ کی بہن نہیں بلکہ پوتی تھی ۔ مولانا کو یہ تسامح شاید اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے یہ خط قلعہ احمد نگر میں اپنی نظر بندی کے دوران میں لکھا تھا اور دکن کی تاریخ ان کے پاس نہیں تھی ۔

ملکہ پونجی (پونجی) خاتون

بیجاپور کے پہلے عادل شاہی فرمانروا یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء تا ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء) کی بیوی تھی۔ وہ بڑی بیدار مغز باہمت اور دور اندیش خاتون تھی۔ ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء میں یوسف عادل شاہ نے وفات پائی تو اس کا نابالغ بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت پر بیٹھا اور کمال خان دکنی نائب السلطنت مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد کمال خان کے دل میں خود بادشاہ بننے کی ہوس پیدا ہوئی اور اس نے اپنے نابالغ آقا کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کی والدہ ملکہ پونجی خاتون کو کمال خان کے منصوبے کا علم ہوا تو اس نے اُس کا منصوبہ ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا مگر مشکل یہ تھی کہ دربار و فوج کے بیشتر امراء کمال خان کے حامی تھے۔ اس نے اس صورت حال سے اسمٰعیل کی دایہ کے خاوند یوسف ترک کو آگاہ کیا تو وہ اپنے آقا کی خاطر جان قربان کرنے پر تیار ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ایک دن کمال خان کو قتل کر دیا اور خود بھی کمال خان کے حامیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ کمال خان کی بیوی نے اپنے لڑکے صفدر خان کو باپ کے خون کا بدلہ لینے پر ابھارا اور اس سے کہا کہ اسمٰعیل عادل شاہ اور پونجی خاتون کو قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کرو۔ صفدر خان نے فوراً فوج کو قلعے پر حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دیا۔ اُدھر قلعے میں پونجی خاتون کے پاس صرف چھ سو مغل دکنی اور حبشی سپاہی تھے۔ اس نے ان کو جمع کر کے کہا، اسمٰعیل ابھی بچہ ہے دشمن چاہتا ہے کہ اس کو قتل کر کے خود تاج و تخت پر قبضہ کرے تم میں سے جو ہمارے وفادار اور نمک حلال ہوں وہ قلعہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کریں اور جن کو اپنی جان پیاری ہے وہ قلعہ سے نکل جائیں۔ کفرانِ نعمت کرنے والوں کو ایک نہ ایک دن ضرور سزا ملے گی۔

پونچی خاتون کی تقریر سن کر تقریباً تین سو جانبازوں نے اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا باقی سب قلعہ سے نکل کر صفدر خان سے جا ملے۔ اب پونچی خاتون نے قلعے کے دروازے بند کر لیے اور اپنے جاں نثاروں کو محل کی چھت پر کھڑا کر دیا پھر وہ خود، دل شاد آغا (اسمٰعیل عادل کی پھوپھی) چند دوسری خواتین اور اسمٰعیل عادل شاہ کو ساتھ لے کر محل کی سب سے اونچی جگہ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ان خواتین نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا اور سب تیر و کمان سے لیس تھیں۔ اسی اثنا میں صفدر خان فوج گراں کے ساتھ قلعہ کے قریب پہنچ گیا اور اپنے سپاہیوں کو حملے کا حکم دیا۔ پونچی خاتون، دل شاد آغا اور ان کے جاں نثاروں نے حملہ آوروں پر تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی لیکن صفدر خان اپنا دباؤ برابر بڑھاتا جا رہا تھا۔ عین اسوقت عادل شاہی خاندان کا ایک قدیم نمک خوار مصطفیٰ آغا رومی پچاس توپچیوں کو لے کر پونچی خاتون کی مدد کو پہنچ گیا۔ بہادر خواتین نے اس کو دعائیں دیں اور رسے نیچے لٹکا کر اسے اور اس کے ساتھیوں کو اوپر کھینچ لیا۔ انہوں نے قلعے میں موجود توپوں سے حملہ آوروں پر گولے برسانے شروع کر دیئے۔ اب صفدر خان نے اپنی ماں کے مشورے سے جنگی تدبیر بدل دی اور بڑی توپیں لگا کر قلعے کی دیواریں گرانے کی فکر میں لگ گیا۔ یہ دیکھ کر ملکہ پونچی خاتون نے اپنے تمام سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سب ادھر ادھر چھپ جائیں۔ جب وہ لڑائی چھوڑ کر چھپ گئے تو عورتیں اپنے اصلی (زنانہ) لباس میں قلعے کی چھت پر کھڑی ہو گئیں۔ صفدر خان نے سمجھا کہ قلعہ کے لشکری پونچی خاتون کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور اب قلعے پر قبضہ کرنا معمولی بات ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو قلعے پر دوبارہ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کی فوج بڑے جوش سے آگے بڑھی اور قلعے کا ایک دروازہ توڑ ڈالا۔ پھر وہ دوسرے دروازے پر حملہ آور ہوئی۔ اس وقت پونچی خاتون نے اپنے جاں نثاروں کو اشارہ کیا۔ وہ اللہ اللہ کے نعرے لگاتے حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے، اوپر سے خواتین نے بھی ان پر تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ صفدر خان کی آنکھ میں ایک تیر لگا اور اس نے گھبرا کر

قلعہ کی دیوار کے نیچے پناہ لی۔ پونجی خاتون ملکار ملکار کر اپنے جاں نثاروں کا دل بڑھا رہی تھی۔ اس نے صفدر خان کو قلعہ کی دیوار کے نیچے دیکھا تو اپنے بیٹے اسمٰعیل عادل شاہ کو اس پر ایک بڑا پتھر پھینکنے کا اشارہ کیا، اس نے ماں کے حکم کی تعمیل کی۔ صفدر خان یہ پتھر لگتے ہی مر گیا۔ فوج نے اپنے سردار کو مرتے دیکھا تو وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس فتح کے بعد اسمٰعیل عادل شاہ بلا کھٹکے حکومت کرنے لگا۔ اس نے اپنے کوکہ یوسف ترک کا جنازہ نہایت تزک و احتشام سے اٹھوایا اور اس کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ بنوایا۔ پونجی خاتون نے صفدر خان کی والدہ کے ساتھ بڑا فراخدلانہ برتاؤ کیا اور اسے عزت و احترام کے ساتھ ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔

یہ پونجی خاتون کی شجاعت اور تدبیر و ہمت ہی کا نتیجہ تھا کہ یوسف عادل شاہ نے پچیس سال تک حکومت کی اور اس کے بعد بھی عادل شاہی خاندان بیجاپور پر ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک حکمران رہا۔ (تاریخ فرشتہ جلد دوم)

ملکہ آمنہ

برہان نظام شاہ (المتوفی ۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء ہجری) والی احمد نگر کی نہایت چہیتی بیوی تھی۔ یہ خاتون زیورِ عقل و کمال سے آراستہ تھی، اور اس کو رفاہِ عام کے کاموں سے بے حد شغف تھا۔ اس کے بطن سے دو شہزادے حسین نظام شاہ اور عبدالقادر پیدا ہوئے۔ اگرچہ بادشاہ کے حرم میں اور بیویاں بھی تھیں مگر اس کو سب سے زیادہ آمنہ کا اکرام اور احترام مدنظر رہتا تھا کیونکہ وہ اپنے اوصافِ حمیدہ کی بنا پر سب پر فوقیت رکھتی تھی۔ رفاہِ عام کے بے شمار کاموں کے علاوہ اس نے ۹۲۹ھ / ۱۵۲۳ء میں ایک قصبہ آباد کیا جو آج بھی آمنہ پور کے نام سے موجود ہے اور اس نیک ملکہ کی یاد دلاتا ہے۔

(تاریخ فرشتہ)

ملکہ صفیہ

سلطنتِ عثمانیہ کے فرمانروا سلطان مراد ثالث (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء تا ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء) کی بادشاہ بیگم تھی۔ بڑی بیدار مغز خاتون تھی اور اُمورِ سیاست میں کمال درجے کی مہارت رکھتی تھی۔ سلطان مراد ثالث اُمورِ سلطنت سے جس قدر غافل تھا، ملکہ صفیہ اسی قدر ہوشیار تھی اور ملکی نظم و نسق پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ اسی کی غیر معمولی لیاقت اور تدبر کی وجہ سے سلطان مراد نے بائیس برس تک اطمینان سے حکومت کی اور ملک میں عمومی طور پر امن و امان کا دور دورہ رہا۔ ملکہ صفیہ وینس کی رہنے والی تھی۔ اس نے اہلِ وینس کو ایسا رام کیا کہ انہوں نے اس کے عہد میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف کبھی کوئی ہنگامہ برپا نہ کیا۔ ملکہ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی بہت دلچسپی لیتی تھی اور ہمیشہ اہلِ ملک کو فائدہ پہنچانے میں کوشاں رہتی تھی۔ سلطان مراد ملکہ صفیہ کو بہت مانتا تھا اور اس نے اس کو بہت وسیع اختیارات دے رکھے تھے۔

سلطان مراد ثالث نے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں وفات پائی تو اس کا فرزند محمد ثالث تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں بھی ملکہ صفیہ کے اثر و رسوخ اور اقتدار کی وہی کیفیت رہی جو سلطان مراد کے عہد میں تھی۔

(سٹینلے لین پول)

بی بی صدقی

دسویں صدی ہجری میں ایک نامور ترک شاعرہ گزری ہے۔ بڑی عالمہ فاضلہ اور خدا پرست خاتون تھی۔ اس کا ایک دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان کے علاوہ اس نے دو طویل مثنویاں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان پر تصوف کا رنگ غالب ہے اور یہ بڑی حد تک عارفانہ کلام ہے۔ بی بی صدقی بڑی پاکباز خاتون تھی اس لیے اس کا کلام حسن و عشق کی رنگینیوں سے خالی ہے۔ اس نے مدت العمر شادی نہیں کی۔

(مشاہیر نسواں)

مہرماہ سلطان

سلطنتِ عثمانیہ کے دسویں فرمانروا سلطان سلیمان اوّل ذی شان[1] (۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء تا ۹۷۶ھ/۱۵۶۶ء) کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام مہرو ماہ بھی لکھا ہے۔ اس کی شادی وزیرِ اعظم رستم پاشا سے ہوئی۔ نہایت باحمیت، دیندار اور مخیّر خاتون تھی۔ اس نے اپنی بے شمار دولت دینی اوقاف کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان اوقاف میں سب سے اہم اس کی تعمیر کرائی ہوئی دو عظیم الشان مسجدیں تھیں۔ ایک شہر سقوطری یا اشقودرہ (SCUTARI) کے گھاٹ کے قریب اور دوسری استنبول (قسطنطنیہ) میں باب ادرنہ کے قریب۔ یہ مسجدیں اسی کے نام پر مشہور ہوئیں۔ اوّل الذکر مسجد اس دور

---

[1] سلطان سلیمان اوّل سلطنتِ عثمانیہ کا دسواں اور سب سے بڑا فرمانروا تھا۔ بعض مسلمان مؤرخین نے اس کو "سلیمانِ اعظم" لکھا ہے۔ ترک اسے سلطان سلیمان قانونی کہتے ہیں، اور مغربی مصنفین "سلیمان ذی شان" (Solyman the Magnificent) لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت نصف صدی پر محیط اس کی حکومت بحر و بر میں ترکوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ سلطان سلیمان نہایت دانشمند، جوانمرد، شجاع، فیاض اور باوقار حکمران تھا۔ وہ ملک کا نظم و نسق قائم رکھنے اور سلطنت کے انتظام کا آئین اور قواعد مرتب کرنے میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا اسی لیے اسے سلیمان قانونی کہا جاتا ہے۔

سلطان سلیمان بہت بڑا فاتح تھا اس نے بلگریڈ، رودس، ہنگری، جزیرہ نما کریمیا، موصل، بغداد، بصرہ، عدن، طرابلس اور الجزائر کے علاوہ شمالی افریقہ کے ایک بڑے علاقے کو اپنے زیرِ نگین کر لیا۔ صوبہ مصر کی حدود کو وسعت دے کر نوبیہ (سوڈان) تک پہنچا دیا اور آسٹریا کو خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے عہد میں ترکوں کی بحری قوت کو بھی بڑا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے نامور معمار سنان پاشا کے کمالِ فن کا شاہکار تھی جسے اس نے ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں
تعمیر کیا۔

رستم پاشا سے مہر ماہ سلطان کے دو بیٹے جہانگیر اور بایزید اور ایک بیٹی
عائشہ خانم تھی۔ بیٹوں کے ختنہ کی تقریب اس نے اس شان سے کی کہ وہ ایک

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

عروج نصیب ہوا۔ اور وہ سارے بحیرۂ روم، بحیرۂ قلزم، بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند پر چھا گئے
امیر البحر خیر الدین باربروسہ سلطان سلیمان ہی کی بحری فوج کا سالارِ اعظم تھا۔ اس نے
یورپ کی کئی حکومتوں کو بحری لڑائیوں میں شکست دی۔ اس زمانے میں ہسپانیہ (اسپین)
کو دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت سمجھا جاتا تھا، وینس کا ملک بھی بحری قوت کے
لحاظ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں پری ویسا کے مقام پر ہسپانیہ اور
وینس کے متحدہ جنگی بیڑے کا ترکوں کے جنگی بیڑے سے مقابلہ ہوا۔ پوپ نے بھی ہسپانیہ
کی مدد کے لیے جنگی جہاز بھیجے تھے لیکن امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے اس معرکے
میں دشمن کے متحدہ جنگی بیڑے کو ایسی کمر توڑ شکست دی کہ وہ مدتوں اپنے زخم
چاٹتا رہا۔

سلطان سلیمان کی شہرت و عظمت صرف اس کے جنگی کارناموں اور فتوحات
کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ اس نے اپنی وسیع سلطنت کا
انتظام ایسی خوش اسلوبی سے کیا کہ رعایا نہایت آسودہ اور خوشحال ہو گئی۔ اس
نے نظمِ حکومت کے جو قوانین بنائے ان کی بنا پر اس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے
قانون سازوں میں ہوتا ہے۔ ملا ابراہیم حلبی نے اس کے بنائے ہوئے قوانین
کو کتابی صورت دے دی تھی۔ ان قوانین پر عثمانی فرمانروا عرصہ تک عمل کرتے
رہے۔ سلطان سلیمان اعظم نے ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء میں وفات پائی۔

(تاریخِ اسلام۔ خلافتِ عثمانیہ)

تاریخی واقعہ بن گیا۔

بیٹی کی شادی وزیر اعظم احمد پاشا سے ہوئی۔ رستم پاشا نے سنہ ۹۶۸ھ ۱۵۶۱ء میں وفات پائی اس کے بعد مہر ماہ سلطان نے اپنے فاتح اعظم والد کو بڑے اصرار کے ساتھ جزیرہ مالٹا پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس مقصد کے لیے اس نے چار سو جنگی کشتیاں اپنے صرف سے تیار کرنے کی پیش کش کی اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے ثواب کی حقدار ہو جائے۔

مہر ماہ سلطان نے سنہ ۹۸۵ھ ۱۵۷۸ء میں وفات پائی۔ اس کو استنبول میں اپنے والد کے مقبرہ میں اس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

(مشاہیر نسواں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۲۱)

جانفدا قادین

سلطنتِ عثمانیہ کے بارھویں فرمانروا سلطان مراد ثالث (سنہ ۹۸۲ھ تا سنہ ۱۰۰۳ھ ۱۵۸۴ء تا ۱۵۹۴ء) کی ملکہ تھی۔ یہ خاتون بڑی دانشمند، مخیّر، انصاف پسند اور امورِ سیاست میں ماہر تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملکی نظم و نسق میں پورا پورا حصہ لیتی تھی اور سلطان اس کی رائے کو دوسرے عمائدِ حکومت کی رائے پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ رعایا کی بے حد خیرخواہ تھی اور اس پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بدقسمتی سے اس کا حقیقی بھائی بہت ظالم اور سفاک تھا۔ ملکہ نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ زیردستوں پر ظلم توڑنے سے باز آجائے لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس پر ملکہ نے اس کو قید کرادیا۔

ملکہ جانفدا قادین نے استنبول اور ترکی کے دوسرے شہروں میں بہت سی مسجدیں اور سبیلیں تعمیر کرائیں جن میں سے کچھ آج بھی موجود ہیں۔

(مشاہیر نسواں)

شہزادی فاطمہ خانم

ملکہ زبیدہؒ (م ۲۱۶ھ / ۸۳۱ء) کے حالات میں نہر زبیدہ کا ذکر آچکا ہے۔ ملکہ زبیدہؒ کے بعد آنے والے مسلمان حکمرانوں نے اس نہر کی دیکھ بھال جاری رکھی لیکن تقریباً سات سو سال بعد مکے کے تمام چشمے اور کنوئیں خشک ہو گئے۔ نہر زبیدہ بھی تھپیڑوں اور ریت سے پُر ہو گئی اور جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی۔ اس میں پانی بہت کم رہ گیا اور ایک بار پھر مکہ میں پانی کی قلت ہو گئی۔ ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء ہجری میں تو مکے کی حالت بالکل ویسی ہی ہو گئی جیسی نہر زبیدہ کے جاری ہونے سے پہلی تھی۔ ان حالات کی خبر ایک نیک دل ترک شہزادی فاطمہ خانم کو پہنچی تو وہ بے چین ہو گئی۔ فاطمہ خانم ترکی کے ایک عثمانی فرمانروا سلطان سلیم کی دختر نیک اختر تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ایسا انتظام کرے گی جس سے مکہ کے گھر گھر میں پانی پہنچ جائے اور حاجیوں کو بھی ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہے اس نے اپنے ایک معتمد ملازم ابراہیم بن تکرین کو پچاس ہزار اشرفیاں دے کر حکم دیا کہ مکہ معظمہ جا کر پہلے تو نہر زبیدہ کی صفائی اور مرمت کراؤ اور پھر اس کو "چاہِ زبیدہ" سے خاص مکہ معظمہ شہر تک پہنچانے کا انتظام کرو۔

ابراہیم بن تکرین نے مکہ معظمہ جا کر مصر شام اور یمن وغیرہ سے بڑے بڑے انجنیئروں اور کاریگروں کو جمع کیا اور انہیں سینکڑوں مزدور دے کر نہر کی صفائی پر لگا دیا۔ ان لوگوں نے سخت محنت کر کے نہر کو صاف کیا اور جہاں جہاں سے یہ ٹوٹ گئی تھی اس کی مرمت کی۔ اس کے بعد انہوں نے نہر کو چاہِ زبیدہ سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ آگے ایک بہت بڑی چٹان ہے جو دو ہزار فٹ دور تک چلی گئی ہے، اس کی موٹائی پچاس فٹ اور چوڑائی کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔

اس چٹان کو کاٹنا ناممکن نظر آتا تھا، اس لیے ابراہیم ہمت ہار بیٹھا اور فاطمہ خانم کو اطلاع دی کہ چٹان کی وجہ سے نہر کو چاہِ زبیدہ سے آگے بڑھانا ممکن نہیں۔ شہزادی بڑی باہمت خاتون تھی، اس نے ابراہیم کو ایک سخت فرمان بھیجا جس میں لکھا کہ اس چٹان کو ہر قیمت پر کاٹ کر نہر کو مکہ معظمہ تک پہنچاؤ۔ چنانچہ سینکڑوں مزدور بیسیوں انجنیئروں کی نگرانی میں اس چٹان کو کاٹنے کے کام میں جٹ گئے۔ اس زمانے میں نہ ڈائنامیٹ ایجاد ہوا تھا اور نہ ایسی بڑی بڑی مشینیں تھیں جن سے آج کل پہاڑ کاٹنے کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ پتھروں پر مسلسل آگ جلاتے رہتے تھے جب وہ کچھ نرم ہو جاتے تو انہیں تیز دھار آلوں سے کاٹتے تھے۔ دس سال تک وہ لگاتار اسی طرح محنت کرتے رہے اور شہزادی فاطمہ خانم ان کو دل کھول کر مزدوری دیتی رہی۔ آخر وہ مبارک دن آگیا جب ۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء) میں چٹان کی رکاوٹ دور ہو گئی اور نہر مکہ معظمہ تک پہنچ گئی۔ اس دن اہلِ مکہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے دعوتیں کیں اور غریبوں اور محتاجوں کو دل کھول کر خیرات دی۔ حکومت کی طرف سے بھی انجنیئروں اور مزدوروں کو نقد رقم اور قیمتی پارچات کی صورت میں انعامات دیئے گئے۔ اس نیک کام کی بدولت شہزادی فاطمہ خانم کو "ملکہ زبیدہ ثانی" کہا جاتا ہے۔ (ماہنامہ "الحسنات" رامپور)

شاہ سلطان

ترکی کے فرمانروا سلطان سلیم اوّل (۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء تا ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء) کی بیٹی اور لطفی پاشا کی اہلیہ تھی۔ بڑی باخدا نیکوکار اور مخیر خاتون تھی۔ اس نے ایک عظیم الشان جامع مسجد اور ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس خانقاہ کو بعد میں مدرسہ کی شکل دے دی گئی۔

(مشاہیر النساء)

گیارہویں صدی ہجری

۱۔ جاناں بیگم (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ، نیک سیرت)
۲۔ آنی فاطمہ (شاعرہ)
۳۔ ملکہ نور جہاں (عالمہ، ادیبہ، شاعرہ، مخیرہ، حسن صورت وسیرت میں یکتائے زمانہ)
۴۔ ملکہ ارجمند بانو ممتاز محل (سلیقہ شعار، دانا، باوفا)
۵۔ جہاں آرا بیگم (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ، مصنفہ خوش عقیدہ، مخیرہ)
۶۔ ملکہ ترکان خاتون (عالی حوصلہ، سخی، عبادت گزار)
۷۔ روشن آرا بیگم (عالمہ، فاضلہ، کاتبہ، مخیرہ، بیدار مغز)
۸۔ ملکہ اعز النساء بیگم (دیندار باخدا، مخیرہ)
۹۔ ستی النساء (عالمہ، فاضلہ، طبیبہ، قاریہ)
۱۰۔ ملکہ ام احمد (نیک سیرت، دیندار، مخیرہ)
۱۱۔ مائی لاڈو (دیندار باخدا)
۱۲۔ بی بی گلشن (شاعرہ)
۱۳۔ شہزادی نادرہ بیگم (باوفا بیوی، حسن صورت وسیرت میں یکتا)
۱۴۔ شہزادی زیب النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، حافظہ، شاعرہ، ادیبہ، معارف پرور سخی)
۱۵۔ شہزادی زینت النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ دیندار، سخی، معارف پرور)
۱۶۔ شہزادی بدر النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، حافظہ)
۱۷۔ شہزادی زبدۃ النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، دیندار، پابندِ شرع)
۱۸۔ حافظہ مریمؒ (حافظہ، عالمہ)
۱۸۔ ملکہ ماہ پیکر (دانشمند، عالی حوصلہ، مدبرہ)
۱۹۔ بی بی صاحب جی (حسن صورت و سیرت میں یکتا، ہوشمند سلیقہ شعار)
۲۰۔ بی بی جمال خاتونؒ (عارفہ)
۲۱۔ ملکہ شاد خانم (خطاطہ)

جاناں بیگم

عبدالرحیم خانخاناں[1] کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے بیٹے شہزادہ دانیال سے ہوئی تھی۔ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے آراستہ تھی۔ مکارمِ اخلاق اور لیاقتِ علمی کے اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتی تھی۔ دین سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے قرآنِ مجید کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی تھی۔ حجِ بیت اللہ

---

[1] عبدالرحیم خانخاناں بن بیرم خان خانخاناں عہدِ اکبری و جہانگیری کا مشہور امیر ہوا ہے۔ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ / ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ خود بھی نہایت اونچے درجے کا عالم تھا اور اربابِ علم کا قدر شناس اور مربی تھا۔ اس کو فارسی ترکی اور ہندی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ عربی میں بھی دستگاہِ کامل رکھتا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ریاضی، ہیئت اور فلسفہ وغیرہ میں بھی اس کو درجۂ تبحر حاصل تھا۔ فارسی اور ہندی میں اس کا کافی کلام ابھی تک محفوظ ہے۔ اکبر کی فرمائش پر تزکِ بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

نہایت دریادل اور سخی تھا۔ اس کی فیاضی اور سخاوت کے واقعات پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ شجاعت میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ سخاوت اور علم دوستی کے واقعات کے علاوہ اس کی بہادری اور جنگی قابلیت کے واقعات بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ وہ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں بڑے بڑے مناصب پر فائز رہا۔ اس کو کتابوں سے بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ اس نے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جس میں نادر اور نایاب کتابوں کی بہت بڑی تعداد جمع کر دی۔ مؤرخین نے اس کتب خانے کی بے حد تعریف کی ہے۔ اس عظیم شخصیت نے جمادی الآخر ۱۰۳۶ھ (فروری ۱۶۲۷ء) میں دلی میں وفات پائی۔ بستی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں اس کا مقبرہ ابھی تک موجود ہے۔

کا شرف بھی حاصل کیا۔ شہزادہ دانیال کے انتقال کے بعد باقی زندگی بیوگی کے عالم میں گزار دی۔ ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ نے اس کو نکاح کا پیغام بھیجا لیکن اس نے معذرت کر دی — ہمیشہ پاک دامن اور عفت شعار رہی۔ شعر و سخن کا نہایت عمدہ ذوق رکھتی تھی۔ تذکروں میں اس کے یہ تین شعر محفوظ رہ گئے ہیں:

عاشق ز خلق عشق تو پنہاں چساں کند
پیداست از دو چشم ترش خوں گریستن

ز راہِ امن و سلامت کسے بہ او رسد
غبار تا نشود خاکِ پا بہ او نرسد

خیز تا رہ بہ رہ گزار کنیم
خویش را چشمِ انتظار کنیم

جاناں بیگم نے سنہ ۱۰۷۰ ہجری (۱۶۵۹ء) میں وفات پائی۔ (اختر تاباں، مشاہیر نسواں)

آتی فاطمہ

گیارھویں صدی ہجری میں استنبول (ترکی) کی رہنے والی یہ خاتون علم و ادب اور شعر و سخن میں یکتائے زمانہ تھی۔ وہ خواجہ سعد الدین جنجانی مصنف "تاج التواریخ" کی اولاد سے تھی۔ اس کا شوہر امیر آغا تھا اور اس کا بیٹا نیکی شہر کا قاضی تھا۔ وہ ترکی زبان کی نغز گو شاعرہ تھی۔ اس کا دیوان مرتب ہو چکا ہے۔ اس باکمال خاتون نے سنہ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں نیکی شہر میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ (مشاہیر نسواں)

ملکہ نور جہاں (مہرالنّساء)

اعتماد الدولہ میرزا غیاث بیگ کی بیٹی اور نورالدین محمّد جہانگیر بادشاہ کی چہیتی ملکہ تھی۔ میرزا غیاث بیگ کا تعلق ایران کے ایک معزّز خاندان سے تھا اور اس نے بڑی اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس کا والد میرزا محمد شریف پہلے محمد خان تکلو حاکمِ خراسان کا وزیر اور بعد میں شاہ طہماسپ صفوی اوّل (سنہ ۹۳۰ھ تا سنہ ۹۸۴ھ / ۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء) کی طرف سے حاکمِ مرو (MERV) مقرر ہوا۔ اس خاندان پر کسی وقت ایسی افتاد آپڑی کہ میرزا غیاث بیگ کو اہل و عیال سمیت بحالِ خستہ تلاشِ روزگار کے لیے ایران سے نکلنا پڑا۔ دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اثنائے سفر میں قندھار کے نزدیک اس کی اہلیہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا جس کا نام مہرالنّساء رکھا گیا[1]

---

[1] اس سلسلے میں بعض تذکرہ نگاروں نے ایک عجیب کہانی لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ مہرالنساء ایک جنگل میں پیدا ہوئی۔ ماں باپ سفر کی صعوبتوں اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں اس ننھی سی جان کو اپنے ساتھ لے جانا انہیں بہت مشکل نظر آیا اس لیے انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر بچی کو ایک درخت کے سائے میں لٹا دیا اور خود آگے بڑھ گئے۔ کرنا خدا کا ان کے پیچھے ایک اور قافلہ وہاں آ پہنچا۔ قافلے کے سردار نے سنسان جنگل میں ایک نومولود بچی کو بے کسی کی حالت میں پڑا دیکھا تو اس کو ترس آگیا اور اس نے اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے لیا جب اگلا پڑاؤ آیا تو اس نے اِدھر اُدھر آدمی بھیجے کہ کسی انّا کی تلاش کریں جو اس بچی کو دودھ پلا سکے۔ حسنِ اتفاق سے اسی پڑاؤ پر میرزا غیاث ٹھہرا ہوا تھا۔ سردار کے آدمی اس کے پاس پہنچے تو اس نے اپنی بیوی کی خدمات پیش کیں۔ بیوی نے جا کر دیکھا تو وہ اس کی اپنی بچی تھی بے تاب ہو کر سینے سے لگا لیا۔ سردار کو واقعہ کا علم ہوا تو اس نے بچی کو ماں کے سپرد کر دیا اور ان لوگوں کو ہندوستان پہنچنے میں مدد دی۔

میرزا غیاث بیگ ہندوستان پہنچا تو اس کی اکبر بادشاہ کے دربار میں رسائی ہو گئی اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت کی بدولت دیوانِ بیوتات مقرر ہو گیا اور بادشاہ سے اعتماد الدولہ کا خطاب پایا۔ میرزا غیاث بیگ معاملہ فہمی کے علاوہ ایک اچھا خوشنویس، انشاء پرداز اور نغز گو شاعر بھی تھا اور اس کا دستِ سخاوت بھی بہت کشادہ تھا۔ (مگر جہانگیر نے اپنی تزک میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے باوصف میرزا غیاث بیگ رشوت لیے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ جہانگیر کا اپنا تجربہ تھا یا اس نے سنی سنائی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا) مرزا غیاث بیگ نے مہر النساء کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ وہ بہت ذہین و فطین لڑکی تھی اس نے قرآن مجید ختم کرنے کے بعد چند ہی سال میں مختلف علوم میں دسترس حاصل کر لی اور فارسی جو اس کی مادری زبان تھی اس کے شعر و ادب میں بھی ماہرانہ دستگاہ پیدا کر لی۔ اس کے علاوہ وہ امورِ خانہ داری میں بھی طاق ہو گئی اور اپنی والدہ کے ساتھ شاہی محل میں بکثرت آمد و رفت سے ادب، تمیز اور سلیقہ کے اعتبار سے بھی شہزادیوں کے ہم پلّہ نظر آنے لگی۔ جب شادی کی عمر کو پہنچی تو والدین نے اسے شاہی دربار سے وابستہ ایک لائق ایرانی نوجوان علی قلی خان سے بیاہ دیا۔ بادشاہ نے علی قلی خان کی خدمات سے خوش ہو کر (یا غیر معمولی بہادری دکھانے پر) اس کو شیر افگن کا خطاب دیا تھا (ایک روایت یہ ہے کہ یہ خطاب اس کو جہانگیر نے شہزادگی کے زمانے میں دیا تھا) شیر افگن اور مہر النساء کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار رہی۔ ان کو اللہ نے ایک بیٹی دی جس کا نام انہوں نے لاڈلی بیگم رکھا۔ جہانگیر اپنی "تزک" میں لکھتا ہے:۔

"میرے والد مجھ سے بے التفاتی ظاہر کرتے تھے اس لیے ان کی یہ بے رُخی دیکھ کر میرے اکثر ہمراہی مجھ سے جُدا ہو گئے۔ ان میں علی قلی خان بھی تھا۔ حالانکہ میں نے اس پر بڑی بڑی عنایات کی تھیں۔ اس پر بھی میں نے بادشاہ ہو کر اس کی تقصیرات معاف کر دیں اور اس کو بنگالہ میں جاگیر عطا

کی لیکن وہاں اس نے بادشاہی آدمیوں سے فساد شروع کر دیا میں نے اپنے دودھ شریک بھائی (کوکا) قطب الدین خاں کو اس کی تنبیہ کے لیے بھیجا لیکن علی قلی خاں نے اس کو قتل کر دیا۔ قطب الدین کے ساتھی ایک کشمیری رئیس زادہ انبہ خان نے جو والیانِ کشمیر کی اولاد سے تھا اور جو ایک ہزاری ذات اور تین سو سوار کے منصب سے سرفراز تھا، علی قلی کے ساتھ دست بدست لڑائی کی اس لڑائی میں دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے مارے گئے۔"

شیر افگن کے قتل کے بعد اعتماد الدولہ (میرزا غیاث بیگ) نے اپنی بیوہ بیٹی کو اکبر کی بیوہ اور جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی خدمت گزاری کے لیے اس کے محل میں بھیج دیا۔ وہیں سنہ ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱) کے جشنِ نوروز میں جہانگیر نے اس کو دیکھا اور اس کے حسنِ خداداد اور عادات و اطوار سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی سوتیلی والدہ کی معرفت اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ مہرالنساء رضامند ہو گئی اور دو ماہ بعد اس کی جہانگیر سے شادی ہو گئی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جہانگیر مہرالنساء کو اپنی شہزادگی کے زمانے سے چاہتا تھا اور اس نے شیر افگن کو اسی لیے مروایا تھا کہ وہ مہرالنساء سے شادی کر سکے۔ لیکن یہ سب من گھڑت اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ کسی مستند تاریخ سے ان کا ثبوت نہیں ملتا۔

حرم شاہی میں داخل ہونے کے بعد مہرالنساء کا ستارۂ اقبال روز بروز بلند ہوتا گیا۔ اپنی لیاقت، سلیقہ شعاری اور دانش مندی کی بدولت وہ جہانگیر کے مزاج پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔ بادشاہ نے اسے پہلے نور محل اور پھر نور جہاں کا خطاب دیا۔ یہ خطاب ایسا مشہور و مقبول ہوا کہ بقول مولانا محمد حسین آزاد مرحوم "حرم سرائے میں ایک سے ایک بڑھ کر رانیاں تھیں لیکن نور جہاں نے سب کے چراغ بے نور کر دیے۔ صرف خطبہ میں اس کا نام نہیں پڑھا جاتا تھا باقی تمام لوازم سلطنت میں اس کا دخل تھا۔" جہانگیر کے حکم سے نور جہاں کے نام کا یہ سکہ بھی

بھی جاری ہوا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

جہانگیر اسے سفر و حضر میں ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ شکار پر بھی اس کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء میں وہ فتح پور سیکری کے قریب شکار کھیل رہا تھا کہ نورجہاں نے بندوق کی پہلی ہی گولی سے شیر کو مار ڈالا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کی بہادری کی بہت تعریف کی۔ کہا جاتا ہے کہ نورجہاں نے ایک اور موقع پر چار شیر مارے۔ ۱۰۲۹ھ / ۱۶۲۰ء میں جہانگیر نے اپنے بیٹے شہریار کی منگنی نورجہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم سے کر دی۔ لاڈلی بیگم شیر افگن کی صلب سے تھی اور شہریار جہانگیر کی ایک دوسری بیوی (یا کنیز) کے بطن سے تھا۔ جہانگیر یہ رسم ادا کرنے کے لیے خود اعتماد الدولہ (نورجہاں کے باپ اور لاڈلی بیگم کے نانا) کے گھر گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ تزکِ جہانگیری میں لکھتا ہے:

"میں نے اس مسرّت بخش موقع پر سعادت مند فرزند شہریار کو آٹھ ہزار پیادوں اور چار ہزار سواروں کا منصب عطا کیا اور اسے درازیٔ عمر اور اقبال مندی کی دعا دی۔"
(ص ۶۷۰)

منگنی کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جہانگیر نے شہریار اور لاڈلی بیگم کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ اس کے بعد نورجہاں نے درباری سیاست میں پس پردہ رہ کر بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا مقصد اپنے داماد شہریار کے لیے جہانگیر کی جانشینی کا راستہ ہموار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جہانگیر کی خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ اس کی صحت کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جہانگیر بلانوش تھا مگر نورجہاں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ حد اعتدال کے اندر رہے۔

رفتہ رفتہ وہ جہانگیر کے مزاج میں اس قدر دخیل ہو گئی کہ بادشاہ کے اپنے الفاظ میں:۔

"میں نے سلطنت نورجہاں بیگم کو بخش دی۔ مجھے ایک سیر شراب

اور نصف سیر گوشت کے سوا کچھ نہیں چاہیئے۔"[1]

(اقبال نامۂ جہانگیری ص ۶۴)

نوبت یہاں تک پہنچنے کے باوجود جہانگیر نے عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس معاملے میں وہ نور جہاں کی بھی رو رعایت کرنے کا روادار نہ تھا۔ اس نے نور جہاں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "بیگم سلطنت بیشک تمہاری ہے مگر خبردار کسی سے بے انصافی نہ کرنا۔"

ایک دو موقعوں پر بعض لوگ نور جہاں کی زیادتی کا شکار ہوئے تو جہانگیر نے اس کا سختی سے محاسبہ کیا اور جب تک اس نے مظلوموں کو کچھ دے دلا کر راضی نہ کر لیا جہانگیر نے اس کو معاف نہ کیا۔

شہزادہ خرم (شاہجہاں) جہانگیر کا سب سے لائق بیٹا تھا۔ وہ نور جہاں کے بھائی میرزا ابوالحسن آصف جاہ کا داماد تھا۔ نور جہاں نے شہریار کو آگے بڑھانے اور شہزادہ خرم کو بادشاہ کی نظروں سے گرانے کے لیے ایسی چالیں چلیں کہ جہانگیر اور شہزادہ خرم کی آپس میں ٹھن گئی۔ جہانگیر نے مہابت خاں کی مدد سے شہزادہ خرم کی بغاوت کو فرو کیا اور اس خدمت کے صلے میں مہابت خاں کو خانِ خاناں سپہ سالار کا خطاب دے کر سات ہزار پیادوں اور سات ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ سواروں کے منصب پر ترقی دی اور اس کے بیٹے خانہ زاد خان کو پانچ ہزاری ذات و سوار

---

[1] سنہ ۱۰۳۰ھ / ۱۶۲۱ء میں جہانگیر شدید بیمار ہو گیا۔ اس بیماری میں نور جہاں نے بڑی تندہی سے اس کی تیمارداری کی۔ شوہر کی بحالی صحت کے لیے اس نے جو خدمات انجام دیں اور جو تدابیر اختیار کیں ان سے جہانگیر بہت ہی خوش ہوا اور نور جہاں کو اپنی محسنہ قرار دیا۔ اس نے بر ملا نور جہاں کی خدمات کا اعتراف کیا اور دل کھول کر اس کی تعریف و توصیف کی۔ اس حسنِ خدمت کی وجہ سے وہ جہانگیر کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا گئی اور عملاً وہی حکمران بن گئی۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ آئندہ شاہی نوبت کے بعد اس کے لیے بھی نوبت بجا کرے۔ اس سے پہلے نوبت کا بجنا صرف بادشاہ کے لیے مخصوص تھا۔

کے منصب پر ترقی دی۔ بعد میں نورجہاں نے اپنی سیاسی حکمتِ عمل کے تحت بادشاہ کو مہابت خاں کے خلاف کر دیا۔ پہلے اسے صوبہ بنگال کا صوبہ دار مقرر کرایا۔ اس کے بعد اس کو حکم ہوا کہ وہ ہاتھی جو بنگال میں اس کے ہاتھ آئے تھے وہ دربار میں بھیج دے۔ اس کے علاوہ شاہی محاصل اور واجبات کا حساب خود دربار میں حاضر ہو کر دے۔ مہابت خاں نے سارے ہاتھی فوراً بھیج دیئے اور خود دربار میں حاضری دینے کے لیے روانہ ہوا لیکن ایک طرف اس کی حاضری میں رکاوٹ پیدا کی گئی اور دوسری طرف اس کے داماد خواجہ برخوردار نقشبندی (ابنِ خواجہ عمر نقشبندی) کو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا کہ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر ایک سرکردہ شاہی عہدیدار (مہابت خان) کی لڑکی سے شادی کیوں کی؟ صرف گرفتاری پر ہی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اس کو بید لگوائے گئے، اور جو کچھ اس کی بیوی کو جہیز میں ملا تھا اسے بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ اس واقعہ نے مہابت خاں کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب جہانگیر اور نورجہاں کابل جا رہے تھے مہابت خاں نے دریائے جہلم کے کنارے جہانگیر اور نورجہاں دونوں کو حراست میں لے لیا۔ یہ بڑا نازک موقع تھا مگر نورجہاں نے ایسی عقلمندی اور ہوشیاری دکھائی کہ مہابت خان کا زور ٹوٹ گیا اور اس نے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔

نورجہاں کی سیاسی زندگی کے حالات بڑی تفصیل کے متقاضی ہیں جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء میں نورجہاں، جہانگیر کے ساتھ کشمیر گئی۔ وہاں جہانگیر سخت بیمار ہو گیا۔ نورجہاں نے اس کی تیمارداری اور خدمت میں دن رات ایک کر دیئے مگر جہانگیر کا وقتِ آخر آ چکا تھا۔ اس نے ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ (مطابق ۷ نومبر ۱۶۲۷ء) کو پیر پنجال کے قریب وفات پائی۔ نعش لاہور لائی گئی اور نورجہاں کے "باغ دلکشا" میں دفن کی گئی۔ قبر پر شاہجہاں کے حکم سے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جس پر دس لاکھ روپے لاگت آئی۔ نورجہاں نے اس کی تعمیر میں ذاتی دلچسپی لی اور جب تک یہ تیار نہ ہو گیا برابر تعمیر

کے کام کی نگرانی کرتی رہی۔

جہانگیر کے انتقال کے بعد تخت نشینی کے سلسلے میں نورجہاں کی اپنے بھائی آصف جاہ کے ساتھ کچھ عرصہ کشمکش رہی۔ وہ اپنے داماد شہریار کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی جبکہ آصف جاہ اپنے داماد شہزادہ خرم کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا دونوں نے سیاسی داؤ پیچ لڑائے۔ ان میں آصف جاہ غالب آیا اور شہزادہ خرم شاہجہاں کا لقب اختیار کر کے تاج و تخت کا مالک بن گیا۔ شہریار کی آنکھوں میں پہلے سلائی پھرا دی گئی اور پھر چند دن بعد کچھ دوسرے شہزادوں کے ساتھ اسے قتل کرا دیا گیا۔

اب نورجہان نے سیاست میں حصہ لینا بالکل چھوڑ دیا اور ملکی معاملات سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگی۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد وہ اٹھارہ سال زندہ رہی۔ یہ سارا عرصہ اس نے لاہور میں گزارا۔ شاہجہاں نے اس کا دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ جہانگیر کی زندگی میں وہ بڑی پرتکلف زندگی گزارتی تھی۔ اس نے زیور، پوشاک، بناؤ سنگار اور دیگر آرائش کی چیزوں میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ گلاب کا عطر بھی اسی کی ایجاد ہے۔ مگر جہانگیر کی موت کے بعد اس نے بہت سادہ زندگی اختیار کر لی۔ اپنے وظیفے کا بیشتر حصہ علم کی اشاعت، صدقہ و خیرات اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش پر صرف کر دیتی تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے پانچ سو سے زیادہ غریب لڑکیوں کی شادیاں اپنی گرہ سے کرائیں اور جہیز وغیرہ کے تمام اخراجات اپنے پاس سے ادا کیے۔

اس نے جہانگیر کی زندگی ہی میں اپنے باپ اعتماد الدولہ (وفات ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۲ء) کا مقبرہ آگرہ میں اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر کرایا۔ ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب۔ بھارت) میں ایک خوش وضع خوش منظر پختہ اور سنگین سرائے تعمیر کرائی جو نور محل کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی نام سے ایک قصبہ وہاں آباد ہو گیا۔ لاہور میں بھی کچھ عمارات بنوائیں۔ نورجہاں نے بہ اختلافِ روایت ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ یا یکم ربیع الثانی ۱۰۵۵ھ مطابق ۲۷ مئی ۱۶۴۵ء کو لاہور میں وفات پائی۔ اس کا مقبرہ

شاہدرہ (لاہور) میں مقبرۂ جہانگیر کے قریب واقع ہے۔ لاڈلی بیگم بھی وفات کے بعد وہیں دفن ہوئی۔

نورجہاں کی زندگی کا ایک خاص پہلو شعروادب سے اس کی دلچسپی ہے۔ وہ ایک خوش فکر اور نازک خیال شاعرہ تھی اور نہایت علم دوست، بذلہ سنج اور حاضر جواب خاتون تھی۔ تاریخ اور تذکروں میں اس کی معارف پروری، علمی استعداد، سخن فہمی اور سخن سنجی کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ صاحبِ "مراۃ الخیال" نے اس کے بارے میں لکھا ہے:—

"در بذلہ سنجی و سخن گوئی و شعر فہمی و حاضر جوابی از نسائے زماں ممتاز بود۔"

آزاد بلگرامی "ید بیضا" میں کہتے ہیں:—

"در وادیٔ شعر بسیار خوش سلیقہ بود"

شاہنواز خان نے "مآثر الامراء" میں لکھا ہے کہ نورجہاں مخفی تخلص کرتی تھی مگر مولانا عبدالباری آسی نے "تذکرۃ الخواتین" میں اس کا تخلص نور بیان کیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

نورجہاں کی بذلہ سنجی، برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:—

ایک دفعہ جہانگیر کئی روز تک نورجہاں سے نہ مل سکا جب وہ ملا تو فرطِ مسرّت سے نورجہاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جہانگیر نے اس کیفیت سے متاثر ہو کر یہ مصرعہ پڑھا۔ ؏

گوہر ز اشکِ چشمِ تو غلطیدہ می رود

نورجہاں نے برجستہ دوسرا مصرعہ کہا: ؏

آبے کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ می رود

ایک مرتبہ رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہوا اور عید کا چاند دکھائی دیا۔ جہانگیر

اور نورجہاں دونوں نے بالا خانۂ شاہی سے چاند دیکھا۔ اس وقت جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: ؎

ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد

نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ کہا: —— ؎

کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

محرم سنہ ۱۰۲۸ ہجری میں ایک دُم دار ستارہ نظر آیا۔ نورجہاں نے اسے دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا ؎

ستارہ نیست بدیں طول سر بر آوردہ
فلک بشاطریٔ شہ کمر بر آوردہ

ایک مرتبہ جہانگیر کی نظر ایک بوڑھے پر پڑی جس کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے جُھک گئی تھی۔ جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: —— ؎

چرا خمِ پشت می کردند پیرانِ جہاں دیدہ

نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ کہا: - ؎

بزیرِ خاک می جویند ایامِ جوانی را!!

ایک مرتبہ جہانگیر نے لباس تبدیل کیا۔ اس کی قبا پر لعلِ بے بہا کا تکمہ تھا۔ نورجہاں کی نظر پڑی تو فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

ترا نہ تکمہ لعل است بر قبائے حریر
شدہ است قطرۂ خوں منّت گریباں گیر!!

ایک دن جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: ؎

از برائے سوزِ دل آتش زِ طور آوردہ است

نورجہاں نے فوراً کہا: - ؎

تاجرِ ما جنسِ درد از راہِ دور آوردہ است

تذکروں اور تاریخوں میں نورجہاں کے جو اشعار ملتے ہیں ان میں سے چند

یہ ہیں :

باین حسن و کمالاتے چو در گلشن گذر سازم | ز جانِ بلبلاں شورِ مبارکباد برخیزد
چو بردارم ز رُخ برقعہ ز گل فریاد برخیزد | زنم بر زلف گر شانہ ز سنبل داد برخیزد

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار ست | کلید قفلِ دلِ ما تبسم یار ست
نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف | دلِ کسے کہ بحسن و ادا گرفتار ست

عشقت چناں گداخت تنم را کہ آب شد | گردی کشاند سرمۂ چشمِ حباب شد

تہِ زلف خالش بلائے نہاں است | مترس از بلا ہا کہ شب درمیاں است

نامِ تو بردم و زدم آتش بجانِ خویش | در آتشم چو شمع ز دستِ زبانِ خویش

بینی و چشم و دو ابروئے تو اے گل اندام | شاخِ بادام و دو بادام و دو برگِ بادام

ز نارِ عشق اگر ظاہر کنم گل در چمن سوزد
اگر نالم بخلوت خانہ شمعِ انجمن سوزد

(تُزکِ جہانگیری ۔
مشاہیرِ نسواں ۔ معارف لاہور جنوری سنہ ۱۹۸۱ء ۔ نقوش لاہور نمبر
ہمدرد صحت ڈائجسٹ اگست سنہ ۱۹۷۰ء
تحریک احیائے اسلام اور سلاطینِ مغلیہ)

ملکہ ارجمند بانو (ممتاز محل)

شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ (۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء تا ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء) کی چہیتی ملکہ تھی۔ والد کا نام یمین الدولہ ابوالحسن آصف خان تھا جو آصف جاہ کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ ملکہ نورجہاں کا حقیقی بھائی تھا اور عہدِ جہانگیری میں بڑے جاہ و اقتدار کا مالک تھا۔ ارجمند بانو کی والدہ مرزا غیاث الدین علی قزوینی کی بیٹی تھی جو عہدِ اکبری میں فوج کا میر بخشی تھا۔

ارجمند بانو ۱۴ رجب ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء کو پیدا ہوئی۔ والدین نے اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ جہانگیر بادشاہ کو اس کی سلیقہ شعاری، علم و دانش، ادب و تمیز اور حسنِ صورت کا علم ہوا تو اس نے اسے نوجوان شہزادے خرم (شاہجہان) کے لیے مانگ لیا۔ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ رسوم شادی اعتماد الدولہ کے عظیم الشان محل میں ادا کی گئیں۔ جہانگیر بادشاہ بنفسِ نفیس رونق افروز ہوا۔ دولہا نے اپنے ہاتھ سے ہیروں کا ہار دلہن کے سر سے باندھا۔ پانچ لاکھ کا مہر قرار پایا۔

ارجمند بانو کے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی وجہ سے شاہجہان اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ وہ بڑی عالمہ فاضلہ، سخن فہم اور سخن سنج خاتون تھی اور شاہجہان کے مزاج پر پوری طرح حاوی تھی۔ سفر ہو یا حضر وہ بالعموم اس کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں وہ تخت نشین ہوا تو تاج پوشی کے موقع پر ارجمند بانو کو ممتاز محل کا لقب دیا اور ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی۔ دونوں میاں بیوی کی مثالی محبت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ شاہجہان اس کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کو ہمیشہ رعایا کے حق میں مفید ثابت کرتی رہی۔ اس نے بہت سے لوگوں

کی جان بخشی کرائی۔ اور بے شمار قیدیوں کی سزا میں تخفیف کرائی۔ یہ سب کچھ اس نے ازراہِ ترحم کیا اور بادشاہ سے درخواست کرکے احکام حاصل کیے ورنہ وہ گھریلو قسم کی خاتون تھی، اور امورِ سلطنت میں دخل دینا پسند نہ کرتی تھی۔ اپنے شوہر کا بے حد خیال رکھتی تھی، اور اس کی خدمت کو اپنے لیے بڑی سعادت جانتی تھی۔ اس کو شاہی خزانہ سے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس کا بڑا حصہ وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد کرنے میں صرف کر دیتی تھی۔

۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء میں شاہجہان دکن گیا تو ممتاز محل کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ برہان پور کے مقام پر ممتاز محل کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کی ولادت کے فوراً بعد، ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ/ ۱۷ جون ۱۶۳۱ء کو وہ راہیٔ ملکِ عدم ہو گئی۔ شاہجہان کو اس کی موت کا نہایت صدمہ ہوا اور اس کے بعد اس نے کوئی اور نکاح نہ کیا۔ ممتاز محل کا جسدِ خاکی کچھ مدت بعد برہان پور سے آگرہ لا کر اس عظیم الشان مقبرے میں دفن کیا گیا جو "تاج محل" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک ہے بلکہ صنعتِ تعمیر اور فن کاری کے بعض پہلوؤں سے دنیا بھر میں اس حسین و جمیل عمارت کا کوئی جواب نہیں۔ یہ شاہجہان اور ممتاز محل کی مثالی محبت کی لافانی یادگار ہے۔

ممتاز محل سے شاہجہان کے چودہ بچے ہوئے جن میں سے نصف زندہ رہے۔ تین شہزادیاں اور چار شہزادے۔ شہزادوں کے نام یہ تھے، دارا شکوہ، محمد شجاع، محمد مراد بخش اور محمد اورنگ زیب۔ ان میں سے محمد اورنگ زیب (عالمگیر) ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک ہوا اور پچاس سال تک بڑی شان سے حکومت کی۔ شہزادیوں کے نام یہ تھے، جہاں آرا بیگم، روشن آرا بیگم اور گوہر آرا بیگم۔

(بزمِ تیموریہ۔ مشاہیرِ نسواں۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ)

شہزادی جہاں آرا بیگم

شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ) اور ارجمند بانو (ممتاز محل) کی پہلوٹھی کی بیٹی تھی۔ ۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ (مطابق ۲ اپریل ۱۶۱۴ء) کو پیدا ہوئی۔ بیگم صاحب، بادشاہ بیگم اور فاطمۃ الزمان القاب تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ چنانچہ وہ نہ صرف جملہ علوم دینی میں طاق ہو گئی بلکہ ذوقِ شعر و ادب کے اعتبار سے بھی بہت بلند مقام حاصل کیا۔ نہایت فیاض، معارف پرور اور علماء و شعراء کی قدردان تھی۔ اگرچہ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی لیکن روزمرہ کی زندگی میں احکامِ شریعت کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کے دستِ کرم سے بے شمار غربا اور حاجت مند وظیفہ پاتے تھے۔ عبادتِ الٰہی اور خلقِ خدا کی خدمت کے سوا اسے اور کوئی شوق نہ تھا۔ جہاں آرا بیگم کی لیاقت اور گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر شاہجہاں اس کو بے حد عزیز جانتا تھا۔ اس نے اپنی چہیتی بیٹی کا چھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ یہ نصف نقد اور نصف جاگیر کی صورت میں تھا۔ جو بادشاہ نے اسے عطا کر رکھی تھی۔

شاہجہاں نے جہاں آرا بیگم کا محل اپنے محل کے بالکل قریب ہی بنوایا تھا۔ جب تک اسے روزانہ دیکھ نہ لیتا چین نہ پڑتا تھا۔ شاہجہاں کو تخت نشین ہوئے ابھی چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۱ء) میں اس کی چہیتی بیگم ارجمند بانو (ممتاز محل) فوت ہو گئی۔ اب بادشاہ نے شاہی محل کا سارا انتظام جہاں آرا کے سپرد کر دیا۔ شہزادی کو بھی اپنے شفیق باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ تمام کھانے اپنی نگرانی میں تیار کرواتی اور جب تک خود چکھ کر دیکھ نہ لیتی انہیں

بادشاہ کے دسترخوان پر نہیں چُنا جاتا تھا۔

جہاں آرا بہت باحیا اور پردے کی پابند تھی۔ ایک دفعہ وہ رات کو بادشاہ سے رخصت ہو کر اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی کہ اس کا دامن کافوری شمع سے الجھ گیا اور اس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ شہزادی نے اس شرم سے کہ دوسرے لوگ آ کر کہیں اس کے جسم کا کوئی حصہ نہ دیکھ لیں شور و غل نہ کیا۔ اتفاق سے چار لونڈیوں نے جو کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے آ رہی تھیں اس کو آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا دیکھ لیا۔ انہوں نے دوڑ کر آگ بجھانے کی کوشش کی۔ آگ بجھاتے بجھاتے بھی شہزادی کے ہاتھ اور بازو جل گئے اور دو لونڈیاں بھی بُری طرح جھلس گئیں۔ اس صدمہ سے شہزادی کو غش آ گیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو وہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا۔ اس نے دُور دُور سے ماہرِ فن جراح اور طبیب طلب کیے اور اُن کو شہزادی کے علاج پر مامور کیا۔ ساتھ ہی ہر روز ہزاروں روپے اللہ کی راہ میں لٹانے شروع کر دیے تاکہ غربا اور مساکین شہزادی کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ اس نے چار ماہ تک سلطنت کا کام کاج نہیں کیا، ہر وقت مصلّے پر بیٹھ کر شہزادی کی صحت یابی کی دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ اس دوران میں شہزادی کے بھائیوں نے بھی اپنی پیاری بہن کی خبر گیری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آخر عارف نامی ایک جراح کے علاج سے شہزادی کو شفا ہو گئی۔ بادشاہ نے عارف کو سونے میں تولا اور یہ سارا سونا اسے عطا کر دیا۔ اس کے علاوہ بیش قیمت خلعت اور ہاتھی گھوڑے بھی اس کو انعام میں دیئے۔ شہزادی سلام کے لیے والد کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے بے شمار قیمتی جواہر، لعل اور یاقوت اس پر نچھاور کیے۔ شاہجہاں نے منت مانی تھی کہ شہزادی کے صحت یاب ہونے پر پانچ لاکھ روپیہ راہِ خدا میں تقسیم کروں گا۔ چنانچہ اس میں سے اس نے ایک لاکھ روپیہ مکہ معظمہ اور پچاس ہزار روپیہ مدینہ منورہ بھیجا۔ باقی رقم مختلف مقامات پر غریبوں، یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شہزادی نے تندرست ہونے پر اجمیر شریف جانے کی منت مانی تھی۔ چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ اجمیر شریف کی طرف روانہ ہوئی۔ طویل سفر کی وجہ سے اس کے زخم پھر ہرے ہو گئے اور نئے سرے سے علاج شروع ہوا۔ اب کی بار ہامون نامی ایک درویش کے مرہم سے اس کو مکمل شفا نصیب ہوئی۔ بادشاہ نے ہامون کو انعام میں کئی گاؤں بطور جاگیر دیئے۔ پھر اس نے ایک عام جشن برپا کیا جس میں لاکھوں روپے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کیے۔

سنہ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں جہاں آرا بیگم نے قلعہ آگرہ کے صدر دروازہ کے متصل ایک عالی شان جامع مسجد بنوانی شروع کی۔ اس کی تعمیر پر پانچ لاکھ روپیہ صرف ہوا اور یہ سنہ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے ساتھ شہزادی نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو بہت عرصہ تک نہایت کامیابی سے چلتا رہا۔ اب بھی یہ کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے۔ مسجد کے گرد اگرد دکانوں کی آمدنی مسجد اور مدرسہ کے لیے وقف ہے۔

اس جامع مسجد کے علاوہ شہزادی نے مزار خواجہ معین الدین حسن چشتیؒ اجمیری کے نقرئی محجر اور بیگمی دالان، کشمیر میں ملا شاہ بدخشیؒ کی مسجد اور دلی میں ایک بہت بڑی سرائے کی عمارتیں بھی بنوائیں۔ اس نے صرف یہ عمارتیں ہی نہیں بنوائیں بلکہ مختلف مقامات پر چند وسیع و عریض احاطوں میں باغات بھی لگوائے مگر اب ان کے کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس کا احداث کرایا ہوا ایک بہت بڑا باغ لاہور میں بھی تھا، اب اس باغ کی صرف بلند و بالا منقش ڈیوڑھی باقی رہ گئی ہے جسے "چوبرجی" کہا جاتا ہے۔ یہ ڈیوڑھی دراصل باغ کا بڑا دروازہ ہے۔ اس دروازے کی پیشانی پر مشرق کی جانب نیلے حروف میں بخط جلی آیۃ الکرسی منقوش تھی۔ جس کے آخر میں اس باغ اور عمارت کا سنہ تعمیر ۱۰۵۶ھ درج تھا۔ اس کے علاوہ یہ دو شعر بھی درج تھے:

بفضلِ قادر و قیوم و خالق دوراں بنا پذیر شد ایں باغ روضۂ رضواں

بگشت مرحمت ایں باغ بر میا بائی ز لطف صاحب زیبندہ بیگم دوراں

میا بائی شہزادی جہاں آرا بیگم کی کنیز یا کھلائی تھی۔ شہزادی نے یہ باغ اسے بخش دیا تھا۔ ڈیوڑھی کے مغربی دروازے پر یہ شعر منقوش تھا :

ساخت میا بائی فخر نساء

روضۂ عالی ارم احتشام

افسوس کہ امتدادِ زمانہ سے ان عمارتوں کے بہت کم حصے اب باقی رہ گئے ہیں۔

اسی سال (۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء) میں شاہجہاں اور شہزادہ اورنگ زیب کی آمد لاہور میں ہوئی۔ شہزادے نے یہ باغ دیکھا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے لاہور سے ایک خط جہاں آرا بیگم کو بھیجا جس میں اس باغ کا ذکر ان الفاظ میں کیا :-

"لحظہ سیر باغ سرکار عالیہ نشاط افزائے خاطر مشتاق گشت و از مشاہدۂ تالاب و عمارات کہ بتازگی اساس یافتہ بہجت فراواں اندوخت۔ نہایت جائے تفریح دلکشا است اگر عمارت فراست خاں را بطرف ساختہ در آنجا بقرینہ ایوانے کہ در برابر آں مرتب شود نشیمنے ترتیب یا بدو بعض تصرفات مناسب بعمل آید سیر گاہ بے نظیر میشود۔" (رقعاتِ عالمگیری ص ۱۴۵)

یعنی ہم نے کچھ دیر سرکارِ عالیہ کے باغ کی سیر کی جس سے طبیعت کو بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ تالاب اور عمارات جو تازہ بنی ہیں ان کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی یہ جگہ بہت اچھی تفریح گاہ ہے اگر فراست خاں کی عمارت کو گرا کر محل کے انداز پر قرینے سے ایک نشیمن بنا لیا جائے اور عمارت میں کچھ اور ردو بدل کر دیا جائے تو ایک بے نظیر سیر گاہ بن سکتی ہے۔

اس خط میں اورنگ زیب نے جس تالاب اور جن عمارات کا ذکر کیا ہے اب ان میں سے کوئی باقی نہیں ہے۔ صرف یہ ڈیوڑھی قائم ہے۔

جہاں آرا بیگم کی علم دوستی، سخن فہمی اور علماء و شعراء نوازی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ اس کو صوفیۂ کرام سے بے حد عقیدت تھی، ابتدا

میں وہ حضرت ملا شاہ قادریؒ [1] کی مرید تھی۔ بعد میں سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کرلی۔ وہ وقتاً فوقتاً حصول برکت و دعا کے لیے اپنے دور کے اہل اللہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتی رہتی تھی۔ شہزادی نے دو کتابیں بھی تصنیف کیں۔ "مونس الارواح" اور "صاحبیہ۔" اول الذکر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور ان کے اکابر خلفاء کے سوانح حیات ہیں اور ثانی الذکر میں حضرت ملا شاہ قادریؒ کے نامکمل سوانح حیات ہیں۔ اس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی خوش عقیدہ خاتون تھی اور اپنے والد کی طرح اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضر ہونے اور ان پر چادریں چڑھانے کو کار ثواب سمجھتی تھی۔

---

[1] حضرت ملا شاہ قادری بدخشی کا شمار گیارہویں صدی ہجری کے اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے اصل نام شاہ محمد اور لقب لسان اللہ تھا۔ موضع ارکساہ (علاقہ روستاق ولایت بدخشاں) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ملا عبدی تھی جو ارکساہ کے قاضی تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ارکساہ میں ہوئی۔ دینی علوم حاصل کرنے میں انہوں نے سخت محنت کی۔ عنفوان شباب میں وطن سے کشمیر آئے۔ تین سال بعد آگرہ گئے۔ اور ۱۰۲۲ھ میں آگرہ سے لاہور آکر حضرت میاں میرؒ کے دامن ارادت سے وابستہ ہوگئے اور تیس سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ مرشد گرامی نے راہ سلوک کی منزلیں طے کرا کے کندن بنا دیا۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ عبادت الٰہی میں گزارتے تھے۔ بہت کم کھاتے تھے، بہت کم بولتے تھے اور بہت کم آرام کرتے تھے۔ سرد ملک کے رہنے والے تھے گرمیوں میں مرشد کی اجازت سے کشمیر چلے جاتے تھے۔ دارا شکوہ ان کا نہایت عقیدت مند تھا۔ اس نے اپنی کتاب "سکینۃ الاولیاء" میں ان کی کئی کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ملا شاہ فقر و استغنا، قناعت و توکل، تسلیم و رضا، عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم ہونے کے علاوہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ شاہ تخلص کرتے تھے۔ ۱۰۶۹ھ مطابق ۱۶۵۸ء میں وفات پائی۔ آخری آرامگاہ موضع میاں میر (لاہور) میں ہے۔ انہوں نے جو تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ دیوان اول، دیوان دوم، شرح رباعیات، قصائد عربی، رسالہ حمد و نعت و منقبت یوسف زلیخا، رسالہ بسم اللہ، رسالہ شاہیہ، رسالہ مرشد، تفسیر شاہ (سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ یوسف کی تفسیر)۔ (تذکرہ اولیائے پاک و ہند۔ "نقوش" لاہور نمبر)

۱۰۵۲ھ میں شاہجہاں کے ساتھ اجمیر گئی اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر حاضر ہوئی۔ اس سفر کے تاثرات اس نے اس طرح قلمبند کیے ہیں:

"۱۸ شعبان المبارک ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) کو والدِ بزرگوار کے ساتھ اکبر آباد سے اجمیر روانہ ہوئی اور ۲ رمضان المبارک کو اجمیر پہنچی۔ راستہ بھر یہ معمول رکھا کہ ہر منزل پر دو رکعت نماز نفل ادا کرتی۔ پھر سورۂ یٰسین اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر حضرت خواجہ معین الدین رضی اللہ عنہ کی روح پر فتوح کو ثواب پہنچاتی۔ اجمیر میں تال انا ساگر کے کنارے قیام تھا۔ ادب کے خیال سے رات کو پلنگ پر نہ سوئی۔ روضۂ مقدس کی طرف پاؤں پھیلائے اور نہ پشت کی۔ دن کو درختوں کے نیچے رہتی ــــ سات دن گزار کر ۱۴ رمضان المبارک کو مزارِ اقدس کی زیارت سے سرفراز ہوئی۔ پلکوں سے مزار کے اردگرد جھاڑو دی، خاکِ مزار کو چہرے پر ملا۔ اس وقت ایسا ذوق و شوق طاری ہوا کہ احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ بہرحال مزارِ اقدس پر عطر ملا اور پھولوں کی چادر چڑھائی جو سر پر اٹھا کر لے گئی تھی۔ اس کے بعد سنگِ مرمر کی مسجد میں جو ابا حضرت نے بنوائی ہے دوگانۂ شکر پڑھا۔ پھر گنبد مبارک میں بیٹھ کر سورۂ فاتحہ اور سورۂ یٰسین پڑھی اور مغرب کی نماز تک وہیں قیام کیا۔ شمع روشن کی جھالرے کے پانی سے روزہ افطار کیا اور با دلِ بریاں و چشمِ گریاں رخصت ہوئی۔ اگرچہ اس مقدس مقام سے ہٹنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تمام رات بیقراری میں گزاری۔ صبح اکبر آباد کی طرف کوچ کیا۔" (مونس الارواح)

اس تحریر سے جہاں آرا بیگم کے رجحانِ طبع کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "صاحبیہ" کے آخر میں اپنی خود نوشت سرگزشت میں وہ لکھتی ہے کہ:

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے مجھ سے کوئی فرض نماز قضا نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ نفلی روزے رکھتی رہی تا کہ جوانی کا جوش اور نفسانی

خواہشات مرتی رہیں۔"

شہزادی عمر بھر اپنے والد کی نہایت فرماں بردار اور اطاعت گزار رہی۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں جب اورنگ زیب نے دارا شکوہ کو شکست دے کر شاہجہاں کو نظر بند کر دیا اور خود تاج و تخت سنبھال لیا تو جہاں آرا بیگم نے اس وقت بھی باپ کا ساتھ نہ چھوڑا اور جب تک وہ جیا برابر سنہری کے ساتھ اس کی خدمت کرتی رہی۔ شاہجہاں کی نظر بندی کے زمانے میں وہ اس کے اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتی تھی اور تمام خط و کتابت اسی کے ذریعے ہوتی تھی۔ دارا شکوہ سے بے حد الفت کی بناء پر وہ کچھ عرصہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی موردِ عتاب بھی رہی لیکن بعد میں یہ کشیدگی دور ہو گئی اور عالمگیرؒ نے نہ صرف اس کے وظیفے کی رقم دگنی کر دی بلکہ اعزاز و احترام میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آٹھ سال کی نظر بندی کے بعد شاہجہاں نے قلعۂ آگرہ میں انتقال کیا تو جہاں آرا بیگم نے اس کے کفن دفن کا تمام بندوبست خود کیا۔ عالمگیرؒ تعزیت کے لیے خود اس کے محل میں حاضر ہوا۔

شہزادی جہاں آرا بیگم ایک خوش گو شاعرہ بھی تھی۔ اس نے اپنے والد (شاہجہاں) کی وفات پر ایک دردناک مرثیہ کہا جس کے تین شعر یہ ہیں:-

اے آفتابِ من کہ شدی غائب از نظر
آیا شبِ فراق ترا ہم بود سحر

اے بادشاہِ عالم و اے قبلۂ جہاں
بکشائے چشمِ رحمت و بر حالِ من نگر

نالم چنیں ز غصہ و بادم بود بدست
سوزم چو شمع و رغم و دودم رود ز سر

اپنی تصنیف "مونس الارواح" میں وہ حضرت معین الدین اجمیریؒ کے حالات کی ابتدا اپنے ان اشعار سے کرتی ہے:

آں شہنشاہِ جہانِ معرفت | ذاتِ او بیروں ز ادراک و صفت

خسرو ملکِ فنا بے تخت و تاج	از خود واز غیر خود بے احتیاج
غرقِ بحرِ عشق از صدق و صفا	از خودی بیگانہ با حق آشنا

یاد رہے کہ یہ کتاب شہزادی نے ۱۰۴۹ھ ۱۶۳۹ء میں لکھی تھی۔ اس وقت اس کی عمر فقط بائیس برس کی تھی۔

جہاں آرا بیگم نے ۱۰۹۲ھ ۱۶۸۱ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے احاطے میں اپنے لیے ایک سادہ سا مقبرہ بنوا لیا تھا چنانچہ اسی میں سپردِ خاک کی گئی۔ اس کی لحد پر یہ شعر کندہ ہے جو خود اسی کا بیان کیا جاتا ہے ؎

بغیرِ سبزہ نپوشد کسے مزارِ مرا	کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

اورنگ زیب عالمگیرؒ اس کی وفات کے وقت دکن میں تھا۔ اسے جب بہن کی رحلت کی خبر ملی تو بے اختیار رو پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں آرا بیگم نے تین کروڑ روپے کی جائداد چھوڑی۔ اس کی وصیت کے مطابق یہ تمام دولت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے خدام میں تقسیم کردی گئی۔ (مشاہیر نسواں۔ ناموران عالم۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ وغیرہ)

ترکان خاتون تالی رابعہؒ

سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) کے انیسویں فرمانروا سلطان ابراہیم (۱۰۴۹ھ ۱۶۳۹ء تا ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء) کی ملکہ اور بیسویں فرمانروا سلطان محمد چہارم (۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء تا ۱۰۹۹ھ ۱۶۸۷ء) کی والدہ تھی۔ نہایت عالی حوصلہ سخی اور عبادت گزار خاتون تھی۔ کثرتِ عبادت کی وجہ سے وہ "تالی رابعہ" (رابعہ ثانی) کے لقب سے مشہور ہو گئی تھی۔ اس نے ایک عظیم الشان جامع مسجد استنبول میں بنوائی اور اس کے لیے وقف مقرر کیا۔ ایک اور جامع مسجد جس کو ترکان خاتون کی ساس ملکہ ماہ پیکر نے بنوانا شروع کیا تھا، اس کی تعمیر پایۂ تکمیل تک پہنچائی۔ علاوہ ازیں رفاہِ عام کے بے شمار کام کیے جن میں کئی نہریں، مدرسوں اور شفاخانوں کی تعمیر بھی شامل ہے۔ اس طرح خدمتِ خلق کے ذریعے اس نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اس نیک ملکہ نے ۱۰۹۴ھ ۱۶۸۳ء میں وفات پائی۔ (سی ڈبلیو ولسن وغیرہ)

شہزادی روشن آرا بیگم

۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء

شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ کی صاحبزادی تھی۔ ۲ رمضان المبارک کو ملکہ ارجمند بانو (ممتاز محل) کے بطن سے پیدا ہوئی۔ جہاں آرا بیگم اس کی حقیقی بڑی بہن تھی۔ جہاں آرا بیگم کی طرح اس کی تعلیم و تربیت بھی بڑے اہتمام سے ہوئی۔ چنانچہ وہ جملہ علوم و فنون اور تدبیر و سیاست میں یکتائے روزگار ہو گئی۔ فن کتابت میں تو وہ اپنا جواب آپ تھی۔ اس کا خط اتنا پاکیزہ تھا کہ اسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ اس نے بھی جہاں آرا بیگم کی طرح ساری عمر شادی نہیں کی۔ والد کی طرف سے اس کو ایک بڑی جاگیر ملی ہوئی تھی اور معقول وظیفہ بھی ملتا تھا۔ وہ اپنی دولت کا بیشتر حصہ غریبوں مسکینوں اور محتاجوں پر صرف کر دیتی تھی۔

روشن آرا بیگم بہت دیندار اور صحیح العقیدہ خاتون تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس کو سب بھائیوں میں اورنگ زیب (عالمگیرؒ) سے زیادہ محبت تھی اور وہ اس کی دل و جان سے ہوا خواہ تھی۔ جب اس کے بھائیوں (داراشکوہ، مراد، شجاع اور اورنگ زیب) کے درمیان تخت نشینی کا جھگڑا پیدا ہوا تو اس نے ہر موقع پر اورنگ زیب کا ساتھ دیا۔ شاہجہاں کے دربار میں اورنگ زیب کے خلاف جو سازشیں ہوتی تھیں وہ ان سے اورنگ زیب کو آگاہ کر دیا کرتی تھی۔ معرکہ ساموگڈھ کے بعد اورنگ زیبؒ نے شاہجہاں کو معزول کر کے قلعہ آگرہ میں نظر بند کیا تو باپ نے بیٹے کو ملاقات کے لیے بلا بھیجا۔ اس موقع پر قلعے کے اندر داراشکوہ کے حامیوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ جب اورنگ زیب قلعے کے اندر داخل ہو تو چند مسلح عورتیں اس پر حملہ کر کے گرفتار کر لیں یا قتل کر دیں۔ شہزادی روشن آرا بیگم

نے اس منصوبے سے اورنگ زیب کو آگاہ کر دیا اور وہ اس جال میں پھنسنے سے بچ گیا۔ اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ روشن آرا بیگم کی مخلصانہ خیر خواہی اور بیدار مغزی نے اورنگ زیب کو بہت فائدہ پہنچایا اور وہ اپنے مخالفین کے عزائم کو ناکام بنا کر تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بلاشبہ یہ کامیابی اس کی اپنی تدبیر و سیاست اور عزم و ہمت کی بھی مرہونِ منت تھی، مگر اس سلسلے میں روشن آرا بیگم کی مساعی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب تھا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ اس کو بے حد عزیز رکھتا تھا۔

شہزادی روشن آرا بیگم نے رفاہِ عامہ کے سلسلے میں بھی بہت سے کام کیے لیکن اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا البتہ دلی میں اس کا لگوایا ہوا ایک باغ مدت تک باقی رہا۔ شاید یہ اب بھی وہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہو۔

(مشاہیر نسواں وغیرہ)

ملکہ اعزّالنّساء بیگم

شہاب الدین محمدؔ شاہجہان فرمانروائے ہند کی ملکہ تھی۔ وہ بالعموم "اکبر آبادی محل" کے لقب سے مشہور ہے۔ بڑی دین دار، باخدا اور مخیّر خاتون تھی۔ دلی کی اکبر آبادی مسجد اس نے ڈیڑھ لاکھ روپے (آج کل کے دو تین کروڑ روپے) کی لاگت سے تعمیر کرائی۔ پھر اس مسجد کے لیے وقف معیّن کیے اور حکم دیا کہ وقف جائداد کی آمدنی مسجد و حمام کی مرمت اور علما و طلبا کے وظائف پر خرچ کی جائے۔ دلی کے فیض بازار میں مسجد اکبر آبادی آج تک اس نیک خاتون کی یاد دلاتی ہے۔ (مشاہیر نسواں)

ستی النساء

بعض تذکروں میں اس کا نام سیدۃ النساء بیگم، بعض میں بستی خانم اور بعض میں ستی النساء خانم درج ہے۔ ملک الشعراء طالب آملی[1] کی بہن تھی۔ قرآن مجید کی حافظہ اور بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھی۔ علم طب، علم قرأت اور فارسی ادب میں اس کو خاص دسترس تھی۔ علم طب اس نے اپنے شوہر نصیرائی کاشی (برادر حکیم رکنائی کاشی) سے حاصل کیا تھا جو ایک مستند حاذق طبیب تھا۔ اس سے پہلے اس نے امراض نسواں کے علاج کی باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی۔ رسوم خانہ داری میں بھی طاق تھی اور ادب و تمیز کے لحاظ سے بھی منفرد مقام رکھتی تھی۔ اس کا وطن آمل (مازندران کا ایک شہر تھا) جہانگیر کے عہد میں طالب آملی کو ملنے ہندوستان آئی اور یہیں رہ پڑی۔

ستی النساء کو اپنے بھائی طالب آملی سے بہت محبت تھی۔ جب اس نے سنہ ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء میں وفات پائی تو اپنے پیچھے دو بیٹیاں چھوڑیں۔ ستی النساء نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کی پرورش اور تربیت اپنے ذمے لی۔ اس کے اپنے

---

[1] طالب آملی کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے نامور فارسی شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ آمل (مازندران - ایران) کا رہنے والا تھا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر ہی میں ہندسہ، منطق، فلسفہ، ہیئت، تصوف اور خوشنویسی میں درجۂ کمال کی دسترس حاصل کر لی تھی۔ وہ ابتدائے عمر ہی میں مازندران سے کاشان آ گیا تھا۔ اس نے یہیں شادی کی اور یہیں مشق سخن کا آغاز بھی کیا۔ پھر مرو جا کر وہاں کے حاکم ملکش خان کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ وہاں سے تلاش معاش میں ہندوستان آیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان سے جانی بیگ ترخان والیٔ قندھار کے پاس چلا گیا۔ سنہ ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں اس کی وفات کے بعد دوبارہ ہندوستان

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بطن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان لڑکیوں ہی کو اپنی بیٹیاں بنالیا۔ ستی النساء کے شوہر نے وفات پائی تو اس کو ملکہ ممتاز محل کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ اپنے اخلاق، شائستگی، حسنِ گفتگو، ادب و تمیز اور فنِ طب میں مہارت کی وجہ سے بہت جلد ملکہ کی منظورِ نظر بن گئی اور اس نے اُس کو اپنی "مُہردارِ خاص" مقرر کر دیا۔ شاہی حرم میں یہ ایک بہت اونچا اور معزز عہدہ تھا۔ اس کی قابلیت اور علمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے شاہجہاں بادشاہ نے اس کو اپنی چہیتی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم کی اتالیق بنا دیا۔ اس نے شہزادی کو بڑی محنت اور توجہ سے تعلیم دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادی بہت جلد قرآنِ پاک اور فارسی ادب کی تعلیم سے فارغ ہو گئی۔

ستی النساء شاہی خیرات خانہ کی بھی منتظم تھی۔ وہ ہمیشہ غریب اور محتاج عورتوں کی تلاش میں رہتی تھی کہ ان کی مدد کر سکے۔ اسی طرح وہ قابلِ شادی غیر مستطیع

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

آیا اور بعض امراء کے توسط سے اعتماد الدولہ خواجہ غیاث الدین بیگ محمد رازی (والدِ نور جہاں) کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ وہاں اس کی شاعری نے خوب بال و پر نکالے اور اعتماد الدولہ نے اس کو جہانگیر کے دربار میں پہنچا دیا۔ جہانگیر نے اس کو ۱۰۲۹ھ میں ملک الشعراء بنا دیا۔ بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق ملک الشعراء کا خطاب اسے شاہجہان کے زمانے میں ملا لیکن یہ صحیح نہیں۔ طالب آملی نے بحالتِ دیوانگی جہانگیر کے عہدِ حکومت کے آخر میں ۱۰۳۵ھ میں وفات پائی۔ اس نے بہت سی غزلیات، قصائد، قطعات، ترکیب بند اور مثنویاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ اس کے دیوان کے قلمی نسخے دنیا کے کئی اہم کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے طالب آملی کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔ آزاد بلگرامی نے اسے "شاعرِ خوش تخیل و جویائے معانی بلند و غواص لآلی لاپسند" قرار دیا ہے۔ طالب نے اپنی غزلیات میں معانی کی لطافت اور خیال کی رنگینی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کے قصائد اور قطعات کی زبان بہت شیریں اور لطیف ہے اور عہدِ جہانگیر کی رنگین و لطیف فضا کی ترجمان ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۲)

کنواری لڑکیوں کی ٹوہ بھی لگاتی رہتی تھی تاکہ عزت و آبرو کے ساتھ ان کی شادی کرا دے۔ اس قسم کی لڑکیوں کے بارے میں وہ ملکہ کی وساطت سے بادشاہ کو خبریں پہنچاتی رہتی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے اس کو ایسے نیک کاموں کے لیے روزانہ دل کھول کر روپیہ دیا جاتا تھا۔ اس طرح اس کے ہاتھ سے ہر روز ہزاروں روپیہ کارہائے خیر پر صرف ہوتا رہتا تھا۔

ملکہ ممتاز محل نے سنہ ۱۰۴۰ھ ۱۹۳۰ء میں برہان پور کے مقام پر وفات پائی۔ کچھ مدت بعد جب اس کی لاش تدفین کے لیے آگرہ لے جائی گئی تو ستی النساء بھی اس کے ساتھ گئی اور تجہیز و تکفین کے تمام مراسم اسی کے زیر نگرانی انجام دیئے گئے۔ ممتاز محل کی موت کے بعد شاہجہان نے اپنے وعدہ کے مطابق کوئی اور شادی نہیں کی اس لیے ملکہ کی تمام ذمہ داریاں جہاں آرا بیگم کے سر پر آ پڑیں اور اس کو ماں کی جگہ شاہی حرم میں صدرِ خاندان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نے بھی ستی النساء کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا اور تمام امور میں اس سے مشورہ لیتی رہتی۔ "مُہر دارِ خاص" کا عہدہ بھی بدستور ستی النساء کے پاس رہا۔ شاہی خاندان کے شہزادوں اور شہزادیوں کی شادی کے موقع پر وہی شاہی تحفہ جات لے کر جاتی تھی اور انہیں مناسب موقع پر پیش کرتی تھی۔ اس خدمت کے صلے میں اسے وہاں سے بھی کافی انعام و اکرام ملتا تھا۔ داراشکوہ اور دوسرے شہزادوں کی شادیوں اور دوسری تقاریب پر بادشاہ اور جہاں آرا بیگم نے ستی النساء کے ذریعے لاکھوں روپے خرچ کیے۔ اس سے ایک طرف تو اس پر اعتماد کا اظہار مقصود تھا اور دوسری طرف اس کی عزت افزائی منظور تھی۔

چونکہ ستی النساء نے کئی سال تک ملکہ ممتاز محل مرحومہ کی دل و جان سے خدمت کی تھی اس لیے شاہجہان اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس نے ستی النساء کو حرم کا مہتمم خاص بنا دیا تھا اور اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا۔ شاہی خاصہ کا انتظام بھی ستی النساء کے سپرد تھا۔ وہ شاہی دسترخوان اپنے سامنے بچھواتی تھی اور جب تک بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کھانے سے فارغ نہ ہو لیتے وہ وہاں

حاضر رہتی تھی۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ستی النساء نے اپنے مرحوم بھائی طالب آملی کی دو بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں بنا لیا تھا۔ ویسے تو اس کو دونوں لڑکیوں سے محبت تھی لیکن چھوٹی لڑکی سے حد سے بڑھ کر پیار تھا۔ جب یہ لڑکیاں جوان ہوئیں تو اس نے بڑے اہتمام سے ان کی شادیاں کیں۔ چھوٹی لڑکی کی شادی اس نے اپنے شوہر کے بھتیجے حکیم ضیاءالدین سے کی جسے اس نے ایران سے خاص اسی غرض سے بلایا تھا اور اس کو دربار میں ایک اچھے عہدے پر فائز کرا دیا تھا۔ لیکن ستی النساء کی بدقسمتی کہ اس کی یہ چہیتی بھتیجی شادی کے بعد زیادہ مدت زندہ نہ رہی اور اس کو داغ مفارقت دے گئی۔ یہ واقعہ ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء کا ہے۔ پھوپھی کو اس کی وفات کا شدید صدمہ پہنچا۔ وہ گیارہ دن تک اپنے مکان میں بیٹھ کر روتی رہی۔ ان دنوں اس کا قیام لاہور میں تھا جہاں اس کی قیام گاہ قلعۂ لاہور کے باہر ایک مکان میں تھی۔ اقربا اور خیرخواہوں نے اس کی تسکین و دلدہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اس کو کسی پل قرار نہ آتا تھا۔[1] آخر وہ تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو گئی۔ تلاوت کرتے کرتے ہی اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ شاہی حکیموں اور خود اس کے داماد کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود لمحہ بہ لمحہ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ آخر سب سے بڑے شاہی حکیم مسیح الزماں کو بلایا گیا۔

---

[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ وفات سے پہلے ستی النساء دلی میں تھی۔ جب شاہجہان کو اس کی حالت کا علم ہوا تو وہ جہاں آرا بیگم کو ساتھ لے کر خود اس کے مکان پر گیا اور اس کو شاہی محل میں واپس لے آیا اور ہر طریقے سے اس کی دلجوئی کی لیکن جب دوسرے دن بادشاہ شکار کی غرض سے باہر گیا تو ستی النساء پھر اپنے مکان پر واپس آگئی اور تلاوتِ قرآنی کرتے کرتے فوت ہو گئی۔ اس کی لاش پہلے امانتاً دلی میں دفن کی گئی، بعد کو جب آگرہ میں اس کا مقبرہ تیار ہو گیا تو تابوت قبر سے نکال کر آگرہ بھیج دیا گیا۔

ان سے ستی النساء کا دُور کا رشتہ بھی تھا۔ ان کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ تاریخِ وفات ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء ہجری ہے۔

دوسرے دن شاہجہان کو شاہی کیمپ میں ستی النساء کی وفات کی خبر ملی تو اس کو بڑا دکھ ہوا اور اس نے حکم دیا کہ تجہیز و تکفین میں خاص اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں دس ہزار روپے خرچ کیے گئے اور اسے لاہور بطور امانت دفن کر دیا گیا۔ ایک سال اور چند ماہ کے بعد بادشاہ کے حکم سے اس کی لاش قبر سے نکال کر آگرہ لائی گئی اور تاج محل کے مغرب میں چوک جلو خانہ کے متصل اُس مقبرہ میں دفن کی گئی جو بادشاہ نے خاص اس کے لیے تیس ہزار کی لاگت سے تیار کروایا تھا۔ بادشاہ نے اس کے اخراجات کے لیے تیس ہزار سالانہ آمدنی کا ایک گاؤں بھی وقف کر دیا۔

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ مشاہیر نسواں۔ "نقوش" لاہور نمبر "سہیلی" لاہور مئی ۱۹۳۲ء وغیرہ)

ملکہ اُمّ احمد

ترکی کے دو عثمانی فرمانرواؤں سلطان مصطفیٰ ثانی (۱۱۰۶ھ/۱۶۹۴ء تا ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) اور احمد ثالث (۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء تا ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) کی والدہ تھی۔ نہایت نیک سیرت، دیندار اور مخیرہ خاتون تھی۔ اس نے مخلوقِ خدا کی خدمت اور بھلائی کے کئی کام کیے۔ ان میں سے دو عظیم الشان جامع مسجدیں آج بھی قسطنطنیہ میں اس کی یادگار باقی ہیں — اور "یینی والدہ جامع" کہلاتی ہیں۔ ملکہ اُمّ احمد نے بارھویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے کے اخیر یا تیسرے عشرے کے شروع میں وفات پائی۔ اسے اس کی تعمیر کرائی ہوئی ایک جامع مسجد کے قریب دفن کیا گیا۔ (سی ڈبلیو ولسن)

مائی لاڈو

مائی لاڈو گیارھویں صدی ہجری میں ایک بہت مالدار اور پرہیزگار خاتون گزری ہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ شہزادہ سلیم (یعنی جہانگیر بادشاہ) کی دایہ تھی، اور اس کو اپنا دودھ پلایا تھا لیکن ایک اور روایت کے مطابق وہ شہزادہ خرم (شاہجہاں بادشاہ) کی دایہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے اپنے وقت پر باپ (سلیم) اور بیٹے (خرم) دونوں کو دودھ پلانے کی عزت نصیب ہوئی ہو۔ بہر صورت شاہی داد و دہش نے اس کو مالامال کر دیا۔ اس کے خاوند کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ دونوں میاں بیوی عابد شب زندہ دار تھے اور لاہور کے رہنے والے تھے مائی لاڈو شیخ سلیم چشتیؒ (مرشد اکبر بادشاہ) کی مرید تھی اور فریضۂ حج بھی ادا کر چکی تھی۔ اس نے لاہور کے محلہ "زین خان" یا "گزر تلہ"[1] میں بہت سی حویلیاں بنوائیں اور باغ لگوائے۔ ان کے علاوہ ایک شاندار مسجد بنوائی جس کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ پھر اپنی جائداد کا بہت سا حصہ اس مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے وقف کر دیا۔ مسجد اور مدرسے کی تعمیر سنہ ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۱ء میں مکمل ہوئی۔ مدرسے کے پہلے صدر مدرس اس دور کے ایک نامور عالم دین مولانا عصمت اللہؒ

---

[1] یہ محلہ اس جگہ تھا جہاں اب میو ہسپتال کا وہ شعبہ تعمیر ہو گیا ہے جس میں ناک کان گلے اور ہڈیوں وغیرہ کا علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میڈیکل کالج کے ہوسٹل تالاب گراؤنڈ اور نسبت روڈ کے اردگرد کا علاقہ بھی اس میں شامل تھا۔ بعض لوگ اس محلے کو محلہ ٹلہ بھی کہہ دیتے تھے۔ مائی لاڈو کی تعمیرات کے بعد اسے محلہ دائی (مائی) لاڈو کہنے لگے۔ آج کل تو اس کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اب مسجد کے سوا اس محلے کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ ہر طرف جدید طرز کی عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔

تھے۔ وہ بڑے عابد و زاہد اور متقی بزرگ تھے۔ ان کی کشش دُور دُور سے طلبہ کو مدرسے میں کھینچ لائی اور یہ مدرسہ تعلیمِ دین کا بہت بڑا مرکز بن گیا ـــــ مائی لاڈو نے سنہ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں وفات پائی۔ اس کا خاوند اس سے چند ماہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ دونوں میاں بیوی مسجد کے احاطے میں بجانب شرق مدفون ہوئے۔ ان کے فرزند محمد شکور نے اس مدرسے کی سرپرستی جاری رکھی۔ چونکہ وہ بے اولاد تھا اس نے اپنی تمام جائداد مدرسے کے نام وقف کر دی۔

امتدادِ زمانہ سے مدرسہ تو اب برباد ہو چکا ہے البتہ مسجد باقی ہے اور آباد ہے۔ اس کی عمارت پختہ چونہ کی ہے اور بہت مضبوط بنی ہوئی ہے۔ تین محرابیں ہیں اور ایک عالیشان گنبد مسقف قالبوتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک کنواں اور ایک حوض بھی تھا انہیں پُر کر دیا گیا ہے۔

(لاہور عہدِ مغلیہ میں ''نقوش'' لاہور نمبر)

بی بی گلشن

شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ (سنہ ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء تا سنہ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء) کے عہد میں مشہور شاعرہ گزری ہے۔ صاحبِ دیوان تھی اور اپنا دیوان اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر مرتب کیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ دیوان اہلِ ہند کی جنگِ آزادی (سنہ ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۷ء) کے دوران میں ضائع ہو گیا۔ اس کے یہ چند اشعار محفوظ رہ گئے ہیں:

بے رُخت خار نماید چمن گل مارا
نالۂ زاغ بود، نغمۂ بلبل مارا

در جہاں ہمچو چناریم کہ با دستِ تہی
ہرگز از جانہ رود پائے توکّل مارا

در شود قطرہ چو افتاد از ابر نیساں
رہنما سوئے ترقی ست تنزّل مارا

گلشن ز جلوۂ تو پری خانہ گشتہ است
بوئے گل از ہوائے تو دیوانہ گشتہ است (اختر تاباں)

شہزادی نادرہ بیگم

شہزادہ سلطان پرویز (خلف جہانگیر بادشاہ) کی بیٹی اور شہزادی داراشکوہ (خلف شاہجہاں) بادشاہ کی اہلیہ تھی۔

شہزادی نادرہ بیگم کا والد شہزادہ سلطان پرویز جہانگیر بادشاہ کے حکم سے الہ آباد اور دکن کی مہمات پر مامور رہا۔ جس زمانے میں اس کے بھائی شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے والد سے بغاوت کی، سلطان پرویز ہی کو اس پر قابو پانے کے لیے دکن بھیجا گیا۔ وہ رندِ بلانوش تھا۔ سنہ ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء میں بعمر ۳۵ سال دکن ہی میں فوت ہوگیا۔ لاش وہاں سے آگرہ لائی گئی اور اس کے اپنے باغ میں دفن کی گئی۔ نادرہ بیگم اس وقت کم سن تھی۔ دادا نے یتیم پوتی کے سر پر دست شفقت رکھا اور اس کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ دو سال بعد دادا بھی فوت ہوگیا اور اس کا چچا شاہجہان تخت شاہی پر بیٹھا۔ اُس نے بھی نادرہ بیگم اور اس کی والدہ کا خاص خیال رکھا۔ نادرہ بیگم کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ جوان ہوئی تو صورت اور سیرت کے اعتبار سے ہمہ صفت موصوف تھی۔ سنہ ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء میں شاہجہان نے اس کی شادی اپنے بڑے (اور سب سے پیارے بیٹے) داراشکوہ سے کر دی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ منشی ذکاء اللہ دہلوی اپنی کتاب "ظفر نامہ شاہجہاں" میں لکھتے ہیں:

"شعبان سنہ ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء میں سلطان پرویز (خلف جہانگیر) کی بیٹی سے شہزادہ داراشکوہ کا نکاح ہوا۔ بزم نشاط و چراغاں نے آرائش پائی اور آتش بازی کے عجائبات ہوئے۔ شاعروں نے تہنیت نامے لکھے اور تاریخ ہوئی "قران کردہ سعدین بہ برج جلال"

اس شادی پر بہ تفصیلِ ذیل ۳۲ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ سرکارِ خالصہ

کا چھ لاکھ، جہاں آرا بیگم (داراشکوہ کی بہن) کا ۱۶ لاکھ روپیہ اور دلہن کی والدہ کا دس لاکھ"۔ ؎1

نادرہ بیگم کے بطن سے داراشکوہ کے دو بیٹے پیدا ہوئے، شہزادہ سپہر شکوہ اور شہزادہ سلیمان شکوہ۔ نادرہ بیگم کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں کئی عمارتیں بنوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ الٰہ آباد کے قریب اس نے ایک گاؤں بسایا۔ یہ گاؤں آج بھی موجود ہے اور "بیگم کی سرائے" کے نام سے مشہور ہے۔

ساموگڑھ کے معرکے میں اورنگ زیب سے شکست کھا کر داراشکوہ پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا۔ مصیبت کے ان ایام میں نادرہ بیگم نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ وہ اس کا حوصلہ بندھاتی اور غم دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ داراشکوہ بھی بیوی کی تشفی بخش باتوں سے اپنی مصیبتوں کو ہلکا محسوس کرتا۔ اسی زمانے میں دھاندر کے زمیندار ملک جیون نے داراشکوہ کو اپنا مہمان بنا کر گرفتار کر لیا تاکہ عالمگیر بادشاہ

؎1 مولوی نور احمد چشتی اور بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ نادرہ بیگم داراشکوہ کی بہن تھی اور بچپن ہی سے حضرت میاں میرؒ کے پاس رہا کرتی تھی۔ نو سال کی عمر میں حضرتؒ کو ظہر کی نماز کے وقت وضو کرایا کرتی تھی۔ جب گیارہ سال کی ہوئی تو ایک دن حضرتؒ نے اس سے فرمایا کہ بیٹی اب تم جوان ہو، اب مجھے وضو نہ کرایا کرو۔ شہزادی کو یہ خدمت ترک کرنے پر اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ رات ہی کو فوت ہو گئی اور حضرتؒ کے حکم سے ان کی قیامگاہ کے قریب ہی دفن ہوئی۔ داراشکوہ نے اس کی قبر پر ایک عالیشان بارہ دری تعمیر کرا دی ——— لیکن یہ روایت بالکل بے سروپا ہے کیونکہ شاہجہاں کی کوئی بیٹی نادرہ بیگم نام کی نہیں تھی، اس لیے اس کے داراشکوہ کی بہن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے یہ نادرہ بیگم نام کی کوئی اور لڑکی ہو لیکن داراشکوہ نے اس کی قبر پر کوئی بارہ دری نہیں بنوائی۔ موجودہ بارہ دری عالمگیرؒ کی بنوائی ہوئی ہے۔

کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ اس سے کچھ پہلے نادرہ بیگم مصیبتیں سہتے سہتے بیمار ہو گئی اور بعارضۂ اسہال فوت ہو گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ میری لاش لاہور لے جا کر حضرت میاں میرؒ کے قدموں میں دفن کی جائے۔ چنانچہ دارا شکوہ نے اس کی لاش تابوت میں رکھ کر ستر آدمیوں کے ساتھ لاہور روانہ کر دی جہاں وہ درگاہ حضرت میاں میرؒ کے احاطہ میں دفن کی گئی۔ یہ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء کا واقعہ ہے۔ اُدھر عالمگیرؒ نے علماء سے فتویٰ حاصل کر کے ۲۲ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ/۱۰ ستمبر ۱۶۵۹ء کو دارا شکوہ کو قتل کرا دیا۔

دارا شکوہ نے اپنے عروج کے زمانہ میں احاطۂ حضرت میاں میرؒ میں کچھ عمارتوں کی تعمیر شروع کرائی تھی۔ اس کے زوال اور موت کی وجہ سے یہ تعمیر رک گئی۔ اسی زمانے میں نادرہ بیگم کی تدفین بھی احاطۂ حضرت میاں میرؒ میں ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عالمگیرؒ نے تخت نشین ہونے کے بعد ان نامکمل عمارات کی تکمیل کرائی اور نادرہ بیگم کی قبر پر موجودہ بارہ دری بنوائی۔ اس کے ساتھ ہی ایک تالاب اور پُل بھی بنوایا۔ تالاب کا تو اب نام و نشان تک مٹ چکا ہے البتہ بارہ دری اور پُل کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

(مشاہیر نسواں۔ ظفر نامہ شاہجہان۔ نقوش لاہور نمبر۔ دائرۂ معارف اسلامیہ)

شہزادی زیب النّساء

فرمانروائے ہند محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ (۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ عالمگیرؒ کی شہزادگی کے زمانے میں باختلافِ روایت ۱۰ یا ۲۰ شوال ۱۰۴۸ھ (مطابق ۲۵ فروری یا ۷ مارچ ۱۶۳۸ء) کو دولت آباد (دکن) میں پیدا ہوئی۔ محمد صالح کنبوہ کے بیان کے مطابق اس کا نام زیب النساء اس کے دادا شاہجہان نے رکھا۔ (عمل صالح)

والدہ کا نام دلرس بانو المعروف بہ رابعہ دورانی بیگم (دختر شاہنواز خاں صفوی) تھا۔ زیب النساء کی ولادت پر دولت آباد اور دلّی کے محلاتِ شاہی میں بہت خوشیاں منائی گئیں اور بے شمار زر و جواہر غربا و مساکین میں تقسیم کیے گئے۔

زیب النساء کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ جب وہ چار سال چار ماہ اور چار دن کی ہوئی تو دیندار باپ نے اسلامی طریقہ کے مطابق اس کی بسم اللہ کرائی اور حافظہ مریمؒ کو اس کی اتالیق مقرر کیا۔ حافظہ مریمؒ (اہلیہ مرزا شکراللہ خاں کشمیری) بڑی فاضلہ خاتون تھیں اور دینیات میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے زیب النساء کو بڑی توجہ اور محنت سے تعلیم دی۔ شہزادی بہت ذہین و فطین تھی۔ اس نے آٹھ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے سارا قرآنِ پاک حفظ کر لیا اور دینیات کی دوسری ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں۔ اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی تو اس کو بے حد مسرت ہوئی! اس نے اپنی ہونہار بیٹی کو تیس ہزار اشرفیاں بطور انعام دیں اور حافظہ مریمؒ کو بھی مال و دولت سے نہال کر دیا۔

اس کے بعد شہزادی نے علمُ الصرف اور علمُ النحو کی تحصیل ملا احمد جیون امیٹھویؒ (استاد اورنگ زیب عالمگیرؒ) سے کی اور کچھ دوسری دینی کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔

پھر شہزادی کو ملا سعید اشرف ماژندرانی کی شاگرد بنایا گیا۔ ملا موصوف اس دور کے یگانۂ روزگار عالم، ادیب، شاعر اور بہت اونچے درجے کے خوشنویس تھے۔ انہوں نے چودہ سال تک اس کو نہ صرف حدیث فقہ اور دوسرے ضروری علوم کی تعلیم دی بلکہ خوشنویسی بھی سکھائی اور اس میں شعر و ادب کا ذوق بھی پیدا کیا۔

مستعد خان ساقی "مآثرِ عالمگیری" میں لکھتا ہے کہ:

"زیب النساء عربی اور فارسی کے جملہ علوم و فنون پر فاضلانہ دسترس رکھتی تھی۔ نستعلیق، نسخ اور شکستہ لکھنے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔"

کتب خانۂ بھوپال (بھارت) میں زیب النساء کی لکھی ہوئی ایک نادر وصلی محفوظ ہے۔ اس میں اس نے فنِ خطاطی کا پورا پورا کمال دکھایا ہے۔ اس وصلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادی نے یہ وصلی عالمگیرؒ کی خدمت میں اس وقت پیش کی تھی جب اس نے ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں مرہٹوں کے دارالحکومت ستارہ کو فتح کیا تھا۔ وصلی کے اس شعر سے فتح ستارہ کی تاریخ نکلتی ہے۔

از معجزۂ شق القمر عیاں شد
اعجازِ خسروی ہیں شقِ ستارہ آمد — فتح ستارہ

زیب النساء

تمام مؤرخین اور تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ شہزادی زیب النساء عربی اور فارسی میں نہایت اعلیٰ استعداد رکھتی تھی اور علم و ادب سے دلی لگاؤ رکھتی تھی۔ طبیعت نکتہ رس پائی تھی۔ شعر خوب سمجھتی تھی اور خود بھی کبھی کبھی مشقِ سخن کرتی تھی۔ وہ علماء اور شعراء کی بہت قدر شناس تھی اور اکثر انہیں انعام و اکرام سے نوازتی رہتی تھی۔ اپنے استادوں کے علاوہ وہ حاجی عبدالوسع بن حاجی محمد جان قدسی، عزیز اللہ خان عزیز اور مرزا خلیل کی ان کے کمالاتِ علمی کی بناء پر خصوصیت سے سرپرستی کرتی تھی۔ اس کی خواہش پر ملا صفی الدین اردبیلی نے امام فخر الدین رازیؒ کی "تفسیرِ کبیر" کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "زبدۃ التفاسیر" (بروایت دیگر

"زیب التفاسیر") رکھا۔ یہ ترجمہ کئی جلدوں میں تھا۔ اب صرف ایک (پانچویں) جلد بودلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ باقی جلدوں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ شہزادی نے ملا صاحب کو اس خدمت کے صلے میں خطیر رقم عنایت کی۔ اس کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ شاہی کتب خانے کی بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر اپنا کتب خانہ بنایا جس میں نہایت نادر اور نایاب کتابیں جمع کیں۔ مستعد خان ساقی "مآثر عالمگیری" میں لکھتا ہے کہ:

"اس زمانہ میں کسی کا کتب خانہ شہزادی زیب النساء کے کتب خانے سے بڑا نہ تھا۔"

شہزادی کی معارف پروری کے بارے میں غلام علی آزاد بلگرامی "ید بیضا" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اس نے اپنی ہمت کو ارباب فضل و کمال کی ترقی میں مصروف رکھا۔ شاعروں، منشیوں اور خوشنویسوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کی قدردانی کے سائے میں پرورش پاکر آسودگی سے زندگی بسر کرتی تھی۔ بہت سی کتابیں اس کے نام پر تصنیف و تالیف ہوئیں۔"

علامہ شبلی نعمانی ؒ نے اپنے ایک مقالے میں زیب النساء کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"فارسی زبان دانی میں کمال رکھتی تھی۔ نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی۔ خود صاحب تصنیف گزری ہے لیکن اس کی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں۔ مجمع الغرائب میں ملا سعید اشرف مازندرانی نے لکھا ہے کہ زیب النساء کی ایک بیاض ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام ارادت فہم تھا، حوض میں گر پڑی، اس پر انہوں (ملا سعید اشرف) نے ایک قطعہ لکھ کر شاہزادی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قطعہ کا وہ شعر جس میں ارادت فہم کا نام آیا ہے، یہ ہے

ودش از دست ارادت فہم خاک بر دہن　　چوں بیاض سینۂ ماہی در آب افتادہ است

اس کے علاوہ تذکروں میں شہزادی کی ایک اور تصنیف "زیب المنشآت" کا ذکر ملتا ہے۔ تذکرۃ الغرایب کے مصنف نے لکھا ہے کہ "میں نے اس کو دیکھا ہے۔ زیب المنشآت شاہزادی کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے" .... اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعرہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا۔"

بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء نے نمونہ ہائے خطی کا ایک مجموعہ اور مرقع تصاویر بھی مرتب کیا تھا۔ زیب النساء کی طرف ایک دیوان بھی جو "دیوانِ مخفی" کے نام سے چھپا ہے منسوب کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ زیب النساء کا تخلص مخفی تھا اور نہ اس کا یہ دیوان ہے۔ اس دیوان کا مصنف مخفی تخلص کا ایک خراسانی شاعر ہے جو ہندوستان بھی آیا تھا۔ بقول بعض وہ شہزادی زیب النساء کی ملازمت میں بھی رہا۔ یہ ثابت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ دیوانِ مخفی کو زیب النساء سے دور کی نسبت بھی نہیں کیونکہ اس دیوان کے مندرجات خود اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ یہ کسی تہی دست مرد شاعر کا کلام ہے جس میں اس نے کہیں اپنی پریشان حالی اور افلاس و غربت کا رونا رویا ہے کہیں دوریٔ وطن کا شکوہ اور حاسدوں کی کارستانیوں کا ذکر کیا ہے اور کہیں صلہ کا تقاضا کیا ہے۔

بعض تذکروں میں بہت سی رباعیاں، غزلیں اور متفرق اشعار زیب النساء سے منسوب کیے گئے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی نسبت زیب النساء سے صحیح ہے۔ ان میں سے کچھ اشعار یہ ہیں:-

آہستہ برگ گل بہ فشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

اے آبشار نوحہ گر از بہر چیستی   چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی[1]

---

[1] بعض تذکروں میں یہ مصرع اس طرح درج ہے۔ چیں بر جبیں فگندہ ہم از بہر کیستی۔

آیا چہ درد بود کہ چوں من تمام شب   سر را بسنگ می زنی دمی گریستی[1]

بشکنند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت
غنچۂ باغِ دلِ ما زیبِ دستارے نشد

دخترِ شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام   زیب و زینت بس ہمیں نامِ من زیب النساست

رمضان ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب عالمگیرؒ نے تخت و تاج کے دوسرے تمام دعویداروں کو مغلوب کرکے تاجِ شاہی سر پر رکھا تو زیب النساء نے اس موقع پر اس کی خدمت میں ایک بیش بہا نذر پیش کی جسے بادشاہ نے قبول کرلیا اور شہزادی کو چار لاکھ روپے کا انعام مرحمت فرمایا۔ اس سے اگلے سال جشنِ تخت نشینی کے موقع پر شہزادی نے پھر نذر پیش کی۔ بادشاہ نے اسے بھی قبول فرمالیا اور شہزادی کو بہت سا زر و جواہر عطا کیا۔

۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۴ء میں عالمگیرؒ کشمیر گیا، شہزادی زیب النساء بھی اس کے ہمراہ تھی جب شاہی قافلہ چشمہ بیگم آباد (اچھابل) پہنچا جو زیب النساء کی جاگیر میں تھا تو شہزادی نے باپ کو کھانے کی دعوت دی۔ بادشاہ نے یہ دعوت قبول کرلی۔ دعوت کے بعد شہزادی نے بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی اور ایک بڑی بھاری رقم اس پر نچھاور کرکے عرض کی کہ بادشاہ یہاں چند یوم قیام

---

[1] بعض تذکروں میں یہ شعر اس طرح درج ہے:

دردت چہ درد بود کہ چوں من تمام شب   سر را بہ سنگ می زدی دمی گریستی

فرمائیں۔ بادشاہ نے اس کی درخواست خندہ پیشانی سے منظور کرلی اور چند روز وہاں قیام فرمایا۔ اس کے بعد شہزادی کا قیام بالعموم دلی یا لاہور میں رہا۔

زیب النساء عام طور پر علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف رہتی تھی اور ملکی سیاست سے الگ تھلگ رہتی تھی لیکن ایک دفعہ وہ ایک غلط فہمی کی بناء پر عتاب شاہی کی زد میں آگئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء میں اہل راجپوتانہ نے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ بادشاہ نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے زیب النساء کے حقیقی بھائی شہزادہ محمد اکبر کو بھیجا۔ شہزادہ جودھپور پہنچ کر اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے باغی راجپوتوں کے فریب میں آکر انہی سے مل گیا۔ شہزادی کے بعض حاسدوں نے بادشاہ کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ وہ شہزادہ محمدؐ اکبر کی حامی ہے۔ چنانچہ وہ شہزادی سے بدظن ہوگیا اور اسے سلیم گڑھ کے قلعے میں نظر بند کردیا، اس کے ساتھ ہی اس کا سالانہ وظیفہ (چار لاکھ روپیہ) بند کردیا اور تمام مال و متاع بھی ضبط کرلیا مگر جلد ہی تحقیق کے بعد ثابت ہوگیا کہ شہزادی بالکل بے قصور ہے۔ چنانچہ اسے باعزاز تمام رہا کردیا گیا، وظیفہ بھی بحال کردیا گیا اور تمام مال و متاع بھی واپس کردیا گیا۔

شہزادی کو اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت تھی اور وہ ان کے دکھ سکھ میں برابر شریک رہتی تھی۔ ۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۳ء میں شہزادہ کام بخش کی شادی سیادت خاں صفوی کی بیٹی آرام بانو سے ہوئی۔ اس شادی کی تمام رسوم زیب النساء نے ادا کیں اور شادی بھی اسی کے محل میں ہوئی۔

۱۱۰۵ھ / ۱۶۹۳ء میں شہزادہ اعظم شاہ مرض استسقاء میں مبتلا ہوگیا۔ یہ بڑا خطرناک مرض تھا۔ اس بیماری کے دوران میں زیب النساء اپنی بہن زینت النساء کے ساتھ مل کر دن رات اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ شہزادہ محمدؐ اکبر جب اپنے باپ سے باغی ہوکر راجپوتوں سے مل گیا تو زیب النساء اور اس کے درمیان اس زمانے میں بھی مراسلت ہوتی رہی۔ یہی امر عالمگیر کو اس سے بدظن کرنے کا باعث ہوا۔

شہزادی نے ساری عمر تجرد میں گزاری۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ سے منسوب ہوئی تھی مگر اس کے قتل کے بعد دل شکستہ ہوگئی اور عمر بھر شادی نہ کی۔ لیکن یہ محض قیاسی بات ہے۔ اس کے شادی نہ کرنے کا سبب اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ویسے وہ نہایت عفیف و پارسا خاتون تھی اور احکامِ شریعت کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ سیرت و کردار کے اعتبار سے نہایت بلند مقام رکھتی تھی۔ ہمیشہ سادہ اور سفید لباس پہنتی تھی۔ زیب و زینت کا مطلق شوق نہ تھا تمام عمر سرمہ اور مسی کا استعمال نہیں کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا کوئی نماز قضا نہیں کی بلکہ نوافل اور مستحب بھی بڑے ذوق و شوق سے ادا کرتی تھی۔ اس کی فیاضی کی تو کوئی حد و نہایت نہیں تھی! اربابِ کمال کی قدر دانی اور سرپرستی کے علاوہ اس نے بے شمار غریب لڑکیوں، بیوہ عورتوں یتیم بچوں اور محتاجوں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ بنگالی اور اردو کے بعض غیر ذمہ دار ناول نویسوں اور ڈرامہ نگاروں نے اس کے کئی معاشقے بیان کیے ہیں لیکن یہ سب فرضی اور من گھڑت ہیں اور ان میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔

شہزادی زیب النساء نے اپنی زندگی میں بہت سے باغات لگوائے، عمارتیں بنوائیں اور سرائیں بنوائیں مگر امتدادِ زمانہ نے قریب قریب ان سب کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا ہے بعض تذکرہ نگاروں نے لاہور کے چوبرجی باغ کو زیب النساء سے منسوب کیا ہے لیکن یہ غلط ہے چوبرجی باغ زیب النساء کی پھوپھی جہاں آرا بیگم نے لگوایا تھا۔ اپنے دور میں یہ بڑا شاندار باغ تھا مگر اب اس کی صرف ڈیوڑھی باقی رہ گئی ہے۔

شہزادی زیب النساء نے ماہ محرم ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء میں دلّی میں وفات پائی! اس وقت اس کی عمر سرسٹھ سال کی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ ان دنوں دکن میں تھا اس کو شہزادی کی وفات کی اطلاع ملی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے حکم دیا کہ سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ نور محمد خاں شہزادی کے نام پر صدقات و خیرات غریبوں میں تقسیم کریں اور باغ سی ہزاری میں اس کے مقبرے کی

تعمیر کا انتظام کریں۔ چنانچہ زیب النساء کو جہاں آرا بیگم کے متروکہ باغ سی ہزاری واقع دلی میں دفن کیا گیا اور اس پر شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ "سیر المنازل" مصنفہ سنگین بیگ بن علی اکبر بیگ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء کا مقبرہ دلی میں کابلی دروازہ کے باہر سی ہزاری باغ میں تھا۔ مزار کے کتبہ پر یہ الفاظ کندہ تھے: "کل من علیہا فان۔ ہذا مرقد بنت الکبریٰ للعبد المذنب العاصی المخفوضۃ برحمۃ الرحیم الکریمۃ الحافظۃ زیب النساء المرجو عباد الصالحین ان یدعوا لہا بالغفران والرضوان وتاریخ فوتہا قولہ وادخلی جنتی"

سر سید احمد خاں نے بھی "آثار الصنادید" میں اس مقبرے کا ذکر کیا ہے۔ ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء میں حکومت ہند نے راجپوتانہ۔ مالوہ" ریلوے لائن بچھائی تو یہ مقبرہ اس کے راستے میں آ گیا اور اسے مسمار کر دیا گیا۔ اگرچہ اب اس مقبرے کا نام و نشان باقی نہیں ہے لیکن یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ شہزادی زیب النساء دلی میں فوت ہوئی اور وہیں دفن ہوئی۔

بعض تذکرہ نگاروں نے نواں کوٹ کے ایک مقبرے کو زیب النساء کا مقبرہ بتایا ہے۔ لیکن بہت سے محققین نے قوی دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ اس مقبرے کا انتساب زیب النساء سے غلط طور پر کیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مقبرے کی ساخت شاہجہانی دور کی ہے۔ دوسری بات جو بہت اہم ہے یہ ہے کہ یہ کسی عورت کا مقبرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ تیموریوں میں دستور تھا کہ وہ خواتین کی قبریں تہہ خانے میں بنواتے اور دوسری منزل پر خالی تعویز تعمیر کرتے۔ نواں کوٹ والے مقبرے میں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی مرد کا مقبرہ ہے جو شاہجہاں کے عہد میں فوت ہوا۔ بعض مؤرخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقبرہ عہد شاہجہانی کے ایک امیر افضل خاں علامی (المتوفی ۱۰۳۹ھ / ۱۶۳۰ء) کا ہے۔ کچھ کی رائے یہ ہے کہ اس مقبرے میں ملا محمد فاضل خاں مدفون ہے جو عہد شاہجہانی اور عہد عالمگیری کا نامور امیر تھا۔ وہ ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء میں کشمیر میں فوت ہوا اور اس کی لاش لاہور میں دفن کی گئی۔ (واللہ اعلم بالصواب) بہر صورت یہ مقبرہ زیب النساء کا ہرگز نہیں۔

(مآثر عالمگیری۔ مخزن الغرائب۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۰۔ مشاہیر نسواں۔ ماہنامہ "عالمگیر" لاہور، تاریخ نمبر ۱۹۶۳ء۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء۔ ماہنامہ مہر نیم روز" کراچی اپریل ۱۹۵۵ء۔ مقالات شبلی)

شہزادی زینت النسّاء

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی دوسری صاحبزادی کا نام ہے۔ دلرس بانو المعروف بہ رابعہ دورانی بیگم کے بطن سے تھی۔ سنہ ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۳ء) ہجری میں پیدا ہوئی۔ دین سے محبت اور شریعت کی پابندی اس کو اپنے جلیل القدر والد سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ علوم دینی میں رتبۂ تبحر رکھتی تھی۔ علاوہ ازیں بڑی معارف پرور اور سخی تھی! اخلاق بھی بہت بلند تھے۔ سنہ ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۳ء) میں اس کا بھائی شہزادہ اعظم شاہ مرض استسقاء میں مبتلا ہوا تو وہ شہزادی زیب النساء کے ساتھ مل کر دن رات اس کی تیمارداری میں مشغول رہی اور ہر قسم کا آرام اپنے اوپر حرام کر لیا جب تک شہزادہ بیمار رہا وہ بھی اس کے ساتھ پرہیزی غذا استعمال کرتی رہی۔ اس نے خاص اپنی لاگت اور اہتمام سے شہر دہلی میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی۔ یہ مسجد دہلی کے محلہ دریا گنج میں اب بھی موجود ہے اور "زینت المساجد" کے نام سے مشہور ہے۔ شہزادی زینت النساء نے سنہ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۹ء) یا بروایت دیگر سنہ ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں وفات پائی اور "زینت المساجد" کے صحن میں دفن کی گئی۔

شہزادی کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً کچھ شعر کہہ لیا کرتی تھی۔ زینت تخلص تھا۔ اس کی لوحِ مزار پر اس کا اپنا یہ شعر کندہ تھا ؎

مونسِ ما در لحد فضلِ خدا تنہا بس است
سایۂ از ابرِ رحمت قبر پوشِ ما بس است

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ مشاہیر نسواں۔ "ادیب" دہلی نومبر ۱۹۳۹ء)

شہزادی بدر النسّاءؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تیسری بیٹی تھی۔ اورنگ آبادی محل کے بطن سے تھی۔ سنہ ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) ہجری میں پیدا ہوئی۔ قرآن کریم کی حافظہ اور بڑی عالمہ فاضلہ تھی۔ اس نیک شہزادی نے صرف چوبیس برس کی عمر پائی اور سنہ ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء) میں فوت ہو گئی۔

(ماہنامہ "ادیب" دہلی نومبر ۱۹۳۹ء)

شہزادی زبدۃ النساءؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی چوتھی بیٹی تھی۔ دلرس بانو کے بطن سے تھی سنہ ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۰ء میں پیدا ہوئی دوسری بہنوں کی طرح یہ شہزادی بھی بہت لائق تھی۔ جملہ علومِ دینی میں ید طولیٰ رکھتی تھی اور احکامِ شریعت پر سختی سے عمل کرتی تھی۔ اس کو اپنے والد سے بہت محبت تھی سنہ ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء میں والد کی وفات کے چند دن بعد اس نے بھی پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ (ماہنامہ "ادیب" دہلی نومبر ۱۹۶۳ء)

حافظہ مریمؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے معتمد عنایت اللہ خاں کی والدہ اور مرزا شکر اللہ خاں کشمیری کی زوجہ تھیں۔ ان کا خاندان نیشاپور سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ یہ خاندان علم و فضل کے اعتبار سے نہایت ممتاز مقام رکھتا تھا۔ بی بی مریم قرآنِ حکیم کی حافظہ ہونے کے علاوہ دوسرے دینی علوم میں کافی دسترس رکھتی تھی۔ چنانچہ عالمگیر بادشاہؒ نے حافظہ مریم کو اپنی لختِ جگر زیب النساء کا اتالیق مقرر کیا۔ اس وقت شہزادی کی عمر چار سال چار ماہ اور چار دن کی تھی۔ حافظہ مریمؒ نے شہزادی کو خوب جی لگا کر پڑھایا اور پونے چار سال کے عرصے میں اسے سارا قرآن مجید حفظ کرا دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے زیب النساء کو دینیات کی بعض ابتدائی کتابیں بھی پڑھائیں۔ جب اورنگ زیب عالمگیرؒ کو شہزادی کے قرآنِ پاک حفظ کرنے کی اطلاع ہوئی تو اس کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ اس نے زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں عنایت کیں اور حافظہ مریمؒ کو بھی مالا مال کر دیا۔ (مآثرِ عالمگیری، دائرہ معارفِ اسلامیہ)

ملکہ ماہ پیکر

سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) کے اٹھارہویں فرمانروا سلطان مراد چہارم (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء تا ۱۰۴۹ھ/۱۶۴۰ء) کی والدہ تھی۔ تخت نشینی کے وقت سلطان مراد کی عمر صرف بارہ برس کی تھی اور سلطنت کی حالت نہایت ابتر تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ سلاح خانوں میں ہتھیاروں اور گولہ بارود کی کمی تھی۔ ایشیائے کوچک مصر اور لبنان کے گورنروں نے سرکشی پر کمر باندھی تھی۔ بعض سرحدی مقامات پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ بحری قزاقوں نے بحیرہ اسود اور آبنائے باسفورس میں اودھم مچا رکھا تھا۔ غرض ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونا نوعمر سلطان کے بس کی بات نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی والدہ ماہ پیکر بڑی دانشمند، باہمت اور صاحبِ تدبیر خاتون تھی۔ اس نے بڑے عزم و استقلال کے ساتھ تمام مشکلات کا سامنا کیا اور اپنے بیٹے کا اقتدار قائم رکھا۔ سلطان جب بالغ ہوا اور رموزِ سلطنت سمجھنے لگا تو اس نے کاروبارِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا مگر تمام اہم معاملات میں اپنی دانشمند والدہ کا مشورہ ضرور لیتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد فوج کا ایک حصہ بگڑ گیا اور اس نے سلطان کے سامنے وزیرِ اعظم کو قتل کر ڈالا۔ سلطان بڑا بہادر آدمی تھا، ماں کے مشورے کے مطابق وہ باغیوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس نے اپنے وفادار سپاہیوں کو ساتھ لے کر باغیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ سلطان نے بیشتر باغیوں کو قتل کر دیا جو باقی بچے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد سلطان ایشیائے کوچک کے سرکشوں کو زیر کر کے بغداد کی طرف بڑھا جس پر ایرانی قابض تھے۔ سلطان نے ایرانیوں کو شکست دے کر بغداد پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کے بعد وہ یورپ پر لشکر کشی کی

تیاریاں کر رہا تھا کہ موت کا پیغام آگیا اور اس نے عین عالمِ شباب میں لاولد وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی ملکہ ماہ پیکر ہی کے حسنِ تدبیر کی مرہونِ منت تھی۔ مگر ابراہیم اچھا حکمران ثابت نہ ہوا۔ ملکہ نے اس کو بار بار سمجھایا کہ وہ عیاشی اور غفلت شعاری کو ترک کر دے لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر اس کے اللوں تللوں اور ناشائستہ حرکات سے تنگ آکر عمائدِ سلطنت کا ایک وفد ملکہ ماہ پیکر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے درخواست کی کہ سلطان ابراہیم کو معزول کر کے اس کے بیٹے محمدؒ (چہارم) کو تخت نشین کیا جائے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد ملکہ نے ان کو اجازت دے دی۔ چنانچہ سنہ ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء میں محمدؒ (چہارم) کو سلطان ابراہیم کی جگہ تخت نشین کیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ ملکہ ماہ پیکر نے پوتے کی سرپرستی بھی جاری رکھی اور کاروبارِ حکومت چلتا رہا۔ ملکہ نے سنہ ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۴ء میں وفات پائی تو حالات بگڑنے لگے لیکن خوش قسمتی سے سنہ ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء میں سلطان محمدؒ چہارم کو محمد پاشا کپرلی جیسا قابل وزیرِ اعظم مل گیا۔ اس نے حالات درست کر کے سلطنت کو پھر ترقی اور عروج کی راہ پر ڈال دیا۔

ملکہ ماہ پیکر کی یادگار ایک عظیم الشان جامع مسجد ابھی تک قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ یہ چنیلی جامع کہلاتی ہے۔ ملکہ نے یہ مسجد سنہ ۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء میں تعمیر کروائی تھی۔

(تاریخِ اسلام۔ تاریخِ خلافتِ عثمانیہ۔ مشاہیرِ نسواں)

بی بی صاحب جی

عہدِ شاہجہانی کے نامور امیر نواب علی مردان[1] خان کی دختر نیک اختر تھی۔ اس کی شادی اسی دَور کے ایک نامور امیر خلیل خان یزدی کے بیٹے امیر خان سے ہوئی۔ صاحب جی نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور اس کی تربیت نہایت عمدہ طریقے سے کی گئی تھی۔ امیر خان اس کی سلیقہ شعاری، ہوشمندی، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی بنا پر اس کی بے حد قدر کرتا تھا لیکن ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے امیر خان اس سے خفا ہوگیا۔ واقعہ یہ تھا کہ صاحب جی ایک دفعہ چوڈولے (ایک قسم کی پالکی) میں بیٹھ کر دلی کے ایک راستہ سے گزر رہی تھی کہ ایک شاہی ہاتھی بدمست ہوکر ادھر آگیا۔ صاحب جی کے خدام نے اس کا رُخ پھیرنے کے بہتیرے جتن کیے لیکن ہاتھی چوڈولے کے قریب پہنچ گیا۔ خدام بے بسی کے عالم میں اضطراری طور پر ادھر ادھر ہٹ گئے۔ قریب تھا کہ ہاتھی چوڈولے کو الٹ کر پاؤں تلے روند ڈالے، صاحب جی نے (اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے) چوڈولے سے چھلانگ لگا دی اور قریب کی ایک

---

[1] علی مردان خان کا والد گنج علی خان امرائے ایران سے تھا اور ۱۰۳۲ھ میں شاہِ ایران کی طرف سے قندھار کا ناظم تھا۔ شاہِ ایران اس کا بہت ادب کرتا تھا اور اسے ارجمند بابا کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ اس کی وفات پر شاہِ ایران نے اس کے بیٹے علی مردان خان کو قندھار کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شاہ عباس صفوی کا دورِ حکومت تھا۔ شاہ عباس نے ۱۰۳۸ھ میں وفات پائی تو اس کا پوتا صفی تختِ حکومت پر بیٹھا۔ وہ علی مردان خان کے مخالف امراء کے بھڑکانے پر اس سے بدظن ہوگیا۔ علی مردان خان کو بادشاہ کے رویّہ سے اس قدر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دکان میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ صاحب جی نے جان تو بچالی لیکن بے پردہ ہو جانے کے "جرم" میں امیر خان اس سے ناراض ہو گیا۔ (اس زمانے میں اونچے طبقہ کے لوگوں میں پردے کی نہایت سختی سے پابندی کی جاتی تھی)۔ شاہجہاں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ڈکھ ہوا کہ اس نے شاہجہان کی اطاعت قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور سنہ ۱۰۴۷ھ میں قندھار میں شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اس کے نام کے سکّے مسکوک کرائے۔ شاہجہاں نے اُس کی اس کارگزاری سے خوش ہو کر قیمتی خلعت اور تین لاکھ روپے بھیجے۔ دو لاکھ اس کے اپنے لیے اور ایک لاکھ اس کے عزیزوں اور خادموں کے لیے۔ چند ماہ بعد وہ قندھار شاہجہانی امراء کے حوالے کر کے رجب سنہ ۱۰۴۸ھ میں لاہور پہنچ گیا، جہاں بادشاہ اس وقت مقیم تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو ایک لاکھ روپیہ سفر خرچ کے طور پر دیا جائے اور بیس ہزار روپے اس کے ملازموں کو دیئے جائیں۔ اس کے علاوہ اس کے قریبی رشتہ داروں کو بھی نقد انعام اور قیمتی تحفے دے کر اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ پھر علی مردان خان کو بادشاہ نے ششش ہزاری ہزار کا منصب دے کر ناظم کشمیر مقرر کیا (سنہ ۱۰۴۹ھ) اگلے سال اس کو امیر الامراء بنا کر اور ہفت ہزاری ہفت ہزار کا منصب دے کر پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس دوران میں وہ کچھ عرصہ کے لیے بلخ و بدخشاں کی تسخیر کے سلسلے میں شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ رہا اور اوزبکوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

علی مردان خان کا نظامتِ پنجاب کا زمانہ بہت شاندار تھا۔ اس نے صوبے کا نظم و نسق نہایت خوش اسلوبی سے چلایا اور منکرات فحاشی اور فسق و فجور کو ختم کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ اس کے دورِ حکومت میں جو مشٹنڈے فقیر اور ملنگ بے نماز نظر آتے تھے اور فسق و فجور کے مرتکب پائے جاتے تھے ان کو گرفتار کر کے کابل بھیج دیا جاتا تھا۔

علی مردان خان ایک اعلیٰ درجے کا انجینئر بھی تھا اور اس کی زیادہ تر شہرت بھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو خبر ہوئی تو اس نے امیر خان کو بُلا کر سمجھایا کہ تمہاری بیوی نے جو کچھ کیا اس کے لیے وہ قابلِ تحسین ہے نہ کہ قابلِ تعزیر۔ فی الحقیقت اس نے اپنی جان ہی نہیں بچائی بلکہ تمہاری عزت بھی بچائی۔ اگر ہاتھی چوڈولے کو پامال کر کے صاحب جی کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالتا تو اس کی برہنہ لاش سرِ بازار پڑی ہوتی۔ اس وقت تمہاری عزت کہاں رہتی؟ امیر خان کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس کا دل صاحب جی کی طرف سے صاف ہو گیا۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں امیر خان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بادشاہ نے اس کو کابل کا گورنر مقرر کیا۔ اس عہدے پر وہ سنہ ۱۰۸۹ھ / ۱۶۷۸ء سے لے کر اپنی وفات سنہ ۱۱۰۹ھ / ۱۶۹۸ء تک فائز رہا۔ کابل کے لوگ فطرتاً بڑے سرکش تھے لیکن امیر خان نے صوبے میں مکمل امن و امان قائم رکھا اور کسی شورش پسند کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ امیر خان کے حسنِ انتظام کے پیچھے صاحب جی کی بیدار مغزی اور فراست کارفرما تھی۔ وہ بڑی با تدبیر خاتون تھی اور امورِ سیاست میں زبردست مہارت رکھتی تھی۔ چنانچہ امیر خان حکومت کا تمام کاروبار

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اسی وجہ سے ہے۔ اس نے پنجاب اور کشمیر میں بے شمار اعلیٰ درجے کی عمارتیں بنوائیں۔ باغات لگوائے۔ نہریں کھدوائیں۔ دو شہر بسائے۔ ان کے علاوہ دلّی اور آگرے میں تعمیر ہونے والی شاہی عمارتوں کی منصوبہ بندی میں بھی حصہ لیا۔ اگر اسے عہدِ شاہجہانی کا "میرِ تعمیرات" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ سنہ ۱۰۶۰ھ میں وہ اسہال کے عارضے میں مبتلا ہو گیا اور بادشاہ سے رخصت لے کر کشمیر روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں ۱۲ رجب سنہ ۱۰۶۰ھ کو فوت ہو گیا۔ اس کی میّت کو لاہور لا کر اس کی ماں کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس کا شاندار مقبرہ لاہور میں ابھی تک اس کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ یہ مقبرہ اس نے اپنی والدہ کے لیے تعمیر کرایا تھا لیکن تقدیر میں اسی کو اس کا اپنا مدفن بننا بھی لکھا تھا۔ (مآثر الامراء۔ نقوش لاہور نمبر)

(شاہکار لاہور اکتوبر ۱۹۳۹ء۔ چٹان لاہور ۶/ ۶۲ء)

اسی کے مشوروں کے مطابق چلاتا تھا۔ ۱۱۰۹ھ (۱۶۹۸ء) میں اس نے ایک دفعہ اپنے لشکر کے ساتھ کسی جگہ کا عزم کیا۔ صاحب جی اس کے ساتھ تھی۔ اثنائے سفر میں جب وہ ایک طویل وادی سے گزر رہا تھا کہ اس کا وقت آخر آ پہنچا اور وہ تیرِ قضا کا شکار ہو گیا۔ صاحب جی نے اس موقع پر کمال تدبر اور حکمت سے کام لیا۔ وہ افغانوں کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر ان کو امیر خان کے مرنے کی خبر مل گئی تو وہ شورش برپا کر دیں گے جس پر قابو پانا بہت مشکل ہو گا۔ اس نے شوہر کی موت کے جانکاہ صدمے کو اپنے چہرے سے مطلق ظاہر نہ ہونے دیا اور ایک انتہائی قابلِ اعتماد آدمی کو امیر خان کا لباس پہنا کر اس کی پالکی میں بٹھا دیا۔ (یہ سفر امیر خان علالت کی وجہ سے پالکی میں بیٹھ کر کر رہا تھا) اس کی جھلک کھڑکی کے شیشہ سے باہر نظر آتی تھی۔ اس طرح سارا لشکر یہی سمجھتا رہا کہ امیر خان زندہ ہے۔ جب یہ سفر ختم ہوا تو صاحب جی نے شوہر کی موت کا اعلان کیا اور سوگ منایا۔ تمام سردارانِ قبائل نے اپنی خواتین کو تعزیت کے لیے اس کے پاس بھیجا اس نے ان کا بہت احترام کیا اور بہت خاطر مدارات کی۔ جب وہ رخصت ہونے لگیں تو ان کے ذریعے تمام سرداروں کو کہلا بھیجا کہ وہ حکومت کے وفادار رہیں اور دستور کے مطابق تمام واجبات ادا کرتے رہیں۔ اس صورت میں ان کے مراتب اعزاز برقرار رہیں گے جب تک نیا گورنر نہیں آجاتا میں حکومت کی نگران ہوں۔ اگر کسی نے حکومت کے احکام کی سرتابی کی کوشش کی تو پھر ع

ہمیں میداں ہمیں چوگان و ہمیں گوئے

میں سرکشوں سے نبٹنا خوب جانتی ہوں۔ سرکشوں کا سر کچل کر مجھے دوامی عزت حاصل ہو گی اور شکست کھانے والوں کے حصے میں دوامی ذلت اور رسوائی آئے گی۔

افغان سرداروں نے صاحب جی کے کڑے تیوروں کو سمجھ لیا اور اس کے عہد میں کسی نے سر اٹھانے کی جرأت نہ کی۔

اُدھر اورنگ زیب عالمگیرؒ کو امیر خان کی وفات کی اطلاع ملی تو اس کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں صوبۂ کابل میں بغاوت کی آگ نہ بھڑک اٹھے اور نئے گورنر کے پہنچنے تک حالات خطرناک صورت نہ اختیار کر جائیں۔ اس نے فوراً امیر الامراء ارشد خاں کو طلب کر کے اس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ جہاں پناہ تشویش کی کوئی بات نہیں امیر خان کی بیوہ بڑی لائق بہادر باہمت اور باتدبیر خاتون ہے۔ امیر خان کی زندگی میں بھی سارا کاروبارِ حکومت اسی کے مشورے سے چلتا تھا اور اب بھی اس کے جیتے جی کسی فتنہ کا احتمال نہیں ہے۔ چنانچہ عالمگیرؒ نے صاحب جی کو فرمان بھیجا کہ جب تک کوئی دوسرا گورنر مقرر نہیں کیا جاتا کابل کی صوبے داری کے فرائض تم ہی انجام دیتی رہو۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ نئے گورنر کے تقرر میں تاخیر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ دو سال گزر گئے۔ اس عرصے میں صاحب جی نہایت خوش اسلوبی سے صوبے کا کاروبارِ حکومت چلاتی رہی۔ ۱۱۱۱ھ / ۱۷۰۰ء کے آغاز میں نئے گورنر نے اس کو ان فرائض سے سبکدوش کر دیا۔

امیر خان سے صاحب جی کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی اس لیے اس نے صاحب جی سے پوشیدہ ایک اور شادی کر لی تھی۔ دوسری بیوی سے کئی بچے ہوئے۔ لعبدیں صاحب جی کو معلوم ہوا تو اس نے بڑی وسعتِ قلب سے کام لیا۔ ان بچوں کو اپنے منہ بولے بچے بنا لیا اور بڑی محبت شفقت اور توجہ سے ان کی تربیت کی۔

کابل کی گورنری سے فارغ ہونے کے بعد وہ حجاز روانہ ہو گئی اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ حجاز کے اثنائے قیام میں اس نے راہِ خدا میں ہزاروں روپے خرچ کیے۔ ایک طرف حاجیوں کی خوب خدمت کی اور دوسری طرف حجاز کے غریب اور حاجت مند باشندوں کو دل کھول کر روپیہ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شریفِ مکہ اور اہلِ حجاز اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ غرض صاحب جی نے بڑی نیک نامی کی زندگی بسر کی اور عہدِ عالمگیری کی نامور خواتین میں شمار ہوئی۔ اس کا سالِ وفات کسی تذکرے میں درج نہیں ہے۔ (مآثر الامراء، مغل دورِ حکومت کا جائزہ وغیرہ)

بی بی جمال خاتونؒ

حضرت میاں میر لاہوری[1] رحمۃ اللہ علیہ کی بہن تھیں ۔ اپنے عظیم المرتبت بھائی کی طرح زہد و عبادت میں یگانۂ روزگار تھیں ۔ اللہ تعالیٰ سے ایسی لَو لگائی تھی کہ جو دعا کرتی تھیں فوراً درِ اجابت پر پہنچتی تھی ۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے مستجاب الدعوات ہونے کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے اور ان کی بہت سی کرامات بیان کی ہیں ۔ "سفینۃ الاولیاء" میں ہے کہ ایک دفعہ بی بی جمال خاتونؒ

---

[1] اسمِ گرامی میر محمد تھا ۔ سیوستان (سندھ) کے رہنے والے تھے ۔ والد کا نام قاضی سائیں دتہ تھا ۔ ۹۳۸ھ میں پیدا ہوئے ۔ بچپن میں دینی علوم کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی ۔ بارہ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ۔ والدہ سے اجازت لے کر شیخ خضر سیوستانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے ۔ عرصہ تک سہون کے قریب ایک پہاڑی پر عبادات و ریاضات میں مشغول رہے ۔ پھر مرشدِ گرامی نے انہیں رخصت کر دیا اور وہ ۲۵ سال کی عمر میں لاہور آ گئے ۔ یہاں انہوں نے مولانا سعد اللہؒ، مولانا نعمت اللہؒ اور مفتی عبدالسلام لاہوریؒ سے کئی سال تک مزید تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد سرہند تشریف لے گئے ۔ وہاں ایک سال قیام کرنے کے بعد واپس لاہور آ گئے اور باقی تمام عمر یہیں وعظ و ہدایت اور ارشاد و تبلیغ میں گزار دی ۔

بے حد عبادت گزار اور متبع سُنّت تھے ۔ ان کی بدولت پنجاب میں سلسلۂ قادریہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ جہانگیر، شاہجہاں اور دارا شکوہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی ۔ وہ کئی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ سکھ بھی ان کا اس قدر احترام

(باقی اگلے صفحہ پر)

نے دو من گیہوں ایک بڑے برتن میں بھر لیے۔ اللہ نے ان میں ایسی برکت دی کہ وہ پورے ایک سال تک ان کو روزانہ فقرا اور مساکین میں تقسیم کرتی رہیں۔
بی بی صاحبہ نے ۱۰۴۹ھ میں وفات پائی۔ (سفینۃ الاولیاء)

ملک شاد خانم

امیر تیمور کی نسل سے تھی۔ سلسلۂ نسب یوں ہے:
ملک شاد خانم بنت محمدؐ سلطان مرزا بن جہانگیر مرزا بن امیر تیمور
نہایت اعلیٰ درجے کی خوشنویس تھی اور قرآنِ حکیم کی خطاطی ایسی عمدگی سے کرتی تھی کہ اس کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہان نے اپنے ایک امیر نذر محمد خان کو والیٔ بلخ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ ۱۰۴۵ھ میں یا اس کے کچھ بعد واپس دلی آیا تو اس کے ساتھ بہت سے قیمتی تحائف تھے جو والیٔ بلخ نے شاہجہان کے لیے بھیجے تھے۔ ان میں ایک قرآن مجید بھی تھا جو خطِ ریحان میں نہایت عمدہ اور پختہ ملک شاد خانم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ آخر میں خانم نے اپنا نام اور نسب خطِ رقاع میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ درج کیا تھا۔ (سیر المتاخرین)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کرتے تھے کہ انہوں نے امرتسر میں اپنے دربار صاحب (گوردوارہ) کا سنگِ بنیاد حضرتؒ کے دستِ مبارک سے رکھوایا۔ حضرت میاں میرؒ نے ۱۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو لاہور میں وفات پائی۔

بارہویں صدی ہجری

١۔ شرف النساء بیگم (عابدہ، زاہدہ، قرآن اور تلوار کی عاشق)

٢۔ بی بی عتو (غیرت مند)

٣۔ بی بی حلیمہ (خطاط)

٤۔ نواب بیگم جان (نیک شریف، درد مند)

٥۔ بی بی فخر النساء (سخی دیندار)

٦۔ مغلانی بیگم (حوصلہ مند، مدبرہ)

٧۔ عادلہ خاتون (دانا، منتظم، مخیرہ)

٨۔ منّا بیگم (ادیبہ، شاعرہ)

٩۔ ملکہ قدسیہ زمانی (دانا، دور اندیش، مخیرہ)

١٠۔ بی بی زبیدہ بنت اسعد (عالمہ، فاضلہ، ادیبہ، شاعرہ)

١١۔ نواب صدر جہاں بیگم (پاکدامن، باخدا، فیاض، زیرک)

١٢۔ بی بی بی خانم (سخی، دیندار، باحیا)

١٣۔ امۃ الزہرا نواب بہو بیگم (دانشمند، رحم دل، مخیرہ)

١٤۔ ممولا بیگم (بیدار مغز، دانا)

شرف النساء بیگمؒ

شرف النساء بیگمؒ کا شمار بارھویں صدی ہجری کی نہایت عظیم المرتبت خواتین میں ہوتا ہے لیکن اس کی عظمت اور شہرت کے باوجود تاریخ کی کتابوں میں اس کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں اور جو ملتی ہیں ان میں بہت الجھاؤ ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ حاکمانِ لاہور۔ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ اور نواب خان بہادر زکریا خاں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور قرآنِ پاک اور تلوار سے اس کا لگاؤ عشق کے درجے تک پہنچا ہوا تھا۔ حاکمانِ لاہور کے خاندان سے اس کا کیا تعلق تھا؟ اس کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں:-

۱۔ وہ نواب عبدالصمد خاں کی بیٹی اور نواب زکریا خاں کی بہن تھی۔

۲۔ وہ نواب زکریا خاں کی بیٹی اور نواب عبدالصمد خاں کی پوتی تھی۔

۳۔ وہ نواب عبدالصمد خاں کی دوسری بیوی تھی اور نواب عبداللہ خاں کی ماں۔ نواب زکریا خاں اس کا سوتیلا بیٹا تھا جو بیگم جان کے بطن سے تھا۔

عام طور پر مؤرخین نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے البتہ منشی محمد الدین فوق کاشمیری مرحوم نے "مآثرِ لاہور" میں تیسری روایت کی صحت پر اصرار کیا ہے۔

(نقوش لاہور نمبر صفحہ ۳۶۱ - ۳۶۲)

مشہور مؤرخ سید عبدالقادر مرحوم (پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور) کا بیان ہے کہ "یہ فخرِ ملت خاتون عبدالصمد خاں کی صاحبزادی تھیں۔ تمام عمر تارک الدنیا رہیں۔ ہر وقت تلاوتِ قرآن مجید میں مشغول رہتیں اور تلوار ان کے پاس پڑی رہتی۔"

(زمیندار لاہور - ۱۶ مئی ۱۹۳۵ء)

شرف النساء بیگم نے اپنے باغ میں عبادتِ الٰہی کے لیے ایک چبوترہ بنوایا تھا۔ وہ سیڑھی کے ذریعے اس چبوترے پر چڑھ جاتی اور روزانہ نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو جاتی۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک مرصع تلوار بھی ہوتی تھی۔ تلاوتِ قرآن سے فارغ ہونے کے بعد وہ قرآنِ مجید اور تلوار کو چبوترے پر ہی چھوڑ دیتی اور خود نیچے اتر آتی۔ زندگی بھر اس کا یہی معمول رہا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے مرتے وقت اپنی ماں کو وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی قرآن اور تلوار اس سے جدا نہ کیے جائیں۔ چنانچہ اسی چبوترے میں اس کو دفن کر کے قرآنِ پاک اور تلوار اس کی قبر پر رکھ دیے گئے۔ پھر اس کی قبر پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا جس کی تین اطراف بند کر کے ان پر سبز رنگ کے سرو کے درخت منقش کیے گئے۔ انہی کی نسبت سے یہ سرو والا مقبرہ مشہور ہو گیا۔ "سکھا شاہی" میں اس مقبرے کو اس خیال سے کھودا گیا کہ شاید وہاں کوئی خزانہ دفن ہے لیکن ظالموں کو تلوار اور قرآن کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا البتہ قبر پر پھر مٹی ڈال دی۔ انگریزوں کے زمانے میں اس مقبرے کی مرمت کرا دی گئی اور اسے محکمہ آثارِ قدیمہ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ مقبرہ ابھی تک اچھی حالت میں موجود ہے اور اس عظیم خاتون کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے شرف النساء بیگم کی زندگی کے حالات سنے تو وہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے "قصرِ شرف النساءؒ" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم کہی جو جاوید نامہ میں شامل ہے۔

اس نظم کے گیارہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

"قصرِ شرف النساء"

قلزمِ ما ایں چنیں گوہر نزاد	ہمارے سمندر میں کبھی ایسا موتی پیدا نہیں ہوا
ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد	کبھی کسی ماں نے ایسی بیٹی کو جنم نہیں دیا

خاکِ لاہور از مزارش آسماں
کس نداند رازِ او را در جہاں
آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ
حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
تا زِ قرآں پاک می سوزد وجود
از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود

سرزمین لاہور کو اس کے مزار نے آسمان بنا دیا ہے
اس جہان میں کوئی اس کے راز کو نہیں جانتا
وہ سراپا ذوق و شوق اور درد و داغ
خاتونِ پنجاب کے حاکم کی چشم و چراغ تھی
اس کی زندگی کی تپش اور حرارت قرآنِ پاک کی مرہونِ منت تھی اس لیے ایک لمحہ کے لیے بھی تلاوتِ قرآن سے فارغ نہ ہوتی تھی۔

در کمر تیغ دو رو قرآں بدست
تن بدن ہوش و حواس اللہ مست

اس کی کمر میں دو دھاری تلوار اور ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور اس کا تن بدن اور ہوش و حواس اللہ کی یاد سے سرشار رہتے تھے۔

خلوت و شمشیر و قرآن و نماز
اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز
بر لبِ او چوں دمِ آخر رسید
سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر!
سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن
تیغ و قرآں را جدا از من مکن
مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

(جاوید نامہ ۔ اقبالؒ)

اس کی زندگی تنہائی، تلاوتِ قرآن اور نماز سے عبارت تھی
کیسی مبارک زندگی تھی جو اللہ کی بندگی میں گزری۔
جب اس کا دمِ آخر قریب آیا تو اس نے ماں
کی طرف مشتاقانہ انداز میں دیکھا۔
اور کہا کہ اگر آپ کو میرے راز کا علم ہے
تو اس تلوار اور قرآن کی طرف دیکھیے۔
یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں
اور یہی مسلمانوں کی زندگی کا محور ہیں۔
اب میں دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں تو آپ سے کہتی ہوں
کہ تلوار اور قرآن کو مجھ سے جدا نہ کریں۔
مومنوں کے لیے تلوار کے ساتھ قرآن کافی ہے اور
ہماری قبر کے لیے یہی سامان کافی ہے۔

(مشاہیر نسواں۔ نقوش لاہور نمبر۔ شرف النساء)

بی بی عینو

تیموریوں کے دورِ زوال میں مرہٹے اس قدر زور پکڑ گئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ اس نازک وقت میں افغانستان کے فرمانروا احمد شاہ ابدالی (دُرّانی) نے ہندوستان پر یلغار کی اور جمادی الآخر سنہ ۱۱۷۴ھ میں ایک خونریز لڑائی کے بعد پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو تباہ کن شکست دی۔ اس فتح عظیم کے بعد اس نے جلد ہی افغانستان کو مراجعت کی۔ جب قندھار دو منزل کے فاصلے پر رہ گیا تو احمد شاہ نے اپنی فوج کو تین روز کے لیے قیام کا حکم دیا تاکہ تھکے ماندے سپاہی طویل سفر کی زحمتوں اور کلفتوں کو دُور کر لیں، اطمینان کے ساتھ نہا دھو لیں، کپڑے بدل لیں اور تر و تازہ ہو کر قندھار میں داخل ہوں۔

ایک افغان سپاہی جسے اپنے اہل و عیال سے بچھڑے ہوئے مدت گزر چکی تھی عین وطن کے قریب پہنچ کر توقف و تاخیر کے حکم کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک مجاہد کی حیثیت سے احمد شاہ کے ساتھ ہندوستان پہنچا، مرہٹوں کے خلاف جہاد میں کامیابی کے بعد وطن واپس آیا اب وہ یہاں تین دن کیوں ٹھہرے۔ یہ سوچ کر لشکر سے نکل گیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ دو دن اپنے گھر میں ٹھہرنے کے بعد شاہی لشکر کے قندھار میں داخل ہونے سے پہلے اس سے جا ملے گا۔

سپاہی گھر پہنچا تو بچے موجود تھے مگر بیوی پانی لانے کے لیے قریب کی ندی پر گئی ہوئی تھی۔ سپاہی نے بچوں کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا، اتنے میں اس کی بیوی بھی آگئی۔ وہ شوہر کو گھر میں بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کو نہ پانی پت کی لڑائی اور اس کے نتیجے کا کچھ علم تھا اور نہ شاہی لشکر کے قندھار کے قریب پہنچنے کی اطلاع

تھی۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ اس کا شوہر بادشاہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے گیا ہوا ہے اور کافروں کے خلاف لڑتے ہوئے یا تو اس نے اپنی جان قربان کر دی ہوگی یا فتح و کامرانی کے بعد شاہی لشکر کے ساتھ گھر واپس آئے گا لیکن اس کے اس طرح تنہا وطن آنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس نے مسرت اور شادمانی کا اظہار کرنے کے بجائے غصے کے ساتھ شوہر سے سوال کیا:

"احمد شاہ بابا اور شاہی لشکر کہاں ہے اور جس مقصد کے لیے تم ہندوستان گئے تھے اس کا کیا بنا؟"

شوہر نے جواب دیا: — "کافروں کو شکست فاش ہوئی ہے۔ شاہی لشکر فتح کے پھریرے اڑاتا وطن واپس پہنچ چکا ہے اور قندھار سے صرف دو منزل کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا ہے۔ میں اہل وعیال کی محبت سے مجبور ہو کر جلد یہاں آ گیا"

بیوی: — "مجھے کیسے یقین آئے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست ہے لوگ تمہیں دیکھیں گے تو یہی کہیں گے کہ تو جہاد فی سبیل اللہ سے جی چرا کر بھاگ آیا ہے۔"

شوہر: — "لیکن یہ شبہ کا کون سا موقع ہے شاہی لشکر دو دن کے بعد قندھار پہنچ جائے گا۔"

بیوی: — "اگر یہ سچ ہے تو تم اسی وقت واپس چلے جاؤ۔ جب تک احمد شاہ بابا کا لشکر قندھار نہ پہنچے گا میں تمہاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ میں عورتوں سے یہ طعنہ نہیں سن سکتی کہ میرا شوہر جہاد کے میدان سے بھاگ آیا ہے۔"

شوہر نے ہر چند کہا کہ وہ ایک دن گھر میں ٹھہر کر چلا جائے گا لیکن غیور اور باحمیت بیوی نے صاف کہہ دیا کہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی تمہیں گھر میں نہیں بٹھا سکتی۔ مجبور ہو کر شوہر اٹھا اور شاہی لشکر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لشکر میں پہنچا تو اجازت کے بغیر لشکر سے نکلنے کے جرم میں اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ احمد شاہ نے اس سے لشکر چھوڑنے کا سبب پوچھا تو اس نے ساری

کہانی شروع سے لے کر آخر تک سچ سچ بیان کر دی۔ شاہ ابدالی اپنے وطن کی ایک بیٹی کی قومی حمیت کا حال سن کر بہت خوش ہوا۔ سپاہی کو سچ بولنے کی بناء پر فوراً رہا کر دیا۔ قندھار پہنچا تو حکم دیا کہ سپاہی کی بیوی کو جس کا نام علینو تھا ایک کاریز (زمین دوز نہر جس میں چشموں سے پانی آتا ہے) انعام کے طور پر دی جائے۔
(افغانستان اور بلوچستان جیسے سنگلاخ علاقوں میں کاریز کی بے انتہا قدر و قیمت ہے)
اس کاریز کا نام اب تک اس غیور خاتون کے نام پر "کاریز علینو" مشہور ہے۔ یہ قندھار سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر مشرقی سمت میں واقع ہے۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

بی بی حلیمہ

قسطنطنیہ کی نامور خطاطہ ہوئی۔ ایک عالمِ دین محمد صادق کی بیٹی تھی اس نے اپنے دور کے ایک سرآمدِ روزگار خطاط سید محمد علی سے کتابت کا فن سیکھا اور اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ سارے ملک میں اس کی شہرت ہو گئی۔ ترکی کا نامور خطاط محمد راسم آفندی جو حلیمہ کا ہم عصر تھا، اس نے اس باکمال خطاطہ کی بے حد تعریف لکھی ہے۔

بی بی حلیمہ نے ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء میں وفات پائی۔

(تذکرۃ الخواتین)

نواب بیگم جان

لاہور اور ملتان کے نامور گورنر (صوبیدار یا ناظم) نواب سیف الدولہ عبد الصمد خاں دلیر جنگ[۱] کی اہلیہ اور نواب زکریا خاں[۲] کی والدہ تھی۔ نہایت نیک شریف اور دردمند خاتون تھی۔ وہ نیکی کے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی اس لیے لاہور کے لوگ اسے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے سنہ ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۶ء) میں مغل پورہ اور اس کے ملحقہ محل نہل پورہ کی زمین پر عالی شان محلات اور خوبصورت مکانات تعمیر کرائے اور ایک باغ اور ایک خوشنما کاشی کار مسجد سے ان کو رونق دی۔ اسی کے

---

[۱] نواب عبد الصمد خاں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آیا۔ بادشاہ نے اس کو "چار صدی" کا منصب دیا۔ عالمگیرؒ کی وفات کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اول تخت پر بیٹھا تو اس نے عبد الصمد خاں کو ہفت صدی کا منصب دیا۔ فرخ سیر نے اپنے دورِ حکومت (سنہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) تا سنہ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء)) میں اس کو پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب دیا اور دلیر جنگ کا خطاب دے کر سنہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) میں لاہور کا صوبیدار (گورنر) مقرر کیا۔ اس زمانے میں سکھوں کے ایک رہنما بندہ بیراگی نے سخت شورش برپا کر رکھی تھی اس کے جتھے ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے اور مسلمانوں پر سخت ظلم ڈھاتے تھے۔ فرخ سیر کے حکم سے عبد الصمد خاں نے بندہ بیراگی کا تعاقب شروع کر دیا اور آٹھ ماہ کی خونریز لڑائیوں کے بعد اسے لوہگڑھ میں تباہ کن شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ پھر اسے اور اس کے سات سو چالیس ساتھیوں کو دہلی بھیج دیا، جہاں سب کو قتل کرا دیا گیا۔ فرخ سیر نے اس کارگزاری کے صلے میں اسے ہفت ہزاری کا منصب اور سیف الدولہ کا خطاب دیا۔ اس کے بعد عبد الصمد خاں نے پنجاب کے ایک جاگیردار عیسیٰ خان، قصور کے تعلقہ دار حسین خان خویشگی اور جموں کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نام پر یہ محلہ "بیگم پورہ" مشہور ہوا۔ اس محلے کے اردگرد ایک مضبوط فصیل تھی جس کے غرب رویہ ایک وسیع بازار تھا۔ اس میں دنیا کی ہر چیز ملتی تھی۔ یہ محلہ ناظمانِ لاہور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

راجہ دھوپ دیو کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ فرخ سیر کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے سن ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء میں نواب عبد الصمد خان کو ملتان کا اور اس کے بیٹے زکریا خان کو لاہور کا صوبیدار بنا دیا۔ نواب عبد الصمد خان نے سن ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں وفات پائی۔ نعش لاہور لائی گئی اور بیگم پورہ میں دفن کی گئی۔

نواب سیف الدولہ عبد الصمد خاں دلیر جنگ، خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد سے تھا وہ بڑا بہادر اور نیک سیرت انسان تھا۔ اس کی راتیں مصلے پر اور دن گھوڑے کی پیٹھ پر بسر ہوتے تھے۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں تمام فتنوں کا قلع قمع کر دیا اور پنجاب میں ہر طرف امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

۲ نواب زکریا خاں، نواب عبد الصمد خاں کا لائق فرزند تھا۔ وہ نواب خان بہادر خاں کے نام سے بھی مشہور ہے۔ وہ ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۲ء سے سن ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء تک لاہور اور سن ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء سے اپنی وفات سن ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء تک لاہور اور ملتان دونوں صوبوں (سارے پنجاب) کا صوبیدار (گورنر) رہا۔ وہ نہایت زیرک، عدل پرور، شجاع اور دور اندیش حکمران تھا۔ اس نے دو بڑے زمیندار دل جنگ بنا جٹی اور میر یار کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ جموں کے راجے نے سرکشی کی تو خونریز لڑائی کے بعد اس کو شکست دی اور اس نے اطاعت قبول کر کے اپنی جان بچائی۔ اس کے زمانے کا سب سے اہم واقعہ نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ ہے۔ نادر شاہ کابل اور پشاور فتح کر کے پنجاب میں داخل ہوا تو نواب زکریا خاں نے محمد شاہ کو بار بار پیغام بھیجا کہ نادر شاہ کے مقابلے کے لیے امدادی فوج بھیجی جائے لیکن بادشاہ نے اس کے پیغام پر کوئی توجہ نہ دی چونکہ مرکزی حکومت کی مدد کے بغیر نادر شاہ کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے نواب زکریا خان نے تیس لاکھ روپیہ دینے کے وعدے پر نادر شاہ سے صلح کر لی اور وہ لاہور کو چھوڑ کر دہلی کی طرف بڑھ گیا۔ اس طرح نواب کی دور اندیشی نے لاہور کو اس تباہی اور قتل و غارت سے بچا لیا جس کا بعد میں دہلی کو سامنا کرنا پڑا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا گورنمنٹ ہاؤس تھا۔ نواب عبدالصمد خاں، بیگم جان اور نواب زکریا خان وفات کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

جب نادر شاہ دلی سے واپس ہوا تو اس نے چند دن لاہور میں قیام کیا۔ نواب زکریا خاں نے اس کی بہت خاطر مدارات کی اور صلحنامہ کے مطابق تیس لاکھ روپے اس کو دے دیئے۔ نادر شاہ بہت خوش ہوا اور اس سے کہا کہ آپ کی کوئی فرمائش ہو تو بتائیں میں اسے پورا کروں گا۔ نیک دل نواب نے کہا کہ آپ اپنے ساتھ جو قیدی لیے جا رہے ہیں ان کو رہا کردیں۔ نادر شاہ نے فوراً سب قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ان میں بڑے بڑے صاحب کمال اور ہنرمند کاریگر اور فن کار بھی تھے۔ اگر اس موقع پر نواب زکریا خان حب الوطنی کا مظاہرہ نہ کرتا تو ملک ان کے ہنر و کمال سے محروم ہو جاتا۔

مؤرخین نے نواب زکریا خاں کی رعایا پروری، بے تعصبی اور عدل و انصاف کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ وہ رات کو اکثر بھیس بدل کر شہر میں گشت کرتا رہتا تھا تاکہ لوگوں کے دکھ سکھ اور مسائل سے آگاہ ہو سکے۔ اس کی بے تعصبی کی یہ کیفیت تھی کہ مالیات کا محکمہ ایک ہندو دیوان لکھپت رائے کے سپرد کر رکھا تھا۔ کوٹ لکھپت کی بستی اسی دیوان کے نام سے مشہور ہوئی۔ نواب زکریا خاںؒ کا دورِ حکومت صوبہ پنجاب اور ملتان کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ چونکہ ہر طرف امن و امان، عدل و انصاف اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ اس لیے رعایا کے تمام طبقوں میں نواب بے حد ہر دلعزیز تھا۔ $\frac{\text{۱۱۵۸ھ}}{\text{۱۷۴۵ء}}$ میں اس نے لاہور میں وفات پائی تو شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ جب اس کا جنازہ اٹھا تو لوگوں نے اس پر اس قدر پھول برسائے کہ شہر میں پھول نایاب ہو گئے۔ نواب زکریا خاں بھی بیگم پورہ میں اپنے باپ کے پہلو میں آسودۂ خواب ہے۔

نواب زکریا خاں نے اپنے دورِ حکومت میں لاہور میں بہت سی شاندار عمارتیں بنوائیں مگر وہ سب کے سب استوا زمانہ کی نذر ہو گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت خواجہ خاوند محمود الشاںؒ (المتوفی $\frac{\text{۹۶۲ھ}}{\text{۱۵۵۴ء}}$) کا گنبد اور دوسری مادھو لال حسین کے مزار کے قریب ایک مسجد ہے۔ یہ مسجد دوبارہ تعمیر کی گئی ہے۔ تاہم نواب موصوف کے دور کے چند کتبے ابھی اس میں محفوظ ہیں۔ (نقوش لاہور نمبر۔ تاریخ پاکستان کے بزرگ)

بعد اسی محلے میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبریں ایک چبوترے پر ابھی تک موجود ہیں۔ یہ بارونق اور متموّل محلہ ۱۱۶۲ھ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے میں برباد ہو گیا، اور اس کی ساری دولت حملہ آور افغان فوج نے لوٹ لی۔ بربادی کی رہی سہی کسر سکھوں کے عہدِ حکومت میں پوری ہو گئی۔ اب اس محلے کی عظمتِ رفتہ کے آثار چند کھنڈروں کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔ بیگم جان کی بنوائی ہوئی مسجد کی وہ اگلی شان تو باقی نہیں رہی تاہم مسجد موجود اور آباد ہے۔ اس میں کاشی کاری کا جو کام باقی رہ گیا ہے وہ ابھی تک تازہ اور خوش رنگ نظر آتا ہے۔

(نقوش لاہور نمبر۔ لاہور عہدِ مغلیہ میں وغیرہ)

بی بی فخر النّساء

فرمانروائے ہند محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ ہجری تا ۱۱۶۱ھ ہجری) کے عہد کے ایک نامور امیر نواب شجاعت علی خان کی حرمِ خاص تھی۔ نہایت دانشمند اور خوش مذاق خاتون تھی۔ غربا و مساکین کی امداد اور دینی کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ اس کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو فخر النساء کو سخت صدمہ ہوا۔ اس نے ۱۱۴۱ھ میں نواب مرحوم کی یادگار میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور اس کے لیے جائداد وقف کی۔ یہ مسجد اب تک شہر دہلی میں کشمیری دروازہ کے قریب موجود ہے اور فخر النساء کے نام کی نسبت سے "فخر المساجد" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کی لوح پر یہ شعر کندہ ہیں:

خانِ دیں پرور شجاعت خاں بجنت یافت جا	بارضائے حق تعالےٰ از طفیلِ مرتضیٰ
صدرِ خاتوناں کنیزِ فاطمہ فخرِ جہاں	یادگارش ساخت ایں مسجد بفضلِ مصطفیٰ

(مفتاح التواریخ)

مُغلانی بیگم

بارھویں صدی ہجری کی یہ نامور خاتون نواب عبدالصمد خان ناظمِ پنجاب (۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء تا ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء) کی نواسی، اور دُردانہ بیگم (خواہر نواب زکریا خان ناظمِ پنجاب از ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء تا ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) اور دربارِ لاہور کے ایک باثر امیر نواب جانی بیگ کی بیٹی تھی۔ اس کا شوہر نواب معین الملک عرف میر منو ناظمِ پنجاب (۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء) تھا[1]۔ مغلانی بیگم کی زندگی کے ابتدائی حالات کسی مؤرخ نے نہیں لکھے البتہ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئی تو والدین نے ان کا نام ثریا بیگم رکھا اور

---

[1] نواب معین الملک دہلی کے وکیلِ السلطنت نواب قمرالدین خان کا جواں بخت اور جواں ہمت فرزند تھا۔ وہ پہلے شاہِ دہلی کی طرف سے اور پھر احمد شاہ ابدالی کی طرف سے پنجاب کا ناظم رہا وہ ایک بیدار مغز، بہادر اور دور اندیش حاکم تھا۔ جس زمانے میں اس نے پنجاب کی حکومت سنبھالی، سکھوں نے ہر طرف شورش برپا کر رکھی تھی اور ان کی غارت گری سے خلقِ خدا عاجز آچکی تھی۔ نواب موصوف نے سکھ غارت گروں پر پے در پے ضربیں لگا کر پنجاب میں بڑی حد تک امن قائم کر دیا مگر افسوس کہ اس کا زمانۂ حکومت بہت مختصر ثابت ہوا۔

۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء میں وہ لاہور سے باہر نکل کر سکھ باغیوں کے ایک گروہ کا تعاقب کر رہا تھا کہ اچانک بیمار ہوگیا، اطبا نے جو لشکر کے ہمراہ تھے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اس کا وقتِ آخر آچکا تھا، لشکر گاہ ہی میں فوت ہوگیا۔ اس کی وفات پر سکھوں نے بہت خوشی منائی مگر مسلمانوں میں کہرام مچ گیا۔ فی الحقیقت نواب معین الملک کی رحلت سے پنجاب میں مسلمانوں کا آفتابِ اقبال غروب ہوگیا اور چند سال بعد یہاں "سکھا شاہی" کا آغاز ہوگیا۔ (نقوش لاہور نمبر)

شادی کے بعد سسرال والوں نے اسے مراد بیگم کا نام دیا مگر اس نے تاریخ میں مغلانی بیگم کے نام سے شہرت پائی۔

صفر سنہ ۱۱۶۷ھ (نومبر سنہ ۱۷۵۳ء) میں اس کے شوہر نواب معین الملک نے اچانک وفات پائی تو فوج کے سپاہیوں میں شورش کے آثار نمودار ہوئے کیونکہ ان کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ اس موقع پر مغلانی بیگم نے بڑے صبر واستقلال اور حوصلے سے کام لیا اور اپنے ذاتی خزانے سے سپاہیوں میں تنخواہ بانٹ کر انہیں خوش کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں اس نے تین دن میں تین لاکھ روپے تقسیم کیے۔ اس کے بعد وہ شوہر کی میت لے کر لاہور گئی اور اس کو باختلاف روایت بیگم پورہ میں یا موجودہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے نواح میں دفن کر دیا۔ چند دن بعد شاہ دہلی (احمد شاہ) نے اپنے تین سالہ لڑکے محمود خاں کو لاہور اور ملتان کا ناظم اور نواب معین الملک کے دو سالہ فرزند محمد امین کو اس کا نائب مقرر کیا۔ امور سلطنت کا انتظام میر مومن خاں کے سپرد ہوا مگر یہ سب باتیں برائے نام تھیں۔ اصل حکمران مغلانی بیگم ہی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے محمد امین کے لیے احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان سے نظامتِ پنجاب و ملتان کی سند حاصل کر لی اور اس خوشی میں بہت بڑا جشن منایا۔ بدقسمتی سے شعبان سنہ ۱۱۶۷ھ (مئی سنہ ۱۷۵۴ء) میں محمد امین خاں کا انتقال ہو گیا۔ اگرچہ مغلانی بیگم کو بیٹے کی وفات سے جانکاہ صدمہ ہوا لیکن اس نے ہوش وحواس قائم رکھے اور حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کی سند لینے کے لیے اپنے قاصد دہلی اور قندھار روانہ کر دیے لیکن اس کی توقع کے برعکس فرمانروائے ہند عالمگیر ثانی نے مومن خاں کو لاہور اور ملتان کے صوبوں کا ناظم مقرر کر دیا۔ مغلانی بیگم نے بادشاہ کے فرمان کو صرف اتنی اہمیت دی کہ مومن خاں کو برائے نام ناظم تسلیم کیا مگر ساری طاقت اور حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس زمانے میں بیگم کے سب سے بڑے مشیر تین خواجہ سرا میاں خوش فہم، میاں ارجمند اور میاں مہابت (محبت) تھے۔ بیگم پردے کی پابندی کی وجہ سے تمام امورِ حکومت انہی کے ذریعے انجام دیتی تھی۔

شامتِ اعمال سے یہ تینوں خواجہ سرا شاذ ہی کسی معاملے میں متفق ہوتے تھے اور اکثر ان کی طرف سے متضاد احکام جاری ہوتے تھے اس طرح نظامِ حکومت میں سخت خلل پیدا ہوا اور خواجہ مرزا خاں نے جسے مغلانی بیگم نے ایمن آباد کا حاکم بنایا تھا، ایک با اثر امیر بھکاری خان کے ایماء اور تعاون سے بیگم کو نظر بند کرکے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ بیگم نے نظر بندی ہی میں نہایت رازداری سے اپنے ماموں خواجہ عبداللہ خان کے ذریعے احمد شاہ ابدالی سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے پشاور کے ناظم جہان خان کے بھائی امان خان کو ایک مضبوط فوج دے کر لاہور روانہ کیا۔ امان خان نے خواجہ مرزا خان کو شکست دے کر مغلانی بیگم کو پھر مسندِ حکومت پر بٹھا دیا اور خواجہ عبداللہ خان کو اس کا نائب مقرر کیا۔ بیگم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بھکاری خان کی مشکیں کسوا کر اپنے حضور طلب کیا جب وہ محل میں لایا گیا تو بیگم کے حکم سے محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں نے اس پر جوتوں اور ڈنڈوں کی بارش کردی یہاں تک کہ اس کا دم نکل گیا اور اس کی لاش شہر سے باہر خندق میں پھینک دی گئی[1]۔ اس کے بعد بیگم نے خواجہ عبداللہ خان کی مدد سے نظم و نسق درست کرنے کی طرف توجہ کی مگر خواجہ خود حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ چنانچہ امان خان کے پیٹھ پھیرتے ہی اس نے اپنی فوج منظم کرنی شروع کردی اور چند دن بعد مغلانی بیگم کو حراست میں لے کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی چونکہ خزانہ خالی تھا اس نے جبر و تشدد سے روپیہ جمع کرنا شروع کردیا۔ اسی زمانے میں لاہور

---

[1] بھکاری خان نواب معین الملک کے زمانے میں حکومت کا مختار اور مدار المہام تھا۔ وہ بڑا وجیہہ، پرہیزگار اور عالم آدمی تھا۔ لاہور کی سنہری مسجد اسی نے تعمیر کروائی [۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۳ء]۔ چونکہ اس نے مغلانی بیگم کی مخالفت کی تھی، اس لیے مغلانی بیگم اس کے خون کی پیاسی ہوگئی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۱۶۹ھ [۱۷۵۵ء] میں جب بھکاری خان اس کے قابو میں آیا تو اس نے بڑے دردناک طریقے سے اس کا کام تمام کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب جوتوں اور ڈنڈوں کی بارش سے بھکاری خان نیم بیہوش ہوگیا تو مغلانی بیگم نے اپنے ہاتھ سے اس کو خنجر کے دو زخم لگائے جن سے اس کا دم نکل گیا۔

(سیر المتاخرین۔ نقوش لاہور نمبر)

میں یہ ضرب المثل مشہور ہوئی:

حکومت نواب عبداللہ نہ رئی چکی نہ رُنیا چکھا (یعنی نواب عبداللہ
کی حکومت میں نہ کسی کی چکی سلامت رہی ہے اور نہ چولھا بجا ہے۔)

خواجہ عبداللہ خان کی سختیوں کی وجہ سے اہلِ لاہور میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ اسی زمانے میں جالندھر دوآب کے حاکم آدینہ بیگ نے لاہور پر لشکر کشی کی۔ خواجہ عبداللہ خان مقابلہ کیے بغیر سندھ کی طرف بھاگ گیا، اور آدینہ بیگ لاہور پر قابض ہو گیا مگر وہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد صادق بیگ خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے جالندھر واپس چلا گیا۔ ان حالات میں مغلانی بیگم نے دہلی کے وزیر غازی الدین عماد الملک کو مدد کے لیے خط لکھا۔ عماد الملک، نواب معین الدین کا بھانجا تھا اور اس سے مغلانی بیگم کی بیٹی عمدہ بیگم کی منگنی ہو چکی تھی۔

اس کے بعد کے جو حالات مؤرخین نے بیان کیے ہیں ان میں خاصا الجھاؤ ہے۔ مختصر یہ کہ عماد الملک نے آدینہ بیگ کے ذریعے لاہور پر قبضہ کر لیا اور اسی کے ذریعے مغلانی بیگم کو اپنی تحویل میں لے کر اپنے کیمپ ماچھی واڑہ سے دہلی واپس چلا گیا۔ دہلی سے مغلانی بیگم نے احمد شاہ ابدالی کو اپنے حالات سے آگاہ کیا اور اس کو دہلی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی ایک جرار لشکر کے ساتھ دہلی میں وارد ہوا۔ مغلانی بیگم نے دہلی کے متمول لوگوں سے روپیہ حاصل کرنے میں شاہ ابدالی کی بہت مدد کی اور اس کو یہاں تک بتایا کہ میرے خسر قمر الدین خان کی حویلی میں فلاں فلاں جگہ دولت گڑی ہے اور فلاں فلاں امیر کے پاس اتنی دولت ہے۔ اس نے خود بھی بہت سے قیمتی ہیرے شاہ ابدالی کی نذر کیے۔ اس کی کارگزاری سے خوش ہو کر شاہ نے اس کو سلطان مرزا کا خطاب دیا اور کہا کہ آج سے تم میری بیٹی نہیں بلکہ فرزند ہو۔ پھر اپنی پگڑی (جیغہ سمیت جس میں قیمتی موتی ٹنکے ہوئے تھے) اپنے سر سے اتار کر اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا لباس (یا شاہانہ خلعت) بھی اس کو عطا کیا۔ اسی شب کو اس نے عمدہ بیگم (دخترِ مغلانی بیگم) کی شادی

عماد الملک سے کردی اور اس کی پہلی بیوی گنّا بیگم کو مغلانی بیگم کی کنیز بنا دیا۔ دہلی سے واپسی پر احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو پنجاب اور ملتان میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور مغلانی بیگم کے لیے تیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ لاہور میں اب وہ اپنی حویلی کے سوا کسی چیز کی مالک نہ تھی۔ اس صورت حال سے وہ سخت دل برداشتہ ہوئی اور لاہور میں عزلت گزینی کی زندگی گزارنے لگی۔ کچھ عرصہ آدینہ بیگ نے اس کو معقول مالی امداد دی مگر اس کی وفات (سنہ ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸ء) کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اسی سال مغلانی بیگم جموں چلی گئی۔ وہاں کے راجہ رنجیت دیو نے اس کی شاندار پذیرائی کی، رہنے کو ایک محل دیا اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا مگر بیگم نے یہ وظیفہ لینے سے معذرت کردی۔ اس زمانے اس کے جو پرانے ملازم اور نمک خوار اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے اپنی کمزور مالی حالت کے باوجود سب کو دوشالے دے کر رخصت کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دو سو دوشالے تقسیم کیے۔ اس زمانے میں راجہ سکھ جیون کشمیر کا ناظم تھا اس کو بیگم کی طرف سے ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا۔ اس نے اس شرط کے ساتھ بیگم کو بھاری خراج کی پیش کش کی کہ وہ جموں سے باہر نہ نکلے لیکن بیگم نے یہ پیش کش مسترد کردی۔ چند دن کے بعد وہ ایک عیار آدمی کے فریب میں آکر اپنا رہا سہا اثاثہ بھی کھو بیٹھی اور بالکل قلاش ہوگئی۔ سنہ ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۰ء میں احمد شاہ ابدالی پانچویں مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ جب اس کو مغلانی بیگم کی تباہ حالی کا علم ہوا تو اس نے تیس ہزار سالانہ آمدنی کا پرگنہ سیالکوٹ اس کو مرحمت کیا مگر سکھوں کی شورش کی وجہ سے وہ اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ اب وہ گوناگوں مشکلات میں گھر گئی۔ اس نے حالات سے مجبور ہو کر اپنے خادم شہباز خان سے شادی کرلی اور زندگی کے آخری ایام گمنامی کی حالت میں جموں میں گزارے اور وہیں سنہ ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء یا ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء میں اس نے سفر آخرت اختیار کیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ مغلانی بیگم بہت فیاض، سخی، خوددار اور بلند ہمت خاتون تھی۔ وہ نہ صرف اپنے زیر دستوں اور ہواخواہوں کو اکثر انعام و اکرام سے

نوازتی رہتی تھی بلکہ دوسرے حاجت مندوں کی بھی دل کھول کر مدد کیا کرتی تھی۔ اس نے بڑے پُر آشوب زمانے میں پنجاب میں امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کی اور نامساعد حالات کا مقابلہ بڑی ہمت اور جرأت سے کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

اس کی روداد زندگی ایک ایسی داستانِ عبرت ہے جس کا مطالعہ کر کے بے اختیار یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

نہیں رہی ہے جہاں میں کسی کی بات بڑی
کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

("الشجاع" کراچی جون ۱۹۵۳ء، "المعارف" ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۹ء، "نقوش" لاہور نمبر)

عادلہ خاتون

احمد پاشا کی بیٹی اور بغداد کے عثمانی والی سلیمان پاشا مزا قلی (ابو لیلیٰ) کی اہلیہ تھی وہ بڑی دانا، منتظم اور مخیر خاتون تھی اپنے شوہر کی زندگی میں وہ صوبے کا نظم و نسق چلانے میں سرگرم حصہ لیا کرتی تھی اور باقاعدہ اجلاس لگا کر بیٹھتی تھی، اس میں لوگ ایک خواجہ سرا کی وساطت سے اس کے سامنے عرضیاں پیش کرتے تھے اور وہ ان پر مناسب کارروائی کرتی تھی۔ اس نے ایک عالی شان مسجد اور ایک کاروان سرائے بھی تعمیر کرائی۔

۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء ہجری میں سلیمان پاشا مزا قلی نے وفات پائی اور علی پاشا اس کا جانشین مقرر ہوا تو عادلہ خاتون نے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی کہ ینی چری (ترک فوج کا ایک فعال عنصر) علی پاشا کے خلاف ہو گئے۔ اس کے بعد پانچ ذی اثر مملوک امرا بھی اس کے مخالف ہو گئے۔ اس طرح وہ علی پاشا کی جگہ اپنے برادرِ نسبتی عمر پاشا کو ولایت بغداد کا حاکم مقرر کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ (۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۳ء)

عادلہ خاتون کا سالِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔

(اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جلد ۱۲)

گنا بیگم

نواب عماد الملک وزیر عالمگیر ثانی (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۳ھ) کی بیوی اور علی قلی خان والہ داغستانی ہفت ہزاری (امیرِ دربارِ عالمگیر ثانی) کی بیٹی تھی۔ بے حد حسین وجمیل تھی اور بہت اونچے درجے کی ادیبہ اور شاعرہ تھی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتی تھی۔ اس کے ادیبانہ اور شاعرانہ کمالات کا سارے ہندوستان میں شہرہ تھا۔

کہتے ہیں کہ وہ نہایت نازک اندام اور غیر معمولی ہلکے پھلکے وزن کی تھی۔ قضائے الٰہی سے اس کا لختِ جگر فوت ہو گیا۔ نواب عماد الملک نے خبر منگائی تو اس نے یہ شعر لکھ بھیجا ؎

از حالِ ما مپرس کہ دل چاک کردہ ایم
لختِ جگر بریدہ تہہِ خاک کردہ ایم

اس کے کچھ اور فارسی اشعار یہ ہیں:

تاکشیدے از نزاکت سرمۂ دنبالہ را — شد عصائے آبنوسی چشمِ بیمارِ ترا

جگر پُر سوز دل پُر خوں گریباں چاک جاں بر لب — قضا را شرم می آید ز سامانیکہ من دارم

فوارہ زہر گوشہ شرارہ برزد
از تارِ تمر شمع گرہ گوہر زد
نے نے غلطم کہ در رگ و ریشۂ آب
فصاد ہوا ہزار جا نشتر زد

اردو میں بھی گنّا بیگم کا کلام بہت ہے۔ شوخ تخلّص تھا۔ اصلاحِ سخن اس دور کے نامور شعراء میر قمرالدین منّت، میر سوز اور مرزا محمد رفیع سودا وغیرہ سے لی۔

اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

رقیبوں سے وہ جس دم ہنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر مژہ اے دردِ جگر موتی پروتی تھی
ترے منہ کی تجلّی دیکھ کر کل رات حیرت سے
زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع روتی تھی

لے اڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے
گل نے سیکھی روشِ چاک گریباں ہم سے

شمع کو چہرۂ دلدار سے کیا ہے نسبت
کیونکہ یہ ہے رُخِ خنداں وہ ہے رونی صورت

شمع کی طرح کون روجانے
جس کے جی کو لگی ہے وہ جانے

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسّر!
کیا جانیے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی!

مقابل ہو اگر لب کے ترے مصری چبا جاؤں
تری آنکھوں سے ہم چشمی کرے بادام کھا جاؤں

نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا
ہاتھ اک اور بھی لگانا تھا

شب کو میاں طلب میں تری ہم بھٹک بھٹک
جوں حلقۂ در یہ رہ گئے سر کو پٹک پٹک
میری بھی مشتِ خاک کا پایہ ہے کچھ ضرور
اے جامہ زیب! جائیو دامن جھٹک جھٹک

گنّا بیگم کی زندگی کا آخری زمانہ کہاں اور کس طرح گزرا، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ گنّا بیگم کو عقدِ نکاح میں لانے سے پہلے نواب عماد الملک کی منگنی (نواب معین الملک عرف میر منو ناظمِ پنجاب اور مغلانی بیگم کی لڑکی) عمدہ بیگم سے ہو چکی تھی لیکن عمدہ بیگم کا نکاح سنہ ۱۱۷۰ھ میں نواب عماد الملک سے اس وقت ہوا جب مغلانی بیگم (بیوہ نواب معین الملک) دہلی میں قیام پذیر تھی اور سلطان احمد شاہ ابدالی بھی دہلی پر قبضہ کر کے وہیں مقیم تھا۔

تقریبِ نکاح میں احمد شاہ ابدالی بھی موجود تھا۔ اس نے گنّا بیگم کو مغلانی بیگم کے حوالے کر دیا اور کہا کہ وہ اسے اپنی کنیز تصور کرے اور عماد الملک کو حکم دیا کہ اپنی پہلی بیویوں کو طلاق دے دے۔ اس کے بعد گنّا بیگم پر کیا بیتی؟ تاریخ سے اس کا جواب نہیں ملتا۔

(گلشنِ بیخار۔ مشاہیر نسواں وغیرہ)

ملکہ قدسیہ زمانی

فرمانروائے ہند فرخ سیر (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ) کی صاحبزادی اور محمد شاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) کی ملکہ تھی۔ اصل نام اودھم بائی تھا۔ نہایت قابل، دانا اور دور اندیش خاتون تھی۔ جب ۱۱۶۱ھ میں محمد شاہ نے وفات پائی تو اسی فتنہ (خانہ جنگی) کے برپا ہونے کا خدشہ پیدا ہوگیا جو اس سے پہلے ہر بادشاہ کی وفات پر پیدا ہوتا رہا تھا۔ اودھم بائی نے سات دن تک سلطنت کا کاروبار اس طرح جاری رکھا کہ کسی کے کانوں میں بادشاہ کے مرنے کی بھنک تک نہ پڑی۔ اس دوران میں اس نے احمد شاہ فرزند محمد شاہ کو اس حادثہ جانکاہ سے آگاہ کیا اور وہ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ میں سریر آرائے تاج شاہی ہوا۔ اس نے والدہ کو نواب بائی کا خطاب دیا۔ وہ نہایت نیک نہاد اور مخیر ملکہ تھی۔ بعد میں وہ "نواب قدسیہ صاحبہ زمانی" کے معزز لقب سے مشہور ہوئی۔ اس نے ۱۱۶۴ھ میں ایک خوشنما مسجد قلعہ شاہجہان آباد کے متصل تعمیر کی، جو سنہری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہیں:

شکر حق در عہد احمد شاہ غازی بادشاہ
خلق پرور دادگر شاہان عالم را پناہ
مسجدے کردہ بنا نواب قدسی مرتبت
باد دائم فیض عام آں ملائک سجدہ گاہ
سعیٔ نواب بہادر صاحب لطف و کرم
ساخت تعمیر چنیں جاوید عالی دستگاہ
چاہ و حوض و صاف صحنش آبروئے زمزم است
ہر کہ از آبش طہارت کرد شد پاک از گناہ

سالِ تاریخش چو خورم یافت از الہامِ غیب
مسجدِ بیتِ مقدس مطلعِ نورِ الٰہ

تیسرے شعر میں جس "نواب بہادر" کا ذکر ہے وہ جاوید خاں خواجہ سرا تھا جس کو ملکہ زمانی کی سفارش پر بادشاہ نے نواب بہادر کا خطاب عطا کیا تھا۔

ملکہ زمانی نے سنہ ۱۱۶۲ھ میں دلی میں ایک اور عمارت بھی "شاہ مرداں" کے نام سے نواب بہادر جاوید خاں کے ذریعے تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد میں ایک پتھر ہے جس میں پاؤں کا نشان کندہ ہے۔ خوش اعتقاد لوگوں میں مشہور ہے کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا نقش پا ہے۔ ہر قمری مہینے کی بیس تاریخ کو "شاہ مرداں" میں اس نقش پا کی زیارت کے لیے آنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا ہے۔

سنہ ۱۱۶۷ھ میں احمد شاہ کو معزول کر دیا گیا تو ملکہ زمانی نے ہندوستان میں رہنا مناسب نہ سمجھا، اس نے اپنی بھانجی صاحبہ محل کا عقد احمد شاہ ابدالی سے کر دیا اور اس کے ساتھ افغانستان چلی گئی وہیں اس نے سنہ ۱۱۹۹ھ میں وفات پائی۔

(مفتاح التواریخ۔ تاریخ ہند وغیرہ)

بی بی زبیدہ بنتِ اسعدؒ

قسطنطنیہ کے ایک نامور عالم اسعد بن شیخ الاسلام اسمٰعیل آفندی کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے علوم فقہ، لغت اور ادب میں ایسا کمال پیدا کیا کہ تمام عالم اسلام میں مشہور ہو گئیں۔ ان کو کتابوں کے مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتی تھیں اور ملک کے اونچے درجے کے شعراء میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کی شادی نقیب الاشراف درویش آفندی سے ہوئی۔ ان کی ایک بیٹی فطنت نے بھی شاعری میں بڑا نام پایا۔ بی بی زبیدہ نے سنہ ۱۱۹۴ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر النساء)

نواب صدر جہاں بیگم

بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا نام صدر النسا بیگم لکھا ہے۔ نواب سعادت خاں برہان الملک میر محمد امین والی اودھ (۱۱۳۴ھ تا ۱۱۵۱ھ / ۱۷۲۲ء تا ۱۷۳۹ء) کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ والدین نے اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ چنانچہ اسے نہ صرف جملہ علوم دینی میں دسترس ہو گئی بلکہ وہ نہایت اعلیٰ اخلاق سے بھی آراستہ ہو گئی۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ وہ نہایت پاکدامن، خداترس، باحیا، فیاض، زیرک اور حوصلہ مند خاتون تھی۔ اس کی شادی اپنی پھوپھی کے بیٹے (برہان الملک کے بھانجے) مرزا محمد مقیم سے ہوئی جسے محمد شاہ بادشاہ نے صفدر جنگ کا خطاب دیا۔ برہان الملک اور صفدر جنگ دونوں شاہی دربار میں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ بادشاہ نے برہان الملک کو اودھ کا صوبہ دار (گورنر یا وزیر) مقرر کیا تو صفدر جنگ بھی اہلیہ کے ساتھ اپنے ماموں (خسر) کے پاس اودھ چلا گیا۔ برہان الملک نے اسے اپنا نائب مقرر کیا۔ ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء میں برہان الملک نے وفات پائی تو محمد شاہ بادشاہ نے اس کی بیٹی نواب صدر جہاں بیگم کو اودھ کی صوبہ داری کا پروانہ عنایت کیا کیونکہ برہان الملک کا ایک کمسن لڑکا جسے باپ کی وفات کے بعد اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا چند دنوں کے بعد چیچک میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ نواب صدر جہاں بیگم نے اپنی طرف سے اپنے شوہر صفدر جنگ کو صوبے کا منتظم (یا نائب) بنا دیا۔

نادر شاہ کے حملے کے نتیجے میں سارے ہندوستان میں ہل چل مچ گئی اور جگہ جگہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسی زمانے میں امیٹھی (ضلع لکھنؤ) کے شیخوں نے حکومتِ اودھ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک لاکھ سے زیادہ گنوار اپنے ساتھ ملا لیے۔ صفدر جنگ نے بوجوہ ان کے مقابلے پر جانے سے پہلوتہی کی۔ اس پر

نواب صدر جہاں بیگم نے اس کو غیرت دلائی اور لکھنؤ سے باہر اپنی فوج جمع کرنے پر آمادہ کیا۔ جب یہ منظم فوج توپ خانہ سمیت شہر سے باہر خیمہ زن ہوئی تو تمام باغی مرعوب ہو کر تتر بتر ہو گئے۔ اگر اس موقع پر نواب صدر جہاں بیگم غیر معمولی جرأت اور حوصلے سے کام نہ لیتی تو شاید حکومتِ اودھ کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس طرح وہ اکثر اپنے خاوند کو نہایت مفید مشورے دیتی رہتی تھی۔

نواب صدر جہاں بیگم کے بطن سے صفدر جنگ کا بیٹا شجاع الدولہ پیدا ہوا۔ سنہ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں صفدر جنگ نے وفات پائی تو شجاع الدولہ باپ کا جانشین ہوا۔ اسی زمانے میں اسے انگریزوں کو ادا کرنے کے لیے چالیس لاکھ روپیہ کی ضرورت پڑی۔ بیس لاکھ تو فراہم ہو گیا لیکن باقی بیس لاکھ کے لیے سخت پریشانی ہوئی۔ اس موقع پر نواب صدر جہاں بیگم اس کے آڑے آئی اور اس نے شجاع الدولہ کی پریشانی کا حال سنتے ہی اسے بیس لاکھ روپیہ بھیج دیا۔

شجاع الدولہ کے آغازِ حکومت میں اودھ کے کھتریوں نے کچھ مغل سرداروں کے ساتھ مل کر اس کو معزول کرنے کی سازش کی مگر نواب صدر جہاں بیگم نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ سازش ناکام ہو گئی اور شجاع الدولہ نے اکیس برس تک اودھ پر حکومت کی۔

نواب صدر جہاں بیگم نے اپنے بیٹے کا پورا دورِ حکومت دیکھا۔ اس زمانے میں اودھ کا دارالحکومت فیض آباد تھا۔ نواب صدر جہاں بیگم نے اس شہر کو خوب آباد کیا تاہم اس کی احتیاط اور پرہیزگاری کی یہ کیفیت تھی کہ قلعہ فیض آباد کی زمین کے اصل مالکوں کو بڑی مشکل سے تلاش کیا اور زمین کی قیمت ادا کی تاکہ غصب کا گناہ اس کے سر پر نہ آئے اور قلعہ کے اندر بننے والی مسجد بھی غصب کی آلائش سے پاک رہے۔

اس کا معمول تھا کہ سال میں تین مہینے روزے رکھا کرتی تھی اور غربا و مساکین کی مدد پر ہر وقت آمادہ رہتی تھی۔ رفاہِ عامہ کے سلسلے میں اس نے کئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔

نواب شجاع الدولہ نے سنہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا آصف الدولہ مسند نشین ہوا۔ اسی کے عہدِ حکومت (سنہ ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء) میں نواب صدر جہاں بیگم نے ستانوے برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے بیٹے نواب شجاع الدولہ کی قبر کے پاس گلاب باڑی میں دفن ہوئی۔

(مشاہیر نسواں - بیگمات شاہانِ اودھ)

بی بی بنی خانم

قاسم علی خان کی بیٹی اور نواب نجم الدولہ اسحاق خان کی اہلیہ تھی۔ نواب نجم الدولہ، محمد شاہ بادشاہِ ہند (۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کے دربار میں وزیر اعظم سے بھی زیادہ اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا تو نواب نجم الدولہ کی پہلے جیسی قدر و منزلت نہ رہی، اس پر اس نے دربار کی ملازمت چھوڑ دی۔ کچھ عرصہ بعد وہ بنگش افغانوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کی بیوہ بنی خانم کچھ مدت تو دلی میں رہی لیکن جب وہاں مرہٹوں جاٹوں وغیرہ نے لوٹ مار مچائی تو دلی سے فیض آباد (اودھ) چلی گئی۔ اس وقت نواب شجاع الدولہ کا دورِ حکومت تھا (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۸۸ھ)۔ اس نے بنی خانم کا بے حد احترام کیا۔ اس کو بے شمار تحفے تحائف بھیجے اور پانچ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ بیگم کے پاس اپنا اندوختہ بھی بہت کچھ تھا اس طرح اس کے پاس دولت کی ریل پیل ہو گئی لیکن جس چیز نے اس کو شہرتِ دوام بخشی وہ یہ تھی کہ اس نے اپنی دولت مخلوقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ جلد ہی سارے ملک میں اس کی سخاوت اور فیاضی کی دھوم مچ گئی۔ لوگ دلی، لکھنؤ اور دوسرے مقامات سے اس کے پاس آتے اور منہ مانگی مرادیں پاتے تھے۔ کبھی کوئی سائل اس کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر روپیہ حاجت مندوں میں تقسیم کرتی تھی، اور سب اس کو دعائیں دیتے جاتے تھے۔

بنی خانم اپنے عزیزوں اور دوسرے لوگوں میں ایسی لڑکیوں کی تلاش

میں رہتی جو شادی کی عمر کو پہنچ جاتیں لیکن ماں باپ غریبی کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیلے نہ کر سکتے تھے۔ بنی خانم ایسی لڑکیوں کی شادی کے اخراجات اپنے ذمے لے لیتی اور یہ کارِ خیر بڑے احسن طریقے سے انجام دیتی تھی۔ مخیّر ہونے کے علاوہ بنی خانم بہت پرہیزگار، باعصمت اور پردہ دار بی بی تھی اس کا ایک سگا بھائی آغا علی خان تھا۔ بیگم کو اس سے بے حد محبت تھی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بیگم کی اپنی اولاد کوئی نہ تھی اور دوسرے اس لیے کہ ماں باپ کی نشانی صرف یہ اکلوتا بھائی تھا اور وہی اس کا وارث تھا۔ بھائی سے اتنی محبت کے باوجود بیگم کو شریعت کا اس قدر پاس تھا کہ اس نے آغا علی خان کو تاکید کر رکھی تھی کہ جب کبھی مجھ سے ملاقات کے لیے آنا چاہو تو پہلے خبر ضرور کر دو جب وہ آتا تو بیگم نہایت احتیاط سے اپنا سارا جسم کپڑے سے ڈھانکتی اور سوائے چہرے کے کوئی حصۂ جسم کھلا نہ چھوڑتی۔

اس نیک بی بی نے ۱۵ شوال ۱۲۱۱ھ ہجری کو ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ تاریخ فرح بخش)



اَمَۃُ الزَّہرا نواب بہو بیگم

نواب مؤتمن الدولہ مُحمّد اسحاق خاں صوبہ دار گجرات کی حقیقی اور فرمانروائے ہند مُحمّد شاہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی منہ بولی بیٹی تھی۔ ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئی اور پیدائش کے فوراً بعد اُسے مُحمّد شاہ بادشاہ کی خواہش پر شاہی محل میں بھیج دیا گیا۔ بادشاہ نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا اور یہ بھی شاہی محل میں پرورش پانے لگی۔ اس کی تعلیم بھی شاہی محل میں ہوئی۔ لڑکی بچپن ہی سے بڑی ذہین اور عقلمند تھی۔ بادشاہ نے اس کا نام اَمَۃُ الزَّہرا رکھا، اسے ہر قسم کا ہنر سکھایا اور آدابِ شاہی سے واقف کیا۔ جب اس کی عمر چوبیس برس کی ہوئی تو نواب صفدر جنگ والیٔ اَودھ نے اپنے بیٹے شجاع الدولہ کے لیے اَمَۃُ الزَّہرا کے رشتے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے پیغام قبول کر لیا اور ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں اپنی منہ بولی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے شجاع الدولہ سے کر دی۔ بادشاہ نے جہیز میں اس قدر زر و جواہر اور مال اسباب دیا کہ حد بیان سے باہر ہے۔ مختلف صوبوں کے گورنروں نے بھی بادشاہ کی بیٹی جان کر گرانقدر تحائف مال اسباب، مرصع زیورات اور نقد رقوم کی صورت میں بھیجے علاوہ ازیں حقیقی باپ نواب مؤتمن الدولہ مُحمّد اسحاق خاں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو جس قدر مال و اسباب اور زر و جواہر وغیرہ دیئے اُن کی مالیت کروڑوں روپے تک پہنچتی تھی۔

اَمَۃُ الزَّہرا کو سسرال کی طرف سے نواب بہو بیگم کا خطاب ملا۔ اس خطاب نے اتنی شہرت پائی کہ لوگ اس کا اصل نام بھول گئے۔ ساس سسر اور شوہر بہو بیگم کے بے حد قدر دان تھے کچھ اس کے اوصاف کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ وہ کروڑوں کی دولت اپنے ساتھ لائی تھی۔ ساس، نواب صدر جہاں بیگم نے تو بہو کو فقط پان کھانے کے نام سے کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی جائداد لکھ دی اور اپنی

جاگیر بھی اس کے نام کر دی۔ ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء میں نواب بہو بیگم کے بطن سے نواب آصف الدولہ پیدا ہوا۔ اس سے اس کی عزت و توقیر میں اور اضافہ ہو گیا۔

۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء میں صفدر جنگ نے وفات پائی اور نواب شجاع الدولہ مسندِ حکومت پر بیٹھا۔ وہ عمر بھر نواب بہو بیگم کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آتا رہا۔ اگرچہ اس کی اور بھی بیویاں تھیں لیکن بہو بیگم کو سب پر فوقیت حاصل تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے سامنے بلند آواز سے گفتگو کرے۔ گویا وہ اودھ کی خاتونِ اول تھی۔

نواب بہو بیگم نہایت دانشمند، رحم دل اور مخیر خاتون تھی۔ اس کی دولت اور جاہ و حشمت کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا، مگر وہ اپنی دولت کو سینت سینت کر رکھنے کے بجائے بے دریغ خرچ کرتی رہتی تھی۔ دس ہزار پیادے اور سوار براہ راست اس کے ماتحت تھے جن کے ساتھ سینکڑوں ہاتھی اور گھوڑے بھی تھے۔ ان سب کو بہو بیگم کی سرکار سے تنخواہ اور خوراک وغیرہ ملتی تھی۔ علاوہ ازیں ایک لاکھ سے زیادہ ملازمین اور متوسلین اس کے طفیل پرورش پاتے تھے۔ یہ سب لوگ ایسے خوش و خرم تھے جیسے بچہ اپنی ماں کی گود میں ہوتا ہے۔

نواب شجاع الدولہ نے ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء میں وفات پائی اور اس کی جگہ نواب آصف الدولہ تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اس کے تیئس سالہ دورِ حکومت میں بھی بہو بیگم کا فیضِ عام جاری رہا۔ اس زمانے میں اس کو جنابِ عالیہ کہا جاتا تھا۔ آصف الدولہ بہو بیگم کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دوسری بیگمات سے شجاع الدولہ کے چوبیس لڑکے اور سولہ لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے بعض کی شادی ہو چکی تھی اور ان کی اولاد تھی۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد آصف الدولہ تو باپ کا جانشین ہوا باقی سب سوتیلے لڑکے لڑکیوں کو بہو بیگم نے اپنے پاس بلایا۔ ہر ایک کو گلے لگایا پیار کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پھر آصف الدولہ سے کہا کہ ازروئے صلہ رحمی تم پر ان سب کی پرورش فرض ہے۔ نواب نے تمام لڑکوں کے لیے دو ہزار روپیہ فی کس اور تمام لڑکیوں کے لیے سات سو روپیہ فی کس ماہوار صرفِ خاص

کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ خاصہ سب کا نواب کے باورچی خانہ سے مقرر ہوا۔ دوسری بیگمات کی تنخواہیں بدستور قائم رہیں۔

نواب آصف الدولہ نے اپنے عہدِ حکومت میں فیض آباد کی بجائے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا تو شہر کو آراستہ کرنے پر بے تحاشا روپیہ صرف کیا۔ ویسے بھی وہ شاہ خرچ بلکہ فضول خرچ تھا۔ ہاتھ تنگ ہوا تو فوراً ماں کے پاس پہنچا اور اس سے پچاس لاکھ روپیہ لے کر ٹلا۔ کئی مرتبہ نواب بہو بیگم سے روپیہ لایا اور لکھنؤ میں لٹا دیا۔ ایک دفعہ ساس نواب صدر جہاں بیگم نے بہو بیگم کو ہاتھ روکنے کا مشورہ دیا تو کہا، میرا تو سوا اس لڑکے کے کوئی وارث نہیں ہے اب نہ دوں تو مرنے کے بعد ہر چیز کا یہی مالک ہو گا۔ خدا کی قدرت آصف الدولہ نے سنہ ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۸ء میں ماں کی زندگی میں انتقال کیا۔ اس کی جگہ اس کا سوتیلا بھائی نواب سعادت علی خاں تخت نشین ہوا۔ اس وقت فیض آباد میں سخت بدامنی تھی۔ نواب بہو بیگم نے وہاں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور شہر کی حالت سدھارنے کا کام ایک مردِ جری داراب علی خان کے سپرد کر دیا۔ اس نے تمام غنڈوں اور سرکشوں کے کس بل نکال دیئے اور مکمل امن و امان قائم کر دیا۔ بہو بیگم نے سعادت علی خاں کا سارا زمانۂ حکومت بھی دیکھا۔ سنہ ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۵ء میں نواب سعادت علی خاں کی وفات کے بعد اس کا فرزند غازی الدین تخت نشین ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں نواب بہو بیگم نے ۲۵ محرم سنہ ۱۲۳۱ھ (مطابق ۲۷ دسمبر سنہ ۱۸۱۵ء) کو وفات پائی۔ انتقال سے پہلے اس نے وصیت کی کہ جو روپیہ اور جائداد میں چھوڑے جا رہی ہوں اس میں سے تین لاکھ روپیہ میرے مقبرے کی تعمیر پر اور ایک لاکھ روپیہ مذہبی رسوم ادا کرنے پر صرف کیا جائے۔ علاوہ ازیں دس ہزار سالانہ کی جائداد ان لوگوں کی پرورش کے لیے ہو گی جو اس کی قبر پر قرآن خوانی کرتے رہیں۔

اس طرح بہو بیگم اپنی وفات کے بعد بھی بیسیوں لوگوں کی روزی کا بندوبست کر گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بہو بیگم نے دس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کا ایک گاؤں اپنی موت سے کافی عرصہ پہلے غریبوں مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔

(بیگمات شاہانِ اودھ۔ مشاہیر نسواں)

ممولا بیگم (بی بی)

بھوپال[1] کے والی نواب یار محمد خان (المتوفی سنہ ۱۱۶۷ھ) کی اہلیہ اور نواب فیض محمد خاں (المتوفی سنہ ۱۱۹۱ہجری) کی سوتیلی والدہ تھی۔ نہایت بیدار مغز اور دانا خاتون تھی۔ نواب فیض محمد خاں کی صغر سنی میں ریاست کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں مرہٹوں کا بڑا زور تھا۔ انہوں نے چاہا کہ مسلمانوں کی اس ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا جائے لیکن ممولا بیگم نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ مرہٹوں کا پیشوا بالاجی راؤ صرف سات پرگنے پر راضی ہو گیا اور اسی طرح ریاست مرہٹوں کی دست برد سے بچ گئی۔ اگر وہ موقع شناسی سے کام نہ لیتی تو ریاست کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ صاحب تدبیر ہونے کے علاوہ ممولا بیگم بڑی فیاض اور انصاف پسند بھی تھی نواب فیض محمد خان کے بعد نواب حیات محمد خاں سنہ ۱۱۹۱ھ میں مسند نشین ریاست ہوا تو اس نے بھی ممولا بیگم کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا۔ اکثر امورِ ریاست وہ اس کی رائے سے انجام دیتا تھا یہاں تک کہ وزیروں کا تقرر بھی اسی کے مشورے سے کرتا تھا۔

ممولا بیگم نے دو عظیم الشان مسجدیں بھوپال میں بنوائیں جو آج تک موجود ہیں۔ اس نے ۸۰ برس کی عمر پا کر سنہ ۱۲۰۹ھ میں انتقال کیا۔ (تاریخ ہوپال۔ مشاہیر نسواں)

---

[1] بھوپال وسطی ہند کی ایک خوشحال مسلمان ریاست تھی۔ ۱۹۵۱ء میں اس کی آبادی ۸۳۸۰۷۴ تھی۔ برِ کوچک پاک و ہند کی آزادی کے کچھ عرصہ بعد جب بھارت کی حکومت نے ملک کی تمام ریاستوں کو مختلف صوبوں میں ضم کر دیا تو ریاست بھوپال کو ختم کر کے صوبہ "مدھیا پردیش" میں شامل کر دیا۔ اس ریاست کا رقبہ ۶۸۷۸ مربع میل تھا اور اس میں ایک بڑا شہر (بھوپال) ۳۰ پرگنے، ۳۰ قصبے اور اڑھائی ہزار کے لگ بھگ گاؤں تھے۔

تیرہویں صدی ہجری

۱۔ نواب قدسیہ بیگم (داتا، فیاض، دیندار، دلیر)
۲۔ بی بی رابعہ جیلانیہؒ (عابدہ، زاہدہ، عارفہ)
۳۔ نواب سکندر بیگم (والیہ ریاست، دیندار، مدبرہ، مخیّر)
۴۔ نواب شاہجہان بیگم (والیہ ریاست، عالمہ فاضلہ، شاعرہ، مخیّر، دیندار، رعایا پرور)
۵۔ زکیہ بیگمؒ (راسخ العقیدہ، موحد، دیندار، فیاض، باوفا)
۶۔ دختر شاہ محمد اسحاقؒ (عالمہ فاضلہ)
۷۔ بی بی شرف خانم (شاعرہ)
۸۔ نواب ملکہ کشور صاحبہ (نیک سرشت، دیندار عالی دماغ، حوصلہ مند)
۹۔ ملکہ بزم عالم (دیندار، مخیّر، نیک سیرت)
۱۰۔ بی بی آسیہ خانم (عابدہ، سخی)
۱۱۔ بی بی عائشہ تیموریہ (شاعرہ)
۱۲۔ گلبدن باجی (عابدہ، زاہدہ، امین)
۱۳۔ بی بی صفوت (شاعرہ)
۱۴۔ ملکہ شرافت محل (علم دوست، دیندار، فیاض)
۱۵۔ قرۃ العین طاہرہ (عالمہ، ادیبہ، خطیبہ، شاعرہ، بابی مذہب کی سرکردہ رہنما)
۱۶۔ بی بی کیفی (شاعرہ)
۱۷۔ سری خانم (شاعرہ)
۱۸۔ حیات النساء بیگم حیا (شاعرہ، عالمہ، فاضلہ)
۱۹۔ بی بی فطنت خانم (شاعرہ)
۲۰۔ ملکہ زینت محل (ہنر مند، سلیقہ شعار، باوفا بیوی)
۲۱۔ نواب حضرت محل (مدبرہ، نڈر، بہادر، غیرت مند)
۲۲۔ عزیز النساء بیگم (روشن دماغ، دانشمند، دیندار، نیک سرشت، دوراندیش ماں)
۲۳۔ نواب اختر محل اختر (شاعرہ)
۲۴۔ بی بی لیلیٰ خانم (شاعرہ)
۲۵۔ مہ لقا بائی چندا (شاعرہ، عالمہ، فنون سپہگری میں طاق)
۲۶۔ بی بی لحاظ النساء (محدثہ)
۲۷۔ ملکہ پر توپیالہ (نیک سیرت، باخدا، مخیّر)
۲۸۔ پادشاہ بیگم دہلوی (خطاطہ)
۲۹۔ بی بی شمس النساء (عالمہ، فاضلہ، دیندار)
۳۰۔ صولت النساء بیگم (مخیّرہ، دیندار)
۳۱۔ بی بی اسماء عبرت (خطاطہ)
۳۲۔ بی بی رشحہ (شاعرہ)

نواب قدسیہ بیگم

اصل نام گوہر بیگم تھا۔ ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئیں۔
نواب غوث محمد خان (فرزند نواب حیات محمد خان والی بھوپال) کی بیٹی تھیں

ان کی شادی نواب نظیر الدولہ نظیر محمد خان والی بھوپال سے ۱۲۳۲ھ میں ہوئی۔ تین سال بعد نواب نظیر الدولہ فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے ایک خرد سالہ بچی سکندر بیگم چھوڑی۔ عمائدِ ریاست نے اس کی والدہ قدسیہ بیگم کو مختارِ ریاست مقرر کیا۔ اسی سال نواب قدسیہ بیگم کے والد نواب غوث محمد خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ لیکن انہوں نے بڑے حوصلے سے کام لیا اور ریاست کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے چلاتی رہیں۔ وہ بڑی دانا، فیاض دیندار اور دلیر خاتون تھیں۔ انہوں نے بھوپال میں ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوائی اور لاکھوں روپے خرچ کرکے بھوپال کے شہریوں کو پانی مہیا کرنے کے لیے واٹر ورکس بنوایا۔

۱۲۵۰ہجری میں نواب قدسیہ بیگم نے اپنی لختِ جگر سکندر بیگم کی شادی نواب جہانگیر محمد خاں سے کی۔ شادی کے بعد نواب جہانگیر محمد خان نے مطالبہ کیا کہ عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اس پر قدسیہ بیگم نے ناراض ہو کر اس کو نظر بند کر دیا لیکن وہ کسی طرح نظر بندی سے نکل کر سیہور پہنچ گیا اور کئی مواضعات پر قبضہ کر لیا۔

اب قدسیہ بیگم اور نواب جہانگیر محمد خان میں باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی۔ آخر انگریزوں نے مداخلت کرکے جنگ بند کرا دی اور ریاست

نواب جہانگیر محمد خان کے سپرد کر کے نواب قدسیہ بیگم کو چار لاکھ کی جاگیر دے دی۔ یہ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) کا واقعہ ہے۔

نواب قدسیہ بیگم نے ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) میں وفات پائی۔

نواب قدسیہ بیگم کو عبادت و ریاضت سے بڑا شغف تھا۔ روزانہ رات کو دو بجے کے قریب بیدار ہوتیں اور صبح آٹھ بجے تک تلاوتِ قرآن، نماز اور ذکر اذکار میں مشغول رہتیں۔ فرض نمازوں کے علاوہ تہجد کی بھی پابند تھیں، اور نوافل بھی بڑی کثرت سے پڑھتی تھیں۔ اپنے متعلقین اور ملازمین کو بھی نماز کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ صدقات و خیرات کرنے میں بڑی کشادہ دست تھیں اور سینکڑوں غرباء اور مساکین ان کے دسترخوان پر پرورش پاتے تھے۔

(تاریخِ نوری۔ تاج الاقبال۔ مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی رابعہ جیلانیہؒ

مرزا محمد کی دختر نیک اختر تھیں جو رشت کے رہنے والے تھے اور گیلان کے وزیر تھے۔ بی بی رابعہ کی شادی مرزا اسمٰعیل سے ہوئی۔ یہ بڑی خدا رسیدہ خاتون تھیں، اور علم و عرفان میں بہت بلند مقام رکھتی تھیں۔ ان کے زہد و عبادت کو دیکھ کر شاہِ ایران نے ان کو "رابعہ ثانیہ" کا خطاب دیا تھا، اور ہزار تومان سالانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے کرمان میں ایک شاندار عمارت بنوائی جہاں بڑے بڑے اولیاء و مشائخ کے مزار ہیں۔ بی بی رابعہ جیلانیہؒ نے سن ۱۲۹۰ ہجری میں شہر قم میں وفات پائی۔ (مشاہیرِ نسواں)

نواب سکندر بیگم

پیچھے نواب قدسیہ بیگم کے حالات میں ذکر آچکا ہے کہ سکندر بیگم (دخترِ نواب نظیر الدولہ نظیر محمّد خان و قدسیہ بیگم) کی شادی سنہ ۱۲۵۰ھ میں نواب جہانگیر محمّد خان سے ہوئی اور ۱۲۵۲ھ میں نواب جہانگیر محمّد خان سکندر بیگم کے شوہر ہونے کی بنا پر بھوپال کے والی ریاست قرار پائے۔ دو تین سال تو میاں بیوی کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار رہے لیکن پھر کشیدہ ہو گئے۔ (ایک روایت کے مطابق نواب جہانگیر محمّد خان پردے کے معاملے میں سخت متشدّد تھے جبکہ سکندر بیگم اعتدال پسند تھیں۔ اسی سلسلے میں ایک دن میاں بیوی میں سخت جھگڑا ہو گیا اور نواب جہانگیر محمّد خان نے ان پر تلوار اٹھائی۔ یہ بات میاں بیوی میں سخت بگاڑ کا باعث بن گئی) چنانچہ نواب سکندر بیگم اپنی والدہ قدسیہ بیگم کے ساتھ اسلام نگر چلی گئیں۔ وہیں ٦ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ کو نواب سکندر بیگم کے بطن سے نواب شاہجہان بیگم پیدا ہوئیں۔

نواب جہانگیر محمّد خان نے ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۰ ہجری کو بعارضہ ضعفِ معدہ وفات پائی۔ ان کے بعد شاہجہان بیگم رئیسۂ ریاست، نواب سکندر بیگم نگرانِ ریاست اور فوجدار محمّد خان مدار المہام مقرر ہوئے مگر وہ ۱۲۶۳ ہجری میں استعفا دینے پر مجبور ہوئے۔ ان کی جگہ منشی جمال الدین خان بہادر مدار المہام مقرر ہوئے۔ مولانا عبد الحیؒ نے نزہتہ الخواطر میں لکھا ہے کہ نواب سکندر بیگم نے اسی سال ان سے نکاحِ ثانی کر لیا تھا۔ نواب سکندر بیگم نے یہ دستور کہ نواب بھوپال کے اولادِ نرینہ نہ ہونے کی صورت میں

اس کی بیٹی کا شوہر بھوپال کا حکمران ہوگا، حکومتِ ہند سے منسوخ کرالیا۔
سنہ ۱۲۷۱ ہجری میں انہوں نے اپنی لختِ جگر شاہ جہان بیگم کی شادی بڑی دھوم دھام سے نواب باقی محمّد خان سے کر دی۔ مولانا عبدالقیومؒ فرزند مولانا عبدالحیؒ بوڑھانویؒ نے خطبہ نکاح پڑھا۔ دو کروڑ روپے مہر مقرر ہُوا۔ اس شادی پر تقریباً آٹھ لاکھ روپے صَرف ہوئے۔ سنہ ۱۲۷۳ھ میں سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے (یہ اہلِ ہند کی جنگِ آزادی تھی لیکن انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا) نواب سکندر بیگم نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ ریاست بھوپال میں کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ چنانچہ انگریزوں اور نواب شاہجہان بیگم کی باہمی رضامندی سے نواب سکندر بیگم بھوپال کی حکمران (رئیسہ) اور نواب شاہجہان بیگم ولی عہد مقرر ہوئیں۔

نواب سکندر بیگم نے اپنے عہدِ حکومت میں دور رس فوجی و انتظامی اصلاحات کیں۔ دفتروں کو مرتّب کیا اور ریاست کو تین حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک حصے پر ایک ناظم مقرر کیا۔ انہوں نے ریاست کا تمام قرض جس کی مقدار تیئس لاکھ اکسٹھ ہزار آٹھ سو اکتالیس روپے تھی، اتار دیا۔ وہ اکثر اپنی ریاست میں دورہ کرتی رہتی تھیں اور لوگوں کی شکایات سُن کر ان کو دور کر دیتی تھیں۔ بڑی مخیّر اور دیندار خاتون تھیں۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ جب ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ جامع مسجد سہور جسے ملک غیاث الدین نے سنہ ۷۳۲ ہجری میں تعمیر کرایا تھا، کھنڈر کی صورت اختیار کر گئی ہے تو انہوں نے فوراً اس کی تعمیرِ نو کا حکم دیا۔ چنانچہ سنہ ۱۲۹۱ ہجری میں مسجد کی تعمیرِ نو مکمل ہوگئی اور اس کی اصل شان و شوکت بحال ہوگئی۔

اس سے پہلے سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں نواب سکندر بیگم مع قدسیہ بیگم و فوجدار محمّد خان اور ایک ہزار ہمراہیوں کے حجِ بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ

گئیں اور یہ سعادت حاصل کر کے جمادی الاولیٰ ۱۲۸۱ھ ہجری میں واپس بھوپال آئیں۔

۱۲۸۲ھ ہجری میں نواب سکندر بیگم کی بیٹی نواب شاہجہان بیگم کے شوہر نواب باقی محمد خان نے حج سے واپس آکر انتقال کیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک بیٹی سلطان جہان بیگم چھوڑی۔

نواب سکندر بیگم نے موتی مسجد کے نام سے ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوانی شروع کی لیکن ابھی یہ زیرِ تعمیر تھی کہ اُن کا وقتِ آخر آ پہنچا اور وہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ ہجری کو عالمِ فانی سے دارِ بقا کو سدھار گئیں۔ ان کو فرحت افزا باغ میں دفن کیا گیا جو انہوں نے اپنی زندگی میں خود تیار کرایا تھا۔ ان کی وصیت کے مطابق قبر پر کوئی گنبد وغیرہ نہ بنایا گیا۔

کسی نے ان کی تاریخ وفات یہ کہی:

بیگم عالیہ سکندر نام
چوں بدار البقا نمود سفر
سالِ تاریخ آں ستودہ خصال
گفت شاہجہان غمِ مادر

۱۲۸۵ھ

(تاریخ لودی۔ تاج الاقبال)

نواب شاہجہان بیگم

نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد نواب شاہجہان بیگم ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں بھوپال کی حکمران (رئیسہ) بنیں۔ اس وقت ان کی عمر ۳۱ برس کی تھی اور ان کو بیوہ ہوئے تین برس گزر چکے تھے۔ انہوں نے مسند نشین ہوتے ہی غلّہ پر محصول معاف کر دیا اور فوج کی تنخواہ بڑھا دی۔ پھر ساری ریاست کا دورہ کیا۔ اس کا مقصد رعایا کی دادخواہی، نظم و نسق کی درستی اور حکام کے جبر و تعدی کا انسداد تھا۔ انہوں نے اشاعتِ تعلیم پر خاص توجہ دی اور رفاہِ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ وہ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں اور نہایت فراخ دلی سے اہلِ علم و ہنر کی سرپرستی کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ ایک کاتبہ فاطمۃ الکبریٰ نے ایک پنج سورہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور کاتبہ کو مرصّع پہنچیوں کی ایک جوڑی انعام میں دی۔ اسی طرح دوسرے اہلِ کمال بھی ان کی فیاضی سے مستفیض ہوتے تھے۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں "تاج الاقبال" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ بھوپال کی تاریخ ہے اور فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے —— اس کے علاوہ "خزینۃ اللغات" اور "تہذیب النسواں" بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں نواب شاہجہان بیگم کا عقدِ ثانی سید صدیق حسن خان قنوجی[1] سے ہوا۔ حکومتِ برطانیہ کی منظوری سے ان کو نواب والا جاہ امیر الملک کا خطاب

---

[1] نواب سید صدیق حسن خان قنوجی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے سرآمدِ روزگار

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیا گیا۔ والیانِ ملک کی طرح تمام قلمروِ برطانیہ میں ان کے لیے سترہ توپوں کی سلامی بھی منظور ہوئی۔ نواب شاہجہان بیگم نے ان کو پچھتر ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اربابِ علم و فضل میں ہوتا ہے۔ ۱۲۴۸ھ میں اپنے ننھیال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید اولاد حسن قنوجی تھا جو اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ نواب صاحب کا اصل نام صدیق حسن اور تاریخی نام خورشید حسن تھا۔ ابو الطیب، ابو الطاہر اور ابو الوفا تین کنیتیں تھیں۔ تین ہی تخلص تھے: روحی، نواب اور توفیق۔ سلسلۂ نسب سیدنا حضرت حسین رضؓ (شہید کربلا) بن علیؓ سے جا ملتا ہے۔ پانچ برس کے تھے کہ والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ والدہ بڑی دیندار اور متقی خاتون تھیں، انہی کی آغوش میں نواب صاحب کی پرورش و تربیت ہوئی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد صرف نحو اور منطق کی ابتدائی کتابیں نواب صاحب نے اپنے بڑے بھائی مولانا سید احمد حسن عرشی سے پڑھیں۔ پھر فرخ آباد چلے گئے اور مختلف اساتذہ سے مشکوٰۃ المصابیح، درمختار، کافیہ، شرح جامی، قطبی، میر قطبی، افق المبین اور دیگر متداول درسی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے کانپور گئے اور ملا محمد مراد بخاری اور مولانا محمد محب اللہ پانی پتی سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۶۹ھ میں دلی پہنچے اور صدر الافاضل مفتی صدر الدین آزردہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تقریباً دو برس تک کتبِ منقول و معقول پڑھ کر علومِ رسمیہ سے فارغ ہو گئے۔ دلی کے اثنائے قیام میں کئی دوسرے اکابر علماء سے بھی استفاضہ کیا اور ان سے اجازۂ حدیث لیا۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اور ان کے ولی عہد مرزا فخرو سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ مرزا غالب سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ دلی میں ان کا قیام نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کے مکان پر رہا اور ان سے مخلصانہ تعلق قائم ہو گیا۔ تحصیلِ علوم سے فارغ ہو کر وہ اکیس برس کی عمر میں واپس قنوج پہنچے مگر وہاں گزر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ تلاشِ معاش میں بھوپال پہنچے۔ یہ نواب سکندر بیگم کا زمانہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عطا کی اور سرکاری مراسلوں میں ان کے لیے مندرجہ ذیل القاب و آداب مقرر کیے گئے:

"نواب صاحب معدنِ محامد اخلاق، مخزنِ مکارمِ اختصاص، نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خاں صاحب بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ!"

نواب شاہجہان بیگم کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ اردو میں شیریں تخلص تھا اور فارسی میں "شاہجہاں"۔ بالعموم فارسی میں مشقِ سخن کرتی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تھا۔ انھوں نے مدار المہام منشی محمد جمال الدین خاں کی سفارش پر انھیں تیس روپیہ ماہوار پر منشی مقرر کر دیا۔ کچھ مدت بعد میر دبیر کے عہدے پر تقرر ہو گیا لیکن ایک سال بعد بوجوہ ملازمت سے الگ ہونا پڑا (اس کا بڑا سبب حُقّہ کی اباحت اور کراہت کے بارے میں ان کا مولانا علی عباس چڑیا کوٹی سے اختلاف تھا)۔ وطن واپس ہوتے ہوئے کچھ عرصہ کانپور اور بلگرام میں قیام کیا۔ قیامِ بلگرام کے دوران میں چند مہینوں کے اندر قرآنِ پاک حفظ کر لیا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔ نواب صاحب کے لیے یہ بڑی عسرت کا دور تھا۔ کئی کئی مہینے تک کالے رنگ کے موٹے جھوٹے کپڑے کا ایک ہی جوڑا پہنے رہتے۔ اسے خود ہی دھو کر پھر پہن لیتے۔ روکھی سوکھی روٹی پانی کے سہارے حلق سے اتار لیتے۔ بلگرام سے قنوج پہنچے تو وہاں نمک کی کنکری کا سہارا بھی نہ تھا مجبوراً تلاشِ معاش کے لیے پھر وطن سے نکلے بڑاوت ہوتے ہوئے ٹونک پہنچے۔ نواب وزیر الدولہ بڑے احترام سے پیش آئے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ ابھی وہاں آٹھ مہینے ہی گزرے تھے کہ والیۂ بھوپال کی طرف سے طلبی ہوئی۔ اب کے بھوپال پہنچے تو وہاں فضا ساز گار تھی۔ یکم صفر ۱۲۷۶ھ کو ریاست کی تاریخ لکھنے پر ان کا تقرر ہو گیا۔ پچھتر روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ منشی جمال الدین خاں مدار المہام ان کے علم و فضل، خاندانی نجابت و شرافت، دینداری

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نمونۂ کلام یہ ہے :

تا چراغِ عقل در فانوسِ دل افروختم | عجب و نخوت جملہ اسبابِ جہالت سوختم

گو بہر گناہ وقف فرصت باشم | در طاعتِ حق کمینہ ہمت باشم
نا امید نیم کہ نا امیدی کفر است | ہر لحظہ امیدوارِ رحمت باشم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اور محاسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی بیوہ لڑکی زکیہ بیگم کا نکاحِ ثانی ان سے کر دیا۔ ۱۲۸۵ھ میں نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد نواب شاہجہان بیگم والیۂ ریاست بنیں۔ اسی زمانے میں نواب صاحب کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ مکۂ معظمہ میں انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور اخلاق و تصوف کی نادر کتابوں کے دو دو نسخے خریدے اور بعض رسالوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا۔ حرمین شریفین سے واپس بھوپال آئے تو نواب شاہجہان بیگم نے پہلے تو انہیں سررشتۂ تعلیمات کے مدارس کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا اور پھر ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء میں ان سے عقدِ ثانی کر لیا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے باہمی تعلقات ہمیشہ بڑے خوشگوار رہے لیکن حاسدوں نے نواب صاحب کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور انگریزوں تک یہ بات پہنچائی کہ نواب صاحب حکومتِ برطانیہ کے دشمنوں (وہابیوں) سے ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا۔ ان سے خطاب واپس لے لیا گیا۔ توپوں کی سلامی موقوف کر دی گئی اور حکم دیا گیا کہ وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ نواب صاحب نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور اپنے آپ کو ہمہ تن دین اور علم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ نواب شاہجہان بیگم کی کوششوں سے حکومتِ ہند کی نواب صاحب کے خلاف بدگمانی دور ہو گئی لیکن اسی اثنا میں نواب صاحب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شورِ بختِ من و گفتارِ رقیب و خُنُش
بر سرِ زخمِ شکستیم نمک دانے چند

مشکل مرض است ایں کہ بہ فریاد رسیدؔ است
آں کس کہ بہ فریاد رسیدن نتواند!

(باقی حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کو مرضِ استسقاء لاحق ہوگیا اور وہ سنہ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ نواب صاحب نے اپنے پیچھے ایک لڑکی اور دو لڑکے چھوڑے جو ان کی پہلی بیوی ذکیہ بیگم کے بطن سے تھے۔ نواب شاہجہان بیگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نواب صاحب کا عظیم الشان کارنامہ ان کی علمی اور دینی خدمات ہیں۔ ان کے عہد میں بھوپال اسلامی علوم وفنون کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا جہاں اقصائے ہند کے علاوہ دُور دُور کے ملکوں سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے آتے تھے۔ نواب صاحب نے عربی کی امہات کتب جمع کرنے کا خاص اہتمام فرمایا اور ایک لاکھ روپیہ (جو آج کل کے دو کروڑ سے بھی زیادہ کے برابر ہیں) خرچ کرکے تفسیر وحدیث کی نایاب کتابیں شائع کیں اور اقصائے عالم کے کتب خانوں اور علماء کو مفت مہیا کیں۔ ان میں تفسیر ابنِ کثیر، فتح الباری شرح صحیح البخاری اور امام شوکانیؒ کی نیل الاوطار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے تمام انواعِ علوم اور اصنافِ فنون (صرف، نحو، لغت، تفسیر، حدیث، فقہ، بدیع، ادب، تاریخ وسِیَر، تصوّف، شعر وانشاء، تذکرہ، مناقب، علم الاشتقاق وغیرہ) پر عربی فارسی اور اردو میں دو سو بائیس کتابیں خود تصنیف کیں ان میں سے بیشتر کتابیں شائع ہوگئیں البتہ کچھ غیر مطبوعہ قلمی کتابیں بھی تھیں جن کا سراغ نہیں ملتا۔ نواب صاحب کی چند مشہور تالیفات کے نام یہ ہیں:

اے چرخ چہ کردی بہ سلیمان وسکندر — کز تو ہوس عیش بود شاہ جہاں را

چو ز عہد او بپرسم چہ بلا جواب گوید — کہ ہزار جا بہ بستم بہزار جا شکستم
پئے قدر ناشناسے کہ بہ رائگاں نہ گیرد — دل بے بہائے خود را بعبث بہا شکستم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

فتح البیان فی مقاصد القرآن (سات جلدیں)، اکسیر فی اصول التفسیر، عون الباری لحل ادلۃ البخاری، ترجمان القرآن (پندرہ جلدیں) فتح العلام بشرح بلوغ المرام، السراج الوھاج فی شرح مختصر الصحیح المسلم بن حجاج، اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین، التاج المکلل، ابجد العلوم، العلم الخفاق من علم الاشتقاق، شمع انجمن —— علاوہ ازیں صحاح ستہ کے اوّلیں تراجم وشروح کے اہتمام کی سعادت بھی نواب صاحب کے حصے میں آئی۔ انہوں نے مولانا وحید الزماں اور مولانا بدیع الزماں کے معقول وظائف مقرر کر کے دونوں بھائیوں کو صحاح ستہ کے اردو تراجم پر لگا دیا۔ نواب صاحب نے مدارس ومکاتب کی اس طرح سرپرستی کی کہ نظام الملک طوسی کی یاد تازہ ہو گئی۔ ذاتی زندگی میں بھی نواب صاحب نہایت متقی، خاشع، عبادت گزار اور پابندِ سنت تھے۔ فی الحقیقت وہ جملہ محاسنِ اخلاق کا پیکرِ جمیل تھے۔ غربا، مساکین اور طلبہ کے لیے وہ ایسا ابرِ سخاوت تھے جو اُن پر جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا۔ وہ نہایت وجیہ وجمیل، گورے چٹے، متناسب الاعضا اور متشرع شکل وصورت کے آدمی تھے۔ نواب صاحب عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

نو فغاں ہیں اور نو فریاد ہم —— رحم کے قابل ہیں اے صیاد ہم

ہوا جو وصل میسر تو یہ ہوئی حسرت —— کوئی دن اور ابھی مشقِ آرزو کرتے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایں عمرِ دراز صرفِ عصیاں بودہ — یکبار ترا نہ چشمِ گریاں بودہ
با ایں ہمہ اعوجاج بخشش خواہی — گر نیست عمل بیا پشیماں بودہ

اثر نالۂ دردم بچمن باقی باد ! — حیف گر نالۂ من یادنگیری بلبل
گرچہ ایں نغمۂ آزادی تو نیز خوش است — لیک خوشتر بود آہنگِ اسیری بلبل

باور مکن قولِ عدو ساغر کجا و شیشہ کو — اے محتسب ایں ہا مجو دارم ز صہبائے دگر
من میدم سوئے حرم دل می کشد سوئے صنم — من میروم جائے دگر دل می بُرد جائے دگر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

منائیں گے دلِ بیمار کو جفا کے لیے — وفا تو اب کہیں ملتی نہیں دوا کے لیے

گلہ کیا تو کس انداز سے بگڑ کے کہا — کہ تم نے رنج سہے اپنے مدعا کے لیے

بار کیا ذات ہے تیری کہ ندیدہ ہو کر — مجھ کو دیدہ نظر آتا ہے شنیدہ ہو کر
ن کے ملنے کی ہوس کی تو یہ لیجے افسوس — رہروِ عشق کی یہ شان جریدہ ہو کر

اور دو فارسی شعر:

پروانہ ام کہ کارِ من از حد گزشتہ است — در اختیارِ خویش نہ در اختیارِ شمع
سوزم من از دلِ خود و پروانہ از چراغ — من داغدارِ خویشتم و او داغدارِ شمع

(مآثر صدیقی۔ فقہائے ہند۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جلد ۲،
ماہنامہ "فاران" کراچی جون ۱۹۷۱ء)

اے عشق بے پروا بیا تا دارہم از ما سوا | جز درد تو نبود مرا در دل تمنائے دگر
شاہجہانم بیگماں ہم تاجور در ہندیاں | جز یاد دا ور در جہاں دارم نہ سودائے دگر

"باغ دلکشا" کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

دلکشا باغ لطیف و خوب است | فرحت افزا چوں رخ محبوبست
ثمرش قوت دلہائے ضعیف | گل او تازگی جان نحیف
انبہ اش کوزۂ شہدست و نبات | شیرہ اش صاف تر از آب حیات
بوئے او راحت جان شیدا | رنگ عشاق زبویش پیدا

اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

خالق ہے خدائے سحر و شام ہمارا | مشہور اسی نے کیا یہ نام ہمارا
پیدا ہوئے ہم امت محبوب خدا میں | برتر نہ ہو کیوں رتبۂ اسلام ہمارا
آتی ہے ہوا سر دگھٹا اٹھتی ہے گھنگور | منگواؤ صراحی مے و جام ہمارا
بیتابیٔ دل اس کے بھی دل میں تو اثر کر | مدت سے یہی تجھ سے ہے پیغام ہمارا
اے باد صبا تو ہی تن زار کو لے چل | گلزار میں آیا ہے وہ گلفام ہمارا
ہم کہتے ہیں حج کوچۂ دلدار کا اپنے | ہے چادر تن جامۂ احرام ہمارا
فرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اسی نے | کام آیا بہت یہ دل ناکام ہمارا
پہلی سی کاوٹ نہیں اب ہے نظر لطف | آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا
کافر کیا مجھ کو تری اس زلف نے کافر | اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

دنیا میں بڑا شور ہے شکر شکنی کا!
شیریں جو تخلص میں ہوا نام ہمارا

نواب باقی محمد خان مرحوم کی صلب سے نواب شاہجہاں بیگم کی دو بیٹیاں

پیدا ہوئی تھیں، سلیمان جہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم ۔ سلیمان جہاں بیگم صغر سنی میں فوت ہوگئیں البتہ سلطان جہاں بیگم، والدہ کے عقدِ ثانی کے وقت جوان تھیں۔ بدقسمتی سے ماں بیٹی کے تعلقات سخت کشیدہ ہوگئے۔ اس کے کئی اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ تھا کہ نواب شاہجہان بیگم کو شبہ تھا کہ سلطان جہاں بیگم نے اپنے سوتیلے باپ (نواب صدیق حسن خان) کے خلاف سازشوں میں حصہ لیا ہے۔ جس کی بناء پر نواب صاحب پر انگریزی حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ چنانچہ وہ بیٹی سے ایسی ناراض ہوئیں کہ ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں تھیں۔ بول چال ملنا جلنا سب ترک ہوگیا تھا۔ بیٹی نے ماں کو منانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے دل میں کچھ ایسی گرہ بندھی تھی کہ مرتے دم تک نہ کھل سکی۔

نواب شاہ جہان بیگم نے ریاست کی آبادی کے لیے بہت کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے شہر بھوپال کے باہر شاہ جہان آباد تعمیر کرایا جس پر بیس لاکھ روپے صرف ہوئے ـــــ نواب شاہ جہان بیگم کے دوسرے شوہر نواب صدیق حسن خان نے ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔ اس کے گیارہ سال بعد ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ء میں نواب شاہجہان بیگم نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ نواب صدیق حسن خانؒ نے اپنی کتاب "تذکرہ شمع انجمن" مرتب کی تو اس میں نواب شاہجہان بیگم کے بارے میں یہ عبارت لکھی :

> "نواب شاہجہان بیگم نے اہلِ علم و فضل اور اصحابِ ہنر و کمال کی تربیت پر جس ہمتِ خداداد سے توجہ مبذول فرمائی اس کی نظیر خواتینِ ہند میں زیب النساء بیگم دخترِ عالمگیر اعظم کے سوا کہیں نہیں ملتی۔"

یہ عبارت انہوں نے اس لیے نہیں لکھی کہ نواب شاہجہان بیگم ان کی اہلیہ تھیں بلکہ فی الحقیقت نواب شاہ جہان بیگم نے معارف پروری اور اربابِ فضل و کمال کی قدردانی میں خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے۔

(مشاہیرِ نسواں ۔ تاریخِ لودی ۔ فاران کراچی جون ۱۹۶۸ء ۔ بیگماتِ بھوپال)

زکیہ بیگم

یہ خاتون منشی جمال الدین خاں بہادر[1] کی صاحبزادی تھیں جو نواب سکندر بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کے زمانے میں ریاست بھوپال کے مدار المہام (وزیر اعظم) تھے۔ فاضل والد نے ان کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ قرآن کریم خود ان کو ترجمہ کے ساتھ پڑھایا، ساتھ ہی فارسی اور اردو کی تعلیم بھی دی۔ وہ بڑی راسخ العقیدہ، موحد، نرم دل اور فیاض خاتون تھیں۔ پردہ اور نماز کی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات مراۃ العروس اور بنات النعش بڑے شوق سے پڑھیں اور عمر بھر ان کو پسند کرتی رہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی

لے منشی جمال الدین خاں کہنے کو تو ایک بڑی ریاست کے مدار المہام تھے لیکن فی الحقیقت اسلاف کی یادگار اور صلحائے اُمّت کا نمونہ تھے۔ ۱۲۱۱ھ ہجری میں کوتانہ مضافات دہلی کے ایک شریف علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے ملتا ہے۔ عربی اور فارسی کی ضروری تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی پھر دہلی جا کر حضرت شاہ محمد اسحاق محدثؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے حدیث کی سند لی۔ ان کے علاوہ شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلوی، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد القادرؒ، مولانا مملوک علیؒ، شاہ غلام علیؒ اور مولانا محمد آفاق نقشبندیؒ سے بھی کسبِ فیض کیا۔ اس کے بعد تلاشِ معاش میں بھوپال پہنچے۔ پہلی مرتبہ حصولِ ملازمت میں کامیابی نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ آئے۔ اس مرتبہ ایک دفتر میں معمولی سی اسامی پر تقرر ہو گیا۔ بڑے ذہین اور مستعد آدمی تھے ترقی کرتے کرتے افسر بن گئے پھر افسری سے بھی درجہ بدرجہ ترقی کر کے نائب وزیر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ اس وقت نواب سکندر بیگم والیۂ ریاست

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بھی خاصی استعداد تھی "گلستان" کی اکثر ضرب الامثال ان کو زبانی یاد تھیں۔ "بوستان" کے بہت سے اشعار بھی نوکِ زبان تھے۔ مال و دولت، حسبُ نسب، علم و فراست، حسن و جمال اور دینداری یہ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ نے ان میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تھیں۔ انہیں کئی موقعوں پر منشی صاحب کی فراست اور قابلیت کا تجربہ ہو چکا تھا چنانچہ جب وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ خالی ہوا تو انہوں نے منشی صاحب کو بھوپال کا وزیرِ اعظم (مدار المہام) مقرر کر دیا۔ اس وقت معاشی اعتبار سے ریاست کی حالت نہایت ابتر تھی۔ منشی صاحب نے کاروبارِ حکومت ایسی خوش اسلوبی سے چلایا کہ ریاست کی آمدنی پندرہ لاکھ سے بڑھتے بڑھتے ساٹھ لاکھ تک پہنچ گئی اور انگریزی حکومت نے اسے درجۂ اوّل کی ریاست قرار دیا۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے "فقہائے پاک ہند" میں لکھا ہے کہ نواب سکندر بیگم نے ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں ان سے نکاحِ ثانی کر لیا۔

منشی جمال الدین خان نہایت دیندار، مخیّر اور معارف پرور بزرگ تھے انہوں نے نواب سکندر بیگم کی تائید و تعاون سے اشاعتِ تعلیم کے لیے بے پناہ کام کیا۔ سب سے پہلے منشی صاحب نے اپنے ذاتی صَرف سے ایک عالی شان مسجد اور دینی مدرسہ تعمیر کرایا اس میں مفت قیام و طعام کے علاوہ طلبہ کو کتابیں اور وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ تعلیم دینے پر نامور علماء مامور تھے، جن کو معقول مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ اس مسجد کے علاوہ بعد میں انہوں نے ریاست میں کئی اور مسجدیں اور مدرسے بھی بنوائے نواب سکندر بیگم نے بھی ایک عظیم الشان مسجد اور دینی درسگاہ تعمیر کرائی۔ امراء اور جاگیرداروں نے ان کی پیروی کی، اس طرح دینی تعلیم کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔

منشی جمال الدین خاں یوں تو وزیرِ اعظم تھے اور بڑے اختیارات کے مالک تھے لیکن ان کی ذاتی زندگی بالکل درویشانہ تھی۔ وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی انہوں نے ایوانِ وزارت سے قیمتی اور پُرتکلف ساز و سامان اٹھوا دیا اور اس کی جگہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جمع کردی تھیں۔ جنگِ آزادی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء سے پہلے اپنے والد کے ساتھ حجاز گئیں
اور حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ان کی شادی ایک شریف اور معزز گھرانے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

سادہ فرش بچھوا دیا جس پر گاؤ تکیے رکھوا دیے گئے تاکہ وزیرِ اعظم اور عام حاضرین میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ لباس اتنا سادہ ہوتا تھا کہ کوئی اجنبی ان کو دیکھ کر باور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ریاست کے وزیرِ اعظم ہیں۔ ململ کا کرتا، معمولی انگرکھا اور شرعی پاجامہ زیبِ تن ہوتا تھا۔ سر پر ہمیشہ ململ کا صافہ ہوتا تھا۔ کسی تقریب کے موقع پر والیۂ ریاست کی طرف سے قیمتی کپڑے تحفے میں ملتے تو ان کپڑوں کو غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ نماز با جماعت کا بے حد التزام تھا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے مسجد میں دیر ہو جاتی اور جماعت ہو چکی ہوتی تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھ کر مسجد سے باہر آجاتے، وضو کرنے میں جو آستینیں چڑھائی جاتی تھیں اسی طرح کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ دوسری مسجد میں جاکر پوچھا، جماعت ہو گئی ہے؟ جواب ملا، جی ہاں۔ اسی طرح ہر مسجد میں پوچھتے ہوئے پیدل شہر کے آخر تک چلے جاتے کہیں نہ کہیں نماز با جماعت مل جاتی اور وہ اطمینان کا سانس لیتے۔ اس دوران میں بگھی اور اردلی کے سواران کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ محل کے قریب مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے، وہاں کبھی کبھی نمازِ جمعہ سے قبل وعظ بھی کہتے تھے۔ ایک دن منبر پر کھڑے ہوئے اور یوں آغازِ کلام کیا:۔

> "صاحبو آپ سب جانتے ہیں ہم اس ریاست کے وزیرِ اعظم ہیں اتنی بڑی ہماری تنخواہ ہے اتنی بڑی ہماری جاگیر ہے۔ ہم شاہی محل میں رہتے ہیں۔ ہماری حفاظت کے لیے فوج اور پولیس کے دستے متقرر ہیں۔ ہماری سواری کا یہ اہتمام ہے ہم جسے چاہیں جاگیر دیں اور جس کی جاگیر چاہیں ضبط کر لیں۔ ہمارے یہ اختیارات ہیں وہ اختیارات ہیں۔"

ان کی تقریر سُن کر نمازی حیران تھے کہ یہ آج منشی جی کو کیا ہو گیا کیسی متکبرانہ باتیں کر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں ہوئی لیکن جوانی ہی میں بیوہ ہو گئیں۔
نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی کا بھوپال میں ورود ہوا تو منشی جمال الدین خاں ان کے علم و فضل، خاندانی سیادت اور شرافت، دینداری اور حسنِ اخلاق

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ہے ہیں۔ اب یکایک منشی صاحب یوں گویا ہوئے:

"آپ نے ہمارے جاہ و حشم کا حال سن لیا، اب ہماری اصل حقیقت بھی سن لیجئے، آپ جیسے صاحبوں کے ٹکڑوں پر برسوں طالب علمی کرتے رہے۔ پڑھ لکھ کر نوکری کے لیے دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرے مگر کسی نے ہمیں ملازمت کے قابل نہ سمجھا۔ بھوپال میں ایک بیمار اونٹنی پر سوار ہو کر آئے تھے یہاں بھی کسی نے دمڑی کو نہ پوچھا۔ بہت دنوں کے بعد ایک معمولی سی نوکری مل گئی، پھر اللہ نے اس درجے تک پہنچا دیا لیکن بیگم صاحب ذرا ناراض ہو جائیں تو ہمیں ایک پل میں ملازمت سے علیٰحدہ کر دیں، جاگیر ضبط کر لیں، محل سے نکلوا دیں اور ایک معمولی سپاہی ہمیں ریاست کی سرحد سے باہر کر آئے اور ہم وہی جمال الدین رہ جائیں جو پہلے تھے۔ صاحبو! تو یہ حقیقت ہے اس عزت و منصب کی جس پر ہم اتنا اترا رہے تھے اور جسے ایک عورت لمحہ بھر میں چھین سکتی ہے۔ یاد رکھو! اصل عزت وہ ہے جس کو کبھی زوال نہ ہو جو ہمیشہ کے لیے قائم رہے، اس عزت کو حاصل کرنے کے لیے اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ عزت اور ذلت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔"

نواب سکندر بیگم کے بعد نواب شاہجہان بیگم والیہ ریاست ہوئیں تو انہوں نے بھی منشی صاحب کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا بلکہ ان کے منصب میں اضافہ کر دیا۔ منشی صاحب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ۲۵ شعبان ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) کو اپنی بیوہ بیٹی زکیہ بیگم کا نکاحِ ثانی ان سے کر دیا۔ دونوں میاں بیوی کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

(ان کے زمانۂ ولی عہدی میں) ان کے اتالیق بھی رہ چکے تھے۔ چنانچہ وہ ان کو ماموں میاں کہتی تھیں۔ منشی صاحب نجی زندگی میں قدیم اساتذہ کی طرح نواب شاہجہان بیگم کو ازراہِ محبت تو کہہ کر بھی مخاطب کر لیا کرتے تھے۔ اگر وہ کوئی ایسا حکم جاری کر دیتیں جو منشی صاحب کے خیال میں مناسب نہ ہوتا تو وزیر ہونے کی حیثیت میں وہ اس کی تعمیل تو کر دیتے لیکن محلِ شاہی میں جا کر بیگم صاحبہ کے سامنے دلائل کے ساتھ اس کا غلط ہونا ثابت کر دیتے۔ ایک بار کسی ایسے ہی موقع پر ایک طویل تقریر کی اور پھر ہنس کر بولے:-

"اے شاہجہان! تجھے کوئی دو کوڑی میں بیچے تو میں مول نہ لوں۔"

انہوں نے ہنس کر جواب دیا ــــ "ماموں میاں اگر کوئی آپ کو دو کروڑ میں بیچے جب بھی میں خرید لوں۔"

علم و فضل کے اعتبار سے منشی صاحب کا پایہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے گرانقدر علمی خدمات انجام دیں۔ قرآن پاک کا پشتو میں ترجمہ کرایا۔ اس کے علاوہ شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب ایضاح الحق کا ترجمہ بیش قرار معاوضہ دے کر کرایا اور اس کی ایک ہزار جلدیں چھپوا کر مفت تقسیم کیں۔ منشی صاحب شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور گمنام تخلص کرتے تھے۔ منشی صاحب بیاسی سال کی عمر پا کر ۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) کو راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والے لوگوں کی آمد ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی چنانچہ ان کی نمازِ جنازہ گیارہ مرتبہ پڑھائی گئی۔

صاحبِ "فقہائے پاک و ہند" کا بیان ہے کہ منشی جمال الدین طلبہ کو خود قرآن و حدیث

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے نواب صاحب کو ایک لڑکی اور دو لڑکے عطا کیے۔ ۲۳ سال کی مثالی رفاقت کے بعد ۱۳۰۱ھ میں وہ اپنے میاں کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ نواب صدیق حسن خاں ۱۸۹۴ء ان کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"یہ بڑی خوش نصیب بیوی تھیں جب تک وہ زندہ رہیں کبھی کوئی تشویش پیش نہیں آئی ان کی وفات کے بعد ہی مجھ پر رنج و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔" (مآثرِ صدیقی)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اور کتبِ فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید خرید کر مستحقین میں تقسیم کرتے۔ قرآن کریم کے ترکی و فارسی تراجم و تفاسیر خطیر رقم خرچ کر کے طبع کرائے اور انہیں ترکستان اور افغانستان میں تقسیم کرایا۔

شیخ علی بن احمد صائمی (المتوفی ۸۳۵ھ) کی تفسیر رحمانی چار جلدوں میں اپنے خرچ پر مصر سے شائع کرائی ——— شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف "حجۃ اللہ البالغہ" اور "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" مطبع صدیقی بریلی سے طبع کرائیں۔ متعدد دوسری اہم کتابیں بھی اپنے خرچ پر قاہرہ میں چھپوائیں اور مستحقین میں تقسیم کیں۔ انہوں نے "کوکبِ دُرّی" کے نام سے قرآنِ مجید کا فرہنگ بھی لکھا۔

دخترِ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب ؒ

یہ خاتون بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ انہوں نے جملہ دینی علوم اپنے والدِ گرامی سے حاصل کیے تھے اور قرآن حدیث اور فقہ میں درجۂ تبحر حاصل کر لیا تھا۔ ان کی شادی مولانا مفتی عبدالقیوم بودھانوی (بڈھانوی) سے ہوئی تھی جو سید احمد شہید بریلوی کے خلیفۂ اول مولانا عبدالحی بڈھانوی کے فرزند تھے۔ مولانا عبدالقیوم رحمۃ اللہ علیہ بڑے متبحر عالم تھے۔ اور عوام کے علاوہ خواص میں بھی ان کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سنہ ۱۲۷۱ ہجری میں نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کی شادی نواب باقی محمد خان سے ہوئی تو نکاح پڑھانے

لہ حضرت شاہ محمد اسحاق ؒ کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے نامور فقہاء میں ہوتا ہے۔ وہ شیخ محمد افضل ؒ کے بیٹے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ؒ (ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ) کے نواسے تھے علمِ حدیث اور فقہ کی تحصیل انہوں نے اپنے گرامی قدر نانا سے کی۔ وہ اپنے بزرگوں کے تمام اوصافِ حمیدہ کے حامل تھے سنہ ۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیز ؒ کی وفات کے بعد تمام اصحاب نے شاہ محمد اسحاق ؒ ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا (شاہ عبدالعزیز ؒ کی نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی)۔ انہوں نے کچھ دنوں کے بعد حجاز کا سفر کیا۔ حج کرنے کے بعد واپس آئے اور پھر درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور تبلیغ و ہدایت میں مشغول ہو گئے لیکن ان کا دل ہندوستان سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ چند سال بعد پھر حجاز کا رخ کیا اور مکہ مکرمہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہیں سنہ ۱۲۶۲ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر پینسٹھ برس کی تھی۔

کے لیے مولانا عبدالقیوم ہی کو بلایا گیا تھا۔ والیۂ بھوپال نے ان کے علم وفضل کو دیکھتے ہوئے انہیں ریاست کا مفتیٔ اعظم مقرر کر دیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "خواتین اور دین کی خدمت" میں اپنے استاد مولانا حیدر حسین خاں صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"ان (مولانا مفتی عبدالقیوم) کے پاس جب کوئی مقدمہ آتا اور اس میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے اور اس فکر میں پڑ جاتے کہ اس مسئلہ کا شرعی حکم کیا ہے تو کہتے ابھی آتا ہوں اور گھر میں جا کر اہلیہ سے جو حضرت شاہ اسحاق صاحب کی صاحبزادی تھیں، پوچھتے، کیا آپ نے اپنے والد صاحب سے کوئی روایت سنی ہے یا اس مسئلہ میں آپ کے علم میں کوئی بات ہے؟ اور آ کر فیصلہ کرتے اور بعض اوقات تو بلا تکلف کہہ دیتے کہ ذرا بیوی صاحبہ سے پوچھ آؤں۔"

جس خاتون سے بھوپال کے مفتی اعظم پیچیدہ دینی مسائل میں مشورہ کرتے ہوں اس کے علم وفضل کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی شرف خانم

تیرھویں صدی ہجری میں ترکی کی مشہور شاعرہ ہوئی ہے۔ ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئی اور اسی صدی کے اخیر میں وفات پائی۔ وہ شیخ الاسلام عاشر آفندی کی اولاد سے تھی۔ اس کو بہت سے مروجہ علوم پر عبور حاصل تھا۔ اس کا دیوان مشہور و معروف ہے۔ (مشاہیر النساء)

نواب ملکہ کشور صاحبہ

نواب اودھ امجد علی شاہ (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء تا ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء) کی بیگم اور آخری نواب اودھ واجد علی شاہ (۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء تا ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء) کی والدہ تھیں۔ اصل نام تاج آرا بیگم تھا۔ نواب حسین الدین خاں کی بیٹی تھیں جو اودھ کی شاہی فوج میں رسالدار تھے۔

تاج آرا بیگم کی شادی امجد علی شاہ سے ان کے زمانۂ ولی عہدی میں ہوئی۔ سسرال سے انہیں "خاقانِ معظمہ بادشاہ بہو نواب ملکہ کشور صاحبہ" کا خطاب عطا ہوا۔ امجد علی شاہ سے ملکہ کشور کی تین اولادیں ہوئی۔ پہلی خورشید حشمت مرزا محمد واجد علی شاہ جو بعد میں "سلطانِ عالم واجد علی شاہ" کے نام سے تاجدارِ اودھ ہوئے — دوسری سکندر مرزا جواد علی، جو اودھ کی فوج کے سپہ سالار بنائے گئے اور اسی بنا پر عوام و خواص میں جرنیل صاحب کے لقب سے مشہور ہوئے۔ تیسری نواب شرف النساء جن کی شادی نواب منیر الدولہ کے بیٹے نواب سرفراز الدولہ سے ہوئی۔

ملکہ کشور صاحبہ اور نواب امجد علی شاہ کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار رہے مگر جب امجد علی شاہ نے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں بادشاہ بننے کے بعد دو اور شادیاں کیں تو میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی، لیکن وزیرِ اعظم اور دوسرے اعیانِ سلطنت کے سمجھانے بجھانے سے ملکہ کشور صاحبہ راضی برضا ہو گئیں اور پہلے کی طرح ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگیں۔

ملکہ کشور صاحبہ کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ فارسی بخوبی پڑھ لکھ لیتی تھیں۔ قرآن پاک بھی پڑھنے اور سننے کا شوق تھا۔ ایک مولوی صاحب کو صرف اس کام پر مقرر کر رکھا تھا کہ وہ روزانہ ان کو کلام پاک پڑھ کر سنایا کریں۔ ملکہ کا معمول تھا کہ وہ روزانہ کچھ دن چڑھے توشہ خانے میں پسِ پردہ بیٹھ جاتیں اور مولوی صاحب

آکر بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دیتے۔ وہ کافی دیر تک بڑی عقیدت سے کلامِ پاک سنتی رہتیں۔ بہت مخیّر تھیں اکثر غریب اور بیکس عورتوں کو محل میں بلا لیتیں اور ان کو انعام واکرام دے کر رخصت کرتیں۔ ان کا ایک محل (چھتر منزل) لبِ دریا واقع تھا۔ ایک دن اس کی بالائی منزل میں بیٹھ کر جیٹھے ہوئے دریا کا نظارہ کر رہی تھیں کہ ایک بڑھیا کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھا! انہوں نے پکار کر خادماؤں کو حکم دیا کہ فوراً چند آدمی بھیجو اور اس بڑھیا کو پانی سے نکلواؤ۔ غریب بڑھیا کی جھونپڑی سیلاب میں بہہ گئی تھی اور وہ اس کا ایک کونہ پکڑے دریا میں بہتی چلی جاتی تھی۔ ملازمینِ شاہی نے اس کو پانی سے نکال کر کنیزوں کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اس کا جسم خشک کیا اور پھر کپڑے بدلوا کر ملکہ کے سامنے حاضر کیا۔ اس نے بتایا کہ میرے سب رشتہ دار مر کھپ چکے ہیں اور اب میرا کوئی والی وارث نہیں۔ ملکہ نے اس کو بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا اور تین روپے ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جو اس سستے زمانے میں ایک آدمی کے باطمینان زندگی گزارنے کے لیے کافی تھا۔

۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں امجد علی شاہ نے وفات پائی اور واجد علی شاہ تختِ اودھ پر بیٹھے! انہوں نے والدہ کا اعزاز واکرام برقرار رکھا اور وہ "جنابِ عالیہ" کے خطاب سے ملقب ہوئیں۔ اس زمانے میں وہ رات گئے تک قرآنِ کریم کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی دانشمند، نیک سرشت اور عالی دماغ خاتون تھیں۔ سلطنت میں ان کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے بادشاہ بیٹے کو فہمائش بھی کرتی تھیں لیکن وہ ان کو پلٹ کر کبھی جواب نہ دیتے تھے۔ ۳ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ بمطابق ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطنت اودھ ضبط ہو کر انگریزی مقبوضات میں شامل کر دی گئی تو ملکہ کشور کو بے حد قلق ہوا اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ میں انگلستان جا کر ملکہ وکٹوریہ کے پاس فریاد کروں گی، وہ بھی صاحب اولاد ہیں ان سے درخواست کروں گی کہ اودھ کی سلطنت میرے فرزند کو واپس کر دیں۔ یہ اعلان سن کر ملازمین میں کہرام مچ گیا! انہوں نے عرض کیا کہ سرکار کو تو دریا سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے بڑے بڑے سمندروں کو کیسے پار کریں گی؟ لیکن ملکہ کشور بڑی باہمت خاتون تھیں وہ

اپنے ارادے پر قائم رہیں اور اپنی مصاحب خاص بہار النساء کو سفر کی تیاری کا حکم دے دیا۔ جب تیاری مکمل ہوگئی تو ملکہ اپنے چند خاص ملازمین کو ساتھ لے کر اپنے بیٹے واجد علی شاہ معزول شاہ اودھ کے پاس کلکتہ روانہ ہوگئیں۔ باقی عملہ کو جواب دے دیا یا بعض کو پنشن دے دی۔ کلکتہ پہنچیں تو واجد علی شاہ نے خود ان کے ساتھ ولایت جانے کا ارادہ کیا مگر وہ اچانک بیمار ہوگئے اور طبیبوں نے بحری سفر کرنے سے منع کردیا۔ ملکہ کشور اب اپنے دوسرے بیٹے مرزا اسکندر حشمت جواد علی جرنیل صاحب، ولی عہد پرنس حامد علی، مولوی مسیح الدین مختار عام شاہ معزول اور بہت سی خادماؤں اور ملازموں کے ساتھ (جون ۱۸۵۶ء کو انگلستان روانہ ہوگئیں۔ کلکتہ سے چلتے وقت واجد علی شاہ کے بچوں سے مل کر بہت روئیں۔ ان کے قافلے میں ایک سو چالیس آدمی تھے اور پانچ سو صندوق مال اسباب کے تھے۔ بدقسمتی سے سویز کے مقام پر ان کے ملازم کے ہاتھ سے ایک خاصدان سمندر میں گر گیا اس میں نہایت بیش قیمت جواہر تھے۔ غوطہ خوروں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود۔ ملکہ کو اس نقصان کا بہت دکھ ہوا لیکن پھر کمر ہمت باندھ لی۔ ۲۰ اگست ۱۸۵۶ء کو یہ قافلہ لندن پہنچ گیا۔ لندن کے دوران قیام میں ملکہ کشور صاحبہ کی ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات ہوئی جو بہت امید افزا تھی مگر مئی ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جنگ آزادی شروع ہوگئی انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا اور ملکہ کشور کے قافلے سے نفرت اور بیزاری کا اظہار شروع کردیا۔ اس پر ملکہ کشور اپنے ساتھیوں کو لے کر پیرس (فرانس) چلی گئیں۔ وہاں ان کا دیرینہ مرض کثرت استحاضہ عود کر آیا اسی کی وجہ سے ۲۱ فروری ۱۸۵۸ء کو انتقال کر گئیں۔ قبر کے لیے چار پانچ مربع گز قطعہ اراضی دس ہزار روپے میں خریدا گیا۔ جنازہ کے جلوس میں ترکی اور ایران کے سفیر اور فرانس کے کچھ وزراء اور دوسرے اکابر بھی شریک تھے۔ قبر پر تین ہزار روپیہ کے مصارف سے سنگ مرمر کا چبوترہ بنوا دیا گیا۔ ان کی تدفین کے بعد مرزا اسکندر حشمت لندن واپس آگئے مگر مبرز میں ناسور ہوجانے کی وجہ سے تپ محرقہ میں مبتلا ہوگئے اور ۸ مارچ ۱۸۵۸ء کو وہ بھی فوت ہوگئے۔ لاش لندن سے پیرس لائی گئی۔ ان کا جنازہ حکومت فرانس کی طرف سے فوجی اعزاز کے ساتھ اٹھایا گیا اور انہیں ماں کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے چند دن بعد ان کی کمسن بچی رافت آرا بیگم بھی وفات پا گئی اور فرانس ہی میں دفن کی گئی۔ قافلے کے باقی لوگ ناشاد و نامراد ہندوستان واپس آگئے۔ (بیگمات اودھ)

ملکہ بزمِ عالم

عثمانی فرمانروا سلطان محمود خاں ثانی (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء تا ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) کی ملکہ اور سلطان عبدالمجید خاں (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء تا ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء) کی والدہ تھی۔ نہایت دیندار، مخیّر اور نیک سیرت خاتون تھی۔ اس نے استنبول (قسطنطنیہ) میں "نیکی باغچہ" کے پاس ایک عظیم الشان شفاخانہ (ہسپتال) بنوایا جس میں بیسیوں مریض زیرِ علاج رہتے تھے۔ اس شفاخانے کے صحن میں ملکہ نے ایک باغ بھی لگوایا، جس سے مریضوں کو بڑی فرحت حاصل ہوتی تھی۔ شفاخانے کے اخراجات پورا کرنے کے لیے نیک نہاد ملکہ نے ایک بہت بڑی جائداد وقف کر دی اور ہدایت کی کہ مریضوں کا نہ صرف علاج مفت کیا جائے بلکہ ان کو غذا اور لباس وغیرہ بھی اس وقف کی آمدنی سے مہیا کیا جائے۔

ملکہ نے قسطنطنیہ کے محلہ توپ خانہ کے قریب ایک عظیم الشان جامع مسجد بھی بنوائی۔ جو "ینی والدہ جامع" کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ملکہ نے گولڈن ہارن پر ایک نیا پل بنوایا جو "والدہ سلطان کبریٰ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ پل عین وسطِ شہر میں بنایا گیا اور قسطنطنیہ کی تجارت کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

اسی طرح ملکہ نے رفاہِ عامہ کے اور بھی بہت سے کام کیے۔ اپنے نیک کاموں کی بدولت وہ ترکی میں بڑی عزّت و احترام سے یاد کی جاتی ہے۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ سی ڈبلیو ولسن)

بی بی آسیہ خانم

ایران کے ایک قبیلہ بوخاری باش کے سردار محمد خاں عزیز الدین لو کی صاحبزادی تھیں ایران کے شاہی (قاجاری) خاندان میں بیاہی گئیں۔ ان کے بطن سے فتح علی شاہ قاجار پیدا ہوا جس نے ایران پر ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء سے ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء تک حکومت کی۔

آسیہ خانم بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔ خدمت خلق سے خاص شغف تھا اور صدقہ و خیرات بہت کثرت سے کرتی تھیں۔ اپنی ساری عمر عبادت الٰہی اور اعمال حسنہ میں گزاری۔ اہل ایران ان کی ولایت کے قائل ہیں۔ ذی الحجہ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئیں۔ اس مقدس سفر سے طہران واپس آکر اسی سال وفات پائی۔ لاش نجف اشرف (عراق) لے جائی گئی اور وہیں سپرد خاک کی گئی۔

(مشاہیر نسواں)

عائشہ تیموریہ

مصر کی نامور شاعرہ تھی۔ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئی اور دینی و دنیوی علوم کی تعلیم پاکر علمی و ادبی اعتبار سے بہت اونچا مقام حاصل کر لیا۔ اس کو عربی فارسی اور ترکی تینوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ عربی زبان میں مشق سخن کرتی تھی۔ کلام نہایت دلکش اور فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔ اس کا دیوان "حلیۃ الطراز" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کے ایک قصیدے نے بڑی شہرت پائی۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

بيد العفاف اصون عزضي

(اپنی عفت کے ہاتھ سے اپنی آبرو کی حفاظت کرتی ہوں)

عائشہ تیموریہ نے ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔

(مسلمان عورتوں کی دینی اور علمی خدمات)

شرافت محل

سیّد ناصر علی دہلوی کی صاحبزادی اور سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر بہادر شاہ (ثانی) بادشاہ کی بیگم تھی۔ اس نے بچپن میں بہت اعلیٰ تعلیم پائی۔ بڑی علم دوست، دیندار اور فیاض خاتون تھی۔ علماء و فضلا کی بہت قدردان تھی اور دل کھول کر ان کی سرپرستی کرتی تھی۔ عبادتِ الٰہی سے بڑا شغف تھا۔ چنانچہ اس کا بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ جہالت سے بہت نفرت تھی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے میں کوشاں رہتی تھی۔

شرافت محل کا نام تو کچھ اور تھا لیکن جب اس کی شادی بہادر شاہ سے ہوئی تو سسرال والوں کی طرف سے اس کو شرافت محل کا خطاب ملا اور اسی خطاب سے اس نے شہرت پائی۔

شادی کے وقت اس کے شوہر ولی عہد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شرافت محل کے بطن سے ان کو بیٹا عطا کیا تو انہوں نے وعدہ کیا کہ بادشاہت ملنے پر وہی بادشاہ بیگم (اور ملکہ) کہلائے گی اور بادشاہ کے بعد دوسری حیثیت اسی کی ہوگی لیکن جب بہادر شاہ بادشاہ بنے تو حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ وہ اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکے۔ اس سے شرافت محل دل برداشتہ ہو گئی اور قلعے کی ریاست اور بادشاہ سے تعلق منقطع کر لیا۔ اس کے بعد وہ ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہنے لگی۔ ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کے سلسلے میں شہر دہلی ہنگاموں کا مرکز بنا رہا لیکن وہ سب سے کنارہ کش رہی۔

اس نیک بی بی نے ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۱ء میں وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

گُلبدن باجی

شاہِ ایران فتح علی شاہ قاجار (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء تا ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کی والدہ آسیہ خانم (وفات ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء) کی کنیز تھی۔ آسیہ خانم کے فیضِ صحبت سے بہت دیندار اور دیانت دار ہو گئی تھی۔ جب آسیہ خانم نے وفات پائی تو بادشاہ نے خُدامِ حرم سے کہا کہ والدہ مرحومہ کی جگہ کسی ایسی خاتون کو مقرر کر دو جو ان کی طرح مقررہ نقد و جنس ہر سال غربا و مساکین اور ملازمین حرم میں تقسیم کر دیا کرے۔ انہوں نے گلبدن باجی کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ گلبدن باجی نے یہ کام ایسے انصاف اور دیانت داری سے کیا کہ سارے ملک میں اس کی ایمان داری کی دھوم مچ گئی۔ اس کی مُہر کا سجع تھا:

"معتبر در ممالکِ ایران ۔ قبض مسند وقارِ شاہجہان"

اس کے لین دین سے کیا خُدام اور کیا تجار سب خوش تھے۔ وہ کروڑوں کا لین دین کرتی تھی، کیا مجال کہ ایک پیسہ کی بھی ہیرا پھیری ہو جائے۔ بادشاہ نے اس کی کارگزاری سے خوش ہو کر اسے "خازن الدولہ" کا خطاب دیا اور اس سے شادی کر کے بادشاہ بیگم بنا دیا۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی صفوت

استنبول (قسطنطنیہ) کی رہنے والی تھی۔ ترکی کی نامی گرامی شاعرہ ہوئی ہے۔ اس کے اشعار اس کے علمی تبحر کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ ترکی میں اس کے کلام کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بی بی صفوت نے ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

قُرَّةُ العَین طاہرہ

اصل نام زرین تاج اور قُرَّۃُ العَین لقب تھا۔ ایران کے نامی گرامی مجتہد حاجی مرزا محمدؒ صالح قزوینی کی بیٹی، ملا محمد کی بیوی اور ملا محمد تقی مجتہد کی حقیقی بھتیجی تھی۔ فارسی تو اس کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ اس نے علوم عربیہ ادب، تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پاک بھی حفظ کر لیا تھا۔ نہایت حسین وجمیل، شوخ وطرار اور ذہین تھی۔ طبعاً بڑی آزاد خیال اور ایجاد پسند تھی۔ مرزا علی محمد باب نے بابی مذہب کی بنیاد ڈالی[1] تو وہ اس کی پیرو کار بن گئی اور ساتھ ہی برقع کو خیرباد کہہ کر نہایت سرگرمی سے اس مذہب کی تبلیغ کرنے لگی۔ مختلف علوم میں درجۂ تبحر رکھنے کے علاوہ وہ ایک نغز گو شاعرہ اور سحرالبیان خطیبہ بھی تھی۔ شاعری میں طوطی اور طاہرہ تخلص کرتی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ

---

[1] مرزا علی محمد ایران کے شہر شیراز کا ایک نوجوان تھا۔ اس نے اوائل عمر میں کربلا جا کر تعلیم حاصل کی تھی اور حج بھی کیا تھا۔ سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں جبکہ اس کی عمر صرف ۲۴ برس کی تھی۔ اس نے امام غائب (جو اہلِ تشیع کے نزدیک قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے) کا باب یعنی دروازہ یا واسطہ ہونے کا دعویٰ کیا اور ایک عجیب غریب مذہب کی بنیاد ڈالی جسے بابی مذہب کا نام دیا جاتا ہے۔ حکومت ایران نے اس کے گمراہ کن عقائد اور باغیانہ سرگرمیوں کا بڑی سختی سے محاسبہ کیا اور اسے گرفتار کر کے شیراز کے زندان میں ڈال دیا۔ سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) سے سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کے اوائل تک شیراز میں، سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) سے سنہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) تک اصفہان میں اور اپنی زندگی کے آخری چھ ماہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طاہرہ کا لقب اس کو محمد علی باب نے دیا تھا۔

ناصر الدین شاہ قاجار (۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء تا ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) کے عہدِ حکومت میں اس نے اپنی پُرجوش اور گمراہ کُن تقریروں اور تحریروں سے سارے ایران میں زبردست ہلچل ڈال دی۔ وہ بڑے بڑے مجمعوں میں کھڑے ہو کر ایسی فصاحت و بلاغت سے تقریر کرتی تھی کہ لوگ مسحور ہو جاتے تھے اور زار زار روتے تھے۔ اس کا حسن و جمال دیکھ کر بڑے بڑے فرزانے ہوش و حواس کھو دیتے تھے، اور بڑے بڑے فصیحانِ عجم اس کا کلامِ بلاغت نظام سن کر دم بخود ہو جاتے تھے۔ بعض لوگ محض اس کے دیدار کا شوق پورا کرنے کے لیے بابی مذہب میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

وہ چہریق یا ماکو کے قلعہ میں قید رہا۔ اس دوران میں اس کے پیروؤں اور مخالفوں کے درمیان کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ بالآخر علی محمد باب اور اس کے دو ساتھیوں سید حسین اور آقا محمد علی کو موت کی سزا سنائی گئی۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

علی محمد باب کے عقائد سخت گمراہ کُن تھے اور اس کی تعلیمات کو اسلام سے دُور پار کا تعلق بھی نہ تھا۔ اس کے عقائد اور تعلیمات کے خدوخال یہ تھے۔

(۱) نہ کوئی پیغمبر آخری پیغمبر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی الہامی کتاب آخری الہامی کتاب ہو سکتی ہے۔

(۲) جنت و دوزخ کا کوئی مادی وجود نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی اندرونی حالتوں کے نام ہیں۔

(۳) مرنے کے بعد جسم کا دوبارہ احیا ناممکن ہے۔

(۴) یوم الحساب (یوم الدین) کوئی چیز نہیں۔ ہر انسان کے اعمال ہی اس کے فرشتے ہیں جو اس کو نیکی یا بدی کی طرف لے جاتے ہیں۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

داخل ہوجاتے تھے۔ غرض وہ بابی مذہب کی روحِ رواں بن گئی تھی۔ اس کی تقریریں سننے کی خاطر بڑے بڑے وسیع میدانوں میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوجاتا تھا کہ کہیں تل رکھنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔ جب پہلے پہل اس نے قزوین میں بابی مذہب کی کھلم کھلا تبلیغ شروع کی تو اس کے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن وہ باز نہ آئی اور بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملالیا۔ پھر وہ کربلا اور بغداد گئی اور وہاں بھی زور شور سے بابی مذہب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۵) اللہ کی ذات ابدی ہے جسے حاصل نہیں کیا جا سکتا اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وسیلہ ضروری ہے۔ مشیتِ ازلی ایک الگ طاقت ہے جو نبیوں میں ظہور کرتی ہے اور نبی مشیتِ ازلی کے اوتار یا مظہر ہوتے ہیں۔ مشیتِ ازلی نے اس زمانے میں علی محمد باب کی صورت میں ظہور کیا ہے اور لوگ اسی کے وسیلے سے ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

علی محمد باب نے اپنے قتل سے پہلے ایک بیس سالہ نوجوان مرزا یحییٰ بن مرزا بزرگ نوری کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اسے صبحِ ازل کا خطاب عطا کیا لیکن اس کے بڑے (سوتیلے) بھائی بہاؤ اللہ نے مشیتِ ازلی کا مظہر ہونے کا دعویٰ کر دیا، اس طرح بابیوں کے دو فرقے بن گئے۔ سنہ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں صبحِ ازل اور بہاؤ اللہ دونوں بغداد چلے گئے اور بارہ تیرہ سال تک بغداد بابی مذہب کا مرکز بنا رہا۔ (پہلے دس سال تک بہاء اللہ صبحِ ازل ہی کو اپنا پیشوا تسلیم کرتا رہا لیکن بعد میں وہ اس سے منحرف ہوگیا۔)

سنہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) میں حکومتِ ترکی نے صبحِ ازل کو جزیرہ قبرص میں بھیج دیا، جہاں وہ ضعیف العمری کے عالم میں فوت ہوا۔ بہاء اللہ کو ترکی حکومت نے عکہ میں نظر بند کر دیا جہاں وہ سنہ ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) میں فوت ہوا۔ اس کے دو بیٹوں عباس آفندی اور مرزا محمد علی میں گدی پر بیٹھنے کے لیے کشمکش ہوئی اور دونوں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی تبلیغ کرتی رہی۔ بغداد سے لوٹ کر وہ کرمان شاہ اور ہمدان گئی۔ وہاں سے اس نے پایۂ تخت (تہران) جاکر خود شاہِ ایران کو بابی بنانے کا قصد کیا۔ اس کے والد اور دوسرے اعزہ نے بہت سمجھایا اور بابی مذہب ترک کرکے اپنے شوہر کے پاس چلے جانے کی تلقین کی لیکن اس مذہب سے اس کا لگاؤ جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا نہ وہ اسے چھوڑنے پر تیار ہوئی اور نہ اپنی بے پردگی اور غیر معمولی آزادی میں کوئی کمی کرنے پر آمادہ ہوئی۔ قرۃ العین کے علاوہ بابیوں کے کئی اور پُرجوش مبلغ بھی تھے۔ انہوں نے کئی موقعوں پر اپنے ہم مسلک لوگوں کو ساتھ ملا کر حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن ہر مرتبہ ان کی شورش کو کچل دیا گیا۔ بابیوں نے اپنے کئی مخالفین کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس سلسلے میں قرۃ العین اپنے متعدد ساتھیوں سمیت گرفتار ہوئی۔ کچھ عرصہ وہ قید خانے میں رہی لیکن پھر اسے رہا کرکے شہر سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، وہاں سے وہ مازندران گئی اور وہاں زور شور سے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد بدشت جاکر وہاں کے علماء سے مناظرہ کیا۔ پھر بدشت سے بند نور کجور گئی۔ وہاں اس کے بہت سے ساتھی حکومت کے خلاف سرگرمیوں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

نے اپنے الگ الگ فرقے بنالیے۔ عباس آفندی نے عبدالبہا کا لقب اختیار کرکے اپنے سلسلے کو بہائی کا نام دیا۔ یہ بابی مذہب کی ترمیم شدہ صورت تھی۔ زیادہ تر بابی عبدالبہا کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہوگئے جبکہ ایک قلیل جماعت مرزا محمد علی کو اپنا پیشوا مانتی رہی۔ اب بھی بہائی دنیا کے کچھ ملکوں میں موجود ہیں وہ بڑے محتاط طریقے سے اپنے مذہب کی اشاعت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن علماءِ اسلام کے نزدیک اس مذہب کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس لیے مسلمانوں پر ان کی تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ ان کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے۔

(تاریخ اسلام۔ پروفیسر براؤن)

میں مصروف تھے۔ قرۃ العین کو گرفتار کر کے تہران لایا گیا اور ناصر الدین شاہ قاچار کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ اور اس کے امیروں نے اسے بہت سمجھایا کہ اب بھی وہ راہِ راست پر آجائے تو اسے معاف کر دیا جائے گا لیکن وہ نہ مانی، آخر شاہ کے حکم سے وہ ایک مکان میں نظر بند کر دی گئی۔

سنہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء میں تین انتہا پسند بابیوں نے ناصر الدین شاہ قاچار پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن وہ معمولی زخمی ہوا۔ ایک حملہ آور مارا گیا اور دو کو بادشاہ کے محافظوں نے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد بابیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ قرۃ العین کو ایک بار پھر بابی مذہب چھوڑنے کے لیے کہا گیا لیکن وہ نہ مانی، آخر اسے متعدد دوسرے بابیوں کے ساتھ موت کی سزا دی گئی۔ (اس سے پہلے علماء سے ان کے قتل کا فتویٰ حاصل کر لیا گیا) کہا جاتا ہے کہ بابیوں کو مختلف فرقوں کے لیڈروں کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ انہیں اپنے گھروں میں لے جا کر جس طرح چاہیں قتل کریں۔ ان لوگوں نے اپنے قیدیوں کو سخت اذیتیں دے کر ہلاک کیا۔ قرۃ العین کو کس طریقے سے ہلاک کیا گیا، اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ ایک رات کو اس کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ دوسری یہ کہ اسے ایک میدان میں ہزاروں لوگوں کے سامنے سرکاری جلاد نے قتل کیا۔ پھر اس کے تمام کاغذات جلا دیئے گئے (واللہ اعلم)۔

قرۃ العین صاحبِ دیوان تھی لیکن اب اس کا کلام چند غزلوں اور ایک مثنوی کے سوا کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ افسوس کہ قرۃ العین نے اپنی ذہانت اور لیاقت کو اسلام کی بیخ کنی میں صرف کیا۔ اگر اسلام کی خدمت میں صرف کرتی تو آج دنیائے اسلام میں اس کی بے حد قدر و منزلت ہوتی۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

غزل

(۱) گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو — شرح دہم غم ترا، نکتہ بہ نکتہ مو بمو

(۲) از پئے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام — خانہ بخانہ، در بدر، کوچہ بکوچہ، کو بکو

(۳) میرود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام | دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بجو
(۴) در دہانِ تنگِ تو عارض و عنبریں خطت | غنچہ بہ غنچہ، گل بہ گل، لالہ بہ لالہ، بُو بہ بُو
(۵) ابرو و چشم و خالِ تو صید نمودہ مرغِ دل | طبع بہ طبع، دل بہ دل، مہر بہ مہر، خُو بہ خُو
(۶) مہرِ ترا دلِ حزیں بافتہ بر قماش جاں | رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو

(۷) در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو [1]

ترجمہ:

(۱) اگر مجھے تیرے روبرو ہونے اور آمنے سامنے آنے کا موقع ملے تو میں تیرے غم کی شرح نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو کروں۔
(۲) میں تیرے چہرے کے دیدار کے لیے بادِ صبا کی مانند گھر گھر در در کوچہ کوچہ اور گلی گلی پھرتی ہوں۔
(۳) تیرے فراق میں میری دونوں آنکھوں سے دجلہ دجلہ، دریا دریا، چشمہ چشمہ اور نہر نہر خون بہہ رہا ہے۔
(۴) تیرے دہنِ تنگ، عارض اور عنبریں خط کی مثال غنچے، گلاب، لالہ کے پھولوں اور خوشبو جیسی ہے۔
(۵) تیرے ابرو، آنکھ اور خال نے مزاج، محبت اور خوخصلت سے میرے مرغِ دل کو اسیر کر لیا ہے۔
(۶) میرے غم زدہ دل نے تیرے عشق کو جان کے تانے بانے میں بُن لیا ہے۔
(۷) طاہرہ نے اپنی کتابِ دل کا ایک ایک صفحہ ایک ایک تہہ اور ایک ایک پردہ دیکھ لیا لیکن وہاں تیرے سوا کچھ بھی نہ پایا۔

---

[1] اردو کے ایک شاعر جناب نشتر لکھنوی کی تضمین ملاحظہ کیجئے۔ یہ رسالہ سہیلی لاہور کے ۲۵ جون ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

(۱)

آنکھ کو شوقِ دید، قلب میں تیری آرزو ـــــ لب پہ ہے تیری گفتگو، دل میں ہے تیری جستجو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

غزل

(۱) جذبات شوقک احجت بسلاسل الغم و البلا
ہمہ عاشقانِ شکستہ دل کہ دہند جان بہ ولا

(۲) اگر آں صنم ز رہِ ستم پئے کشتنم بنہد قدم
لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضی

(۳) سحر آں نگارِ ستمگرم قدمے نہاد بہ بسترم
واذا رأیت جمالہٗ طلع الصباح کأنما

(۴) نہ چو زلفِ غالیہ بارِ او نہ چو چشمِ فتنہ شعارِ او
شدہ نافہ ہمہ خوں شدہ کافرے ہمہ خطا

(۵) تو کہ غافل از مے و شاہدے پئے مرد زاہد عابدے
چہ کنم کہ کافر جاحدی ز خلوصِ نیتِ اصفیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

دیکھتا ہوں جدھر جدھر میری نظر میں تو ہی تو —— گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

(۲)

دَیر کی سیر کی کبھی اور کبھی گیا حرم
مثلِ غبار اڑا کیا، دشتِ جنوں میں دمبدم
چھانی گلی گلی کی خاک تری تلاش میں صنم
از پئے دیدنِ رخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ دربدر کوچہ بکوچہ کو بکو

(۳)

ہجر میں تیرے اے صنم زندگی ہو گئی ستم
آہ فغاں ہے دمبدم، مجھ سے ہے لشکرِ الم
دل ہے ہمارا اور ہم، آنکھیں ہیں اور اشکِ غم
می رود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بجو

(۴)

تو ہی مکیں تو ہی مکاں تو ہی زمیں تو ہی آسماں
دل کے حجاب میں نہاں، دیدۂ نور سے عیاں
ہر بن مو ہے صد زباں، عشق کی تیری داستاں
مہر ترا دلِ حزیں بافتہ بر قماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو

(۵)

حسن میں عشوہ و ادا، عشق میں نالہ و بکا
پردہ میں لیلیٰ حیا، دشت میں قیسِ بےنوا
دیر و حرم میں جا بجا، تیرے ہی نام کی صدا
در دلِ خویش ظاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بتو

(۶) تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہِ قلندری — اگر آں نکوست تو درخوری وگر ایں بدست مرا سزا

(۷) بمراو زلفِ معلقی پے اسپ و زینِ مغرقی — ہمہ عمر منکرِ مطلقی زِ فقیرِ فارغِ بے نوا

(۸) بگزر ز منزلِ ما و من بگزیں بملکِ فنا وطن
فاذا فعلتَ بمثل ذا فلقد بلغتَ بما تشاء

ترجمہ :

(۱) تیرے جذباتِ عشق نے تمام شکستہ دل عشاق کو غم اور بلا کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ وہ محبت کی راہ میں جانیں دے دیں۔

(۲) اگر محبوب ازراہِ ستم میرے قتل کے لیے قدم اٹھائے تو میں اس کی رضا پر راضی ہوں۔

(۳) سحر کو میرے ستم گر محبوب نے میرے بستر پر قدم رکھا تو مجھے اس کا جمال دیکھ کر یوں لگا جیسے صبح طلوع ہو گئی ہو۔

(۴) نہ اس کی معطر زلف کا سا کوئی نافہ سارے ختن میں ہوا ہے اور نہ اس کی فتنہ شعار آنکھوں کا سا کوئی کافر ملک خطا میں گزرا ہے۔

(۵) تو جو شراب و شاہد سے غافل ہے اور عابد و زاہد کی پیروی کرتا ہے میں کیا کروں کہ تو پاک دل لوگوں کے خلوصِ نیت کا منکر ہے۔

(۶) تو ہے اور ملک و جاہِ سکندری ہے میں ہوں اور رسم و راہِ قلندری ہے اگر وہ اچھا ہے تو تجھے مبارک ہو اور اگر یہ برا ہے تو میں اس کی حقدار ہوں۔

(۷) تو لمبی زلف کا طالب ہے اور گھوڑے اور جڑاؤ زین کی جستجو میں ہے تو عمر بھر بے نیاز اور بے نوا فقیر کا منکر ہی رہا۔

(۸) "ما" اور من کی منزل سے گزر جا، ملکِ فنا کو اپنا وطن بنا لے جب تو ایسا کرے گا تو یقیناً اپنے مقصد کو پا لے گا۔

(مشاہیرِ نسواں ۔ قرۃ العین طاہرہ (مارتھا روٹ))

بی بی کیفی

شروع تیرھویں صدی ہجری میں تیموری خاندان کی ایک شہزادی ہوئی ہے بہت اونچے درجے کی شاعرہ تھی۔ اس نے بھی کئی دوسرے نامور شعراء کی طرح قدسی کی زندۂ جاوید نعت پر ایک خمسہ لکھا ہے جس کے چند بند درج ذیل ہیں:

کس کا منہ ہے جو کرے مدح تری میرے نبی | نعتِ اطہر میں ہے جب شخص ذکی محض غبی
حبذا ذات تری مایۂ حاجت طلبی | مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی!

نور تھا تیرا وہاں نورِ حقیقت سے بہم | دیکھ کر موسیٰ عمراں ہوئے غش شاہِ امم
اور مہرِ رُخِ تاباں پہ ہے کیا ہی عالم | من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی!

مہبطِ روح القدس آپ کی ذاتِ والا | عرشِ اعظم درِ دولت پہ کہے صلِّ علیٰ
عظمتِ رتبۂ والا ہو شہا کس سے ادا | نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی!

نور سے تیرے منور ہے زمیں دشت بدشت | تو ہی بانی ہے بنائے فلک زریں طشت
نہ فلکِ ہشت جناں کی نہ خوش آئی گلگشت | شبِ معراج عروج تو از افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نرسید ہیچ نبی!

حق تعالیٰ نے کیا آپ کو ابرِ اکرام | تجھ سے خنداں ہے لبِ غنچہ ما امیدِ تمام
ہیں شجر اور حجر غرقِ سحابِ اکرام | نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سر سبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی!

ذاتِ انور سے بنا سارا جہاں عالمِ نور | اور فروغ اس کے سے ہر خانہ ہے معمور

رب عزت کو جو اعزازِ عرب تھا منظور | ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

رتبہ ترے سگ کو کا ہے اے شاہِ اُمم | سر بپا اس کے رہا شیرِ فلک بھی مردم
رشکِ افزائے ملائک ہے سوائے آدم | نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

فرقتِ روئے مقدس میں نہیں تابِ حیات | زہر پی جاؤں پلائیں جو مے نابِ حیات
تشنۂ وصلتِ اقدس نہیں سیرابِ حیات | ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ زحد میگزرد تشنہ لبی

چشم ہے آپ سے اے شاہ سرافراز نظر | نظرِ لطف سے عصاۃ پہ ہو باز نظر
تاکریں خلدِ بریں پر بھی وہ با ناز نظر | چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی!

دردِ عصیاں سے ہے بیتاب نہایت کیفی | حکمتِ لطف سے اس درد کے تم ہو شافی
عازمِ درگہِ کیفی ہے مثالِ قدسی | سیّدی اَنْتَ حبیبی وطبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

(مشاہیر نسواں)

سری خانم

دیار بکر کی رہنے والی ایک ترک خاتون تھی۔ سن ۱۱۲۳ھ ہجری میں پیدا ہوئی۔ ترکی زبان کی نغز گو شاعرہ تھی۔ فی الحقیقت اس کو شعر و سخن میں درجۂ کمال حاصل تھا اور تمام سلطنت عثمانیہ میں اس کا کلامِ بلاغت نظام پڑھا اور شا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہ اس نے کب اور کہاں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

حیات النساء بیگم حیاؔ

شاہ عالم ثانی کی بیٹی تھی ۔ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھی ۔
اصل نام حیات النساء بیگم تھا لیکن عام طور پر بھورا بیگم کے نام سے مشہور تھی ۔ شعر و سخن سے خاص لگاؤ تھا ۔ حیاؔ تخلص تھا اور شاہ نصیر دہلوی (المتوفی ۱۲۷۲ھ) کو اپنا کلام دکھاتی تھی ۔ وہ بڑی شفقت اور توجہ سے اصلاح دیتے تھے ۔ اس نے عمر بھر شادی نہ کی کیونکہ اپنے خاندان کو مصیبت اور ادبار میں دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ چکا تھا ۔
طویل عمر پاکر اس دنیا سے رخصت ہوئی ۔۔۔ یہ شعر اسی کا ہے :

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص
حیاؔ ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

(تذکرۃ النساء)

بی بی فطنت خانم

ترکی کی مشہور و معروف شاعرہ ہوئی ہے ۔ ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئی اور سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد شعر و شاعری میں وہ نام پیدا کیا کہ نہ صرف ترکی بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اس کے کلام بلاغت نظام کی شہرت پھیل گئی ۔ اس کے اشعار ترکوں میں مشہور ہیں ۔ چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں وفات پائی ۔ (مشاہیر نسواں)

ملکہ زینت محل

سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار ابوظفر سراج الدین ظفر بہادر شاہ (ثانی) شاہِ دہلی کی سب سے چہیتی بیگم تھی۔ اس کے والد کا نام نواب فرخ جاہ بہادر صمصام الدولہ احمد قلی خان تھا جو احمد شاہ درّانی کے خاندان سے تھا۔ وہ بہادر شاہی دربار کا خاص رکن اور دہلی کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ زینت محل بہ اختلافِ روایت ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء یا ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئی۔ والد نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑی عالمہ فاضلہ خواتین مقرر کیں۔ جوان ہوئی تو اس کے حسن و جمال اور اوصافِ حمیدہ کا چرچا سارے شہر میں پھیل گیا۔ بہادر شاہ کو خبر ہوئی تو اس نے نواب احمد قلی خان سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ نواب صاحب رضامند ہو گئے اور اپنی لختِ جگر کی شادی بادشاہ سے کر دی۔ اس وقت زینت محل کی عمر سولہ اور بیس سال کے درمیان تھی اور بہادر شاہ کی پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان۔ زینت محل بہت جلد بادشاہ کے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔ اس نے شاہی محل (لال قلعہ) میں آکر نئی نئی قسم کی پوشاکیں اور نئی نئی طرح کے کھانے ایجاد کیے جن کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں زینت محل کے بطن سے شہزادہ جواں بخت پیدا ہوا۔ بادشاہ کی نظروں میں اس کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی۔ جواں بخت کے ہوش سنبھالنے سے لے کر ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء تک زینت محل اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے میں کوشاں رہی مگر انگریزوں کے سامنے بے بس ہونے کی وجہ سے وہ آخر دم تک اپنی یہ حسرت پوری نہ کر سکی تاہم بہادر شاہ نے اس کی دلداری اور دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے ملکہ کے لیے ایک عالی شان محل

تعمیر کرایا جس کا نام زینت محل رکھا اور اس کے دروازے پر یہ تاریخ کندہ کرائی ہے کرد اے ظفر زینت محل تعمیر قصرِ بے بدل

شد محل سالِ بنا ایں خانۂ زینت محل

بہادر شاہ نے پہلے مرزا دارا بخت کو ولی عہد مقرر کیا۔ ۱۸۳۹ء میں وہ فوت ہو گیا تو مرزا شاہ رُخ ولی عہد قرار پایا۔ جب وہ بھی ۱۸۴۷ء میں انتقال کر گیا تو مرزا فتح الملک کو ولی عہد بنایا گیا لیکن وہ بھی جلد ہی فوت ہو گیا اب بہادر شاہ نے جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرنا چاہا مگر انگریز شاہی خاندان کو (بہادر شاہ کی موت کے بعد) قلعے سے نکالنے اور اس کی رہی سہی وقعت کو ختم کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ انہوں نے مرزا فخرو سے خفیہ طور پر اپنی شرطیں منوا لیں اور اسے ولی عہد بنا دیا۔

۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا بھی انتقال ہو گیا تو بہادر شاہ نے ایک کاغذ پر تمام شہزادوں سے دستخط کرا لیے کہ وہ جواں بخت کو ولی عہد مانتے ہیں۔ اس پر انگریزوں نے مرزا قویاش کو بھڑکا کر ولی عہدی کا دعویدار بنا دیا۔ یہی کشمکش جاری تھی کہ مئی ۱۸۵۷ء میں اہلِ ہند نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی، اور جنگِ آزادی کا آغاز ہو گیا۔ اس سلسلے میں انگریزوں اور حریت پسندوں میں دلی پر قبضے کے لیے کئی خونریز معرکے ہوئے۔ ان معرکوں کے دوران میں زینت محل نے دو کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش کی تاکہ فتح جس فریق کی بھی ہو اس کی حامی نظر آنے لگے۔ اس کے دل میں جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی خواہش اس قدر شدید تھی کہ اس پُر آشوب زمانے میں بھی اس نے خفیہ طور پر انگریزوں کو یہ پیغام بھیجنے کی کوشش کی کہ اگر جواں بخت کو ولی عہد مان لیا جائے تو وہ بادشاہ پر اس مقصد کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گی کہ وہ انگریزوں کی حمایت اور پناہ حاصل کرے۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ انگریزوں نے دلی پر قبضہ کرنے کے بعد بادشاہ کو گرفتار

کرلیا اور مقدمہ چلا کر اس کو جلا وطنی کی سزا دی۔

۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ، زینت محل اور جواں بخت کو تیرہ متعلقین کے ساتھ دلی سے رنگون کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ۹ دسمبر کو یہ قافلہ رنگون پہنچا جہاں انہیں لکڑی کے ایک بنگلہ نما مکان میں ٹھہرایا گیا۔ جلا وطنی کا زمانہ ان لوگوں نے جس بے کسی کے عالم میں گزارا اس کی تصویر بہادر شاہ ظفر نے یوں کھینچی ہے: ؎

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

اسی غربت کدہ میں بہادر شاہ نے ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۹ھ/ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو وفات پائی۔ زینت محل بیوہ ہو گئی مگر انگریزوں نے اس کی جلا وطنی برقرار رکھی۔ آخر چوبیس سال کے بعد ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء میں وہ بھی اسی غربت کدہ میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی اور اپنے شوہر کے پہلو میں سپردِ خاک کر دی گئی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر تقریباً ستر برس کی تھی۔

(مشاہیر نسواں، تاریخ ہند وغیرہ)

نواب حضرت محل

اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء) کی ولی عہدی کا زمانہ تھا کہ امراؤ نام کی ایک لڑکی اس کے "پری خانے" میں داخل ہوئی۔ اس "پری خانہ" میں لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی تھی اور آدابِ محفل سکھائے جاتے تھے۔ امراؤ نے جلد ہی نواب کے دل میں گھر کر لیا اور دسمبر ۱۸۴۸ء میں اس نے اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس وقت وہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس نے امراؤ کو حضرت محل کا خطاب دیا۔ اس خطاب نے اتنی شہرت پائی کہ لوگ اس کا اصل نام ہی بھول گئے۔ کچھ مدت بعد حضرت محل کے بطن سے واجد علی شاہ کا ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مرزا رمضان علی برجیس قدر رکھا گیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ جان عالم واجد علی شاہ ایک رنگین مزاج حکمران تھا اور اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کی بجائے اکثر رنگ رلیوں میں مشغول رہتا تھا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی رعایا میں بے حد ہر دلعزیز تھا اور شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ مزاج اس کا بے شک رنگین تھا اور وہ کھیل تماشوں اور رقص و موسیقی کا بھی دلدادہ تھا لیکن انگریزوں نے اس کی عیاشیوں کو حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے صرف اس لیے کہ اودھ کو انگریزی سلطنت میں شامل کرنے کا جواز پیش کیا جا سکے۔ بہر صورت اودھ کے حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ انگریزوں کو دخل اندازی کا موقع مل گیا۔ انہوں نے فروری ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا اور اس کی قلمرو کو سلطنتِ برطانیہ میں شامل کر لیا۔ واجد علی شاہ اپنے

بہت سے حاشیہ نشینوں اور ملازموں کو اپنے ساتھ کلکتہ لے گیا۔ البتہ کچھ متعلقین اور بیگمات کا قیام لکھنؤ ہی میں رہا۔ ان میں حضرت محل اور اس کا بیٹا مرزا برجیس قدر بھی شامل تھے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے جنگِ آزادی کا آغاز ہوا (جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔) جلد ہی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ تیزی سے بھڑک اٹھی اور دُور دُور تک پھیل گئی۔ لکھنؤ میں ہندوستانی سپاہیوں کے باغی ہونے کی خبریں پہنچیں تو وہاں بھی ہل چل کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے ایک امیر آغا مرزا نے دو سو مجاہدوں کو ساتھ لے کر محمدی جھنڈا بلند کیا لیکن ریذیڈنٹ کے حکم سے سب کو گرفتار کر لیا گیا اور آغا مرزا اور ان کے ہم ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے لکھنؤ کے امرا اور شاہی خاندان کے لوگوں کے ہتھیار ضبط کرنے کا حکم دیا، لوگوں کے جذبات پہلے ہی انگریزوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے اب ان میں سخت ہیجان پھیل گیا۔ آخر ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ میں مقیم اکثر ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور شہریوں کے ساتھ مل کر انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ انگریز چھاؤنی اور شہر خالی کر کے ریذیڈنسی میں محصور ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اُدھر فیض آباد میں بھی ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور جیل خانے کو توڑ کر تحریکِ آزادی کے ایک نامور مجاہد مولوی احمد اللہ شاہ کو رہا کرا لیا۔ وہ بھی لکھنؤ پہنچ گئے۔ ۵ جولائی کو نواب شمشیر الدولہ بہادر کی تحریک اور نواب ممّو جان اور بہت سے دوسرے با اثر امراء کی تائید سے خرد سال مرزا رمضان علی برجیس قدر کو تختِ حکومت پر بٹھایا گیا اور حضرت محل کو اس کی سرپرست اور مختارِ کل مقرر کیا گیا۔ حضرت محل زمانے کے سرد و گرم دیکھ چکی تھی! اس نے شاہانہ زندگی بھی گزاری تھی اور اس کس مپرسی سے بھی دوچار ہو چکی تھی جو نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد محلات پر گزری تھی۔ اس نے بیمثال

ہمت اور حوصلے سے نئی ذمہ داریوں کو سنبھالا اور عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اودھ کے تعلقداروں اور زمینداروں کے نام یہ فرمان جاری کیا:

"ملک آبائی خدا نے اب ہم کو عطا کیا، دفع کفارِ فرنگ لازم ہے باہم شریک ہو کر باقی ماندگان بیلی گارد (ریذیڈنسی) کو ٹھکانے لگا دو۔ جو یہ کام کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہو گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے مرزا برجیس قدر کے نام کے سکے جاری کر دیئے اور ان پر یہ شعر کندہ کرائے۔

سکہ زد اندر جہاں چوں ماہ بدر ـــ شاہ رمضان علی برجیس قدر

ـــ دیگر ـــ

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر بدر ـــ نیرِ دین میرزا برجیس قدر

ـــ دیگر ـــ

بزد سکہ در دہر چوں مہر بدر ـــ ابو الحرب قاآن برجیس قدر

ـــ دیگر ـــ

سکہ زد از فضلِ حق بر اشرفی مہر بدر ـــ اخترِ سلطانِ عالم میرزا برجیس قدر

ملک کے انتظام کے لیے حضرت محل نے ایک انقلابی کونسل قائم کی جس کے ارکین میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی شامل تھے۔ ان میں شرف الدولہ کی حیثیت وزیرِ اعظم کے برابر تھی۔ مہاراجہ بالکشن وزیرِ مالیہ، ممو جان صدرِ عدالت اور راجہ جے لال سنگھ وزیرِ جنگ تھے۔ مولوی احمد اللہ شاہ حضرت محل کے مشیرِ خاص تھے اور وہ انقلابی کونسل کے اجلاسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔

اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی سارے اودھ میں بغاوت پھیل گئی اور لوگ انگریزوں کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے۔ خان بہادر منشی ذکاء اللہ مرحوم نے تاریخِ ہند میں لکھا ہے کہ:

"صرف گیارہ دن میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف
سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی۔"

حضرت محل کا قیام جس عمارت میں تھا اس کا نام چولکھی تھا وہیں انقلابی کونسل کے اجلاس ہوتے تھے۔ حضرت محل خود گھوڑے پر سوار ہوکر نکلتی اور سپاہیوں کے دل بڑھاتی۔ ۳۱ جولائی کو بیلی گارد پر پہلا حملہ مولوی احمد اللہ شاہ کی قیادت میں ہوا۔ حملے کے دن حضرت محل رات بھر انتظامات میں مصروف رہی اور ایک پل کے لیے بھی نہ سوئی۔ انگریز قلعہ بند ہوکر لڑ رہے تھے اور انہوں نے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اس لیے بیلی گارد پر قبضہ نہ ہو سکا مگر حضرت محل نے اپنی فوج کی ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

اسی طرح جب عالم باغ کی لڑائی میں راجہ مان سنگھ نے سر دھڑ کی بازی لگا کر انگریزوں کو لوہے کے چنے چبوا دیئے تو حضرت محل نے اس کو "فرزند خاص" کا خطاب دیا اور خلعت دوشالہ اور رومال کے علاوہ ملبوس خاص بھی عنایت کیا۔ دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد جنرل بخت خاں، فیروز شاہ اور نانا راؤ بھی لکھنؤ آگئے اور حضرت محل کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی، اب لکھنؤ ہی جنگ آزادی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ منشی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

"ستر اسی ہزار آدمی، بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو قومی عزت اور مذہبی لوائی نے جواں مرد عورت حضرت محل نائب السلطنت کے علموں کے نیچے شہر میں جمع کیا تھا۔"

حضرت محل بڑی غیور، باتدبیر، اور نڈر خاتون تھی۔ وہ پردے کی پابند تھی لیکن محض فوج کا دل بڑھانے کی خاطر گھوڑے پر سوار ہوکر اس کے پاس جایا کرتی تھی۔ ایک لڑائی میں بخت خاں کی توپیں چھن گئیں تو وہ سخت پریشان ہوگیا،

حضرت محل نے اس سے ملاقات کی اور کہا، تم توپوں کے چھن جانے کا غم نہ کرو میں تمہیں اور توپیں دے دوں گی۔

اس وقت انگریزوں کی حالت بہت نازک تھی لیکن دِلّی کی طرح لکھنؤ میں بھی بعض غدارانِ وطن نے ان کی اعانت کی اور ریذیڈنسی پر حضرت محل کا قبضہ نہ ہو سکا۔ اسی اثناء میں سر کولن کیمپ بل بہت بھاری فوج لے کر لکھنؤ پہنچ گیا۔ حضرت محل کی فوج نے اس کی زبردست مزاحمت کی لکھنؤ کے گلی کوچوں میں خونریز معرکے ہوئے لیکن انگریزی فوج مورچے پر مورچہ فتح کرتے آگے ہی بڑھتی گئی اور حضرت محل کی قیام گاہ چوکھی تک پہنچ گئی۔ یہاں غضب کا رن پڑا اور سینکڑوں ہندوستانیوں نے چوکھی کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ قریب تھا کہ چوکھی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جائے خان علی خان ایک ہزار سرفروشوں کے ساتھ حضرت محل کی مدد کو پہنچ گیا۔ ان بہادروں نے وقتی طور پر تو انگریزی فوج کو پیچھے دھکیل دیا لیکن اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہی تھی کیونکہ باقی سارے لکھنؤ پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ ناچار حضرت محل چوکھی کو خالی کر کے ترکِ وطن پر مجبور ہو گئیں۔ مولوی احمد اللہ شاہ اس سے پہلے ہی دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے لکھنؤ سے باہر نکل گئے۔ حضرت محل کی چوکھی سے روانگی کا منظر صاحب "قیصر التواریخ" نے یوں کھینچا ہے:

"حضرت محل بحالِ تباہ مع دیگر بیگمات اور شاگرد پیشہ عورات ملازمین بھاٹک سے نکلیں اس طرح کہ وہ آگے تھیں اور سب پیچھے صف بستہ۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور الجھتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ جلیل سے نکل کر پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ رات کو غلام رضا کے یہاں قیام کیا پھر وہاں سے اشرف الدولہ کے گھر گئیں، وہاں سے محل سرائے حسین آباد آ گئیں۔ شام تک

جتنا عملہ شاگرد پیشہ تھا سب جمع ہو گیا اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے ہوئے۔ علی رضا کے یہاں جنرل اوٹرم کا پیغام پہنچا کہ ہم زمانہ واجد علی شاہ کا بدستور تم کو تمہارا ملک دیں گے جنگ سے دست بردار ہو جائیے فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرم کی اس پیشکش کو نہایت حقارت سے ٹھکرا کر صلح نامہ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

۱۶ مارچ ۱۹۵۸ء کو حضرت محل نے سرزمین لکھنؤ کو خیرباد کہا لیکن ہمت نہیں ہاری، نئی فوج تیار کرنی شروع کر دی۔ پرانے ساتھی بھی آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچنے لگے یہاں تک کہ اس کے پاس چھ ہزار مسلح سوار و پیادوں کا لشکر جمع ہو گیا۔ اسی زمانے میں اس کو اطلاع ملی کہ مولوی احمد اللہ شاہ نے شاہجہانپور کا محاصرہ کر رکھا ہے اور ان کو مدد کی ضرورت ہے۔ فوراً اپنی فوج لے کر ان کی فوج سے جا ملی لیکن انگریز کا نصیبہ یاور تھا اس کو فتح ہوئی اور حضرت محل نے چوکا گھاٹ میں جا پڑاؤ ڈالا۔ وہاں سے آگے بڑھی تو بہرائچ (یا بروایت دیگر بونڈی) میں لارڈ کلائیڈ نے مزاحمت کی۔ اس سے خونریز لڑائی کے بعد وہ نیپال میں داخل ہو گئی جس کی سرحد قریب ہی تھی۔ مہاراجہ نیپال نے حضرت محل اور اس کے بیٹے برجیس قدر کو تو پناہ دے دی لیکن اس کے باقی تمام ساتھیوں کو گرفتار کرا دیا یا اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ ان میں نواب ممو خان بھی شامل تھے۔ انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے پہلے پھانسی کی سزا سنائی مگر بعد میں کالے پانی بھیج دیا۔ انہوں نے وہیں سفر آخرت اختیار کیا۔

حضرت محل اب نیپال کے پہاڑی علاقے میں بالاستقلال مقیم ہو گئی۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ہندوستان واپس آ جائے لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے اس کو یہ پیغام بھی بھیجا کہ اگر وہ اور برجیس قدر ہندوستان واپس آ جائیں تو لکھنؤ یا فیض آباد جہاں وہ چاہیں

ان کو رہنے کی اجازت ہوگی اور معقول وظیفے کے علاوہ احترامِ شاہانہ کا خیال بھی رکھا جائے گا لیکن حضرت محل نے یہ تجویز پلیٹے استحقار سے ٹھکرا دی، نہ خود آئی اور نہ برجیس قدر کو آنے دیا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت محل نے نیپال ہی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئی۔ اس کے انتقال کے بعد مرزا برجیس قدر کلکتہ چلا گیا وہیں ایک دعوت میں کسی نے زہر دے دیا اور وہ اپنی بیگم اور کمسن بیٹے کے ساتھ راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔

نواب حضرت محل کے بارے میں بعض لوگوں میں یہ کہانی بھی مشہور ہے کہ وہ کسی وقت نہایت راز داری کے ساتھ نیپال سے نکلی اور پُر صعوبت سفر کے بعد عراق پہنچ گئیں، وہاں اس نے کربلا، نجفِ اشرف اور دوسرے کئی مقدس مقامات کی زیارت کی پھر ایران پہنچی اور وہیں وفات پائی۔

(واللہ اعلم بالصواب)

(۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ سن ستاون میری نظر میں،
لیل و نہار لاہور ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء، آج کل دہلی جولائی ۱۹۵۹ء
گنج شائگاں)

عزیز النّساء بیگم

برِ کوچک پاک و ہند کی نامور شخصیت سر سیّد احمد خان (المتوفی ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء) کی والدہ تھیں۔ والد کا نام نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد تھا۔ جو بہادر شاہی دربار کے ایک نہایت معزز رکن تھے۔ شوہر کا نام میر تقی تھا۔ اپنے والدین کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں لیکن نہایت ذہین، روشن دماغ، دانش مند سلیقہ شعار، رحمدل، با اخلاق اور نیک سرشت بی بی تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت بھی نہایت عمدگی سے کی اور ہمیشہ یہ مقصد پیش نظر رکھا کہ وہ بڑے ہو کر نیک اور سچے مسلمان بنیں۔ سر سیّد احمد خاں کو اپنے بچپن کے واقعات خوب یاد تھے وہ بتایا کرتے تھے کہ فارسی کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنی والدہ سے حاصل کی، انہوں نے مجھے گلستاں اور فارسی کی اکثر دوسری ابتدائی کتابیں پڑھائیں — جب میں ان کو سبق سنانے بیٹھتا یا ان سے نیا سبق لیتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیاں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیتیں اگرچہ وہ خفا تو کئی بار ہوئی ہوں گی مگر ان لڑیوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔ والدہ نے بچپن میں مجھے بہت سے مفید اور اخلاقی سبق دیئے جو اب تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ اپنے بچپن کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

> "جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی، میں نے ایک نوکر کو جو بہت بڈھا اور پرانا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا، جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر بعد میں گھر میں گیا تو

میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اس کو نکال دو جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے، یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک دوسری ماما میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا، نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر لے گئی۔ میری خالہ نے کہا، دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا اس سے بھی خفا ہوں گی مگر تم کو میں چھپائے رکھتی ہوں اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں چھپا دیا۔ تین دن میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور بہنوں سے کہتی تھیں کہ "دیکھنا آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں۔" تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کر دوں گی اور نوکر ڈیوڑھی میں بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔"

عزیز النساء بیگم کے بچے جوان ہو گئے تب بھی انہوں نے ہمیشہ ان کے اخلاق اور کردار پر نظر رکھی۔ اگر ان کے طرز عمل میں کوئی خامی دیکھتیں تو اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتیں اور وقتاً فوقتاً ان کو اچھی اچھی نصیحتیں کرتی رہتیں۔

سرسید کا اپنے ایک دوست سے بہت میل جول تھا اور دونوں ایک دوسرے کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ دوست ناراض ہو گئے اور سرسید کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ سرسید کچھ عرصہ تو ان کے ہاں جاتے رہے لیکن پھر انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے اس کا سبب پوچھا، سرسید نے واقعہ عرض کیا تو انہوں نے کہا:

"نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی

کرتے ہو۔ جب دوستی ہے تو اسے پورا کرنا چاہیے یہ تمہارا فرض ہے اور۔۔۔۔
اس دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اس کا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض ادا کرنے کے ذمہ دار کیوں ہوتے ہو۔ تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے اس سے تم کو کیا کہ دوسرا ابھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔"

ایک دفعہ ایک ایسا شخص جس پر کبھی سرسید نے بہت احسان کیا تھا، اس نے محسن کُشی کرتے ہوئے نیکی کا بدلہ بدی سے دیا۔ اتفاق سے وہ تمام ثبوت سرسید کے ہاتھ آ گئے جو اس کو عدالت سے سخت سزا دلا سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ ان کی والدہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کو بلا کر کہا۔ "بیٹے اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے اچھا کوئی کام نہیں۔ اگر تم اس کو اس کی بداعمالی کی سزا حاکم سے دلوانا چاہتے ہو تو بڑی نادانی کی بات ہے۔ آخر تم اس کو ہر نیکی بدی کا بدلہ دینے والے احکم الحاکمین کی گرفت سے چھڑا کر دنیا کے ضعیف حاکموں کے پنجے میں کیوں دینا چاہتے ہو؟"

سرسید کہتے ہیں کہ والدہ کی اس نصیحت نے میرے دل پر بڑا اثر کیا اور میں نے اس شخص سے انتقام لینے کا خیال چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی کسی شخص سے بدلہ لینے کا خیال کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا اگرچہ اس نے میرے ساتھ کیسی ہی برائی کیوں نہ کی ہو۔

عزیز النساء بیگم کی فراست اور دور اندیشی بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی ان کے والد نواب دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین نے وزارت سے استعفا دیا تو کچھ عرصے کے بعد پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور سے اپنے ایک معتمد کو تیس ہزار روپے دے کر ان کے پاس دلی بھیجا کہ یہ رقم سفر خرچ کے طور پر قبول کریں اور لاہور آ کر اس (مہاراجہ) کے دربار سے وابستہ ہو جائیں۔ خواجہ صاحب کے تمام احباب اور اعزہ و اقارب کی خواہش

تھی کہ وہ مہاراجہ کی پیش کش کو قبول کریں۔ خود خواجہ صاحب بھی اس پر رضامند تھے لیکن جب انہوں نے بڑی بیٹی (عزیز النساء بیگم) سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس کے خلاف رائے دی اور کہا کہ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے جس سے آپ باقی ماندہ زندگی نہایت آرام اور راحت کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ یہ بات خلافِ مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ آپ لاہور جاکر رنجیت سنگھ کی حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیں اور ہم سب انگریزی عملداری میں رہیں۔ معلوم نہیں کل کو حالات کیا صورت اختیار کریں اس لیے مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ آپ انگریزی عملداری کو چھوڑ کر لاہور چلے جائیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے بڑھاپے کا زمانہ ہے اور آپ کی طبیعت بھی ناساز رہتی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ یہیں رہیں۔ خواجہ صاحب کے دل پر دانا بیٹی کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے مہاراجہ کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر دی اور سفر خرچ واپس بھیج دیا۔

عزیز النساء بیگم بہت رحمدل تھیں۔ جب کسی غریب کو مصیبت میں دیکھتیں تو ہر طریقے سے اس کی مدد کرتیں۔ انہوں نے اپنے مکان کا ایک حصہ غریب اور بے سہارا عورتوں کے رہنے سہنے اور علاج کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک مسکین اور لاوارث بڑھیا زیبن تھی جو آخری وقت تک ان کے ساتھ رہی۔ ایک دفعہ اتفاق سے عزیز النساء بیگم اور زیبن ایک ہی زمانے میں بیمار ہو گئیں۔ طبیب جو دوا بیگم صاحب کے لیے تجویز کرتا وہی دوا وہ زیبن کو بھی استعمال کراتی تھیں۔ جلد ہی خدا نے دونوں کو صحت یاب کر دیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے طاقت کی بحالی کے لیے ایک قیمتی معجون عزیز النساء بیگم کے لیے تجویز کی۔ انہوں نے درپردہ یہ معجون زیبن کو کھلا دی اور خود اسے چکھا تک نہیں۔ چند دن بعد جب سید صاحب نے والدہ سے کہا کہ "اس معجون سے تو آپ کو بہت فائدہ پہنچا" تو انہوں نے ہنس کر کہا، کیا تمہارے

خیال میں اللہ تعالیٰ دوا کے بغیر صحت نہیں دیتا ؟ سید صاحب یہ سن کر حیران ہوئے اور سارا قصہ معلوم ہوا۔

عزیز النساء بیگم کا دست سخاوت بہت کشادہ تھا لیکن وہ کسی مقصد کے لیے منت یا نیاز نہیں مانتی تھیں اور نہ تعویذ گنڈوں وغیرہ پر ان کا اعتقاد تھا۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ "میرے ننھیال والوں کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کا گوشت کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف ہے۔ وہ دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

۱۸۵۷ء میں دلی میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو سید صاحب بجنور میں صدر امین تھے لیکن ان کی والدہ اور ایک نابینا خالہ اپنے گھر دلی میں تھیں۔ جب انگریزوں نے دلی دوبارہ فتح کی تو انگریز سپاہی گھروں میں گھس آئے اور لوگوں کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ عزیز النساء بیگم کا گھر بھی لٹ گیا اور وہ اپنی بہن کو لے کر زین کی کوٹھڑی میں چلی گئیں اور آٹھ دس روز سخت مصیبت میں گزارے۔ سید صاحب نے اس مصیبت کا حال اس طرح بیان کیا ہے:-

"اس عرصے میں میں میرٹھ آ گیا تھا۔ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی

والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ مل گیا اسی پر بسر کی تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں! تم یہاں کیوں آ گئے یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں، تم چلے جاؤ، ہم پر جو گزرے گی، گزرے گی۔" میں نے کہا، آپ خاطر جمع رکھیئے مجھے کوئی نہیں مارے گا میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعے سے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ ان کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے مطلق پانی نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش کو نکلا۔ پانی اس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار پھر قلعے میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا جب اپنے گھر کے قریب بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے۔ اور کسی قدر بدحواس ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ پانی کی تلاش کو نکلی تھی تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی اور پھر اٹھا نہ گیا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ بھی پیاسی ہے دو دن سے پانی نہیں ملا۔ میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا "پانی پی لے" اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورے کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحب پیاسی ہیں ان کے لیے پانی لے جاؤں گی، اور اسی غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔ میں نے کہا، میرے پاس پانی بہت ہے میں لے آیا ہوں تو پانی پی لے۔ پھر آبخورے میں پانی دیا۔ اس نے پیا اور لیٹ گئی۔

میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔ اب میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کر کے ان کو میرٹھ لے جاؤں۔ جب اس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا زمین پر لیٹی ہوئی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے لیکن کہیں سواری نہ ملی۔ آخر کار حکامِ قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے مجھ کو دے دی جائے میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔"

میرٹھ پہنچ کر عزیز النساء بیگم بیمار ہو گئیں۔ ایامِ علالت میں ان کی بیٹی نواسیاں پوتے پوتیاں اور بہوئیں جو مختلف مقامات کو چلے گئے تھے سب میرٹھ پہنچ گئے اور انہوں نے سب کو صحیح سالم دیکھ لیا۔ لیکن وقتِ آخر آ پہنچا تھا زیادہ دن نہ جیئیں اور سید صاحب کو ضروری وصیتیں کر کے میرٹھ ہی میں فوت ہو گئیں۔

سید صاحب کا بیان ہے کہ میری والدہ کی نصیحتیں نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں مثلاً وہ کہتی تھیں کہ مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں اس میں کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے مگر بندے اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔

○ اگر کسی نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

○ جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔

(العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۶۸ء)

نواب اختر محل اختر

تیموری (مغلیہ) خاندان کی ایک شہزادی تھی۔ اردو کی نغز گو شاعرہ تھی۔ ۱۲۸۰ھ میں دلی اور اس کے گرد و نواح میں اس کی شاعری کا عام چرچا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

تیغِ نگاہِ یار کا دونو پہ وار ہے | ٹکڑے اِدھر جگر ہے اُدھر دل فگار ہے

آستاں پر ترے پیشانی کو گھستے گھستے | سر ہی غائب ہوا جس میں کہ ترا سودا تھا

اک آہِ شعلہ بار نے دل کو جلا دیا | لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا
لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا | اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دیا | غیروں نے آج ان کے تئیں کچھ پڑھا دیا
تقصیر یار کی نہ قصورِ عدو ہے کچھ | اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

اختر محل اختر نے قدسی کی مشہور نعت پر ایک خمسہ بھی لکھا ہے۔ یہ خمسہ اختر کی حُبِ رسولؐ کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

تجھ پہ قربان ہوں اے ہاشمی و مطّلبی | کہ ہے مشہور دو عالم تری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو ترے شوکتِ افلاک دبی | مرحبا سید مکّی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی!

وہ ترا نور ہے ماہِ فلک و مہر کرم | تیرے جلوہ سے منوّر ہوئے دونو عالم
تاب یوسف کو کہاں کر سکے دیکھے قدم | من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی!

واہ کیا درجہ ہے کیا شان ہے اور کیا رتبہ
خالقِ ارض و سما خود ہے ترا مدح سرا
انبیا سب کہتے ہیں صَلِّ علیٰ صَلِّ علیٰ
نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
بر تر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

تو ہے نیسانِ کرم اور سحابِ اکرام
بھر دیا موتیوں سے دامنِ امیدِ انام
بار آور ترے باعث سے ہے نخلِ اسلام
نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سر سبز مدام
زاں شدہ شہرہ آفاق بہ شیریں رطبی

سب سے پہلے کیا پیدا ترا اللہ نے نور
پردۂ ذات میں رکھا اس نور کو مستور
اور اس نور کا اظہار ہوا جب منظور
ذاتِ پاک تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآن بزبانِ عربی

ہے ترے نور سے پُر نور زمیں دشت بہشت
گلشنِ چرخ ہے تیرے ہی برائے گلگشت
تیرے ہی واسطے ہیں خاص یہ جنات ہشت
شبِ معراج عروجِ تو زِ افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نرسید ہیچ نبی!

قدسیاں آنکھیں بچھاتے ہیں ترے زیرِ قدم
خاکِ پا تیری نبی سرمۂ چشمِ عالم
بخش دیجو مری تقصیر اے شاہِ اُمم
نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

سختیٔ حشر سے گھبرائے گی جب مخلوقات
اور نہ بن آئے گی اے ابرِ کرم کوئی بھی بات
انبیا سب تجھے کہوینگے کہ اے ابرِ نجات
ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ حدے می گزرد تشنہ لبی

ہو گئی لہو و لعب میں ہی مری عمر بسر
یادِ خالق میں نہ مصروف ہوئی میں دم بھر
گھستی ہوں ناصیۂ عجز کو تیرے در پر
چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی

دردِ عصیاں کے سبب سے ہے مری جاں پہ چلی
اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرضِ اختر کی بھی قدسی کی طرح سے ہے یہی
سیدی انتَ حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

(مشاہیر نسواں)

بی بی لیلیٰ خانم

تیرھویں صدی ہجری میں ترکی کی نامور شاعرہ ہوئی ہے۔ بعض نے اس کو ترکی کے قدیم طرزِ سخن کی سب سے بڑی شاعرہ لکھا ہے اور بعض اس کا شمار ان شاعروں میں کرتے ہیں جنہوں نے ترکی نظم سے ثقیل اور پُر تصنع الفاظ نکال کر اس کو نئے راستے پر ڈالا اور اس کی موجودہ صورت پیدا کی۔ وہ قاضیِ عسکر مُرل زادہ حامد آفندی کی بیٹی تھی۔ قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی اور اعلیٰ تعلیم پائی۔ اس عہد کا ملک الشعراء عزت مُلّا (عزت مولیٰ) اس کا حقیقی (یا رشتے کا) بھائی تھا۔ شعر و شاعری میں وہ اسی کی شاگرد تھی۔ جب وہ فوت ہوا تو لیلیٰ خانم نے اس کا نہایت دردناک مرثیہ لکھا۔ لیلیٰ خانم بہت ذہین و فطین تھی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی —— اس کی شادی کم سنی میں ہو گئی لیکن اسے جلد ہی طلاق مل گئی۔ اس حادثے نے اس کو بہت متاثر کیا اور وہ اپنا بیشتر وقت فکرِ سخن میں گزارنے لگی۔

زندگی کے آخری دَور میں اس کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا اور وہ مولانا رومؒ کے عقیدت مند مولویہ درویشوں میں شامل ہو گئی۔ اس نے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں وفات پائی اور غلطہ کی خانقاہ مولویہ میں دفن ہوئی۔

ترکی کا مشہور مدبّر اور مصلح فواد پاشا لیلیٰ خانم کا بھتیجا تھا۔

لیلیٰ خانم کا دیوان کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ اس کا بیشتر کلام تغزل کے رنگ میں ہے۔ اس کی مناجاتوں اور مرثیوں کو ملک میں حد سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو لوگ روایتی مشرقی شاعری کے دلدادہ ہیں وہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی اس کا کلام پسند کرتے ہیں۔

(مشاہیرِ نسواں۔ مشاہیر النساء۔ سٹینلے لین پول۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۸)

بی بی مہ لقا بائی چندا

چندا بارھویں/تیرھویں صدی ہجری کی ایک باکمال خاتون ہوئی ہے ـــــ والد کا نام مرزا سلطان تھا جو بلخ کا رہنے والا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے دورِ انحطاط میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان آیا۔ یہ احمد شاہ (۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) کا زمانہ تھا۔ مرزا سلطان نے شاہی دربار میں ملازمت اختیار کر لی اور بعض کارہائے نمایاں کے صلے میں بادشاہ سے صلابت خان کا خطاب پایا۔ شاہ عالم (۱۱۷۳ھ تا ۱۲۰۲ھ) کے دور میں اس کا مرتبہ اور بھی بڑھ گیا۔ بادشاہ نے اسے شاہی افواج کا بخشی مقرر کیا اور بسالت خان کا خطاب دیا۔

چندا مرزا سلطان کی اہلیہ راج کنور بائی (دختر محمد حسین خان کاٹھیاواڑی) کے بطن سے ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوئی۔ اصل نام ماہ لقا بائی تھا۔ والد نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور اس کو اُس دَور کے جید علماء اور اہلِ کمال سے تعلیم دلائی۔ وہ طبعاً بڑی ذہین اور علم کی شائق تھی۔ بہت جلد مختلف علوم و فنون میں طاق ہو گئی اور اس کے علم و ہنر کے چرچے ہر طرف پھیل گئے۔ وہ نہ صرف ایک متبحر عالمہ اور بلند پایہ شاعرہ تھی بلکہ گھڑسواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی وغیرہ میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے حساب مال و دولت سے نوازا تھا کہیں جاتی تو اردلی میں پانچ سو سپاہی ہوتے تھے۔

جب دِلّی میں حالات سازگار نہ رہے تو وہ حیدرآباد دکن چلی گئی جہاں نظامِ دکن آصف جاہ ثانی نے بکمال مہربانی اس کی پذیرائی کی اور وہ ریاست کے دیوان (وزیرِ اعظم) راجہ راؤ منیا کی ملازمت میں داخل ہو گئی (غالباً اس میں

نظام کا ایما بھی شامل تھا) چندا علم دوست بھی تھی اور اہل علم کی قدرداں بھی۔ چنانچہ اس کی فرمائش پر جناب غلام حسین جوہر نے سلطنتِ آصفیہ کی تاریخ "تاریخ دل افروز" لکھی۔ بی بی چندا نے جوہر کی ہر طریقے سے سرپرستی کی اور کتاب کی تکمیل پر ان کو بیش بہا انعام سے نوازا۔

شعروشاعری میں بی بی چندا شیر محمد خان ایمان سے اصلاح لیتی تھی وہ اپنی حویلی میں اکثر مشاعروں کا انتظام کرتی جن میں اونچے درجے کے شعرا اور ادیب شریک ہوتے۔ کبھی کبھی وہ محافلِ موسیقی بھی منعقد کرتی جن میں دکن کے اونچے درجے کے امرا شریک ہوتے۔ چندا کے یومیہ معمولات یہ تھے:

"علی الصباح بیدار ہو کر نمازِ فجر ادا کرتی۔ طلوعِ آفتاب تک ادعیۂ ماثورہ اور وظائف و اوراد میں مشغول رہتی۔ اس کے بعد قرآنِ پاک کی تلاوت کرتی، پھر ناشتہ کرتی۔ دوپہر کو قیلولہ کے لیے بالاخانے میں چلی جاتی اور آرام کرتی یہاں تک کہ نمازِ ظہر کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر تسبیح و تہلیل میں مشغول ہو جاتی یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ عصر پڑھ کر دیوان خانے میں بیٹھ جاتی اور ملازموں کو امورِ خانہ داری اور خانگی حساب کتاب کے بارے میں ہدایات دیتی۔ اس کے بعد علما، فضلا اور شعرا سے علمی گفتگو ہوتی۔ چندا کو مطالعۂ کتب کا بھی بہت شوق تھا "حبیب السیر" اور "روضۃ الصفا" اس کی محبوب کتابیں تھیں اکثر ان کا مطالعہ کرتی رہتی۔ ان کے علاوہ فارسی اور ریختہ کے دیوان بھی باقاعدگی سے پڑھتی۔ یہ سلسلہ نمازِ مغرب تک جاری رہتا۔ نمازِ مغرب کے بعد کھانا ہوتا۔ پھر کچھ وقفہ ہوتا یہاں تک کہ نمازِ عشاء کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ عشاء کے بعد فنِ موسیقی کے استادوں کی محفل جمتی جو نصف شب تک جاری رہتی۔ رمضان المبارک میں روزے

کے بجائے روزانہ کھانے کے ایک سو بیس خوان غریبوں مسکینوں کو دیا کرتی تھی۔ "

ایک مرتبہ راجہ راؤ منیا نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ چندا کی اردو غزلیات کا دیوان مرتب کیا جائے۔ چنانچہ سید نصیر الدین خان قدرت نے یہ دیوان مرتب کیا اور چندا کی خواہش پر اس کا دیباچہ بھی لکھا جو فارسی زبان میں ہے۔ اس میں قدرت نے چندا کے کمالِ فن اور کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ جب دیوان مرتب ہو گیا تو اس وقت راجہ راؤ منیا کی جگہ نواب ارسطو جاہ سلطنتِ آصفیہ کی وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس دیوان کو پسند فرمایا۔ اس کی تاریخ

هُوَ اللَّطِيفُ الْأَعْظَم

یعنی ۱۲۱۳ھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چندا اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہے۔ اردو کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہاں طاقت کہ راہِ حمد میں ہو زباں گویا | کہاں عجز و خاموشی نہیں ہے یک زباں گویا
سوائے حق کے کب کوئی واصفِ ثمہ ہو | رہا چندا ملک پر بھی ہے نکتہ نہاں گویا

اخلاق سے اپنے واقف جہاں ہیگا | پر آپ کو غلط کچھ اب تک گماں ہیگا
اک سخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینہ کو | پر کیا کروں کہ تیرا منہ درمیاں ہیگا

ساقی دے مجھ کو جامِ مئے ارغواں پھر | افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جاں پھر

ملتے ہیں تو قع یہ تری غیر سے کم ہم | رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشمِ کرم ہم

چشم کا قہر بھی ہے اور غمزہ خونخوار بھی ہے | قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے

اس دیوان کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں موجود ہے۔
اس کا ایک اور مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ہے۔
کہا جاتا ہے کہ بی بی چنداؔ نے اپنے اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۹ء میں کسی انگریز کو دے دیا تھا۔ اس نے یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) کو دے دیا۔

چنداؔ فارسی زبان میں بھی مشقِ سخن کرتی تھی۔ اس کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

بروزِ حشر الٰہی چو نامۂ عملم	کنند باز کہ آں روز باز خواہ منست
بکُن مقابلہ آں را بسرنوشتِ ازل	کمی و بیشی اگر باشد آں گناہِ منست

گرانی مے کند بارِ تبسم لعلِ جاناں را — کہ آں لب از نزاکت بر ندارد سرخیٔ پاں را

چنداؔ جود و سخا میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ ایک دفعہ اس نے ایک مسجد تعمیر کرائی تو ایک شاعر نے اس کی تاریخ کہی ؎

چو محرابش سجودِ خاص و عام است!
فلک گفتا کہ ایں بیت الحرام است!

چنداؔ یہ سُن کر خوب ہنسی اور ایک ہزار روپے کا انعام اسے دیا۔
چنداؔ نے نواب نظام علی خان بن نظام الملک کے عہد میں کسی وقت انتقال کیا۔ اگرچہ زندگی میں اس کا دستِ سخاوت بہت کشادہ رہا پھر بھی جب اس کا سامان تقسیم کے لیے نکالا گیا تو کئی من سونا چاندی اور بے شمار قیمتی جواہرات برآمد ہوئے۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ تذکرہ شمیم سخن و تذکرہ حکیم قاسم
ماہنامہ المعارف لاہور مئی ۱۹۸۰ء مقالہ پروفیسر علم الدین سالک)

بی بی لحاظ النساءؒ

ان کا شمار تیرھویں صدی ہجری کی ممتاز اہلِ علم خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کو علم حدیث سے بہت لگاؤ تھا۔ پہلے بھوپال میں وہاں کے ایک نامور عالم مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ سے حدیث پڑھی۔ پھر دلی جاکر شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ[1] کے درس میں شریک ہوئیں اور فن کی تکمیل کے بعد سند

---

[1] علامہ سید نذیر حسین محدث دہلویؒ (میاں جی) کا شمار یگانۂ عصر علمائے اہلحدیث میں ہوتا ہے۔ سنہ ۱۲۲۰ھ میں موضع بلتھوا قصبہ سورج گنج ضلع مونگیر صوبہ بہار (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید جواد علی شاہ تھا۔ ابتدائی تعلیم والدِ گرامی سے حاصل کی پھر صادق پور جاکر مولوی سید محمد حسین سے مشکوٰۃ المصابیح اور ترجمہ قرآن مجید پڑھا۔ سنہ ۱۲۴۳ھ میں غازی پور اور الٰہ آباد ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ اثنائے سفر میں کچھ عرصہ الٰہ آباد کے دائرہ شاہ اجمل میں قیام کیا اور وہاں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ دہلی میں مولانا اخوند شیر محمدؒ، مولانا عبدالخالقؒ، مولانا جلال الدین ہرویؒ، مولانا کرامت علی اسرائیلیؒ، مولانا سید محمد بخشؒ اور مولانا شاہ محمد اسحاقؒ نبیرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے جملہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی۔ وہیں ان کی شادی مولانا عبدالخالقؒ کی صاحبزادی سے ہوگئی۔ شاہ محمد اسحاقؒ ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے تو میاں صاحب نے اورنگ آبادی مسجد میں تفسیر اور حدیث کا درس شروع کیا۔ ہزاروں بندگانِ خدا اس سے فیض یاب ہوئے۔ یہ سلسلہ پچاس برس تک جاری رہا۔ سنہ ۱۲۸۰ھ میں انبالہ کے مشہور مقدمۂ علمائے صادق پور کے سلسلے میں قریباً ایک سال راولپنڈی جیل میں قید رہے لیکن بے گناہ ثابت ہوئے۔ ۱۳۲۵ھ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر صرف انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے تمام عمر علمِ حدیث کی اشاعت میں گزار دی۔

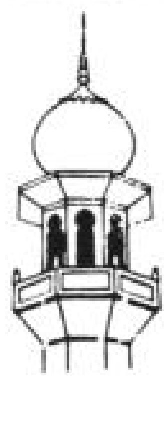
۱۳۰۹ھ ہجری میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

میں حکومتِ ہند نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ تیرانوے سال کی عمر میں رجب ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی اور دہلی کے قبرستان شیدی پورہ میں مدفون ہوئے۔ نہایت عابد و زاہد متقی اور فیاض تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ارشد تلامذہ کے نام یہ ہیں:

حافظ محمد عبد اللہ محدث غازی پوریؒ۔ سید عبد الجبار غزنویؒ۔ سید محمد عبد اللہ غزنویؒ۔ مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ۔ مولانا حافظ محمد لکھویؒ۔ مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ۔ مولانا فضل الٰہی وزیر آبادیؒ۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ۔ مولانا حافظ عبد المنان وزیر آبادیؒ۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ۔



ملکہ پرتو پیالہ

ترکی کے عثمانی فرمانروا سلطان عبدالعزیز (۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ) کی والدہ تھیں - بڑی نیک سیرت، باخدا اور مخیر خاتون تھی۔ انہوں نے ۱۲۸۵ھ میں ایک عالیشان جامع مسجد مع ایک کتب خانہ، ایک شفا خانہ اور ایک لنگر خانہ تعمیر کرائی، اور بے شمار مؤذن، خدام، پیش امام اور خطیب اس کی خدمت کے لیے مقرر کیے۔ یہ مسجد قسطنطنیہ کے محلہ آقسرائے میں واقع ہے۔ اس کے پاس ہی اس ملکہ کی قبر ہے — ملکہ پرتو پیالہ نے قسطنطنیہ کے قریب ارتاکوئی میں ایک اور جامع مسجد بھی بنوائی۔ یہ "یینی والدہ جامع" کہلاتی ہے۔ سلطان عبدالعزیز کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ اس نے ایک لاکھ پونڈ کی لاگت سے اپنے لیے ایک چھوٹا جہاز تیار کرایا تو اس کا نام اپنی والدہ کے نام پر "پرتو پیالہ" رکھا۔ (مشاہیر نسواں)

بادشاہ بیگم دہلوی

تیرھویں صدی ہجری میں یگانۂ روزگار خطاطہ ہوئی ہیں۔ فن کتابت (خوشنویسی) انہوں نے اپنے دور کے وحید العصر خوشنویس استاد محمد امیر پنجہ کش دہلوی سے سیکھا۔ ان کی کتابت دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے ان کے ہاتھ کی وصلیاں دیکھیں تو دنگ رہ گئے اور ان کو نادر قلم کا خطاب دیا۔ ایک بلند پایہ خطاطہ ہونے کے علاوہ وہ اچھی عالم اور شاعرہ بھی تھیں اور فن طب میں بھی دسترس رکھتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ انگریزی زبان بھی جانتی تھیں۔ حالانکہ اس زمانے میں کسی مسلمان خاتون کی انگریزی زبان سے واقفیت بہت عجیب بات سمجھی جاتی تھی۔ (مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی شمس النساءؒ

حیدرآباد دکن کی رہنے والی تھیں۔ جملہ علومِ دینی میں یکتائے زمانہ تھیں۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ قرآن تفسیر اور علوم دینی میں ماہرانہ دستگاہ رکھتی تھیں۔ حدیث کی جملہ مسانید پر گہری نظر تھی۔ اکثر عورتوں کے مجمع میں وعظ وہدایت کیا کرتی تھیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں انہوں نے اپنا بیشتر وقت وعظ وہدایت ہی میں گزارا۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

صولت النساء بیگمؒ

مرزا رحمت اللہ کیرانویؒ ہندوستانیوں کی جنگِ آزادی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ جنگِ آزادی (جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا) بوجوہ کامیاب نہ ہوسکی تو مولانا ہندوستان سے ہجرت کرکے حجاز چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا مگر وسائل کا فقدان تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں سلطان ٹیپو شہیدؒ کے خاندان کی ایک مخیر اور متقی خاتون صولت النساء بیگم کلکتہ سے حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ پہنچیں۔ ان کے سامنے مدرسہ کی تجویز پیش کی گئی تو انہوں نے اس کی پرزور تائید کی اور تیس ہزار روپیہ کی خطیر رقم (جو آج کل کے کئی لاکھ روپے کے برابر ہوتی ہے) مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی خدمت میں پیش کردی۔ مولاناؒ نے مدرسہ قائم کرکے اس کا نام اس مخیر خاتون کے نام پر "مدرسہ صولتیہ" رکھا۔ یہ مدرسہ آج تک قائم ہے اور اس سے لاکھوں طالبانِ علم اب تک فیض یاب ہوچکے ہیں۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی اسماء عبرت

تیرھویں صدی ہجری میں مشہور خطاطہ ہوئی ہے۔ استنبول (قسطنطنیہ) کی رہنے والی تھی۔ والد کا نام احمد آقا تھا اس کی شادی اپنے دور کے سرآمدِ روزگار خطاط محمود سے ہوئی فاضل شوہر نے اس کو ایسی عمدہ تعلیم دی کہ اس کا خط اپنے خط جیسا بنا دیا۔ بعض اوقات محمود خطاط اپنی بیوی اسماء عبرت کے لکھے ہوئے مخطوطات اپنے نام سے لوگوں کو دے دیا کرتا تھا اور وہ مطلق تمیز نہ کر سکتے تھے کہ یہ محمود کے لکھے ہوئے ہیں یا اس کی اہلیہ کے۔ اسماء عبرت کی خوشخطی کے نمونے ابھی تک ترکی میں محفوظ ہیں اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی رشحہ

تیرھویں صدی ہجری میں فارسی زبان کی مشہور شاعرہ ہوئی ہے۔ وطن مالوف ایران تھا۔ ہاتف کاشانی کی بیٹی اور مرزا علی اکبر نظیری کی اہلیہ تھی۔ سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا والد، شوہر اور بیٹا مرزا احمد کشتہ سبھی شاعر تھے۔ اصل نام بیگم تھا اور رشحہ تخلص کرتی تھی۔ صاحبِ دیوان تھی۔ اس کے دیوان میں تقریباً ۳۱ ہزار اشعار ہیں۔ ان میں شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار (۱۲۱۱ھ تا ۱۲۵۰ھ) اور اس کے خاندان کی مدح میں کئی قصائد شامل ہیں۔ نمونہ کلام ہے:

دل رفت وز خونِ دیدہ مارا ——— پیداست بُرخ ازاں علامت

می تپد از شوق دل در سینہ ام گوئی کہ باز ——— تیر دلداری بدل زاہد کمانے می رسد

اشکم ز ہجر تو ہر روز تا سمک ——— آہم ز دستِ خوئے تو ہر شام تا سماک

آں بتِ گلچہرہ یارب بستہ از سنبل نقاب ——— یا بافسوں کردہ پنہاں در دل شب آفتاب

بقصدِ صید تو چوں رشحہ دیدمش گفتم ——— کسے ندیدہ شکارِ مگس کند شہباز

(تذکرۃ الخواتین)

چودھویں صدی ہجری

۱۔ نواب سلطان جہاں بیگمؒ (والیہ ریاست، عالمہ، فاضلہ، صالحہ، مخیّر، معارف پرور)

۲۔ بی بی فاطمہ صغریٰ (عالمہ فاضلہ، شاعرہ، مصنفہ)

۳۔ فاطمہ بنتِ عبداللہؒ (مجاہدہ)

۴۔ بی اماںؒ (دلاور، حوصلہ مند، صابرہ، بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں۔ آزادی کی خاطر مصیبتیں جھیلنے والی)

۵۔ صاحبزادی احمدی بیگمؒ (دیندار، پرہیزگار، قناعت پسند)

۶۔ بی بی مقبول النساء بیگم (بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۷۔ صغریٰ بی بیؒ (صالحہ، مخیّر، علم دوست)

۸۔ بی بی بخت اختر بانو (بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۹۔ بی بی بختیہؒ (مخیّرہ)

۱۰۔ بی بی بدرالنساء بیگمؒ (عالمہ، فاضلہ، طباع، دیندار اعلیٰ درجے کی منتظمہ، مصنفہ، بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۱۱۔ محترمہ محمودہ بیگمؒ (عالمہ، فاضلہ، بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۱۲۔ سید نشاط النساء بیگمؒ (بلند حوصلہ، بہادر، قناعت پسند، باوفا بیوی، آزادی کی خاطر مصیبتیں جھیلنے والی)

۱۳۔ خالدہ ادیب خانم (عالمہ، فاضلہ، مجاہدہ، ادیبہ، مصنفہ، جامع کمالات)

۱۴۔ نازلی بیگم (عالمہ، فاضلہ، مہمان نواز، علم دوست)

۱۵۔ زہرا بیگم (ذہین، طباع، تحریر و تقریر میں طاق)

۱۶۔ عطیہ بیگم (عطیہ فیضی) ذہین و فطین، علم و ادب اور فنون لطیفہ کی شیدائی)

۱۷۔ اماں رقیہ بیگمؒ (عابدہ، زاہدہ، قناعت پسند، حوصلہ مند بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۱۸۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ مادر ملت (قائداعظمؒ کی دست راست بہن، حوصلہ مند، بیباک، حق گو)

۱۹۔ حافظہ حمیدہ بیگم (حافظہ، عالمہ)

۲۰۔ آپا فاطمہ الکبریٰ (خطاطہ، صالحہ، مبلغہ)

۲۱۔ سیدہ خیر النساء بہترؒ (عالمہ، حافظہ، شاعرہ، مصنفہ، صالحہ)

۲۲۔ سیدہ امۃ اللہ تسنیم (عالمہ، مصنفہ، شاعرہ، صالحہ)

۲۳۔ آپا جی حمیدہ بیگمؒ (عالمہ، مصنفہ، ادیبہ، مبلغہ، صالحہ)

۲۴۔ نور الصباح بیگم (ادیبہ، شاعرہ، سیاستدان)

۲۵۔ سیدہ اماں جی (عالمہ، جامع کمالات)

۲۶۔ بنت الاسلام (عالمہ، مبلغہ)

نواب سُلطان جہان بیگم

سنہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۱ء) ہجری میں اپنی والدہ نواب شاہجہان بیگم کی وفات کے بعد بھوپال کی حکمران بنیں۔ وہ سنہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں پیدا ہوئیں —— والد نواب باقی محمد خان (المتوفی سنہ ۱۲۸۲ھ) تھے۔ ان کی شادی سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) ہجری میں احتشام الملک عالی جاہ نواب احمد علی خان افغان رئیس میرانزئی منغیل سے ہوئی۔ اللہ نے اُن سے اُن کو تین بچے عطا کیے لیکن افسوس کہ مسند نشینی کے صرف چھ ماہ بعد نواب احتشام الملک بہادر یکایک وفات پا گئے اور نواب سلطان جہان بیگم بیوہ ہوگئیں۔ یہ اُن کے لیے جانکاہ صدمہ تھا لیکن انہوں نے ایک سچی مومنہ کی طرح بڑے صبر و تحمل سے کام لیا اور اس ہوش رُبا موقع پر ان جذبات کا اظہار کیا:

"ایسے وقت میں جبکہ سچے مشیروں اور قابل ہمدردوں کی مجھے سخت ضرورت تھی، ایک ایسے بیدار مغز خیر خواہ گرامی قدر مشیر کا جس نے ۲۷ سال ہر طرح کی رفاقت اور خیر خواہی سے میرے ساتھ بسر کیے اور جس سے زیادہ دنیا میں کوئی عمدہ اور قابل مشیر نہ تھا۔ خانگی معاملات اور ریاستی انتظامات میں جیسی اعلیٰ اور صائب رائیں انہوں نے دیں اور جیسی دل سوزی کے ساتھ میری ہمدردی کی، اس کا کامل اندازہ میرا دل ہی کر سکتا ہے، پس اس کا یکایک انتقال کر جانا میرے لیے کیسا سخت اور دل شکن اور غم انگیز حادثہ تھا۔ اگر ہم غمناک حادثوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم کو بہت سے حادثے ایسے ملیں گے جو خدا کے نہایت نیک اور برگزیدہ بندوں پر گزرے ہیں

اور ان سے محض قضائے الٰہی پر صبر کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔
دراصل خداوندِ کریم انسانوں کے صبر کی آزمائش صدمات اور تکالیف سے کرتا ہے۔ اگر انسان اس آزمائش میں جو صبر کا حقیقی مفہوم ہے، پورا اترتا ہے تو وہ کامیاب سمجھا جاتا ہے اور خدا اس کو اپنی محبت اور رحمت کی خوشخبری ان الفاظ میں دیتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ [1]

مجھ پر جو عین مشکلات کے وقت یہ سخت حادثہ گزرا وہ دراصل میرے صبر کا امتحان تھا۔ میں نے خدا کی مرضی پر صبر کیا اور قضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا کر آیاتِ کریمہ حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ۔ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ [2] کو اپنا ورد کیا جو میرے دل کو اطمینان دیتی تھیں کیونکہ خدائے عزّ وجلّ فرماتا ہے "أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ [3]"

نواب سلطان جہاں بیگم نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ انہوں نے ریاست کے مدار المہام (وزیر اعظم) مولوی جمال الدین خاں بہادر

---

[1] ترجمہ: اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی رحمت اور مہربانی ہے اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔ (بقرہ - ۱۵۷)

[2] ترجمہ: ہم کو خدا کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے (آل عمران - ۱۷۳) وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔ (الانفال - ۴۰) [3] ترجمہ: سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔ (الرّعد - ۲۸)

سے قرآنِ پاک ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھا۔ وہ اپنے دَور کے بہت بڑے عالمِ دین بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کو اردو فارسی عربی اور انگریزی زبانوں کی تعلیم بھی دی گئی اور امورِ خانہ داری نیز شہسواری اور نشانہ بازی میں بھی طاق کیا گیا۔

ان کا عہدِ طفلی اپنی نانی نواب سکندر بیگم کی آغوشِ شفقت میں گزرا۔ انہوں نے بڑی شفقت اور توجہ سے نواسی کی دینی تربیت کی اِسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے عمر بھر نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن کا کبھی ناغہ نہ کیا۔ قرآنِ حکیم سے ان کو دلی لگاؤ اور گہری عقیدت تھی۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید نادار مسلمانوں اور طلبہ میں تقسیم کرتیں۔ تجوید اور قرأت کے فن کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے بھوپال میں مدرسہ حفاظ قائم کیا۔ اپنے بیٹوں اور پوتوں کو بڑے اہتمام سے قرآن مجید پڑھایا اور ایک فرزند صاحبزادہ عبیداللہ خان کو قرآنِ پاک حفظ کرایا۔ جس دن انہوں نے قرآن حفظ کر لیا ان کو ناقابلِ بیان مسّرت ہوئی۔ اس سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

> "نواب احتشام الملک بہادر کی توجہ ہر وقت اُن پر تھی اور اس دن کی خوشی تو بیان نہیں ہو سکتی جس دن کہ قرآن مجید کی آخری سورۃ صاحبزادہ صاحب نے حفظ کر کے ہم کو سُنائی۔ اُن کو مجھ سے زیادہ اور مجھ کو ان سے زیادہ مَسّرت تھی۔"

بے حد پابندِ شریعت تھیں۔ زندگی بھر نماز قضا نہ کی۔ اسی طرح بچپن سے لے کر اخیر عمر تک رمضان المبارک کے روزے بھی باقاعدگی سے رکھتی رہیں صرف ایک آدھ مرتبہ علالت کی وجہ سے چند روزے قضا کرنے پڑے۔ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کا خاص اہتمام کرتیں اور پورا قرآنِ پاک سنتیں۔ ہر سال زکوٰۃ کا ایک ایک پیسہ بڑی باقاعدگی سے مستحقین میں تقسیم کرتی تھیں اور اس میں کسی قسم کی تاخیر مطلق روا نہ

رکھتی تھیں۔

پردے کی سخت پابند تھیں۔ عمائدِ حکومت ہوں یا ماتحت ملازمین، ہمعصر والیانِ ریاست ہوں یا دوسرے ملکوں کے فرمانروا، گورنر ہوں یا وائسرائے وہ ان سے ملاقات کے وقت ہمیشہ برقع میں مستور رہتی تھیں۔ زندگی کے آخری سال میں انہوں نے قرآنِ پاک کی رخصت کا فائدہ اٹھا کر پردہ ترک کیا لیکن وہ بھی صرف چہرے کی حد تک، باقی تمام جسم برقع میں مستور رہتا تھا۔ اس وقت وہ ۷۱ برس کی تھیں۔

عنانِ حکومت سنبھالنے کے ایک ہی سال بعد وہ حج بیت اللہ کے لیے حجازِ مقدس روانہ ہو گئیں اور وہاں پورے پانچ ماہ قیام کے بعد واپس بھوپال آئیں۔ اپنے سفرِ حج کا حال انہوں نے اپنی ایک کتاب "ریاض الرّاحین" میں بڑے ذوق و شوق سے لکھا ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے دَورِ حکومت میں ہندوستان کے مختلف مقامات اور یورپ کے طولانی سفر بھی کیے۔ اس دوران میں سخت سے سخت سردی میں بھی انہوں نے نماز قضا نہ کی اور نہ تلاوتِ قرآن کا ناغہ کیا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری کو حکم دے رکھا تھا کہ کسی پارٹی یا ملاقات کا وقت ایسا نہ مقرر کیا جائے جس میں نماز کے قضا ہو جانے کا خدشہ ہو۔

نواب سلطان جہاں بیگم کا دستِ سخاوت بہت کشادہ تھا اور معارف پروری میں تو وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ وہ ریاست اور بیرونِ ریاست کے بہت سے علمی اداروں اور اربابِ فضل و کمال کی فراخدلی سے مالی مدد کرتی رہتی تھیں۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کو وہ مسلمان طلبہ کے لیے بہترین درسگاہ سمجھتی تھیں۔ چنانچہ اپنے فرزند صاحبزادہ حمید اللہ خان مرحوم کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان یا اجمیر کے چیفس کالج بھیجنے کے بجائے علی گڑھ بھیجا اور انہوں نے اپنی تعلیم وہیں مکمل کی ـــــ علی گڑھ میں انہوں نے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر کی عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جس پر زرِ کثیر صرف ہوا۔ اس عمارت کا نام انہی کے نام پر "سلطان جہان منزل" رکھا گیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے بعد وہ کچھ عرصے تک اس کی وائس چانسلر رہیں اور اس ادارے کو عرصے تک گرانقدر مالی امداد دیتی رہیں۔

نواب سلطان جہان بیگم کو سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بے پایاں عقیدت اور محبت تھی۔ سن ۱۳۳۰ ہجری میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبیؐ لکھنے کا ارادہ کیا تو مالی مشکلات ان کے راستے میں حائل ہو گئیں اور انہوں نے قوم سے پچاس ہزار روپیہ فراہم کرنے کی اپیل کی۔ نواب سلطان جہان بیگم کو معلوم ہوا تو انہوں نے یہ تمام رقم اپنے پاس سے دے دی اور علامہ شبلیؒ کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر نواب سلطان جہان بیگم نے اپنی آپ بیتی "تزکِ سلطانی" میں اس طرح کیا ہے:

"چونکہ اردو میں اس وقت تک آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کوئی مفصل اور مستند سوانح عمری موجود نہیں ہے اس لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ شمس العلماء مولانا شبلی جو تاریخِ اسلام کے ایک باکمال اور مستند عالم ہیں، سیرتِ نبویؐ مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن مالی مدد سے مجبور ہیں اور انہوں نے ایک اپیل امداد کے لیے شائع کی ہے تو میں نے اس اپیل کو دیکھا اور افسوس ہوا کہ ایک ایسی ضروری اور مذہبی تصنیف کے لیے پبلک سے اپیل کرنے کی نوبت پہنچی ہے۔ میں نے اُن کو مطلع کیا کہ وہ فوراً کام شروع کر دیں اور جس قدر روپے کے لیے اپیل کی گئی ہے وہ میں دوں گی۔"

چنانچہ علامہ شبلیؒ اس کام میں یکسوئی سے مشغول ہو گئے لیکن ابھی وہ اس کا پہلا حصہ ہی مرتب کر پائے تھے کہ پیغامِ اجل آ پہنچا۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ کتاب شائع ہوئی تو بیگم صاحبہ نے اسے ملاحظہ فرما کر بڑی مسرت

کا اظہار کیا اور فرمایا: ——— "یہ تو بڑا کام ہوا"

اس موقع پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب "سیرۃ عائشہؓ" اور مولانا عبدالسلام ندویؒ کی "سیر الصحابہ" اور اس سلسلے کی دوسری کتابوں کے مسودات کا ذکر کیا اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ذاتی پریس نہ ہونے کی بناء پر ان کتابوں کی اشاعت میں جو مشکلات پیش آرہی تھیں، اُن کا اظہار کیا تو بیگم صاحبہ نے دریافت فرمایا:

"پریس کی کیا قیمت ہوگی؟"

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کہا۔ "تین ہزار روپے"!

بیگم صاحبہ نے فرمایا ——— "ایسے نیک کاموں کے لیے تین ہزار روپے کیا چیز ہیں۔ ابھی حکم لکھے دیتی ہوں۔"

چنانچہ یہ رقم ادا کرنے کے لیے فوراً حکم صادر کر دیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم بڑی خداترس اور عدل پرور حکمران تھیں انہوں نے اپنی ریاست میں عادلانہ نظام قائم کیا اور عدلیہ کے افسروں کو حکم دیا کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت احکامِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھیں اور پورا پورا انصاف کریں۔

۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء میں جب نواب سلطان جہاں بیگم کی عمر اڑسٹھ برس کے لگ بھگ تھی وہ اپنے فرزند صاحبزادہ حمید اللہ خاں کے حق میں حکومت سے دست بردار ہوگئیں۔ نئے حکمران کی مسند نشینی کے موقع پر جو دربار منعقد ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم نے فرمایا: ———

"آج ۲۵ برس سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ جب مالکِ حقیقی نے ملکِ محروسہ بھوپال کی عنانِ حکومت میرے سپرد کی۔ آپ سب کو علم ہے کہ میں نے اپنی حیثیت مثلِ ایک امین کے سمجھ کر اور اس کی ودیعتِ کبریٰ کے اہم فرائض کا احساس کر کے فوراً اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ ریاست کے مفاد اور رعایا کی فلاح

کو اپنا مآلِ زندگی بنایا اور مسلسل ۲۵ برس تک اس مقصدِ عظیم کے حصول میں سعی و محنت کو اپنا اوّلیں فرض تصور کیا اور جو ذرائع و وسائل ممکن ہوئے ان کی بہم رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ میں اپنے احکم الحاکمین کا شکر کرتی ہوں کہ اس نے ہر موقع پر اور ہر تدبیر میں میری اعانت کی اور اس امر کا اندازہ کہ میری کوششیں ریاست بھوپال اور میری رعایا کی بہبودی اور فلاح میں کس قدر کامیاب ہوئیں، آپ لوگ خود کر سکتے ہیں۔"

اپنی اس تقریر کے آخر میں انہوں نے نئے حکمران کو مخاطب کرکے پہلے چند آیاتِ قرآنی تلاوت کیں جن میں عدل و احسان کرنے، غریبوں، یتیموں، حاجتمندوں اور مسافروں کی دستگیری کرنے، فحاشی، منکر اور سرکشی سے باز رہنے، نماز قائم کرنے اور عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی اور بیگم صاحبہ نے ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا کی:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ [1] (الاحقاف: ۱۵)

یہ دعا مانگتے ہوئے ان پر رقت طاری تھی اور حاضرین بھی چشم پُر آب تھے۔

اس کے چار سال بعد ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) میں اپنے وقت کی یہ عظیم خاتون دنیائے فانی سے کوچ کرکے دار البقا میں پہنچ گئیں۔ دنیا کے تمام مسلمانوں نے ان کی وفات پر سخت رنج و الم کا اظہار کیا۔ ملک کے تمام وقیع اخبارات و رسائل نے تعزیتی

---

[1] ترجمہ: "اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں ان کی شکر گزار رہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں صلاح و تقویٰ دے۔ میں تیری طرف رجوع کرتی ہوں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔"

اداریے لکھے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ میں "والیہ بھوپال سلطان جہاں بیگم خادمۂ ملت و مخدومۂ اُمت کا ماتم" کے عنوان کے تحت اپنے جو تاثرات قلمبند کیے ان سے مرحومہ کے مقام اور مرتبہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

"علیا حضرت کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس کا ماتم نہ صرف بھوپال نہ صرف ہندوستان، نہ صرف مسلمان بلکہ تمام دنیا کر رہی ہے۔ وہ نہ صرف اسلام کی بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں جن کے کارناموں پر مرد سلاطین اور امرا بھی رشک کر سکتے ہیں ان کا دورِ حکومت ـــــ بھوپال کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔"

"سلطانہ مرحومہ مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا مجمع البحرین تھیں جو آج مصلحینِ اُمت کا آئیڈیل ہے۔ ان کی مشرقی تعلیم پوری اور مغربی واقفیت بقدرِ ضرورت تھی۔ وہ نہ صرف فرمانروا تھیں بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما، مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کی رئیسۂ علیا، مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی حامی، مذہبی علوم و فنون کی سب سے بڑی سرپرست، ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مبلغ، مسلمان عورتوں میں سب سے بڑی کثیر التصانیف اور سب سے بہتر مقررہ لیکن ان ہر قسم کے انتظامی، اصلاحی، ملکی، علمی اور تعلیمی کارناموں سے بڑھکر ان کا حقیقی شرف ان کی مذہبی گرویدگی، دینی عقیدت اور ایمانی جوش و ولولہ تھا۔"

"وہ ہر قومی، مذہبی و علمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتی تھیں اور اس کے لیے عملی قدم اٹھاتی تھیں۔ مسلم یونیورسٹی، مدرسۂ دیوبند، دارالعلوم ندوہ اور ووکنگ مشن چھوٹے بڑے بیسیوں تعلیمی و مذہبی ادارے ان کی امداد و اعانت کے طوقِ منت سے گرانبار ہیں۔ دارالمصنفین

اور سیرۃ نبویؐ کو کہا جائے کہ انہیں کے دستِ کرم سے ان کی بنیاد پڑی خصوصاً سیرۃ النبی جیسی اہم کتاب کا عالمِ وجود میں آنے کا شرف صرف اُن کی ذاتِ گرامی کے لیے مخصوص ہے۔ امید ہے کہ تنہا ان کی یہی نیکی شفاعتِ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے استحقاق کے لیے کافی ہوگی۔"

"سلطانہ مرحوم کی ہستی میں رعب و شفقت کی عجیب آمیزش تھی اور ان کے اخلاق میں عجیب کشش تھی ان کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا۔ دربار کے آداب بھی تمام تر شرعی تھے۔ پردہ کے پیچھے وہ تشریف رکھتی تھی۔ کورنش و تسلیمات و رکوع و سجود کا وہاں دخل نہ تھا۔ سب سے پہلے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کی بلند آواز اُن کی طرف سے آتی تھی۔ شاید ہی کوئی ان سے ملا ہو اور ان کے اخلاق و معلومات کی وسعت سے وہ متاثر نہ ہوا ہو۔ علامہ شبلی مرحوم غالباً ۱۹۰۶ء میں ان سے ملے تو ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے جذبات "الندوہ" کے چند صفحات میں ظاہر کیے۔ مجھے دو تین مرتبہ ان کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا مگر ہر دفعہ دیر تک وہ اس اخلاق سے مصروفِ کلام رہیں کہ مخاطب یہ بھول جاتا تھا کہ وہ کسی خود مختار فرماں روا سے بات کر رہا ہے۔"

"ان کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور اس کے لیے ایک خاص محکمہ تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے مسودات بارہا دیکھے۔ ان کے برمحل اعتراض اور باموقع سوجھ حیرت انگیز تھی۔ اپنی تصنیفات کے مسودوں پر خود نظرِ ثانی کرتی تھیں اور اپنے قلم سے ان پر نشان بناتی تھیں۔

ان کو رسولِ پاک علیہ الصلوٰۃ سے بے مثال عقیدت تھی جس کی کھلی

دلیل خود سیرۃ نبویؐ کا وجود ہے مگر اس کے علاوہ ان کی گفتگو، تحریر ہر چیز سے ان کا یہ جذبہ ظاہر ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں سیرۃ کی پہلی جلد لے کر جب ان کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا تو بڑے اشتیاق سے انہوں نے دریافت کیا تھا کہ عالمِ رویا میں رسولِ اکرم علیہ السلام کی زیارت کس طرح ہو سکتی ہے۔ عرض کی کہ کتبِ حدیث و سیرۃ کے مطالعہ اور درود و سلام کی کثرت سے۔"

نواب سلطان جہان بیگم نے پچاس کے قریب تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سے بیشتر کا موضوع مذہب، اخلاق اور خانہ داری ہے۔ ان میں سے چند اہم اور مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

سیرتِ مصطفےٰؐ، سیرت شاہجہانی، ریاض الراحین، تزکِ سلطانی، گوہر اقبال، خورشید اقبال۔

(بیگماتِ بھوپال، مشاہیر نسواں، صنفِ نازک، یادِ رفتگاں وغیرہ)

بی بی فاطمہ صغریٰ

بانکی پور پٹنہ (بہار۔ بھارت) کے مشہور کتب خانہ کے بانی مولوی خدا بخشؒ کی صاحبزادی تھیں۔ نہایت عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ انہوں نے کئی علمی کتابیں تصنیف کیں۔ شعر و شاعری کا بھی عمدہ مذاق رکھتی تھیں۔ (مشاہیر نسواں)

فاطمہ بنتِ عبداللہؒ

فاطمہ بنتِ عبداللہؒ نہ کسی ملک کی فرمانروا تھی اور نہ کسی فرمانروا کی بیٹی۔ نہ وہ کوئی عالمہ فاضلہ خاتون تھی اور نہ کسی فن یا ہنر میں یکتا ـــــ وہ تو گیارہ سال کی ایک معصوم اور پاکباز بچی تھی، لیکن اس نے اپنے خونِ شہادت سے صفحۂ تاریخ پر جو داستان رقم کی اس کی بدولت وہ آج تک فرزندانِ توحید کے دلوں پر حکومت کر رہی ہے، اس کا نام سن کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، اور وہ بے اختیار اس پر رحمت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ جب تک مہر و ماہ میں روشنی باقی ہے فاطمہ بنتِ عبداللہ کے خونِ شہادت کی سرخی کا پرتو بھی باقی رہے گا۔

فاطمہ طرابلس الغرب (لیبیا) کے ایک طاقتور قبیلے براعصہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد شیخ عبداللہؒ اس قبیلے کے سردار اور بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ وہ ایک دیندار، بہادر، غیور اور مخلص مسلمان تھے اور اپنے قبیلے میں عبدہٗ کے لقب سے مشہور تھے۔ شیخ عبداللہ کے نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی صرف ایک لڑکی فاطمہ تھی جسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے فاطمہ نے صحرا کے آزاد ماحول میں پرورش پائی اور گھر کے دینی ماحول میں تعلیم حاصل کی۔

۱۹۱۲ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا۔ اس زمانے میں طرابلس الغرب خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگین تھا۔ ترکی حکومت نے بھی اٹلی کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا اور دونوں ملکوں کے درمیان خونریز لڑائی چھڑ گئی۔ طرابلس کے مسلمان دعوتِ جہاد پر بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے اور جوق در جوق میدانِ جہاد میں پہنچ گئے ان کے ساتھ ان کی خواتین اور بچے بھی تھے۔ عورتوں

میں بوڑھی خواتین کے ساتھ نوعمر لڑکیاں تک شامل تھیں جن کے ابھی کھیل کود کے دن تھے اور ایسی خواتین بھی تھیں جن کی گود میں دودھ پیتے بچے تھے لیکن وہ سب جذبۂ جہاد سے سرشار تھیں۔ وہ زخمی مجاہدین کو پانی پلاتیں اور ان کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

اس لڑائی میں شیخ عبداللہؒ نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اثرورسوخ سے کام لے کر طرابلس کے مختلف قبائل کو متحد اور منظم کر کے میدانِ جہاد میں لا کھڑا کیا تھا۔ خود ان کے اپنے جذبۂ جہاد کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے گھر کا تمام ساز و سامان راہِ حق میں ترک افسروں کو دے دیا تھا اور وہ وظیفہ لینے سے بھی معذرت کر دی تھی جو خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے ایامِ جنگ میں عرب مجاہدین کو دیا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے قبیلے اور خاندان کے سبھی لوگ جہاد میں شریک تھے ان میں شیخ کی لختِ جگر گیارہ سالہ فاطمہ بھی شامل تھی۔ اس کمسن مجاہدہ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو مجاہدین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی زخمی مجاہدوں کو اپنے مشکیزے سے پانی پلا رہی ہوتی جب دشمنوں کی طرف سے گولوں کی بارش ہو رہی ہوتی۔ اُسے ایک ہی دُھن تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے زخمی مجاہدوں کی مدد کے لیے ان تک پہنچ جاؤں یا اسی کوشش میں اپنی جان قربان کر دوں۔ ایک ترک افسر ڈاکٹر اسماعیل شناقی نے اس جنگ کے چشم دید حالات لکھے ہیں ان میں وہ اس ننھی مجاہدہ کے بارے میں لکھتا ہے:-

”میں نے سب سے پہلے کمسن فاطمہ کو اس وقت دیکھا جب میں اپنے فوجی دستے کے ساتھ عزیزیہ سے زوارہ پہنچا۔ یوں تو فوج میں بہت سی خواتین اور لڑکیاں تھیں کیونکہ بیشتر عرب مجاہدین اپنے اہلِ خاندان کو بھی ساتھ لائے تھے لیکن فاطمہ ان میں منفرد نظر آتی تھی ایک تو اس لیے کہ وہ بہت کم عمر تھی اور دوسرے

اس لیے کہ خوف یا ڈر اس کو چھُو کر بھی نہ گیا تھا، توپیں گولے اگل رہی ہوں، گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو یا تلواروں اور سنگینوں سے دست بدست لڑائی ہو رہی ہو، غرض کیسا ہی خطرناک موقع ہو فاطمہ اپنے مشکیزے سمیت وہاں پہنچ جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ شوق اس کی چھوٹی سی عمر سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ بارود کے دھوئیں سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ توپوں کی گڑگڑاہٹ سے زمین ہل رہی تھی۔ گولوں کے پھٹنے سے بار بار چمک پیدا ہوتی اس کے ساتھ ہی زخمیوں کی چیخ پکار حشر برپا کر دیتی۔ اس ہولناک موقع پر وہ ننھی مجاہدہ اپنا اونچا کرتا پہنے اور پھٹی ہوئی چادر کمر کے گرد لپیٹے بے بس اور مجبور زخمیوں کی مدد کے لیے دوڑتی پھرتی تھی، جیسے خدا نے آسمان سے کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔ فاطمہ کو اپنے گرد و پیش کا جیسے علم ہی نہ تھا اور ایک ہی لگن تھی کہ زخمیوں تک پانی پہنچاؤ۔ کچھ دیر بعد ننھی فاطمہ میرے قریب سے گزری، میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا، ننھی کیا تجھے معلوم نہیں کہ تو اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہے۔ فاطمہ نے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ اسلام اور وطن کے کتنے جاں نثار پانی نہ ملنے کے باعث جاں بلب ہیں اور شاید تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے ابا جان اور امی جان بھی اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کر چکے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بازو چھڑا لیا اور تیزی سے دھوئیں میں غائب ہو گئی۔ ننھی فاطمہ کہا کرتی تھی کہ مجھے سرخ رنگ بہت

پسند ہے۔ آہ یہی رنگ میں نے ایک دن اس کی گردن کے نیچے
بہتا ہوا دیکھا۔"

اثنائے جنگ میں ایک دن بارہ ہزار سے زیادہ اطالوی فوج نے مسلمانوں پر بھرپور حملہ کردیا۔ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے بھی کم تھی لیکن انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دشمن کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے بعد دشمن نے ہولناک گولہ باری شروع کردی۔ ننھی فاطمہ برستے گولوں میں زخمیوں کو پانی پلاتی پھرتی تھی۔ عصر کے وقت عربوں کا ایک دستہ سر بکف دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا۔ ایک ترک افسر احمد نوری بک نے انہیں خطرے میں دیکھا تو کچھ ترک سپاہیوں کو ساتھ لے کر ان کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور لڑتا بھڑتا دشمن کے مشرقی توپ خانے تک جا پہنچا۔ وہاں تازہ دم اطالوی فوج نے مجاہدین کو گھیر لیا۔ ترک مجاہدین یہ گھیرا توڑ کر نکل آئے لیکن چار ترک سپاہی شدید زخمی ہو کر زمین پر گر گئے! اطالوی درندے ان بے بس زخمیوں کو اپنی سنگینوں سے بھنبھوڑنے لگے۔ عین اس وقت چشمِ فلک نے ایک عجیب منظر دیکھا، ننھی فاطمہ اپنا مشکیزہ لیے ہوئے وہاں نمودار ہوئی اور مشکیزہ ایک جاں بلب زخمی کے منہ سے لگا دیا۔ دو اطالوی سپاہیوں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ فاطمہ نے تڑپ کر ایک زخمی سپاہی کی پاس پڑی ہوئی تلوار اٹھا کر ایک اطالوی سپاہی کو اس زور سے ماری کہ اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ دوسرے اطالوی سپاہی نے فوراً اس پر گولی چلا دی اور وہ شہید ہو کر فرشِ خاک پر گر گئی۔ یکایک مسلمان دستے یلغار کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور اطالویوں کو بھاگنے پر مجبور کردیا۔ اس وقت مجاہدین نے ایک دل ہلا دینے والا منظر دیکھا ـــــ چار ترک سپاہی سخت زخمی حالت میں زمین پر پڑے ہیں اور ان کے قریب ننھی فاطمہ کی خون آلود نعش اس طرح پڑی ہے کہ اس کا مشکیزہ ایک زخمی ترک کے سینے پر رکھا ہے اور مشکیزے کا ایک کونہ فاطمہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ننھی مجاہدہ گولی کھا کر زمین پر

گرنے کے بعد بھی زخمی ترک کو پانی پلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کے مشکیزے کا منہ زخمی مسلمان کے منہ تک نہ پہنچ سکا اور وہ جنت الفردوس میں پہنچ گئی۔

اے معصوم فاطمہ! اے دخترِ اسلام تجھ پر ہزاروں سلام!
تو نے ایثار و قربانی کی جو درخشندہ مثال قائم کی وہ ابد الآباد تک تیرا نام زندہ رکھے گی۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے شہیدۂ ملت فاطمہ بنتِ عبداللہ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت ادا کیا ہے:۔

فاطمہ بنتِ عبداللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ ۱۹۱۲ء میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی

○

فاطمہ تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حورِ صحرائی تیری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے!
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے!
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے!
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے!

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے
جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے!
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے!

(بانگِ درا)

(ہفت روزہ "چٹان" لاہور شمارہ ۲۱/۶۲)

(شرف القاء جلد دوم)

بی اماں — آبادی بیگم

محترمہ آبادی بیگم جنھوں نے تاریخ میں "بی اماں" کے نام سے شہرت پائی، ایک سچی مومنہ اور نہایت عظیم خاتون تھیں۔ انھوں نے اسلامی حمیت، حُبُّ الوطنی، جرأت، بے خوفی، ایثار و قربانی اور جذبۂ حریت کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ ان کا نام ابدالآباد تک زندہ رکھیں گے۔

بی اماں ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں دین اور وطن کی خاطر بھرپور حصہ لیا اور پھر ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئے۔ (شاید کسی لڑائی میں شہادت پائی) اس وقت بی اماں کی عمر صرف پانچ برس کی تھی، باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے وہ معمولی تعلیم ہی حاصل کر سکیں لیکن دین اور وطن سے گہری محبت کا جذبہ انھیں ورثے میں ملا۔ ان کی شادی دربارِ رامپور کے ایک معزز و مقتدر افسر عبدالعلی خان سے ہوئی۔ ان سے بی اماں کے سات بچے ہوئے چھ لڑکے اور ایک لڑکی۔ اگست ۱۸۸۰ء میں عبدالعلی خان نے بعارضہ ہیضہ وفات پائی اور بی اماں صرف ۲۸ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ انھوں نے یہ جانکاہ صدمہ بڑے حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ ان بچوں میں سے (مولانا) محمد علیؒ[1] اور (مولانا) شوکت علی[2] آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکے۔

---

[1] رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ کو (قائداعظم محمد علی جناحؒ سے پہلے) ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ ایک سچے مسلمان، بے باک صحافی، شعلہ بیان خطیب، اردو کے نغزگو شاعر، تحریکِ آزادی کے نڈر مجاہد اور مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ سر بلندئ اسلام اور آزادئ وطن کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کرنے والے عظیم رہنماؤں میں شمار ہوئے اور "علی برادران" کے نام سے شہرت پائی۔ اگرچہ بی اماں ذاتی طور پر بھی بڑے اونچے کردار کی حامل تھیں لیکن ان کو ملک گیر شہرت اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بہت بڑے علمبردار تھے۔ ان کی قائدانہ صلاحیتوں اور انگریزی زبان وادب پر ان کی بے مثال قدرت کا لوہا انگریز بھی مان گئے تھے۔ زندگی کے خدوخال یہ ہیں:-

۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو رام پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔

۲۰ اگست ۱۸۸۰ء کو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ (والد محترم عبدالعلی خاں نے ہیضہ سے وفات پائی۔)

۱۸۹۰ء میں علی گڑھ اسکول میں داخلہ لیا۔

۱۸۹۴ء میں انٹرنس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے الٰہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال مزید تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

جنوری ۱۹۰۰ء میں انڈین سول سروس کے امتحان میں گھڑسواری میں ناکام ہونے کے بعد وطن واپس آئے۔ والدہ ماجدہ نے اپنے ایک عزیز جناب عظمت اللہ خاں کی صاحبزادی امجدی بیگم سے ان کی شادی کردی۔ شادی کے بعد دوبارہ آکسفورڈ چلے گئے۔

جولائی ۱۹۰۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ امتحان میں کامیابی حاصل کی اور وطن واپس آئے۔

۱۹۰۳ء میں ریاست بڑودہ کی سول سروس میں داخل ہو گئے۔ چند سال بعد اس سے استعفادے دیا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان دونوں فرزندوں کی بدولت ہی حاصل ہوئی۔ بی اماں کسی بڑی جائداد کی مالک نہیں تھیں لیکن انہوں نے اپنے محدود وسائل میں بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ محمدؐ علی اور شوکت علی انٹرنس پاس کر چکے تو ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ بچوں کے چچا نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تو انہوں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

سنہ ۱۹۰۷ء میں "موجودہ بے چینی کے بارے میں کچھ خیالات" کے عنوان سے انگریزی میں مضامین کا ایک سلسلہ کیا جو "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی میں شائع ہوئے۔

دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کے چوتھے اجلاس منعقدہ ناگپور میں نمایاں حصہ لیا اور اردو زبان کی حمایت میں ایک پرجوش تقریر کی۔

جنوری سنہ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے اخبار "کامریڈ" جاری کیا جو ستمبر ۱۹۱۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ دارالحکومت دلی منتقل ہو جانے کے بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں کامریڈ دلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔

فروری سنہ ۱۹۱۳ء میں نقیب "ہمدرد" جاری کیا۔

جون سنہ ۱۹۱۳ء میں اردو روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا۔

ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء مولانا کا مشہور اداریہ "چائس آف ترکس" کامریڈ میں شائع ہوا اور کامریڈ کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

اپریل سنہ ۱۹۱۵ء مولانا محمدؐ علی اور شوکت علی رامپور میں نظر بند کیے گئے۔ وہاں سے مہرولی (دہلی) اور پھر وہاں سے لینڈوڈن (یو پی) میں منتقل کر دیئے گئے۔ چند ماہ لینڈوڈن سے چھندواڑہ جیل (سی پی) میں بھیج دیئے گئے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں کل ہند مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے (نظر بندی ابھی جاری تھی) سنہ ۱۹۱۸ء میں چھندواڑہ سے بیتول جیل منتقل کئے گئے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں انہیں بیتول جیل سے رہا کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ امرتسر گئے اور کانگریس و مسلم لیگ کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے چپکے چپکے اپنا زیور بیچ کر بچوں کی تعلیم جاری رکھی۔ بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بی اماں بچوں کی دینی تعلیم سے غافل ہوگئی تھیں۔ انہوں نے ان کو نہ صرف دینی تعلیم بھی دلائی بلکہ ان کے دلوں میں دین سے گہرا لگاؤ بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مشترکہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں خلافت وفد کے قائد کی حیثیت سے انگلستان گئے۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں انگلستان سے خلافت وفد ناکام واپس آیا اور مولانا نے تحریکِ خلافت کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے حکومت کے خلاف جابجا نہایت پُرجوش تقریریں کیں۔ اسی زمانے میں مولانا اور دوسرے رہنماؤں کی کوششوں سے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ قائم کی گئی۔

ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو مولانا کو مدراس جاتے ہوئے والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا شوکت علی اور پانچ دوسرے لیڈر بھی گرفتار کر لیے گئے، ان سب کو کراچی لا کر ان پر مقدمہ چلایا گیا، اور سب کو دو دو برس کی سزا سنائی گئی۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں مولانا کو کراچی سے بیجاپور جیل میں منتقل کیا گیا۔ اگست سنہ ۱۹۲۳ء میں رہا کر دیے گئے۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء میں دلی سے "کامریڈ" دوبارہ جاری کیا۔ نومبر سنہ ۱۹۲۴ء میں "ہمدرد" دوبارہ جاری کیا۔

جون سنہ ۱۹۲۶ء میں کامریڈ اور مئی سنہ ۱۹۲۸ء میں ہمدرد بند ہوگیا اور ساتھ ہی مولانا کی صحافتی زندگی بھی ختم ہوگئی۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں مسلمان رہنماؤں کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور "دلی قرارداد" پاس کرنے میں حصہ لیا۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں علاج کے لیے انگلستان گئے اور دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں وہاں سے واپس آگئے۔

مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں برما کا مختصر دورہ کیا۔ نومبر سنہ ۱۹۲۹ء میں کانپور میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیدا کیا۔ وہ خود بھی نماز روزے کی پابند تھیں اور اپنی اولاد سے بھی اس کی پابندی کراتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کی کڑی نگرانی کرتی تھیں۔ کسی بچے کی مجال نہ تھی کہ ماں کا حکم ٹال دے۔ بڑے ہو کر بھی وہ ہمیشہ ماں کے اطاعت گزار

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کی صدارت کی۔ چونکہ جمعیۃ نے شاردا ایکٹ کی حمایت کی اس لیے مولانا اس سے الگ ہو گئے اور "موتمر اسلامی" کے نام سے ایک نئی انجمن قائم کی۔

جون ۱۹۳۰ء میں مولانا شدید بیمار ہو گئے اور شملہ کے برٹش ہسپتال میں داخل ہوئے۔ اسی مہینے میں انہیں گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے وائسرے کا دعوت نامہ ملا جسے انہوں نے علیل ہونے کے باوجود منظور کر لیا۔

وسط نومبر ۱۹۳۰ء میں مولانا بحری جہاز کے ذریعے لندن روانہ ہوئے۔ سفر میں تقریباً ایک مہینہ لگا۔ راستے میں طبیعت اور بگڑ گئی۔ ذیابیطس اور خون کے دباؤ کے مریض تھے سخت محنت کی وجہ سے ایک آنکھ بھی ناکارہ ہو چکی تھی اور ڈاکٹروں نے سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہونے کا مشورہ دیا تھا لیکن آزادی کی لگن انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ کچھ دن پیرس میں علاج کرایا پھر لندن پہنچ گئے۔

۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا نے گول میز کانفرنس میں زبردست تقریر کی اور اعلان کیا کہ یا تو ہندوستان کی آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں گا یا یہیں مر جاؤں گا، اس طرح کم از کم ایک غلام ملک میں تو مرنے سے بچ جاؤں گا۔

۱۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مولانا بے ہوش ہو گئے اور ۲۴ گھنٹے سے زیادہ یہ کیفیت رہی۔ علاج سے ہوش میں آ گئے۔

یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم انگلستان کے نام ایک طویل خط لکھا۔

۳ جنوری ۱۹۳۱ء کی رات کو جسم کے دائیں جانب دماغی جریانِ خون کے باعث فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء اتوار صبح ساڑھے نو بجے پیکِ اجل کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رہے۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں بی اماں نے مولانا محمد علی کو مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا۔ وہاں سے واپس آکر انھوں نے اور بڑے بھائی شوکت علیؒ نے کچھ عرصہ ریاست بڑودہ کی ملازمت کی اس کے بعد جب دونوں بھائیوں نے ملکی سیاست

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ سارے عالمِ اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لاش بیت المقدس لے جاکر دفن کی گئی۔ اس موقع پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

یک نفس جانِ نزار او تپید اندر فرنگ — تا شرر بر ہم زنیم از ماہ و پرویں در گزشت
اے خوشا مشتِ غبار او کہ در جذبِ حرم — از کنارِ اندلس واز ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت — سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

مولانا محمد علی شاعری میں جوہر تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ زیادہ تر میر تقی میرؔ، غالبؔ اور امیر مینائیؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کے مسائل، فلسفے کے دقائق، عشق کی سرمستیاں، غم واندوہ کی کلفتیں، مسرتوں کی لذتیں اخلاق کے سبق وغیرہ ہر چیز موجود ہے۔ اس میں صنائع وبدائع بھی ہیں۔ زبان میں سادگی سلاست اور بے ساختگی کے ساتھ لطافت وحلاوت بھی ہے۔ ان کے بیشتر اشعار جذبۂ ملی کے عکاس ہیں اور ان میں اسلامی عقائد نظریات اور اصول کی ترجمانی کی گئی ہے ان کے بعض اشعار سہلِ ممتنع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا دیوان سنہ ۱۹۵۰ء میں "گنجینۂ جوہر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دشمنوں سے تلطف ہے تو کچھ — دوستوں سے بھی مدارا چاہیے

قیدِ تنہائی کا لذت آشنا — کیسے کہہ دوں تارکِ لذات ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا تو بی اماں کی دعائیں بھی ان کے شاملِ حال رہیں۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد برطانوی سامراج نے خلافتِ عثمانیہ ترکی کو اپنی ہوسِ ملک گیری کا نشانہ بنایا اور اندرونی و بیرونی سازشوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ڈر نہیں مجھ کو گناہوں کی گراں باری کا — تیری رحمت ہے سبب میری سبکساری کا

دَورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر — ہو انتخاب اے نگہِ یار دیکھ کر

جب اپنی جوانی پہ آ گئی دنیا — تو زندگی کے لیے آخری نظام آیا

ہے سُنّتِ اربابِ وفا صبر و توکل — چھُوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور — جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دُور

ہے مسلماں کی بس یہی پہچان — کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بُلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ذریعے "خلافت" کا خاتمہ کر دیا تو ہندوستان کے مسلمانوں میں غم اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ترکی جنگ میں شدید نقصان اٹھا چکا تھا۔ ہندی مسلمانوں نے طبی مشن، دواؤں اور روپے کی صورت میں ان کی مقدور بھر امداد کی اور خلافت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

ل؎ مولانا شوکت علیؒ، مولانا محمد علیؒ کے بڑے بھائی تھے۔ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے گریجویٹ اور کرکٹ کے نہایت اچھے کھلاڑی تھے۔ ایک عرصے تک مذکورہ کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہے۔ بڑے جسیم شحیم، گرانڈیل اور دیو قامت آدمی تھے۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد محکمہ افیون میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہو گئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کا چرچا ہوا تو لمبی چھٹی لے کر سر آغا خاں کے پرائیوٹ سیکرٹری بن گئے اور ہندوستان بھر میں دورے کرتے رہے۔ پھر قومی یا ملی کام کرنے کے لیے پنشن لے لی اور چھوٹے بھائی کے دست و بازو بن گئے۔ ان کو علم و فضل میں مولانا محمد علی سے کوئی نسبت نہ تھی بلکہ فی الحقیقت وہ نہ عالم تھے اور نہ مقرر — مگر راہِ حق کے جانباز مجاہد تھے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "وہ کسی حال میں نا امید نہ ہوتے تھے۔ ان کی تقریر چند فقروں کی ہوتی تھی مگر وہ فقرے لوگوں میں روح پھونک دیتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو کبھی کبھی نا امید نہ ہونے دیتے تھے۔" مولانا محمد علیؒ سے سات آٹھ برس بڑے تھے اور ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ سیاست میں آنے کے بعد تو دونوں بھائی "یک جان دو قالب" ہو گئے۔ سفر ہو یا حضر، قید خانہ ہو یا گھر وہ ساتھ ساتھ ہی ہوتے تھے۔ اسی لیے یہ دونوں "علی برادران" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے حالانکہ ان کے اور بھائی بھی تھے۔ قابلیت اور علم و فضل کے اعتبار سے بلا شبہ مولانا محمد علی کو ان پر فوقیت حاصل تھی لیکن خدا پرستی، غیرتِ دینی، حمیتِ اسلامی، روحِ ایثار اور بہادری و بے باکی کی خوبیاں دونوں بھائیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر موجود تھیں۔ ملی کاموں کے لیے چندہ مانگنے میں مولانا شوکت علی کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی بحالی کے لیے زبردست تحریک چلائی۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے بی اماں کے ساتھ مل کر ملک کے طول و عرض میں وسیع دورے کیے اور مسلمانوں کی غیرت کو جھنجھوڑا۔ وسط ستمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علیؒ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

یدِ طولیٰ حاصل تھا جس سے چندہ مانگا اس سے کچھ نکلوا کے ہی دم لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں وہ بھی مولانا محمد علیؒ کے ساتھ چار سال نظر بند رہے۔ مشہور مقدمۂ کراچی میں بھی انھوں نے دو برس کی سزا پائی۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی کے ساتھ انگلستان گئے۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی فوت ہوئے تو ان کی لاش کو بیت المقدس لے جا کر دفن کیا۔ وطن واپس آ کر پھر خلافت کے کام میں جٹ گئے اور بمبئی سے "خلافت" نام کا ایک اخبار بھی نکالتے رہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کا غلغلہ بلند ہوا تو وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے نہایت پُرجوش اور جاں نثار معاون ثابت ہوئے۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ قائدِ اعظمؒ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کے کام کو بہت سراہتے تھے۔

۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء کو دلی میں وفات پائی۔ ان کے انتقال پر قائدِ اعظمؒ فرطِ جذبات سے کئی گھنٹے روتے رہے اور بڑے درد سے فرمایا:

"میرا وہ رہنما جس کی دلپذیر شخصیت پر مجھے ناز رہا افسوس وہ آج چل بسا۔ وہ پوری سنجیدگی اور خلوص سے ہماری جماعت میں شامل ہوئے اور بلاشبہ وہ ایک دلیر اور بہادر انسان تھے۔"

مولاناؒ کی تدفین کے وقت قائدِ اعظمؒ جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر دو تین گھنٹے دھوپ میں بیٹھے رہے اور انھیں دفن کرنے کے بعد ہی وہاں سے رخصت ہوئے۔

(معاصرین۔ یادِ رفتگاں۔ ہمدرد صحت ڈائجسٹ کراچی دسمبر ۱۹۶۹ء۔ معارف اعظم گڑھ شمارہ ...)

اور کچھ دوسرے مسلمان رہنماؤں کو حکومت نے گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا۔ اس مقدمے کی سماعت کراچی کے خالق دینا ہال میں ۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو شروع ہوئی اور یکم اکتوبر ۱۹۲۱ء تک جاری رہی۔ اسی زمانے میں کسی صاحب دل نے "صدائے خاتون" کے نام سے ایک نظم لکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی۔ فنی لحاظ سے اس نظم میں کچھ اسقام ہیں لیکن اس نے ملک بھر میں جو مقبولیت حاصل کی اس کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ یہ پوری نظم نایاب تو نہیں لیکن کمیاب ضرور ہے اس لیے ہم اسے یہاں درج کرتے ہیں۔

صدائے خاتون

(۱)

بولیں اماں محمدؐ علی کی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۲)

ہو تمہیں میرے گھر کا اُجالا | تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلیٰ | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۳)

اے مرے لاڈلو، اے میرے پیارو | اے مرے چاند اے میرے تارو
میرے دل اور جگر کے سہارو | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۴)

صبر سے جیل خانے میں رہنا[1] | جو مصیبت پڑے اس کو سہنا
کیجیو اپنی اماں کا کہنا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۵)

---

[1] بعض نے یہ مصرعہ اس طرح لکھا ہے:۔ جیل خانے میں خوش ہو کے رہنا

۵

ہتھکڑی تو ہے مردوں کا گہنا | جانگیہ تم نے کمبل کا پہنا
آدھی ٹانگوں سے بالکل برہنہ | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۶

بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا | کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورا اس امتحان میں اترنا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۷

گر ذرا سست دیکھوں گی تم کو | دودھ ہرگز نہ بخشوں گی تم کو
میں دلا ورنہ سمجھوں گی تم کو | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۸

میرے بچوں کو مجھ سے چھڑایا | دل حکومت نے میرا دکھایا
اس بڑھاپے میں مجھ کو ستایا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۹

میرے بچوں کو پکڑا سفر میں | کس طرح چین ہو مجھ کو گھر میں؟
خاک دنیا ہے میری نظر میں | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۱۰

اب مری حق سے فریاد ہوگی | غیب سے میری امداد ہوگی
میری محنت نہ برباد ہوگی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۱۱

ہوتے میرے اگر سات بیٹے | کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دینِ احمدؐ کے رستے | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۱۲

کاٹے پانی خوشی ہو کے جانا | سجدۂ شکر میں سر جھکانا
میں پڑھوں گی خدا کا دوگانا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۳)

پھانسی آئے اگر تم کو جانی | مانگنا مت حکومت سے پانی
بات رکھ لیجیو خاندانی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۴)

حشر میں حشر برپا کروں گی | پیشِ حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۵)

دین و دنیا میں پاؤ گے عزت | سب کہیں گے شہید خلافت
اے محمدؐ علی اور شوکت | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۶)

آج اسلام نرغہ میں آیا | ظلم کفّار نے مل کے ڈھایا
چین یاسینؔ ہم نے نہ پایا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

---

۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ان کے پانچوں ساتھیوں (مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا نثار احمد کانپوریؒ، مولانا غلام مجدد سرہندیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو مرحوم اور سوامی شنکر اچاریہ) کو دو دو سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ اسی زمانے میں یٰسین نام یا تخلص کے انہی صاحب نے جنھوں نے "صدائے خاتون" لکھی تھی ایک اور دردناک نظم "صدائے مظلوم" کے عنوان سے لکھی۔ یہ نظم بھی عوام میں بے حد مقبول ہوئی اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ [لہ]

[لہ] نظم "صدائے مظلوم" یہ تھی:

(۱)

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی | ہم تو جلتے ہیں دو دو برس کو
آبروئے حق کے رستے میں دے دی | ہم تو جلتے ہیں دو دو برس کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بی اماں نے اپنے پیارے فرزندوں کی قید کا زمانہ بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔ ایک دفعہ یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مولانا محمدؔ علی (بعض دیگر لوگوں کی طرح) معافی مانگ کر جیل سے رہا ہو جائیں گے۔ بی اماں نے یہ خبر سُنی تو غضبناک ہو گئیں اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لو، سزا بے گناہوں نے پائی! | آج ہوتی ہے تم سے جدائی!
سارے ہندو مسلمان بھائی | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۳)

قید سے ہم جو جیتے بچیں گے | بھائیو تم سے پھر آملیں گے
صبر سے شکر سے ہم رہیں گے | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۴)

تم ہمیں یاد کر کے نہ رونا! | آنسوؤں سے نہ دامن بھگونا
مل کے سوراج کا بیج بونا! | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۵)

کام مل کر خلافت کا کرنا! | جُز خدا کے کسی سے نہ ڈرنا!
حق کے رستے پہ کچھ کر گزرنا! | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۶)

جرم ہم نے بس اتنا کیا تھا | دینِ احمدؐ کا فتویٰ دیا تھا
کیا حکومت کا اس میں بُرا تھا | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۷)

بات قرآن کی جب بتائی | یہ سزا اس کے بدلے میں پائی
مل کے سب دو خدا کی دہائی | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

( )

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بولیں: "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ محمدؐ علی اسلام کا سپوت ہے وہ انگریزوں سے معافی مانگنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اس نے یہ حرکت کی تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۹)

بات ہم نے کہی تھی جو سچی | اس کے بدلے میں پیسیں گے چکی
کس کی تقدیر ہے ہم سے اچھی | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۹)

ہائے سچی شریعت کے عالم! | ہائے دینِ محمدؐ کے خادم!!
دشمنوں کے بنے آج مجرم | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۰)

ہیں مسلمان سب جان کھوتے | آسماں پر فرشتے ہیں روتے
صبر کرلیں بڑے اور چھوٹے | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۱)

کچھ نہیں بال بچوں کا غم ہے | پر خلافت کا ہم کو اَلَم ہے
بس اسی واسطے چشم نم ہے | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۲)

بے خطا تھے سزا پا رہے ہیں | بے گنہ قید میں جا رہے ہیں
ہم کو اغیار کلپا رہے ہیں | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۳)

دینِ حق کی حمایت کی خاطر | اور پیاری خلافت کی خاطر
اس نبیؐ کی امانت کی خاطر | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۴)

تم کو محلوں میں رہنا مبارک | بسترا اور بچھونا مبارک
جیل کا ہم کو کونا مبارک | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(بقیہ حاشیہ آئندہ)

میرے بوڑھے ہاتھوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔
ایسی زندگی جس سے اسلام پر حرف آئے، لعنت ہے۔"
بی اماں اپنے لباس کے لیے خود سوت کاتا کرتی تھیں۔ ان کا لباس

---

(۱۵)

عیش دنیا کے تم کو مبارک	خوان سب نعمتوں کے مبارک
ہم کو فاقہ پہ فاقہ مبارک	ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۶)

تم کو تنزیب لٹھے مبارک	تم کو ریشم کے کپڑے مبارک
ہم کو کمبل کے ٹکڑے مبارک	ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۷)

ہتھکڑی تو ہے مردوں کا گہنا	جانگیہ ہم نے کمبل کا پہنا
آدھی ٹانگیں ہیں ننگی برہنہ	ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۸)

ہے سلام آخری یہ ہمارا	کر دیا سب پہ تم آشکارا
قید میں ہم کریں گے گزارا	ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

ایک فاضل بزرگ کنور اعظم علی خان خسروی نے "العلم" کراچی کے شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۸۲ء میں لکھا ہے کہ:

"یہ دونوں نظمیں (خاص طور پر صدائے خاتون) اس زمانے میں اتنی مقبول تھیں کہ دور افتادہ دیہات کی ناخواندہ عورتوں تک جنہیں سیاسی تو کیا سماجی شعور تک نہ تھا انہیں لکھ لکھ کر یا حفظ کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور اس مقصد میں تعاون کے لیے ان کے مرد شہروں سے اپنے خطوط میں یہ منظومات لکھ کر یا لکھوا کر انہیں بھیجا کرتے...... میں نے خود یو پی کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے دیہات کی ہندو اور مسلمان اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کی عورتوں کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لمبے کرتے، چوڑی دار پاجامے اور ایک دوپٹے پر مشتمل ہوتا تھا۔ بوڑھی اور کمزور ہونے کے باوجود وہ شہر شہر جاکر تقریریں کرتیں۔ ان کی تقریروں کا موضوع صرف اسلام اور آزادی ہوتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتیں:

"دنیا کے تمام مسلمان مجھے ایسے ہی عزیز ہیں جیسے محمدؐ علی اور شوکت علی۔"

۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں حکیم اجمل خان ؒ کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ بی اماں نے اس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"بیٹو! میں نے برقع اتار دیا ہے اس لیے کہ اس ملک میں اب کسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یہ نظمیں (خصوصاً صدائے خاتون) تقریبات میں اور ویسے عام طور پر بھی بطور گیت کے ڈھولک پر گاتے سنا تھا۔"

* صدائے مظلوم" کے چھٹے اور آٹھویں بندوں میں جو تلمیحات ہیں جناب خسروی نے ان کی توضیح اس طرح کی ہے:

"۸ تا ۱۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کراچی کی بندر روڈ عیدگاہ میدان میں منعقدہ کل ہند خلافت کانفرنس کے عوامی اجتماع میں ۹/۲۱ کو پورے ہندوستان کے کم و بیش پانچ سو مقتدر علمائے دین کے اس متفقہ فتوے کا اعلان کیا گیا کہ چونکہ انگریز آج کل ترکوں سے برسرِ پیکار ہیں لہٰذا انگریزی فوج میں ملازمت یا اس جنگ کے سلسلے میں انگریزوں کے ساتھ دامے درمے قدمے سخنے کسی بھی نوع کا انفرادی یا اجتماعی تعاون از روئے قرآن و سنّت و اجماع و قیاس خلافِ اسلام ہے اور پھر ۹/۲۱ کو مولانا جوہر نے اپنے اختتامی خطبۂ صدارت میں انتہائی پُر زور و مؤثر انداز میں اس متفقہ فتوے پر عمل کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو دعوت دی تھی۔ اسی خطبۂ صدارت پر مولانا اور ان کے رفیقوں کے خلاف مسلمان فوجیوں میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر اس مقدمہ کا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا اور دورانِ مقدمہ میں مولانا نے استغاثہ کے جواب میں وہ معرکہ آرا مدلل اور مسکت تقریر کی جس میں اپنے موقف پر شدومد سے اصرار کرتے ہوئے اس سرکاری الزام کی توثیق کی تھی۔"

کی آبرو باقی نہیں رہی۔ میں نے ۱۸۵۷ء میں اپنے جھنڈے کو لال قلعہ سے اترتے دیکھا۔ اب میری تمنا ہے کہ بدیسی جھنڈے کو لال قلعے سے اترتے دیکھوں۔"

بی اماں نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ سفر ہو یا حضر پنجگانہ نمازوں کے علاوہ تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے پڑھتیں۔ دینی کتابیں اور اخبارات دوسروں سے پڑھوا کر سنا کرتی تھیں۔

۱۱ مارچ ۱۹۲۴ء کو بی اماں کو اپنی پیاری پوتی آمنہ بنت مولانا محمد علی کی موت کا صدمہ جھیلنا پڑا۔ اس کے چند ماہ بعد ۱۲ اور ۱۳ نومبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی شب کو ۲ بج کر ۱۰ منٹ پر وہ خود بھی خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں ——

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

(سیرۃ محمد علی۔ العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۸۴ء و اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء
پہچان کراچی جنوری ۱۹۸۶ء۔ مسلمان خواتین کی دینی و علمی خدمات)

صاحبزادی احمدی بیگم

والیٔ میسور سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء) کے بعد ان کے خاندان کو انگریزوں نے کلکتہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد مرزا نقی علی تھے جو سلطان ٹیپو شہید کے پوتے تھے۔ صاحبزادی احمدی بیگم انہی مرزا نقی علی کی بیٹی تھیں۔ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی اس کے ساتھ ہی تعلیم و تربیت کا ایسا اہتمام کیا گیا کہ وہ ایک سچی مسلمان بنیں اور مشرقی اقدار پر کاربند رہیں۔ چنانچہ وہ نہایت اعلیٰ اخلاق و کردار کی مالک بنیں۔ ان کی شادی بنگال کے مشہور سہروردی خاندان میں ہوئی۔ خاوند کا نام (علامہ سر) عبداللہ المامون سہروردی تھا۔

صاحبزادی کے میکے میں سارا کام کاج ملازم کرتے تھے اور اہلِ خانہ تنکا بھی نہیں توڑتے تھے لیکن سسرال میں بالکل مختلف ماحول تھا۔ ملازم تو یہاں بھی تھے لیکن خانہ داری کا بیشتر کام خواتین کو خود کرنا پڑتا تھا۔ صاحبزادی صاحبہ نے خوش دلی کے ساتھ اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال لیا اور گھر کا کام کاج خود انجام دینے لگیں۔ وہ بڑی دیندار اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ ان کے شوہر (سر عبداللہ المامون) ان کو اپنے ساتھ انگلستان لے گئے۔ جب تک وہاں مقیم رہیں کبھی کسی حرام اور مشکوک چیز کو دسترخوان کے قریب نہ آنے دیا اور مسلسل انڈوں اور توس پر گزارہ کرتی رہیں۔ صبر، قناعت اور عزم و ہمت بھی ان کی کتابِ اخلاق کے روشن ابواب تھے۔ پہلے شوہر کا انتقال ہوا پھر والدنے وفات پائی مگر انہوں نے بڑے عزم اور حوصلے سے کام لیا اور زندگی کے معمولات پہلے کی طرح انجام دیتی رہیں۔ ملک تقسیم ہوا اور مملکتِ پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے ڈھاکہ آئیں۔ ان کی سابقہ زندگی شاندار حویلیوں میں گزری تھی لیکن ڈھاکہ میں انہیں صرف دو کمروں کا مکان ملا۔ اسی میں باقی زندگی صبر و شکر کے ساتھ گزار دی۔ کبھی زبان پر شکوہ یا شکایت کا ایک لفظ تک نہ آیا ہمیشہ راضی برضا رہیں۔

(نیک بیبیاں)

بی بی مقبول النّساء بیگم

نامور سیاسی رہنما جناب حسین شہید سہروردی مرحوم کی نانی اور ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ سہروردی کی دادی تھیں ـــ ان کی شادی بحرالعلوم مولانا عبیداللہ العبیدی سہروردی پرنسپل (سپرنٹنڈنٹ) مدرسہ عالیہ ڈھاکہ سے ہوئی۔ وہ اردو اور فارسی کے بلند پایہ مصنف اور نغزگو شاعر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام "دیوانِ عبیدی" کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۸۸۶ء میں چھپا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ ڈھاکہ کے بارے میں ان کا قصیدہ فارسی کی بہترین منظومات میں شمار ہوتا ہے۔

مولانا عبیداللہ العبیدی ۱۸۸۵ء میں اکاون برس کی عمر میں فوت ہوگئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے کئی بچے چھوڑے۔ ان کی پرورش اور تربیت کا سارا بوجھ بی بی مقبول النّساء بیگم پر آن پڑا۔ ان کے دیور نے مرحوم بھائی کی اولاد کی کفالت کرنا چاہی مگر انہوں نے یہ بات منظور نہ کی۔ وہ بڑی عالمہ فاضلہ، خوددار، دانا اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی وسیع حویلی فروخت کردی اور چھوٹے سے مکان میں منتقل ہوگئیں۔ بی بی مقبول النّساء بیگم نے اپنے بچوں کی تعلیم تربیت کس طرح کی، اس کی کیفیت ان کی لائق پوتی بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اس طرح بیان کی ہے: ــــــــ

"اماں اولاد کی سخت نگرانی کرتی تھیں۔ قطعاً کوئی نرمی نہیں برتتی تھیں یہ مجال نہ تھی کہ کوئی بچہ غروبِ آفتاب سے قبل گھر نہ آجائے۔ شام کو بچوں کو جمع کرکے وہ تذکرۃ الانبیاء اور دوسری مذہبی کتابیں سنایا کرتی تھیں۔ جب وہ بڑے ہوجاتے تھے تو ان کو فارسی زبان پڑھاتی تھیں فردوسی کا شاہنامہ پڑھاتی تھیں۔ اسلامی تاریخ کے واقعات سناتی

تھیں۔ صحت زبان کا ان کو بہت خیال تھا۔ بچوں کے شین قاف درست کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھاکہ کے قریب ایک گاؤں میدنی پو میں رہنے والے بچے فصیح اردو بولتے تھے جو کسی طرح لکھنؤ کی زبان سے کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ان کے عادات واخلاق کو بھی سنوارتی تھیں۔ اس تربیت کا اثر یہ تھا کہ جب بڑے ہو کر ان کے بچے مزید تعلیم کے لیے انگلستان گئے تو مجال کیا کہ کسی بچے نے سگریٹ کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اس تربیت کا یہ اثر تھا کہ اولاد اپنی ماں کی عزت اس طرح کرتی تھی جس طرح ایک مخلص مرید اپنے مرشد کی کرتا ہے۔"

(نیک بیبیاں)

صغریٰ بی بی

مولوی عبدالعزیز بہاری مرحوم کی اہلیہ تھیں۔ نہایت صالحہ، مخیر اور علم دوست خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی لاکھوں روپیہ کی جائداد (جس کی مالیت موجودہ زمانے کے لحاظ سے کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے) اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ ماہوار (جس کی مالیت اب ایک کروڑ روپیہ سے بھی زائد ہے) کی مستقل آمدنی مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور رفاہِ عامہ کے دوسرے کاموں کے لیے وقف کر دی۔ یہ کارنامہ قیامت تک ان کا نام زندہ رکھے گا۔ صغریٰ بی بی مدت ہوئی وفات پا چکی ہیں۔

(مشاہیر نسواں)

بی بی خجستہ اختر بانو

بحر العلوم مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی مرحوم کی صاحبزادی اور مشہور سیاسی رہنما جناب حسین شہید سہروردی مرحوم سابق وزیر اعظم پاکستان کی والدہ تھیں ——— خجستہ اختر بانو کی عمر ابھی گیارہ برس کی تھی کہ ان کے والد جو مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے پرنسپل تھے، فوت ہو گئے۔ والدہ مقبول النساء بیگم بڑی حوصلہ مند اور باہمت خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی بہترین تربیت کی اور ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ خجستہ اختر بانو نے کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی زبان میں آنرز کیا اور یونیورسٹی بھر میں اوّل رہیں۔ حکومت نے ان کو پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔ خجستہ اختر بانو کو فارسی کے علاوہ عربی، اردو، بنگالی اور انگریزی زبانوں پر بھی پورا عبور حاصل تھا اور وہ یہ تمام زبانیں روانی سے بول سکتی تھیں۔ اردو کی تو وہ بہت اچھی انشاء پرداز تھیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے "ولادتِ نبویؐ" کے موضوع پر ایک کتاب "کوکب دری" بھی لکھی۔ اگرچہ انہوں نے مشرقی علوم کے ساتھ نہایت اعلیٰ مغربی تعلیم بھی حاصل کی تھی مگر اپنی معاشرت میں وہ قدیم مشرقی تہذیب کی دلدادہ تھیں اور مغربی طرزِ معاشرت سے ان کو قطعاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بڑی دیندار اور منکسر المزاج خاتون تھیں۔ ان کی گفتگو اور سادہ لباس سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ پردہ کی بھی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو کی لیڈی نے ان سے ملاقات کرنی چاہی لیکن انہوں نے وائسرائے ہاؤس میں جانے سے معذرت کر دی۔ چنانچہ لیڈی منٹو نے خود ان کے گھر آ کر ان سے ملاقات کی۔

ایک دفعہ بھوپال کی والیہ نواب شاہجہان بیگم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھوپال کی حکومت میں کوئی بڑا عہدہ قبول کر لیں لیکن بی بی خجستہ اختر بانو نے شکریے کے ساتھ ملازمت کرنے سے معذرت کر دی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی بہت اعلیٰ تعلیم دلائی اور ان کی تربیت نہایت عمدگی سے کی۔
خجستہ اختر بانو کی شادی سر زاہد سہروردی سے ہوئی تھی وہ ایک کامیاب بیرسٹر تھے بعد ازاں اپنی قانونی صلاحیتوں کی بنا پر دورِ شباب ہی میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے اور آخر عمر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ (مشاہیر نسواں - نیک بیبیاں)

بی بی بخیتیہ رح

یہ نیک بی بی مصر کے قصبے مطیعہ کی رہنے والی تھیں۔ بہت عبادت گزار اور مخیر تھیں۔ انہوں بہت مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا، اس لیے حاجیہ بخیتیہ کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ والد کا نام سید محمود تھا جو حضرت علیؓ کی اولاد سے تھے۔
بی بی بخیتیہ رح نے مطیعہ میں ایک نہایت عالی شان مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ بہت سی زمین بھی وقف کی (رجب ۱۳۱۹ھ ہجری)۔ اس وقف کی آمدنی سے نہ صرف مسجد مذکور کا بلکہ اس کے ساتھ ملحق عالیشان دینی مدرسے کا خرچ بھی نکالا جاتا ہے۔ باقی آمدنی سے سیوط کے مدرس علماء کو وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ حاجیہ بخیتیہ نے "انجمن خیریہ اسلامیہ" (مصر) کو بھی ایک بہت بڑی رقم اس مقصد کے لیے عطا کی کہ اسے فقیروں اور حاجتمندوں کے بچوں کی تربیت پر صرف کیا جائے۔ حاجیہ بخیتیہ کے ایسے نیک کاموں کی وجہ سے مصر میں ان کی نہایت تعظیم و توقیر کی جاتی تھی اور اب بھی ان کو بہت اچھے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بی بی بخیتیہ کا سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ساٹھ ستر سال پہلے وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

بدرالنسّاء بیگم

اردو کے نامور محقق، مؤرخ اور ادیب نصیرالدین ہاشمی مرحوم (حیدرآباد۔دکن) کی والدہ تھیں۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۵ء میں مدراس میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق دکن کے ایک مشہور علمی اور دینی گھرانے سے تھا۔ قاضی بدرالدولہ جو دکن میں ایک نامور مبلغ اسلام اور عالم دین گزرے ہیں، بدرالنساء بیگم کے دادا تھے۔ ان کی شادی بھی حیدرآباد (دکن) کے ایک معزز علمی خاندان میں ہوئی۔ نصیرالدین ہاشمی ان کے بطن سے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ بدرالنساء بیگم کے بچے ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے بڑی ہمت اور استقامت سے اس صدمے کو برداشت کیا اور بچوں کی تعلیم و تربیت نہایت عمدگی سے کی۔ وہ بڑی دیندار، عالمہ فاضلہ ذہین اور طباع خاتون تھیں۔ اردو ادب سے خاص شغف تھا۔ کئی کتابیں تصنیف کیں ان میں سے دو کتابیں "ممالکِ اسلامیہ کی سیر" اور "گلزارِ اولیاء" بہت مقبول اور مشہور ہوئیں۔ ان کے شوہر نے خاصی جائداد اپنے پیچھے چھوڑی تھی۔ بدرالنساء بیگم نے اس جائداد کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کیا۔ سارے حساب کتاب کی پڑتال خود کیا کرتی تھیں اور باپردہ ہونے کے باوجود زمینوں کی نگرانی کا کام بھی خود انجام دیتی تھیں۔ اُن کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔ حیدرآباد (دکن) میں ایک وسیع قطعۂ اراضی خرید کر اس میں ایک شاندار باغ لگوایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نمونہ کا باغ تھا۔ جب تک یہ باغ تیار نہ ہو گیا وہ ہر مرحلے پر اس کی ذاتی نگرانی کرتی رہیں[1]

---

[1] تذکرہ "مشاہیرِ نسواں" میں "ثمرات الفنون" کے حوالے سے "بدرالنساء بیگم" نام کی ایک خاتون کے حالات ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔

"حیدرآباد (دکن) کی ایک نیک کردار بیگم ہے۔ اس نے حجاز ریلوے کے لیے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ والدہ کی تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ نصیر الدین ہاشمی اردو کے نامور محقق بنے۔ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب "دکن میں اردو" تصنیف کی۔ سرکار آصفیہ نے اس کتاب کی تالیف کے صلہ میں انہیں ۱۹۲۸ء میں ایک سال کے لیے یورپ بھیجا جہاں انہوں نے دکنی ادبیات سے متعلق مواد فراہم کرنے کے علاوہ وہاں کی اردو کیٹلاگوں کی تصحیح بھی کی اور وہاں سے واپس آکر اپنی مشہور کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" تصنیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے ان دکنی مخطوطات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو انگلستان اور پیرس وغیرہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس میں قدیم دکنی مصنفین کے حالات نمونۂ کلام کے ساتھ اور مختلف نسخوں میں اختلافات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اردو لٹریچر کا کوئی محقق اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہاشمی صاحب نے اور بھی بہت سی بلند پایہ تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

بدر النساء بیگم نے ادبی اور علمی دنیا میں اپنے سعادت مند بیٹے کا عروج دیکھ کر کوئی نصف صدی پہلے وفات پائی۔ نصیر الدین ہاشمی بھی طویل عمر پاکر خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ چکے ہیں۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات۔ مصنفینِ اردو)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ایک معقول چندہ بابِ عالی کو روانہ کیا۔ جس کے صلے میں سلطان نے ایک طلائی تمغہ عنایت فرمایا۔"

یہ متحقق نہیں ہو سکا کہ یہ بدر النساء بیگم، نصیر الدین ہاشمی کی والدہ تھیں یا کوئی اور خاتون تھیں۔

محترمہ محمود بیگم

نواب شرف الدین خاں رئیس دہلی کی صاحبزادی تھیں۔ نواب صاحب موصوف شاہ اکبر ثانی (۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء تا ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء) کے وزیر اعظم نواب زین العابدین کے پوتے تھے اور سر سید احمد خاں کے ماموں زاد بھائی۔ وہ عالم فاضل آدمی تھے اور اہل علم کی بے حد قدر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر اس دور کے ایک جید عالم دین مولانا محمد اسحٰق رامپوری[1] کو مامور فرمایا۔ چنانچہ محمود بیگم نے بھی مولانا محمد اسحٰق سے تعلیم پائی اور جملہ علوم دینی میں طاق ہو گئیں۔ ان کا گھرانا دہلی کے علمی گھرانوں میں ممتاز مقام رکھتا تھا اس لیے ان کو اردو علم و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ محاسنِ اخلاق کے اعتبار سے بھی وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ ان کا اصل نام شاید کچھ اور تھا مگر مولوی محمد عبد الرزاق کانپوری مرحوم (صاحب "البرامکہ" و "نظام الملک طوسی") نے اپنی کتاب "یادِ ایام" میں ان کا ذکر محمود بیگم کے نام سے

---

[1] مولانا محمد اسحٰق بیس سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ حکیم مومن خاں مومنؔ سے ملنے رامپور سے دلی آئے۔ والد تو واپس چلے گئے مگر مولانا گلی حکیم مومن خاں کی مسجد میں مقیم ہو گئے۔ نواب شرف الدین خاں نے ان کی علمی قابلیت کا حال سنا تو انہیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا اور اپنے کتب خانے کا کمرہ ان کو رہنے کے لیے دے دیا۔ مولانا نے ایک طرف تو نواب صاحب کے بچوں اور پوتوں کی تعلیم و تربیت کی اور دوسری طرف اس کتاب خانے سے خوب استفادہ کیا۔ مولانا کو اللہ نے دینی علوم کے علاوہ منطق و فلسفہ اور ریاضی میں بھی درجۂ کمال عطا فرمایا تھا۔ مشہور مؤرخ اور ماہر ریاضی شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی بعض اوقات اپنے بیٹے رضاء اللہ (انجینئر) کو مولانا کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے کہ اس سوال کو مولانا سے حل کرا کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا ہے اس لیے یہاں بھی ان کا ذکر اسی نام سے کیا جا رہا ہے ـــــ ان کی شادی سر سید احمد خاں کے لائق فرزند جسٹس سید محمود سے ہوئی۔ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں ان کے بطن سے سر سید راس مسعود پیدا ہوئے۔ ان کی رسم بسم اللہ اسٹریچی ہال علی گڑھ میں ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ اس کے بعد مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا پہلے بغدادی قاعدہ پڑھایا گیا، "راہِ نجات" سے دینی مسائل حفظ کرائے گئے۔ گلستاں بوستاں پڑھائی گئیں۔ حروف کی تشریح بتائی گئی، ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید کی تعلیم بھی دی جاتی رہی۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لاؤ۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ نے ان کو اپنے مدرسے میں فلسفہ اور منطق پڑھانے کے لیے لگا لیا تھا۔

مولانا محمد اسحٰقؒ بڑے درویش صفت اور خوددار انسان تھے۔ کسی کے گھر پڑھانے نہیں جاتے تھے اور گھر آ کر پڑھنے والوں سے پیسہ نہیں لیتے تھے۔ ملا واحدی دہلویؒ بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۰۴ء میں مولانا نے ایک دوست کی خاطر "تفسیر کبیر" کا ترجمہ لکھانا شروع کیا۔ ۱۹۰۵ء میں امیر حبیب اللہ خاں شاہِ افغانستان ہندوستان تشریف لائے۔ ان دوست نے کہا "تفسیر کا ترجمہ امیر صاحب کے نام معنون کر دیا جائے تو کیسا ہے۔" مولانا ترجمہ لکھواتے لکھواتے رک گئے، فقرہ بھی ادھورا چھوڑا اور فرمایا:

"تفسیر کبیر اور محمدؐ اسحاق دونوں کی تم نے بھلی قدر کی، میاں! یہ کام اب مجھ سے نہ ہو گا۔"

ڈھائی سو صفحے فلسکیپ سائز کے تیار تھے، اسی وقت پھاڑ ڈالے۔

مولانا محمدؐ اسحٰقؒ نے نوے سال کی عمر پائی۔ عمر بھر مجرد رہے۔ جس کمرے میں اوّل روز آ کر بیٹھے تھے اور جس پلنگ پر اوّل شب سوئے تھے اسی کمرے میں اور اسی پلنگ پر وفات پائی۔ (ہمدرد صحت ڈائجسٹ اگست ۱۹۸۱ء)

اس ساری تعلیم کی نگرانی محمود بیگم نے کی۔ سید راس مسعود کی تعلیم و تربیت اور ان کی والدہ کے بارے میں مولوی محمد عبدالرزاق کانپوریؒ "یادِ ایام" میں لکھتے ہیں:

"سید مسعود کا عہدِ طفلی، سر سید احمد خاں، سید مسعود اور محمود بیگم کے سایۂ عاطفت میں گزرا لیکن (ان کی) تعلیم و تربیت میں سید محمود کی والدہ کا حق سب سے فائق ہے۔ یہ وہ دہلوی بی بی ہیں جن کی ذات پر نہ صرف دلی بلکہ ہندوستان کو فخر ہے۔ عورتوں کے لیے جو مخصوص صفات ہیں ان کے علاوہ اردو علم و ادب میں یہ بہت ممتاز ہیں، سر سید کو اردو کے جس کسی لفظ یا محاورے میں شک ہوتا تو وہ اپنی بہو سے دریافت کرتے تھے اور سید مسعود نے یہ خدمت اکثر ادا کی ہے۔ ولایت جانے سے قبل دس سال کی عمر تک محمود بیگم نے اپنے بچہ کا قرآن ختم کرا دیا تھا اور اردو کا بہترین کلام بھی حفظ کرایا تھا۔"

یہ والدہ کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ سر راس مسعود کو عمر بھر دین اور علم و ادب سے گہرا لگاؤ رہا۔ چنانچہ حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور بے شمار دوسرے اربابِ فضل و کمال ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔

محمود بیگم کے شفیق خسر سید احمد خان نے ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں اور شوہر سید محمود نے ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔ ان صدموں کو انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے جھیلا اور سید راس مسعود کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ لائق فرزند نے بھی دنیوی لحاظ سے بڑا عروج حاصل کیا۔ وہ اپنی والدہ کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ افسوس کہ محمود بیگم کا یہ لائق جگر گوشہ ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ (۳۰ر جنوری ۱۹۳۷ء) کو ان کی زندگی ہی میں بمقام بھوپال اس عالم فانی سے عالم بقا کو سدھار گیا۔ محمود بیگم اس وقت علی گڑھ میں تھیں۔ میت انہی کی کوٹھی پر علی گڑھ لے جائی گئی اور پھر سر سید کے پہلو میں سپرد خاک کر دی گئی۔ اس جانکاہ صدمہ نے ضعیف ماں کو مزید کمزور کر دیا اور کچھ مدت کے بعد وہ بھی خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں

سیّدہ نشاط النّساء بیگم (بیگم حسرتؔ موہانی)

سیّدہ نشاط النّساء بیگم، سیّد الاحرار مولانا سیّد فضل الحسن حسرتؔ موہانی[1] کی اہلیہ تھیں۔ والد کا نام سیّد بشیر حسن موہانی (وکیل) تھا جو مولانا حسرتؔ موہانی کے ماموں بھی تھے اور پھوپھا بھی۔ ان کی شادی مولانا حسرتؔ موہانی سے بہ اختلافِ روایت ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء یا ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ مولانا اس زمانے میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ دونوں میاں بیوی ہم حب تھے اور ان کی ازدواجی زندگی تقریباً اڑتیس برسوں پر محیط ہے۔ دونوں عمر بھر ایک دوسرے پر جان چھڑکتے رہے۔ شادی کے بعد عرصہ تک ان کا قیام علی گڑھ میں رہا۔ پھر جب کاروبار کے سلسلے میں مولانا نے کانپور کو اپنا مستقر بنایا تو وہ بھی ان کے ساتھ کانپور چلی گئیں اور وہیں باقی زندگی گزاری۔

سیّدہ نشاط النّساء بیگم کو بچپن میں دینی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی بھی معقول تعلیم دلائی گئی اور وہ ان تینوں زبانوں میں بہت اچھی استعداد

---

[1] سیّد الاحرار رئیس المتغزلین مولانا سیّد فضل الحسن حسرتؔ موہانی مرحوم کا شمار برِّصغیر پاک و ہند کی نہایت قدآور سیاسی اور ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ انگریزی سامراج سے شدید نفرت بلکہ دشمنی ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور بحیثیت سیاستدان وہ ایک نہایت بہادر، بے خوف، بے باک، حق گو اور دیانت دار رہنما تھے۔ بحیثیت ادیب و صحافی وہ ایک سلیقہ مند، محنتی اور شعر و ادب پر بہت گہری نظر رکھنے والے ایڈیٹر تھے۔ بحیثیت شاعر وہ صفِ اوّل کے غزل گو تھے اور بجا طور پر رئیس المتغزلین کے لقب کے مستحق ٹھہرائے گئے تھے۔ بطور انسان وہ اقتصادی امور میں سوشلزم کی طرف رجحان رکھنے کے باوجود (بقول مولانا سیّد سلیمان ندویؒ) "بچپن سے موت تک سچے اور پکے دیندار مسلمان رہے۔ وہ نہ صرف مسلمان تھے بلکہ صوفی مسلمان تھے اور صوفیوں میں بھی وہ صوفی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رکھتی تھیں۔ شادی سے پہلے وہ اپنے قصبے موہان کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد زندگی کے آخری سانس تک اپنے شعلۂ متحرک درویش صفت شوہر کا دکھ اور سکھ تنگی اور آسانی ہر حال میں نہایت خلوص اور ثابت قدمی سے ساتھ دیا۔ اور نہ صرف ان کی سیاسی جد وجہد میں بڑے جوش وخروش سے ان کی شریک کار رہیں بلکہ ان کی علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی ہاتھ بٹاتی رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدہ نشاط النساء بیگم مولانا حسرت موہانی کی زندگی کا جزِ لاینفک بن گئی تھیں اور مولانا کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تھے جن سے بزرگوں کا کوئی مزار اور کوئی عرس اور کوئی قوالی کی مجلس نہ چھوٹتی تھی خصوصاً ردولی کی مجلس۔" (یادِ رفتگاں) سادگی اور سادہ مزاجی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ عمر بھر ملک کے بنے ہوئے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے رہے، غذا میں جو مل جاتا کھا لیتے، گھر کا سودا سلف خود بازار سے خریدتے اور اسے اپنے کندھے پر اٹھا کر لاتے۔ ہمیشہ ریل کے نچلے درجے میں سفر کرتے۔ سامانِ سفر ٹین کے ایک چھوٹے سے بکس اور ایک بستر پر مشتمل ہوتا۔ بکس میں لکڑی کے نہایت معمولی کنگھے، مسواک، اور چند کتابوں کے علاوہ معمولی لٹھے کے دو پاجامے اور گھٹیا قسم کی ململ کے دو کرتے ہوتے۔ بستر ایک بوسیدہ دری، ایک تکیے اور ایک بہت ہی فرسودہ کمبل پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ بستر اور بکس خود ہی اٹھاتے تھے اور کسی دوسرے کو اٹھانے کی زحمت نہ دیتے تھے۔ مولانا تسنیم مینائی (نبیرۂ امیر مینائی) کا بیان ہے کہ "قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے مولانا حیدر آباد (دکن) میں تھے، ایک سہ پہر کو ہم کچھ احباب مفتی عبدالقدیر بدایونیؒ کے ہاں سے واپس ہو رہے تھے کہ مولانا سڑک پر مل گئے۔ کندھے پر آٹے کا تھیلا رکھا تھا، ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل تھی دوسرے میں ترکاری گوشت وغیرہ کی ٹوکری، راقم الحروف نے اور دوسروں نے بہت کوشش کی، اصرار کیا کہ مولانا! کچھ سامان ہم کو دے دیجیے ہم گھر تک پہنچا دیں گے مگر مولانا کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ یہی کہا ہم اپنا سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور ہم کو بازار میں سودا سلف لے کر نکلنے میں کوئی عار نہیں۔"

(ماہنامہ "فاران" کراچی مئی ۱۹۸۹ء)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کسی سوانح نگار کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ان کی باوفا بیگم کے کردار کو نظر انداز کر جائے۔ مولانا کی وفات پر علامہ سید سلیمان ندوی نے رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ میں اپنے جو تاثرات قلمبند کیے ان کے آخر میں لکھا کہ:

"حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفادار، شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہیں ہو سکتا۔ آج سے پینتیس برس پہلے وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

جس زمانے میں مولانا کی عمر پینتالیس برس کے لگ بھگ تھی، مولانا الیاس برنی مرحوم نے ان کی زندگی کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا:۔ "ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں میں مولانا حسرت موہانی کی زبردست شخصیت اپنے غیر معمولی خصوصیات اور جامعیت کی بدولت سب سے الگ نظر آتی ہے۔ صورت شکل لباس دیکھو تو کٹھ ملا۔ عربی فارسی کے علوم میں خاصے مولوی۔ انگریزی اور مغربی علوم کے نامور گریجویٹ اور علیگ، زبان اردو کے مسلم الثبوت ادیب۔ شاعری میں مومن بلکہ غالب کے جانشین۔ اخلاق و عادات کی سادگی اور طبیعت کی بے نیازی دیکھو تو سچے فقیر۔ حبِّ دین اور جذبۂ ایمانی دیکھو تو پکے صاحبِ دل۔ معاش کے معاملہ میں چھوٹے سے تاجر اور اپنی سیاسیات کے اعتبار سے لیڈروں کے لیڈر۔ ان کی آواز سنو تو بچوں کی سی نرم۔ بات سمجھو تو شعلہ جیسی گرم۔ عزم و ارادہ کی استقامت و استقلال میں اپنی آپ نظیر اور ملک و ملت کی خاطر آبرو لٹانے اور جان لڑانے میں سب سے پیش پیش۔ مولانا حسرت کی زندگی کا کوئی دور اور کوئی پہلو بھی دیکھو، سر سے پیر تک ان کی رگ رگ میں صداقت اور خلوص بھرا ہوا ہے اور ان کی شخصیت استقامت کا پہاڑ معلوم ہوتی ہے اور یہ بات بڑوں بڑوں میں بھی کمتر نظر آتی ہے۔ مولانا حسرت کی تمام زندگی اکبر مرحوم کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے:۔

مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں | ناز کیا اس پہ کہ بدلا ہے زمانے نے تمہیں

(جذباتِ فطرت)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تھیں اور کسی کی پروا نہیں کرتی تھیں۔ شوہر کی ہر قید و بند کے بعد جب کوئی ان کا مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا، ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلہ کی نکل سکے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔" (یادِ رفتگاں ص ۲۹۵)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

مولانا سید فضل الحسن حسرت یوپی (بھارت) کے ضلع اناؤ کے مردم خیز قصبے موہان میں بہ اختلافِ روایت ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء یا ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق نیشاپوری سادات کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ والد کا نام سید اظہر حسن بن سید مہر الحسن بن سید مظہر حسن اور والدہ کا نام سیدہ شہر بانو بنت سید نیاز حسن تھا۔ قرآن پاک، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم موہان ہی میں حاصل کی، اس کے بعد موہان کے مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ وہیں سے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں مڈل کا امتحان اس شان سے پاس کیا کہ سارے صوبے میں اوّل آئے اور سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور ہسوہ سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔ فتح پور ہسوہ میں حسرت کو مولانا سید ظہور الاسلام (مرید و خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ) اور مولانا حبیب الدین اور مولانا نور محمد جیسے پاک مشرب و پاک نہاد بزرگوں کا فیضِ صحبت میسر آیا جو ان کی دینی اور ادبی تعلیم و تربیت کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اسی زمانے میں وہ قادری سلسلے میں حضرت شاہ عبد الوہاب فرنگی محلیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ فتح پور ہسوہ سے وہ علی گڑھ کالج میں جا کر داخل ہوئے اور ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں وہاں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کی شادی ہو گئی اور اسی زمانے میں انہوں نے ادبی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۳ء میں "اردوئے معلّٰی" کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا۔ اسی سال انہوں نے کانگریس میں شامل ہو کر سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں بمبئی کے اجلاس کانگریس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۹ء میں اردوئے معلّٰی میں شائع ہونے والے ایک سیاسی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا حسرت کی صاحبزادی نعیمہ بیگم نے اپنی کتاب "حسرت کی کہانی نعیمہ کی زبانی" میں لکھا ہے کہ:

"والدہ مرحومہ نے ہمیشہ مولانا کے دوش بدوش بلکہ ان سے بھی بڑھ کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ مولانا کی پہلی گرفتاری تک تو وہ زیادہ تر امورِ خانہ داری میں دلچسپی لیتی تھیں، لیکن جب انگریزوں نے مولانا پر مظالم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

مضمون کو انگریزوں نے باغیانہ قرار دیا اور مولانا کو گرفتار کر کے دو برس کے لیے جیل بھیج دیا۔ یہ مضمون مولانا کے قلم سے نہیں تھا لیکن انہوں نے مضمون نگار کا نام بتانا گوارا نہ کیا اور اس کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس موقع پر ان کا نہایت قیمتی کتب خانہ اور پریس بھی پولیس نے برباد کر دیا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد وہ پھر میدانِ سیاست میں سرگرم ہو گئے۔ سنہ ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں انہیں پھر گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس قید سے ان کو سنہ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ سنہ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ناگپور گئے اور کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ سنہ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اس میں گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں کی مرضی کے خلاف ہندوستان کی آزادیٔ کامل کا ریزولیوشن پیش کر دیا۔ یہ ریزولیوشن اس اجلاس میں تو منظور نہ ہوا لیکن مولانا کو یہ لازوال شرف حاصل ہو گیا کہ کامل آزادیٔ ہند کا مطالبہ کرنے والے وہ اولین رہنما قرار پائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو کہیں آٹھ سال بعد یہ توفیق نصیب ہوئی کہ ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں لاہور کے اجلاس کانگریس میں یہی ریزولیوشن پیش کریں۔

دوسری قید سے رہائی کے بعد مولانا علی گڑھ سے کانپور منتقل ہو گئے تھے اور ایک سودیشی اسٹور قائم کر کے سودیشی تحریک میں زور شور سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ سنہ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس احمد آباد میں شرکت کے علاوہ مولانا مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے۔ یہ اجلاس بھی احمد آباد میں منعقد ہوئے تھے۔

سنہ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں مولانا کو پھر گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور سنہ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں رہا کیا گیا۔ مولانا سنہ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ ان کا قیمتی کتب خانہ کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا تو وہ اللہ کا نام لے کر میدانِ عمل میں کود پڑیں اور ہمت و استقلال کا وہ مظاہرہ کیا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلی گرفتاری کے وقت ان کی بچی تقریباً ایک سال کی تھی اور سخت علیل تھی وہ گھر میں یکہ و تنہا تھیں لیکن انہوں نے ان پریشانیوں کی مطلق پروا نہیں کی اور مولانا کو نہ صرف جرأت و ہمت کی تلقین کی بلکہ انہیں کبھی اپنی ذاتی الجھنوں سے آگاہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تک کسی نہ کسی شکل میں کانگریس سے وابستہ رہے لیکن پھر وہ اس سے بیزار ہو گئے۔ اس کی وجہ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ یہ تھی کہ حسرتؔ کے خیال میں گاندھی جی چینی فلسفی کی طرح ہر کلام میں دو متضاد پہلو رکھتے تھے اور بیک وقت دونوں کو حق سمجھتے تھے۔ بالآخر مولانا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور اس جدوجہد میں شریک ہو گئے جو مسلم لیگ حصولِ پاکستان کے لیے کر رہی تھی قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہندوستان ہی میں مقیم رہے اور اس کی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے لیے پوری قوت سے آواز بلند کرتے رہے۔ ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۰ء میں اپنے آخری سفرِ حج سے واپس آنے کے بعد ان کی علالت کا آغاز ہو گیا جو شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔ آخر ۶ شعبان ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ان کا وقتِ آخر آن پہنچا، اور انہوں نے اسی دن بعد دوپہر لکھنؤ میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ وہیں اپنے پیر کے پائنتی، علماء فرنگی محل کے تاریخی قبرستان "باغ مولانا انوار" میں دفن ہوئے۔

یہاں ہم نے مولانا کی سیاسی زندگی کی محض چند جھلکیاں پیش کی ہیں، ورنہ اس کا احاطہ کرنے کے لیے ایک مبسوط کتاب درکار ہے۔ مولاناؒ نے اس دور میں برطانوی استعمار کو للکارا جب اس کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر تھا اور اس کے خلاف لب کشائی کرنا گویا ہولناک مصائب و آلام کو دعوت دینا تھا۔ مولاناؒ نے ان مصائب و آلام کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور استخلاصِ وطن کے لیے ہر تحریک میں پیش پیش رہے۔ وہ ایک سچے کھرے اور انتہا پسند انسان تھے مزاج میں فقر و درویشی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی نہیں کیا تاکہ وہ مزید پریشانیوں سے بچے رہیں۔"

جس واقعہ کی طرف محترمہ نعیمہ بیگم نے اشارہ کیا ہے خود مولانا حسرتؔ نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

"گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان میں والدہ نعیمہ اور ایک خادم کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بر بنائے سعادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو مغموم کرنے کی بجائے انہوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تھی اور طبیعت باغیانہ پائی تھی۔ جیل خانوں میں وہ جان بوجھ کر وہاں کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے اور اس کی پاداش میں سخت سے سخت سزائیں بھگتتے۔ وہ کہتے تھے کہ میں جیل میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ یہاں کے نظم و ضبط کو توڑوں اور درہم برہم کروں۔

مولاناؒ کی علمی اور ادبی خدمات بیان کرنے کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ اس موضوع پر ہم مولانا ماہر القادری مرحوم کے یہ الفاظ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

"مولانا حسرتؔ موہانی کی شعر و ادب کی خدمات بے اندازہ ہیں۔ عروض و بیان اور معانی و تنقید پر انہوں نے گراں قدر مضامین لکھے ہیں۔ قدیم اساتذہ کے کلام کے انتخابات شائع کیے ہیں اور اپنی غزلوں سے اردو شاعری کی عزت بڑھائی ہے۔ ہم اللہ کے فضل سے تناسخ کے قائل نہیں ورنہ کہتے کہ حکیم مومن خاں نے زیادہ حسین اور طرحدار ہو کر حسرتؔ موہانی کی شخصیت میں جنم لیا ہے۔ ان کی شاعری سچ مچ تغزل کی جان ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی اردو اور فارسی کے پہلے اور شاید آخری شاعر ہیں جنہوں نے غزل میں سیاسی افکار کی ترجمانی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ تغزل کی سبکی وہی پر یہ ترجمانی گراں نہیں گزرتی۔"

دینی اعتبار سے مولانا بڑے خوش عقیدہ مسلمان تھے۔ مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے جعفرت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کارپردازان جیل بھی متحیر رہ گئے ۔ راقم کا دل بفضلہٖ امرِ حق میں یوں ہی قوی تھا لیکن ان کی یہ تحریر کہ تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو، میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو، تقویتِ مزید کا باعث ہوا ۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں اور آخر وقت تک جرأت وہمت میں ان کے ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ۔"

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

مولانا عبدالوہاب فرنگی محلیؒ سے بیعت تھے ۔ ان کے بعد مولانا کا تعلق ان کے فرزند مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ سے ہوگیا ۔ ان سے باقاعدہ خلافت ملی اور بعض افراد کو مولانا نے باقاعدہ اپنا مرید بنایا ۔ مولانا صوم وصلوٰۃ کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور وظائف واوراد بھی کثرت سے کرتے تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں گیارہ حج کیے اور بارہ مرتبہ مدینہ منورہ میں حاضری دی ۔ اس کے علاوہ وہ بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دینے اور ان کے عرسوں میں شریک ہونے کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے ۔ شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہو جس میں وہ کسی بزرگ کے عرس پر نہ جاتے ہوں ۔

مولاناؒ نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں ۔ پہلی شادی سیدہ نشاط النساء بیگم سے ہوئی ۔ ان کے بطن سے صرف ایک لڑکی نعیمہ بیگم پیدا ہوئیں ۔ پہلی بیگم کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی سنہ ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں محترمہ جلیبہ بیگم سے کی ۔ ان سے بھی صرف ایک لڑکی خالدہ بیگم پیدا ہوئیں ۔

نمونۂ کلام

تاثیرِ برقِ حسن جو ان کے سخن میں تھی | اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

تو نے کی حسرت عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی | اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی (فرزند مولانا عبدالباری صاحبؒ فرنگی محلی) نے بیگم حسرت موہانی کے بارے میں لکھا ہے کہ :۔

"مولانا کے تمام سیرت نگاروں نے تسلیم کیا ہے کہ ان کی سیرت کی تعمیر اور ان کی سیاسی اور ادبی خدمات میں بڑا حصہ مرحومہ بیگم حسرت کا ہے۔ وہ تصوف کے ذوق اور ادبی مذاق دونوں میں مولانا حسرت کی شریک تھیں۔ انہوں نے جس دلیری، بہادری، استقلال اور صبر سے مشکلات کا مقابلہ کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مولانا کی قید کے زمانہ میں ان کے مقدمات کی پیروی، اردوئے معلیٰ کی اشاعت، پریس کا بندوبست، تجارت کی نگرانی، دواوین کی ترتیب و طباعت، سب کام ان محترم خاتون نے انجام دیا۔ وہ حقیقی معنوں میں مولانا کی شریک حیات تھیں۔"

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

رشکِ شاہی ہو نہ کیوں اپنی فقیری حسرتؔ | کب سے کرتے ہیں غلامی شہِ جیلانیؒ کی

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی | اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق | پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

جو بندۂ دُنیا ہیں مبارک انہیں دنیا | میں دین کا پیرو ہوں خدا میرے لیے ہے
ہر حال میں خوش ہوں میں کہ ہر بات میں لازم | پابندیٔ تسلیم و رضا میرے لیے ہے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد | جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا حسرتؔ کی طرح سیّدہ نشاط النساء بیگم بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ممبر تھیں اور سیاسی جلسوں میں مولانا کے ساتھ شریک ہوتی تھیں ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اس میں مولاناؒ کے ساتھ بیگم صاحبہ بھی شریک ہوئیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تو اپنی سادگیٔ حُسن آئینے میں نہ دیکھ | یونہی ہے خوب اسے لاجواب رہنے دے

سب نے چھوڑا تجھے گر حسرتؔ | درد کی غمگساریاں نہ گئیں!!

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے | وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق | بس اب جاؤ تم سے خفا ہوگئے ہم

کثرتِ شوق سے ہیں گویا | حسرتؔ اب کوئی آرزو ہی نہیں

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں | اور بھی شوخ ہوگیا رنگ ترے لباس کا

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں | الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی | مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں!!

تری محفل میں ہم آئے مگر باحالِ زار آئے | تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے | ہوس نے کامِ جاں پایا محبت شرمسار آئی

(سید الاحرار - یادِ رفتگاں - جذباتِ فطرت)

اسی اجلاس میں ترکِ موالات کی قرار داد منظور ہوئی۔ سن ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس مسز سروجنی نیڈو کی صدارت میں کانپور میں منعقد ہوا تو مولانا حسرتؔ اور بیگم حسرتؔ نے مزدوروں اور کسانوں کی قیادت کرتے ہوئے پنڈال میں داخل ہونا چاہا۔ اس موقع پر کانگریسی رضا کاروں کی قیادت پنڈت جواہر لعل نہرو کر رہے تھے۔ انہوں نے رضا کاروں کو ساتھ لے کر کسانوں اور مزدوروں کو پنڈال میں داخل ہونے سے روکا۔ اس کشمکش میں بیس پچیس مزدور زخمی ہو گئے۔ پنڈت نہرو خود ہجوم کو دھکیلتے ہوئے پنڈال کے دروازے تک پہنچے۔ وہاں بیگم حسرتؔ بھی موجود تھیں۔ پنڈت جی نے غیر شعوری طور پر انہیں بھی دھکا دے دیا۔ اس پر بیگم حسرت غضب ناک ہو گئیں اور انہوں نے پنڈت جی کے منہ پر چٹاخ سے تھپڑ جڑ دیا اور بولیں، بے غیرت شرم نہیں آتی مجھے ہاتھ لگاتا ہے! اب پنڈت جی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولے "آپ میری ماں ہیں مجھے اور ماریئے سزا دیجئے۔ بھول ہو گئی ماں مجھے معاف کر دیجئے۔"

بیگم حسرتؔ سادگی، سخت کوشی اور خود داری میں بھی اپنی نظیر آپ تھیں۔ نامور صحافی اور ادیب جناب ضیاء الدین احمد برنی مرحوم کا بیان ہے کہ:

> "بیگم حسرت موہانی کئی اعتبار سے اپنے طبقۂ نسواں میں پیش پیش تھیں انہوں نے پردہ چھوڑا مگر سادگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کے ہاتھوں میں میں نے کبھی زیور نہیں دیکھا۔ وہ چوڑیوں سے بے نیاز تھیں ان کے لباس میں میں نے کبھی بھڑک یا نمود نہیں دیکھی وہ سیدھی سادی خاتون تھیں اور بے پردہ سے اس لیے باہر آئی تھیں کہ ان کے خاوند کی رفاقت اس امر کی متقضی تھی کہ وہ ایسا کریں۔"

مولانا حسرتؔ نے عہد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ سودیشی چیزیں استعمال کریں گے۔ بیگم حسرتؔ نے بھی اس معاملے میں اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور ہمیشہ ہاتھ کے کتے ہوئے سوت کے کپڑے پہنتی رہیں۔ مولانا جب کبھی جیل جاتے تو وہ ان کے رسالے، کتابوں، پریس اور سودیشی اسٹور وغیرہ کا تمام کام خود سنبھال لیتی تھیں۔ مولانا کی غیر حاضری

میں کئی دفعہ ان پر پیغمبری وقت آپڑا لیکن انہوں نے حسرت کا یہ زمانہ بڑی ہمت اور حوصلے سے گزارا۔ وہ اُجرت پر لوگوں کے کپڑے سی کر اور کاغذ کے لفافے بنا کر روزی کما لیتی تھیں لیکن یہ گوارا نہ کرتی تھیں کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ۱۳۴۲-۴۳ھ / ۱۹۲۳-۲۴ء میں مولانا حسرت موہانی پونا جیل میں تھے۔ اسی زمانے میں بیگم حسرت اپنی بیٹی نعیمہ بیگم اور داماد کے ساتھ پونا تشریف لے گئیں۔ اہلِ پونا کو معلوم ہوا کہ وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہیں تو انہوں نے مالی امداد کی پیشکش کی مگر خودداد بیگم حسرت نے یہ پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر دی اور لوگوں سے کہا کہ اگر آپ میرے شوہر کے مداح ہیں تو ان کی کتابیں خرید یئے۔ اس طرح میں آپ سے روپیہ نہیں لوں گی۔ چنانچہ جب تک ان کا پونا میں قیام رہا وہ اپنے کھانے پینے کی خود کفیل رہیں اور کسی سے ایک پیسے کی مدد بھی قبول نہ کی۔ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴-۲۵ء سے سیدہ نشاط النساء بیگم کی صحت خراب رہنے لگی مگر وہ اپنے شوہر کی سرگرمیوں میں برابر ان کا ساتھ دیتی رہیں۔ وہ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء سے ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء تک ہر سال مولانا کے ساتھ حج بیت اللہ سے مشرف ہوتی رہیں۔ آخری سفرِ حج براہ عراق کیا۔ اس سفر کے حالات وہ اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو خطوط کی صورت میں لکھ کر بھیجتی رہیں۔ بعد میں انہوں نے ان خطوط کا مجموعہ سفرِ عراق کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ان کو حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس سفر میں ان کے مزار پر حاضر ہونے کی ان کی دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔ حج کے سفر میں وہ اپنے خرد سال نواسے رضوان الحسن کو بھی ساتھ لے جاتی تھیں۔ آخری سفرِ حج سے واپس آ کر وہ سخت علیل ہو گئیں اور چارپائی سے لگ گئیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرطان (کینسر) ہو گیا تھا جو لاعلاج تھا۔ آخر اسی بیماری سے ۲۵ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ مطابق ۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو وفات پائی۔

مولانا حسرت موہانیؒ نے مرحومہ کی زندگی کے آخری دور اور وفات کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں:۔

"۸ اپریل ۱۹۳۷ء ٹھیک ۱۱ بجے دن کے وقت بیگم حسرت مکروہاتِ دُنیا سے

آزاد ہو کر بہ اطمینانِ تمام واصل بحق ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ سلسلۂ علالت کئی سال سے جاری تھا۔ سال بھر برابر بیمار رہتی تھیں لیکن موسمِ حج کے قریب اس قدر صحت حاصل کر لیتی تھیں کہ حج کے لیے میرے ساتھ جانے میں بظاہر کوئی دشواری نظر نہ آتی تھی، چار سال یہی حال رہا آخری بار یعنی ۱۹۵۳ء میں براہِ عراق سفرِ حج کے وقت البتہ وہ اس قدر کمزور اور بیمار تھیں کہ ان کو ساتھ لے جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر ان کی دل شکنی اور مایوسی کا خیال بھی سوہانِ روح تھا مجبوراً مجھ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ بصرہ تک جہاز اور وہاں سے بغداد تک ریل میں جانا چونکہ نسبتاً آسان ہے اس لیے ان کو وہیں چھوڑ دوں گا اور خود صحرائے عرب کے ۱۲۰۰ میل موٹر میں طے کر کے مدینے اور مدینے سے مکے ہو کر پھر اسی راہ سے واپس آؤں گا اور بغداد سے انھیں ساتھ لے لوں گا۔ اس تجویز کو انہوں نے سنا اور کچھ نہ کہا۔ ساتھ ہو لیں مگر بغداد پہنچ کر اپنے جدِ امجد امام موسیٰ کاظمؑ کے روبرو اپنے اللہ سے دعا کی کہ زیارتِ روضۂ رسولؐ اور حج سے محروم نہ رہوں۔ اس دعا نے تریاقِ مجرب کا کام کیا اور انہوں نے باوجود علالت و نقاہت تمام ارکانِ حج بخوبی ادا کیے اور دوبارہ مدینے اور دوہی بار بغداد، کاظمین، نجف و کربلا میں حاضری دے کر صحیح سلامت واپس کانپور پہنچ گئیں مگر پھر سے کراچی پہنچتے پہنچتے علالت پھر نمودار ہو گئی جس کی روز افزوں تکلیفیں آخر کار ان کی جان ہی لے کر گئیں۔

ریڑھ کی ہڈی میں کچھ خرابی ایسی پیدا ہو گئی تھی جو ڈاکٹروں کی رائے میں لاعلاج ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کے جسم کا نصف حصۂ اسفل کئی ماہ سے بالکل بے حس ہو گیا تھا اور پلنگ پر پڑے پڑے کئی زخم نہایت درجہ تکلیف دہ پیدا ہو گئے تھے۔ پسلیوں میں بھی شدید درد رہنے لگا مگر ان کی زبان سے اس کے سوا کہ "اللہ کی مرضی" اور "اس کی مصلحت کا تقاضا" کسی نے کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ سنا۔ کبھی کبھی البتہ اتنا کہتی تھیں کہ جب بیماری میں تکلیف کی اتنی شدت ہے تو افتراقِ روح کے وقت کیا حال ہو گا۔ مگر انتقال سے ایک روز قبل نمازِ فجر کے اول وقت بحالتِ شدتِ تنفس

ٹوٹے پھوٹے جملوں میں مجھ سے کہا کہ " اب مجھ کو کسی قسم کی تکلیف کا اندیشہ نہیں ہے اس لیے کہ ابھی ابھی حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تشریف لائے تھے تو میں نے دامن تھام لیا اور عرض کیا کہ مجھ کو بھی مدینے ساتھ لے چلیئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں ہم جلد تم کو اپنے پاس بلالیں گے اور تکلیف جانکنی کی نسبت بھی ارشاد ہوا کہ ہم ذمہ دار ہیں تم کو ایسی تکلیف نہ ہوگی چنانچہ اب ہم کو کوئی فکر نہیں ہے۔" الحمدللہ کہ نتیجہ بھی اسی شکل میں ظاہر ہوا کہ میرے سوا کسی کو آخر تک اس کا احساس نہ ہوا کہ ان کا خاتمہ اس درجہ قریب ہے۔ خدا گواہ ہے کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ایثار وانکسار، حیا وغیرت، محبت ومروت، فہم وفراست، جرأت وصداقت، عزم وہمت، وفا وسخا، حسنِ عقیدت، صدقِ نیت خلوصِ عبادت، حسنِ خُلق، صحتِ مذاق، پاکی وپاکیزگی، صبر واستقلال اور سب سے بڑھ کر عشقِ رسولؐ اور محبت حضرتِ حق کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی آج ہندوستان میں کم ایسے افراد موجود ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا ان کی برابر بھی قرار دے سکیں، ان تمام باتوں کی تفصیل ایک جداگانہ تصنیف کی طالب ہے لاریب،

این سعادت بزورِ بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا حسرت موہانیؒ کو اپنی مونس وغمخوار رفیقۂ حیات کی رحلت کا بے پناہ صدمہ ہوا اور انہوں نے اپنے رنج والم کا اظہار کئی غزلوں میں کیا۔ یہ غزلیں فی الحقیقت دلدوز مرثیے ہیں۔ ان میں سے ایک غزل یہ ہے:

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزوئی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کاروانِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوقِ شاعری بار ہے تیرے بغیر

شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہیں با وصفِ عزم
ہر جلسے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا دل تیرے لیے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر
دردِ دل جو تھا کبھی وجہِ مباہات و شرف
بہرِ حسرت موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

مرحومہ بیگم حسرت موہانی بہت خوش عقیدہ مسلمان تھیں۔ وہ حضرت شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی رح کی مرید تھیں۔ جن کا عرس لکھنؤ میں ہر سال ۲۶ صفر کو ہوتا ہے۔ شاہ عبدالوہاب رح نے ۲ محرم کو وفات پائی تھی اس لیے بیگم حسرت ہر سال اسی تاریخ کو خاص اہتمام سے نیاز تیار کیا کرتی تھیں۔ ان کو پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے بھی بے حد عقیدت تھی

مولانا حسرت موہانی کی سیدہ نشاط النساء بیگم سے صرف ایک بیٹی پیدا ہوئیں نعیمہ بیگم۔ ان کی شادی سید عبدالسمیع نصرت موہانی سے ۲۰ شعبان ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۹۲۲ء کو ہوئی۔

بیگم حسرت موہانی خود شاعر نہیں تھیں مگر کمال درجے کی سخن فہم تھیں اور ادب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتی تھیں۔ مولانا حسرت کے کلام، مضامین اور دوسری تصانیف کی تمام تر ترتیب و اشاعت بیگم صاحبہ ہی کی مخلصانہ کوششوں کی مرہونِ منت تھی۔

(حسرت کی کہانی نعیمہ کی زبانی (نعیمہ بیگم)
یادِ رفتگاں (مولانا سید سلیمان ندوی رح)
عظمتِ رفتہ (ضیاء الدین احمد برنی مرحوم)
سید الاحرار (جناب اشتیاق اظہر)

خالدہ ادیب خانم

خالدہ ادیب خانم کا شمار جدید ترکی کی نامور ادبی و سیاسی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ترکی سیاست اور جنگِ آزادی میں حصہ لیا بلکہ علمی اور ادبی میدان میں بھی نہایت وقیع کام کیا۔ فی الحقیقت وہ ایک ایسی جامع کمالات خاتون تھیں جن پر کوئی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

خالدہ ادیب خانم ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء میں استانبول کے محلہ بیشکتاش میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ادیب بے، سلطان عبدالحمید ثانی (۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء تا ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء) کے عہد میں "محکمہ جیب ہمایوں" (خزانۂ شاہی) کے معتمد اعلیٰ (چیف سیکرٹری) تھے۔ خالدہ ابھی کمسن تھیں کہ ان کی والدہ فاطمہ فوت ہو گئیں۔ والد نے دوسری شادی کر لی اس لیے ان کی پرورش زیادہ تر نانی کے گھر میں ہوئی۔ بچپن میں کچھ عرصہ نرسری میں رہیں۔ جب پانچ سال کی ہوئیں تو محلے کے ایک مدرسے میں داخل کرا دیا گیا اور گھر میں بھی استاد کا انتظام کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے قرآن مجید ختم کر لیا۔ سات سال کی عمر میں انہیں امریکی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس زمانے میں اس قسم کی درسگاہوں میں ترک لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے خالدہ کو ایک سال بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا کیونکہ سلطان نے ایک فرمان کے ذریعے پیشگی سرکاری اجازت کے بغیر کسی ترک لڑکی کا امریکی درسگاہوں میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا تاہم خالدہ کے والد نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر سلطان سے بعض قیود و شرائط کے ساتھ خالدہ کے لیے امریکی درسگاہوں میں تعلیم پانے کی اجازت حاصل کر لی چنانچہ خالدہ دوبارہ امریکی اسکول میں داخل ہو گئیں۔ اسکول کی تعلیم ختم ہونے کے بعد انہوں نے امریکی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں اپنی تعلیم مکمل کر

لی ۔اس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی ۔ اس دوران میں انہوں نے انگریزی زبان میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ ایک امریکی مصنف جیکب ایبٹ کی کتاب " دی مدر ان ہر ہوم " (THE MOTHER IN HER HOME) کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔اس وقت ان کی عمر صرف سولہ سال کی تھی ۔اس ترجمے کو سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور خالدہ کو ایک اعزازی نشان مرحمت فرمایا۔

خالدہ کی تعلیم صرف مدرسے اور کالج تک محدود نہ تھی بلکہ گھر پر بعض باصلاحیت اساتذہ سے پڑھانے کا انتظام تھا چنانچہ انہوں نے عربی اور انگریزی کی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ اس زمانے میں مشہور فلسفی رضا توفیق سے انہوں نے فرانسیسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی جس سال انہوں نے کالج کی تعلیم مکمل کی اسی سال ان کی شادی مشہور ریاضی دان صالح زکی سے ہوگئی، جو کالج کی تعلیم کے دوران میں ان کے استاد یا اتالیق تھے ۔ان سے خالدہ کے دو بیٹے آیت اللہ اور حکمت اللہ پیدا ہوئے۔ چند سال تک میاں بیوی کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔اسی زمانے میں خالدہ نے ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کردیا ۔ وہ انقلاب پسند نوجوانوں کی جماعت" انجمن اتحاد و ترقی" کی رکن بن گئیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ابنائے وطن میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ۔انجمن اتحاد و ترقی کی جدوجہد کے نتیجے میں ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں ملک میں دستوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد خالدہ نے نوجوانوں کے نمائندہ قومی اخبار طنین (TANIN) میں باقاعدہ لکھنا شروع کردیا۔ ان کے بعض مقالات کو علماء کے ایک طبقے نے پسند نہ کیا۔

۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں قدامت پسند جماعت "جمعیت محمدیہ" نے انجمن اتحاد و ترقی کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس جماعت کو سلطان عبدالحمید خان کی درپردہ حمایت حاصل تھی ۔ انجمن اتحاد و ترقی کے اراکین کے لیے یہ بڑا خطرناک زمانہ تھا کیونکہ مخالفین نے ان کے بہت سے سرکردہ افراد کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور سلطان کے حکم سے قوم پرستوں کی پکڑ دھکڑ بھی شروع ہوگئی تھی۔ خالدہ نے

اپنی جان کو معرضِ خطر میں دیکھ کر پہلے اسکودار کے سلطان تپہ میں اور پھر امریکی کالج میں پناہ حاصل کی۔ چند دن بعد وہ اپنے بچوں کے ساتھ مصر چلی گئیں اور وہاں سے انگلستان۔ انگلستان سے ترکی واپس آنے کے بعد خالدہ نے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں صالح زکی سے طلاق لے لی کیونکہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس اثنا میں سلطان عبدالحمید خاں معزول کیے جا چکے تھے اور سلطان محمد خامس (۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء تا ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء) ان کے جانشین بنے تھے۔ انھوں نے خالدہ کو بُلا بھیجا جب وہ شاہی دربار میں حاضر ہوئیں تو سلطان نے ان کی جبری غیر حاضری پر افسوس کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنی علمی ادبی اور رفاہی سرگرمیاں بلا کھٹکے جاری رکھ سکتی ہیں۔ اس کے بعد خالدہ نے استانبول میں معلمات کے ایک مدرسے میں پڑھانا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ مختلف رفاہی کام بھی زور شور سے شروع کر دیئے۔ سنہ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں جنگِ بلقان شروع ہو گئی جس میں بلقان کے عیسائی ملکوں نے ایکا کر کے ترکی پر یلغار کر دی سخت نامساعد حالات کے باوجود ترکوں نے زبردست مقابلہ کیا اور بالآخر دشمن کو شکست دے کر اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ اس جنگ کے دوران میں خالدہ ادیب خانم نے "تعالیٔ نسواں" کے نام سے خواتین کی ایک جماعت قائم کی اور اس کے ذریعے مختلف امدادی کاموں میں حصہ لیا۔ جنگِ عظیم اول کے آغاز تک خالدہ نے بے شمار رفاہی کام کیے مثلاً "تعالیٔ نسواں" کے تحت بہت سے شفاخانوں کا قیام، محکمہ اوقاف کے تحت متعدد مدارس کا قیام، خواتین کے اخبارات کی تعداد میں اضافہ وغیرہ ـــــ شام کے گورنر جمال پاشا کو خالدہ کی گرانقدر قومی خدمات کا علم ہوا تو اس نے شام اور لبنان میں تعلیمِ نسواں کا کام خالدہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا (لبنان اس زمانے میں شام ہی کا حصہ تھا) چنانچہ وہ اس کی دعوت پر ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء میں بیروت چلی گئیں۔ وہاں ان کو شام اور لبنان کے زنانہ مدارس کا انسپکٹر جنرل بنا دیا گیا۔

وہ ابھی لبنان ہی میں تھیں کہ ان کے والد نے ان کی خواہش کے مطابق ۷ رجب سنہ ۱۳۳۵ھ (مطابق ۲۹ اپریل سنہ ۱۹۱۷ء) کو ان کا نکاح ثانی

ڈاکٹر عدنان آدیوار[1] سے کر دیا۔ جمادی الآخر ۱۳۳۳ھ (مارچ ۱۹۱۸ء) میں خالدہ لبنان سے استانبول واپس آگئیں۔ یہاں استانبول یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات میں مغربی ادب کی پروفیسری پران کا تقرر ہوگیا۔

جنگِ عظیم اوّل میں ترکی نے جرمنی (محوری طاقتوں) کا ساتھ دیا۔ اتحادیوں کو جنگ میں فتح ہوئی تو ان کی فوجوں نے درہ دانیال سے گزر کر استانبول پر قبضہ کر لیا لیکن اُدھر اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے سیواس کے مقام پر متوازی حکومت قائم کر لی اور اپنے ملک کو اغیار کے تسلط سے نکالنے کے لیے مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ استانبول کے قوم پرست پوشیدہ طور پر ان کے پاس پہنچنے لگے۔ اس طرح سیواس میں ایک قومی اسمبلی کی تشکیل ہوئی جسے بعد میں انقرہ منتقل کر دیا گیا۔ خالدہ نے بھی استانبول میں مارشل لا کے باوجود اپنی شعلہ بار تقریروں سے ترکی کے جذبۂ آزادی کو مہمیز لگائی۔ اس سلسلے میں دو جلسے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک جلسہ سلطان احمد ثانی کی مسجد کے سامنے ہوا۔ اس میں دو لاکھ کے لگ بھگ لوگ شریک ہوئے۔ اس میں خالدہ نے ایک پُرجوش تقریر کی۔ دوسرا جلسہ گھوڑ دوڑ کے وسیع میدان میں ہوا۔ اس میں بھی بے شمار لوگ شریک ہوئے۔ خالدہ نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> "تم سات سو برس تک فاتح قوم رہے ہو، تمہارا قومی پرچم ہمیشہ دوسری قوموں کے جھنڈوں سے اونچا نظر آتا رہا ہے۔ کیا آج تم یہ ذلت برداشت

---

[1] ڈاکٹر عدنان آدیوار کا شمار ترکی کے نامور اربابِ سیاست اور اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء سے ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء تک ترکی جمہوریہ میں وزیر رہے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سے تین بہت اہم ہیں (۱) علم اور دین (۲) عثمانی ترکوں میں علم و حکمت (۳) فاؤسٹ کا تجزیہ و تحلیل۔ وہ ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء سے ۱۳۷۴-۷۵ھ/۱۹۵۵ء تک ترکی زبان کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اسلام انسیکلوپیدیسی) کی مجلسِ ادارت کے صدر بھی رہے۔

ڈاکٹر عدنان آدیوار نے ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۵۵ء کو وفات پائی۔

کروگے کہ اسلام کے آخری دار الحکومت پر کفار کا استیلا ہو جائے اور تمہاری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ جائے۔ اٹھو اور دنیا کو بتا دو کہ ترکوں میں ابھی جان باقی ہے اور وہ کبھی کسی کی غلامی کا طوق گلے میں نہیں ڈال سکتے۔"

ولولہ انگیز تقریریں کرنے کے علاوہ خالدہ نے قراقول نامی ایک خفیہ تنظیم میں شامل ہو کر اناطولیہ تک اسلحہ پہنچانے کے کام میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے چالیس محبانِ وطن کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ ان میں خالدہ اور ان کے شوہر ڈاکٹر عدنان آدیوار بھی شامل تھے۔ وہ دونوں انگریزوں کی کڑی نگرانی کے باوجود بھیس بدل کر استانبول سے اناطولیہ پہنچ گئے جہاں مصطفیٰ کمال پاشا نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کو اپنی کابینہ میں وزیرِ تعلیم مقرر کر دیا۔ ان کے فرائض میں ترجمے اور صحافتی نوعیت کے کام بھی شامل تھے۔ یہ واقعہ رجب ۱۳۳۸ھ (اپریل ۱۹۲۰ء) کا ہے۔ لیکن جلد ہی محب وطن ترکوں پر ایک نئی بلا نازل ہو گئی وہ یہ کہ یونانیوں نے انگریزوں کی انگیخت پر حملہ کر کے ازمیر (سمرنا) پر قبضہ کر لیا اور پیشقدمی کرتے ہوئے الفرہ کے قریب دریائے سقاریہ تک پہنچ گئے۔ خالدہ نے پہلے تو محاذِ جنگ پر پہنچ کر ہلالِ احمر کے تحت زخمیوں اور مریضوں کی دیکھ بھال کی پھر انقرہ واپس آکر نرسنگ کی خدمات انجام دیں۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (۱۶ اگست ۱۹۲۱ء) کو خالدہ نے مصطفیٰ کمال پاشا سے فوج میں باقاعدہ شامل ہو کر محاذِ جنگ پر جانے کی اجازت طلب کی۔ یہ اجازت انہیں مل گئی اور انہیں "اون باشی" (کارپورل) بنا کر محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ انہوں نے سقاریہ کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ترجمان اور نامہ نگار کی حیثیت سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ اکثر اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر مجاہدین کی صفوں اور خندقوں میں مقیم جانبازوں کو دیکھنے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے گشت کیا کرتی تھیں۔ چنانچہ انگریزی اخبارات نے ان کو "ترکیہ کی جون آف آرک" کا خطاب دیا۔ ترکوں نے سقاریہ کی لڑائی میں یونانیوں کو تباہ کن شکست

دی اور اناطولیہ کو ان کے وجود سے پاک کر دیا۔ خالدہ اپنی فوج کے ساتھ ۷ محرم
۱۳۴۱ھ مطابق ۳۰ اگست ۱۹۲۲ء کو فاتحانہ ازمیر (سمرنا) میں داخل ہوئیں۔
اس موقع پر ان کی فوجی خدمات کے اعتراف میں ان کو باش چاوش (سارجنٹ میجر)
کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے اس کمیٹی میں کام کیا جو یونانیوں کے مظالم
کی تحقیق کے لیے قائم کی گئی تھی۔ خود مصطفیٰ کمال پاشا نے ایک تار کے ذریعے ان
کی خدمات کو سراہا۔ جب مصطفیٰ کمال پاشا نے اتحادیوں کو ترکی سے نکال کر آزاد
جمہوریہ قائم کی تو خالدہ ادیب خانم اور ان کے شوہر ترکی سے باہر چلے گئے۔ اس کا
پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان دونوں کا تعلق اس طبقۂ فکر سے تھا جو ترکی میں
خلافت قائم رکھنا چاہتے تھے اور جس کی قیادت رؤف بے اور کاظم قرہ بکر کر رہے
تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ برطانوی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کے حامی تھے۔ مگر
کمال اتاترک خلافت کو ہر صورت میں ختم کرنا چاہتے تھے اور ایک لادینی یک جماعتی
نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اوّل الذکر طبقۂ فکر کے بہت سے لوگ
مایوس ہو کر وطن سے باہر چلے گئے۔ خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر عدنان بھی ان لوگوں
میں شامل تھے۔ بعد میں ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں سعید کردی کی بغاوت کے بعد اتاترک
نے سرکاری طور پر جن ڈیڑھ سو افراد کو باقاعدہ جلا وطن کر دیا ان میں غازی رؤف پاشا،
خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر عدنان کے نام بھی شامل تھے۔

خالدہ ادیب خانم اور ان کے شوہر پورے پندرہ سال ترکی سے باہر رہے۔
چار سال انگلستان میں اور گیارہ سال فرانس میں۔ اس دوران میں انہوں نے
کئی ملکوں کے دورے کیے اور مختلف یونیورسٹیوں میں ترکی کے ادب، سیاست
اور تاریخ وغیرہ پر لیکچر دیئے۔ ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم مشہور مسلم
رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی دعوت پر ہندوستان آئیں اور دو ماہ
(جنوری و فروری) کے عرصے میں جامعہ ملیہ (قرول باغ) دہلی میں آٹھ لیکچر
دیئے۔ ہر تقریر کے موقع پر جلسہ کی صدارت ملک کا کوئی ممتاز رہنما کرتا تھا۔ علامہ اقبال

اور گاندھی جی نے بھی ایک ایک جلسے کی صدارت کی۔ اس کے علاوہ خالدہ ادیب خانم نے لاہور، پشاور، لکھنؤ، بنارس، کلکتہ، حیدرآباد دکن اور بمبئی کی سیاحت بھی کی اور وہاں اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں تقریریں بھی کیں۔ بعد میں انہوں نے اس سفر کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے جو "INSIDE INDIA" (اندرونِ ہند) کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

سنہ ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک کے انتقال کے بعد ترکی حکومت نے جلاوطن افراد کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ خالدہ اور ان کے شوہر بلاتاخیر ترکی واپس پہنچ گئے۔ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۸ھ (دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء) میں خالدہ ادیب خانم نے استانبول یونیورسٹی میں انگریزی کی پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ گیارہ سال بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور سنہ ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء میں ترکی کی پارلیمنٹ (مجلس کبیر ملی) کی رکن منتخب ہو گئیں۔ چار سال بعد سنہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء میں وہ پارلیمنٹ کی رکنیت چھوڑ کر استانبول یونیورسٹی میں واپس آ گئیں۔ سنہ ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۵ء میں ان کے شوہر ڈاکٹر عدنان آدیوار فوت ہو گئے۔ خالدہ ادیب خانم اب ضعیف العمر ہو چکی تھیں اور ان کو طرح طرح کے عوارض لاحق ہو چکے تھے تاہم انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا اور نو سال کے عرصے میں کئی کتابیں مکمل کیں۔

۲۳ شعبان سنہ ۱۳۸۳ھ مطابق ۹ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء جمعرات کے دن ۱/۲ ۴ بجے خالدہ ادیب خانم نے وفات پائی اور اگلے دن استانبول کے قبرستان مرکز آفندی میں سپردِ خاک کر دی گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

خالدہ ادیب خانم نے ۴۵ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں ۳۶ کتابیں ان کی طبع زاد تصانیف ہیں (۳۵ کتابیں ترکی زبان میں ہیں اور ایک انگریزی زبان میں) نو کتابیں ایسی ہیں جن کو دوسری زبانوں سے ترکی زبان کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ ان کتابوں کے موضوع وار نام یہ ہیں:

ناول ——— ہیولہ۔ موعود حکم۔ آتش تن گوم لیک۔ راتی کی ماں۔ خاندان۔

ینی توران۔ سون اثرمی۔ قلب آمفری سی۔ درون قحبہ۔ زینونن اُغلو۔ سینک لی بقال۔ پول پلاس جنایت۔ تاتار جک۔ سیوے طالب۔ سون سوز نیایر۔ دو نفر آتیشینہ۔ عقیلہ خانم سوکاک۔ سوداسوکاک۔ حیات پارچہ لری۔ چارہ ساز۔

ڈرامے ـــــ کنعان کے گڈریے۔ روح دماسکہ

افسانے ـــــ خراب معبدلر۔ داغمہ چکان کرت۔ ازمیر دین بیروصائے (اس میں کچھ اور افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل ہیں)

سوانح حیات ـــــ ڈاکٹر عدنان آدیوار

آپ بیتی ـــــ ترکون آتش سے امتحان۔ مورسالکم لی ایو (یہ دونوں کتابیں خالدہ نے پہلے انگریزی زبان میں لکھیں)

تنقید و ادب ـــــ انگریزی ادب کی تاریخ، تین جلدیں۔ یونیورسٹی کتفاسی۔ سانارے ویری یودم عقندہ۔ ترکی میں مشرق و مغرب اور امریکہ کے اثرات۔

انگریزی تصنیف ـــــ (INSIDE INDIA) اس کا ترجمہ "اندرونِ ہند" کے نام سے اردو زبان میں بھی ہوچکا ہے۔

تراجم ـــــ مادر (دی مدراں مرحوم)۔ تعلیم و تربیت۔ بابرخان۔ گزمی۔ ہیملٹ بلدڈ: ناسل خوشو نوزہ گدرسہ۔ کوریولانس۔ انتونی و قلوپطرہ۔ حیوان چفتلیک۔

ان کے علاوہ خالدہ ادیب خانم نے کچھ غیر مطبوعہ کتابیں اور تحریریں بھی چھوڑیں۔

(خالدہ ادیب خانم از عبدالمجید عتیقی مرحوم،
اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جلد ۸،
"معارف" لاہور جون ۱۹۷۵ء مقالہ از جناب ثروت صولت)

نازلی بیگم

علی حسن آفندی کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ والد ترکی کے خلیفہ عبدالحمید ثانی (۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء تا ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء) کے مشیر خاص تھے اور ترکی میں رہتے تھے لیکن ان کا تعلق بمبئی سے تھا۔ نازلی بیگم استنبول (قسطنطنیہ) میں یکم مارچ ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوئیں۔ والدہ کا نام امیر النساء بیگم تھا جو بڑی ذہین اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ نازلی بیگم نے ترکی کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں نہایت اچھے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ ان کو ترکی، انگریزی، عربی اور فارسی میں بہت اچھی دستگاہ حاصل ہوگئی، بعد میں انہوں نے گجراتی اور اردو زبان میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ ابھی تیرہ برس کی تھیں کہ ان کی شادی بمبئی کے قریب واقع ایک چھوٹی سی ریاست جنجیرہ کے نواب سر سیدی احمد خاں سے کردی گئی۔[1] سسرال میں ان کو رفیعہ سلطان کا لقب دیا گیا اور وہ ہر ہائی نس نازلی رفیعہ سلطان آف جنجیرہ کہلائیں۔ نواب سر سیدی احمد خاں بڑے علم دوست مخیر اور نیک فطرت

---

[1] سر سیدی احمد خاں کے آباؤ اجداد سیدی نسل سے تعلق رکھتے تھے یہ لوگ حبشہ (ایبے سینیا یا ایتھوپیا) کے ساحل پر آباد تھے۔ وہاں سے نقل مکانی کر کے بمبئی آگئے اور جنجیرہ کے جزیرے میں آباد ہوگئے۔ بعد میں وہ اس جزیرے کے حکمران بن گئے۔ یہ تحقیق نہیں ہوسکا کہ یہ خاندان کب جنجیرہ (بمبئی) میں آباد ہوا اور کب وہاں اس کی حکمرانی قائم ہوئی۔ "سیدی" شیدی نسل کے لوگوں سے بالکل الگ ہیں۔ شیدی نسل کے لوگوں کا رنگ سیاہ، ہونٹ موٹے اور بال گھنگریالے ہوتے تھے جبکہ سیدی نسل کے لوگ صاف رنگ اور اچھی شکل وصورت کے لوگ ہوتے تھے۔

انسان تھے۔ شادی کے بعد انہوں نے نازلی بیگم کو ریاست کے ترقیاتی کاموں کا منصرم بنا دیا۔ اس ذمہ داری کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نبایا۔ عام لوگوں کے لیے پینے کا صاف پانی فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ سکول قائم کیے اور لوگوں کو سفری سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی معاشی ترقی کے کئی منصوبے بنائے جو بہت کامیاب ہوئے اور نازلی بیگم بہت ہر دلعزیز ہو گئیں۔ ان کو علم و ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی اور ارباب علم کی بے حد قدردان تھیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف "سیرۃ النبیؐ" کی تیاری میں ان کی تحریک اور اعانت بھی شامل تھی۔ علامہ شبلیؒ نے اس کا کافی حصہ جنجیرہ کی پُرسکون فضا میں رہ کر مکمل کیا۔

۱۹۰۶ء میں نازلی بیگم اپنے شوہر اور دوسرے اہل خاندان کے ساتھ یورپ کے سفر پر گئیں صرف ان کی منجھلی بہن زہرا بیگم کسی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جا سکیں۔ نازلی بیگم یورپ جا کر وہاں کے حالات باقاعدگی سے لکھ کر ان کو بھیجتی رہیں۔ یہ خطوط انشاء پردازی اور بے ساختگی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔

سفرِ یورپ کے دوران میں نازلی بیگم کو علامہ اقبالؒ اور کئی دوسرے مشاہیر سے بھی ملاقات کا موقع مل گیا۔ علامہ اقبالؒ ان کی علمی وجاہت سے بہت متاثر ہوئے اور یہ شعر ان کی نذر کیے ؎

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیضِ آستاں بوسی سے گل بر سر قمر
روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

نازلی بیگم نے علامہ شبلیؒ کی میزبانی کے علاوہ کئی بار علامہ اقبالؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ، مسز سروجنی نیڈ وؒ

ملک کے متعدد دوسرے نامور ارباب علم اور اہل سیاست کی میزبانی کی بھی عزت حاصل کی اور ان کو جنجیرہ کی سیر کرائی۔ بقول نازلی بیگم قائدِ اعظمؒ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے جنجیرہ آکر بہت آرام اور سکون ملتا ہے۔ وہ جنجیرہ میں اپنا بیشتر وقت محل سے ملحق باغ میں گزارا کرتے تھے۔

نازلی بیگم برِ کوچک پاک و ہند کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے الٰہ آباد میں منعقد ہونے والی خواتین کی پہلی کانفرنس کی صدارت کی اور خواتین کے مسائل کا حل تلاش کرنے اور بے جا رسم و رواج کو ختم کرنے کے لیے آواز بلند کی۔

ہندوستان میں تحریکِ خلافت کا غلغلہ بلند ہوا تو نازلی بیگم نے اس کی حمایت کی۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر اصغر آفندی بھی اس تحریک کے پرجوش حامی تھے اور اس طبی وفد میں بھی شامل تھے جو ترکی گیا تھا۔

نازلی بیگم نے دہلی میں لڑکیوں کا پہلا اسکول قائم کرایا اور اس کو تیس ہزار روپے کی امداد دی۔ وہ قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں لیکن شوہر کے انتقال کے بعد ان کا تعلق ریاست سے برائے نام رہ گیا کیونکہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اب وہ بمبئی میں اپنی بہن عطیہ بیگم کے ایوانِ رفعت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ یورپ میں تھیں۔ بمبئی واپس آئیں تو بقول ان کے سب کچھ لٹ پٹ چکا تھا تھوڑا بہت جو سامان مل سکا اسے لے کر چھوٹی بہن عطیہ بیگم اور بہنوئی فیضی رحمین کے ساتھ پاکستان آگئیں۔ یہاں آکر انہیں کافی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا بالخصوص عمر کے آخری دَور میں سخت مالی پریشانی میں مبتلا رہیں لیکن وہ بڑی حوصلہ مند اور صابر و شاکر خاتون تھیں کسی حالت میں بھی ہمت نہ ہاری اور اپنے مزاج پر قابو رکھا۔ وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہتی تھیں اور تینوں ایک دوسرے کی نہایت خلوص سے دیکھ بھال کرتے تھے کیونکہ ان کے

ہاں کوئی بچہ نہ تھا (دونوں بہنیں بے اولاد رہیں) ۱۹۶۴ء میں فیضی رحمین وفات پا گئے۔ ۱۹۶۵ء کے وسط میں عطیہ بیگم گر گئیں اور ہڈیاں ٹوٹنے کی وجہ سے معذور ہو گئیں۔ نازلی بیگم نے ضعیف العمری کے باوجود ان کی پوری پوری نگہداشت کی۔ ۱۹۶۶ء میں وہ خود بھی اسی قسم کے حادثے کا شکار ہو گئیں تاہم انہوں نے مصیبت کا یہ وقت بڑی ہمت سے گزارا۔ جنوری ۱۹۶۷ء میں عطیہ بیگم بھی انہیں داغ مفارقت دے گئیں اور وہ دنیا میں یکہ و تنہا رہ گئیں۔ آخر ستمبر ۱۹۶۸ء میں انہیں بھی پیغام اجل آپہنچا اور وہ ۹۶ برس کی عمر میں اس دنیائے ناپائدار سے رخصت ہو گئیں۔

نازلی بیگم انگریزی زبان کی بہترین انشا پرداز تھیں۔ ان کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع تھا خصوصاً ترکی اور مصر کی تاریخ پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔ ان کو اردو اور فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے اور انہیں موقع کی مناسبت سے بڑے دلکش انداز میں پڑھتی تھیں۔ برِ کوچک کی شاید ہی کوئی ایسی بڑی علمی یا سیاسی شخصیت ہو جس کو وہ ذاتی طور پر نہ جانتی ہوں۔ ان کی تحریر بڑی شگفتہ اور پُر از معلومات ہوتی تھی لیکن انہوں نے کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ (ماہنامہ "پہچان" کراچی جنوری ۸۶ء)

زہرا بیگم

نازلی بیگم کی چھوٹی بہن تھیں۔ انہوں نے بھی اپنی بہنوں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ نہایت ذہین اور طباع تھیں۔ تحریر اور تقریر دونوں میں طاق تھیں۔ ان کی علمی اور ادبی شہرت کا آغاز سنہ ۱۹۰۰ء ہی میں ہو گیا تھا۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں نازلی بیگم یورپ گئیں تو زہرا بیگم جنجیرہ ہی میں رہیں۔ نازلی بیگم ان سے وعدہ کر گئیں کہ وہ یورپ سے ان کو اپنی مصروفیات و مشاہدات پر مبنی خط روزنامچہ کی صورت میں باقاعدگی سے لکھتی رہیں گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا وعدہ ایفا کیا۔ ان کے تمام خطوط زہرا بیگم نے سنبھال کر رکھے۔ پھر انہیں مرتب کر کے سنہ ۱۹۰۸ء میں لاہور سے شائع کرا دیا۔ یہ ایک نہایت معلومات افزا سفرنامہ ہے جسے تاریخ جغرافیہ اور انشاپردازی کا نہایت حسین امتزاج قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ سنہ ۱۸۸۰ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک کے ہندوستان اور یورپ کے حالات پر مشتمل ہے ان میں علمی اور ادبی شخصیات کے تذکرے بھی ہیں اور سیاسی حالات کے خاکے بھی۔ زہرا بیگم کی عمر نے وفا نہ کی وہ سنہ ۱۹۱۰ء میں یکایک بیمار پڑیں اور فوت ہو گئیں۔ انہوں نے تقریباً تیس سال عمر پائی۔ ان کے بہت سے خطوط علامہ شبلیؒ کے پاس محفوظ تھے۔ انہوں نے ایک خط میں ان خطوط کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"زہرا بیگم اور عطیہ فیضی کے بہت سے خطوط آئے اور بعض میں علمی مضامین تھے۔ ان ظالموں کی اردو نویسی پر مجھے تعجب ہوتا ہے۔"

علامہ شبلیؒ کو زہرا بیگم کی وفات کا بے حد صدمہ ہوا اور انہوں نے فرمایا، "موت کے بے رحم ہاتھوں نے ایک اچھی اردو کی انشاپرداز کو ہم سے چھین لیا ہے۔"

(پہچان کراچی جنوری سنہ ۱۹۸۶ء)

عطیہ بیگم (عطیہ فیضی)

نازلی بیگم اور زہرا بیگم کی چھوٹی بہن تھیں۔ ۱۸۷۷ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوئیں۔ اپنی بہنوں کی طرح انہوں نے بھی بہت اعلیٰ تعلیم پائی اور ترکی، عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور گجراتی زبانوں میں بڑی مہارت حاصل کرلی، وہ اپنے والد کی واحد بیٹی تھیں جنہوں نے اپنے خاندان کی نسبت سے ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ فیضی لکھا۔[ل] ان کی بڑی بہن نازلی بیگم کی شادی ۱۸۸۵ء میں نواب جنجیرہ (بمبئی) سے ہوئی تو وہ بھی ان کے ساتھ جنجیرہ رہنے لگیں۔ عطیہ اپنے والدین کی بہت لاڈلی تھیں اور سب بہنوں میں زیادہ شوخ و چنچل تھیں، اس کے ساتھ ہی وہ بڑی ذہین و فطین اور علم و ادب کی شیدائی تھیں۔

جنجیرہ ایک پُرفضا جزیرہ تھا اور نازلی بیگم کی دعوت پر ملک کے بڑے بڑے اہلِ سیاست و اربابِ علم وہاں آتے رہتے تھے۔ ان میں علامہ شبلی نعمانیؒ بھی شامل تھے۔ ان کو عطیہ بیگم کی ذہانت علم و ادب سے شغف اور دوسرے اوصاف نے بے حد متاثر کیا اور وہ ان کے بہت مداح بن گئے۔ عطیہ بھی علامہ شبلیؒ کی بہت مداح اور قدردان تھیں۔ ان کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی

ل عطیہ فیضی کے والد علی حسن آفندی کا تعلق ایک عرب نژاد خاندان سے تھا جو اپنے ایک بزرگ فیض حیدرؒ کے نام کی نسبت سے فیضی کہلاتا تھا۔ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے اور تجارتی کاموں کے سلسلے میں بمبئی سے لے کر کاٹھیاواڑ تک پھیل گئے تھے۔ عرب ترکی اور عراق کے عمائد اور عوام سے بھی تعلقات تھے۔ اس خاندان میں علم و ادب کا چرچا تھا عطیہ کبھی کبھی دعویٰ کیا کرتی تھیں کہ ان کا خاندان ترکی النسل ہے لیکن عام طور پر انہیں عرب نژاد ہی خیال کیا جاتا ہے۔

رہتی تھی۔ اس میں بڑی بے تکلفی پائی جاتی تھی بالخصوص علامہ شبلیؒ کے خطوں میں بعض اصحاب نے اس بے تکلفی کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ بے تکلفی ایک حد کے اندر رہی اور عطیہ ہمیشہ ان کو اپنا بزرگ سمجھتی رہیں۔ ۱۹۰۳ء میں عطیہ کی شادی ایک عالمی شہرت یافتہ مصور راحیمین (رحمین[1]) سے ہوئی۔ وہ یہودی نژاد تھے لیکن مسلمان ہوگئے تھے۔ بعض لوگوں نے اس شادی پر اعتراض کیا، علامہ شبلیؒ کو خبر ہوئی تو انھوں نے یہ شعر کہے:۔

عطیہ کی شادی پہ کسی نے نکتہ چینی کی ‖ کہا میں نے جاہل ہے یا احمق ہے یا ناداں ہے
بتانِ ہند کافر کرلیا کرتے تھے مسلم کو!! ‖ عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

علامہؒ نے ایک دفعہ قیام جنجیرہ کے دوران میں عطیہ کو مخاطب کرکے یہ شعر کہے:۔

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی ‖ خیالِ روزہ و فکرِ وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے ‖ یہاں فکرِ مے و جامِ وسبو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف یہ سبزہ یہ منظر یہ بہارستاں ‖ عطیہ تم کو یادِ لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

اور جب ان کو لکھنؤ میں جنجیرہ کی یاد ستاتی ہے تو کہتے ہیں:

یاد ہیں صحبت ہائے رنگیں جو جزیرے میں رہیں
وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی مے خانہ تھا!

---

[1] راحیمین جو عام طور پر ڈاکٹر فیضی رحمین کے نام سے مشہور ہیں بہت اونچے درجے کے مصور تھے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں آج بھی دنیا کے مختلف عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں میں موجود ہیں، ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تعلیم و تربیت یورپ میں ہوئی۔ وہیں مصوری، افسانہ نگاری، ناول اور مضمون نویسی میں شہرت حاصل کی، وہاں سے اچانک ہندوستان آگئے اور پھر یہیں کے ہو رہے عطیہ بیگم نے ان کو یہ دیکھ کر ہی اپنے لیے منتخب کیا کہ وہ اعلیٰ تعلیمیافتہ، اچھے کردار اور پختہ ذہن کے مالک تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد نازلی بیگم اور عطیہ فیضی کے ساتھ پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل اقامت اختیار کی۔ کراچی میں ان کی زندگی کے آخری سال بڑی پریشانیوں میں گزرے انھوں نے ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ بڑے صبر و شکر سے کیا۔ تینوں ایک دوسرے کے بیحد خیر خواہ تھے اور ہمیشہ اکٹھے رہتے تھے۔ فیضی رحمین نے ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔

عطیہ بیگم کو علامہ شبلیؒ سے جو عقیدت مندانہ تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ علامہؒ کے نام ان کے اس خط سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے ۲۱ فروری سنہ ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے لکھا :-

اللہ اکبر

مکرم و محترم جناب مولانا دام مجدکم

تسلیمات عرض خدمت ہے - آپ کے دو مشرف نامے اور کتابیں برابر مل گئیں - حضور عالی اور بہن جان کل تشریف لائے بمبئی اور اسی وقت بہن جان کا مال ان کو دے دیا - اس قدر خوش ہوئیں کہ کیا عرض کروں - کہنے لگیں کہ دنیا میں کوئی چیز اس سے بڑھ کر مقبول نہیں ہو سکتی تھی - بہت ادب کے ساتھ آپ کا بہت بہت احسان مانتی ہیں ---- آگرے کی نسبت ضرور اطلاع دوں گی -
ندوہ کے کل کاغذات جو آپ نے عنایت فرمائے تھے وہ ہمشیرہ جان نے دیئے اور میں نے پڑھے - یہاں کون اس قابلیت کا ہے جو وہاں جائے اور شریک ہو - حضور نواب صاحب اور بہن جان اور علیٰ ہذالقیاس - سارے جبشان کو غم ہے کہ آپ جزیرے تشریف نہ لا سکے - ان لوگوں کی بدقسمتی ! کاش یورپ ہمارے ساتھ آپ چل سکتے - یہ بھی ہماری قسمت بلکہ کل ہندوستان کی -
خدا کرے پاؤں کے بننے سے آپ کو کسی قدر آرام ہو - آپ کو چند باتیں مجھے لکھنی ہیں بندی حاضر ہے -

زیادہ حد ادب

عاجزہ عطیہ

سنہ ۱۹۰۶ء میں نازلی بیگم اپنے شوہر اور دوسرے اہل خاندان کے ساتھ یورپ گئیں تو عطیہ بھی ان کے ساتھ تھیں - انگلستان میں ان کی علامہ اقبالؒ سے

سے خوب ملاقاتیں رہیں (وہ اس وقت بسلسلہ تعلیم انگلستان میں تھے)۔

علامہ اقبالؒ عطیہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو رازدار بنالیا۔ اپنے ذاتی حالات اور ذہنی کیفیات تک سے ان کو آگاہ کرتے تھے اور اپنا کلام ان کو بھیجتے تھے۔ وہ عطیہ فیضی کی غیر معمولی قابلیت اور سلیقہ شعاری کو دل سے مانتے تھے اور اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اقبالؒ کے خطوط عطیہ بیگم کے نام طبع ہو چکے ہیں ان کو دیکھ کر دونوں کے باہمی روابط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عطیہ فیضی بڑی خوبیوں کی مالک تھیں لیکن فی الحقیقت ان کو ملک گیر شہرت مولانا شبلیؒ کی شاعری اور علامہ اقبالؒ کے قلم نے عطا کی اور وہ برِّ کوچک کی نامور خواتین میں شمار ہوئیں۔

عطیہ فیضی کو شاعری، مصوری اور موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا خصوصاً کلاسیکی موسیقی بہت زیادہ جانتی تھیں، اس کی تاریخ تک ان کو ازبر تھی۔ تقریر بھی وہ بہت اچھی کرتی تھیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ خاندان ولایت میں تھا، وہاں سے ہندوستان (بمبئی) آیا معلوم ہوا کہ پیچھے سب کچھ لٹ پٹ گیا۔ بہرحال جو تھوڑی بہت اشیاء باقی رہ گئی تھیں انہیں سمیٹ کر دونوں بہنیں اور فیضی رحمین کراچی آ گئے۔ پہلے دو تین سال تو انہوں نے بڑی آسودگی سے گزارے اس کے بعد حالات روز بروز نامساعد ہوتے گئے۔ تینوں ضعیفی کی عمر کو پہنچ چکے تھے اولاد بھی کوئی نہ تھی۔ آخر میں سخت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ نیک دل لوگ خدمت کرتے رہے اور وقت گزرتا رہا ورنہ ان کی زندگی عبرت کا مرقع بن گئی تھی۔ آئے دن کی بیماریوں نے حالت اور بھی ابتر کر دی تھی اسی نکبت و افلاس کے عالم میں ۱۹۶۴ء میں فیضی رحمین نے وفات پائی۔ عطیہ اور نازلی بیگم اب بالکل بے سہارا رہ گئیں بشتم پشتم وقت گھسیٹتی رہیں۔ آخر ۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو عطیہ فیضی بھی فالج کے حملے سے دارالبقا کو سدھار گئیں۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں نازلی بیگم بھی ان سے جا ملیں —— رہے نام اللہ کا۔

کراچی کے اخباروں اور رسالوں میں عطیہ فیضی کی موت پر بڑا ماتم کیا گیا۔ شذرات، اداریے، طویل مضامین اور تصویریں شائع ہوئیں۔ ادیب شہیر مولانا ماہر القادری مرحوم نے بھی ماہنامہ "فاران" میں اپنے تاثرات قلمبند کیے، ان کے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

"عطیہ فیضی کا لباس ستر پوشی میں ملکہ وکٹوریہ کے لباس سے ملتا جلتا تھا

چہرے کے سوا جسم کا ہر حصہ ڈھکا چھپا اور سر پر عربوں کی طرح رومال جس پر عقال بندھا ہوا، نیچے کرتا پر لمبی سی عبا، گلے میں سیاہ پوتھ کی مالا، پہلی نگاہ میں وہ چرچ کی راہبہ (سسٹر) جیسی نظر آتی تھیں۔"

"فنونِ لطیفہ سے خاصہ شغف تھا۔ شاعری اور مصوری اور رقص و موسیقی یہ سب ان کی دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ راگ راگنی سے واقف تھیں پاکستان آنے کی بجائے بھارت ہی میں رہتیں اور کوئی کلا مندر ان کو سونپ دیا جاتا تو وہاں ان کے ذوق اور طبیعت کے جوہر کھلتے۔ انگریزی کا مطالعہ خاصہ وسیع تھا۔ انگریزی میں رواں اور شگفتہ تقریر کرتیں اور مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتی جاتیں۔"

"کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اس پر طنز کرنے اور ٹوکنے اور بعض اوقات ڈانٹنے ڈپٹنے سے نہ چوکتیں اس لیے ان کے جاننے والے محفلوں اور پارٹیوں میں عطیہ فیضی کے قریب آتے ہوئے کتراتے تھے۔"

"عطیہ فیضی کے پاس مشاہیر کے خطوط کا خاصہ ذخیرہ تھا۔"

"راقم الحروف نے سینکڑوں نہیں ہزاروں کاپیوں پر اپنے آٹوگراف دیئے ہیں لیکن عطیہ فیضی نے جس آٹوگراف بک پر مجھ سے لکھوایا وہ اپنی نوعیت کی نادر اور بیش قیمت "بیاضِ امضا" تھی اس پر ہندوستان، انگلستان، ترکی اور بعض دوسرے ممالک کے مشاہیر کی تحریریں اور دستخط تھے۔ مہاتما گاندھی جب پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد بحری جہاز سے ہندوستان واپس آرہے تھے تو عطیہ بھی اسی جہاز میں تھیں انہوں نے اصرار کر کے گاندھی جی کی انگلی میں آلپین چبھوئی اور گاندھی جی نے اپنی انگلی کے خون کا نشان عطیہ فیضی کی آٹوگراف بک پر ثبت کر کے اپنے دستخط کیے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کے جو ارکان اس جہاز سے گاندھی جی کے ہمسفر تھے ان سے بھی اس صفحہ پر دستخط لیے گئے۔ اس قسم کی نادر و عجیب اور فنکاری کی باتیں عطیہ فیضی کو خوب سوجھتی تھیں۔ عطیہ فیضی کی زندگی صفحۂ رنگین بھی ہے اور ورقِ عبرت بھی۔" (فاران کراچی مارچ ۱۹۶۷ء، بحوالہ کراچی جنوری ۱۹۶۷ء)

اماں بی رقیہ بیگمؒ

مرزا غالب کے ہمعصر نامور شاعر اور صاحب قلم مرزا قربان علی بیگ سالک کی دختر نیک اختر، سید احمد حسن مودودیؒ کی اہلیہ، ادیب شہیر سید ابوالخیر مودودیؒ اور صاحب تفہیم القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ نہایت سادہ مزاج، مخیر، فیاض، نیک دل، اور دیندار خاتون تھیں۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئیں۔ سید احمد حسن مودودیؒ سے ان کی شادی انیسویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں ہوئی۔ اس وقت وہ نوجوان تھیں جبکہ سید احمد حسنؒ کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ چند سال پہلے ان کی پہلی اہلیہ امتہ المجیب وفات پا چکی تھیں۔ انہوں نے اپنے پیچھے تین بچے چھوڑے تھے عصمت خاتون، ابو محمد اور ابوالقاسم۔ بی بی رقیہ بیگم سید احمد حسنؒ کی دوسری بیوی تھیں مگر انہوں نے سوتیلے بچوں کو حقیقی ماں کا پیار دیا اور ان سے ایسا مثالی برتاؤ کیا کہ کوئی ناواقف یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ ان بچوں کی سوتیلی ماں ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا بیان ہے کہ:

> "ہم دونوں بھائیوں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں ہم سوتیلے رشتے کے تصور سے ناآشنا تھے۔ بڑے بھائیوں اور بہن کے ساتھ ہمارے تعلقات کو دیکھ کر کسی کو بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی سوتیلا رشتہ ہے۔"

بی بی رقیہ بیگم کے اجداد مغل سلطنت کے اعلیٰ فوجی مناصب پر فائز رہے تھے۔ ان کے والدین بھی رئیسانہ شان رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو علم و ادب اور دین سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت بہت عمدگی سے کی اور ان کی دینی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ یہی سبب تھا کہ بی بی رقیہ بیگم

میں گہرا دینی شعور پیدا ہو گیا اور وہ بچپن ہی سے صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو گئیں۔ ان کے والدین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) سے بیعت تھے۔ بی بی رقیہ بیگم بھی نو سال کی عمر میں ان کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہو گئیں۔

شادی کے بعد بی بی رقیہ بیگم کو بڑی مشکل صورتِ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ یوں کہ شوہر سید احمد حسنؒ کی طبیعت میں بلا کا غصہ تھا۔ کھانا کھانے بیٹھتے تو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے۔ نمک مرچ میں کمی بیشی ہو جاتی تو ان کا غصہ بھڑک اٹھتا۔ بی بی رقیہ بیگم شوہر کے مزاج کو سمجھ گئیں۔ وہ نہایت احتیاط سے خود کھانا تیار کرتیں اور اس بات کا خاص خیال رکھتیں کہ کوئی چیز شوہر کی طبیعت کے خلاف نہ ہو گویا آہن کو موم کرنا ان کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ یہی سیلِ زمانہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلا فرزند عطا کیا جس کا نام "ابوالخیر" رکھا گیا! اماں بی انہیں پیار سے "خیرو" کہا کرتی تھیں۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء (۳ رجب ۱۳۲۱ھ) کو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسرے فرزند سے نوازا، یہ تھے "ابوالاعلیٰ" اماں بی ان کو پیار سے ساری عمر "مَنّا" ہی کہتی رہیں۔ اس زمانے میں سید احمد حسنؒ کا قیام اورنگ آباد (دکن) میں تھا۔ دوسرے بچے کی پیدائش کے کوئی ایک سال بعد سید احمد حسن نے وکالت ترک کر دی۔ گھر کا تمام اثاثہ اللہ کی راہ میں دے دیا اور اورنگ آباد چھوڑ کر دلی جا بسے۔ چند سال پہلے وہ اپنے رشتے کے چچا مولوی محی الدین خاںؒ کی بیعت کر چکے تھے۔ مولوی صاحب تھے تو میر عدل مگر بڑے عبادت گزار اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اُن کے فیضِ صحبت سے سید احمد حسنؒ بھی ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کی طرف راغب ہو گئے تھے لیکن ساتھ ساتھ وکالت بھی جاری تھی۔ اب دلی پہنچ کر انہوں نے علائقِ دنیا سے قطع تعلق کر لیا اور دلی سے کچھ فاصلے پر عرب سرائے میں ڈیرہ جما لیا۔ پھر وہاں تین ساڑھے تین سال اس حال میں گزرے کہ زندگی کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے خشک روٹی، اُبلے ہوئے ساگ کے ساتھ کھا لیتے تھے باقی دنیا کی کسی چیز سے ان کو کوئی سروکار

نہ تھا۔ دن رات عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ مرشدِ گرامی کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انہوں نے اورنگ آباد بلا کر نصیحت کی کہ اپنے رب سے لو لگانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی ذمہ داریوں سے یکسر منہ موڑ لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے واپس آکر پھر وکالت شروع کر دی مگر اس طرح کہ کبھی کسی جھوٹے مقدمے کی پیروی نہ کرتے تھے صرف وہی مقدمہ ہاتھ میں لیتے جس کے بارے میں پورا اطمینان ہوتا کہ اس میں جھوٹ کی ذرہ برابر بھی آمیزش نہیں ہے۔ اس مومنانہ اور محتاط طرزِ عمل کا اثر ان کی آمدنی پر پڑا مگر انہوں نے سادگی اور قناعت کی جو روش برضا و رغبت اختیار کی مرتے دم تک اس پر قائم رہے۔

زندگی کے ان سارے مراحل میں اماں بی نے اپنے شوہر کا پورا پورا ساتھ دیا اور ہر حالت پر قانع رہیں۔ وہ فطرتاً بڑی سادہ مزاج تھیں۔ نہ ان کو زیور کا شوق تھا اور نہ رنگ برنگے قیمتی کپڑے پہننے کا۔ سفید لٹھے کا پاجامہ، سفید ململ کا کرتا اور سفید ململ کا دوپٹہ۔ یہی ساری عمر ان کا پہناوا رہا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بتایا کرتے تھے کہ

"ہم نے کبھی ان کو زیور یا رنگین لباس پہنے نہیں دیکھا اور والد مرحوم کی زندگی میں بھی ان کی یہی روش تھی۔"

اماں بی کا معمول تھا کہ جب ان کو گھر کے خرچ کے لیے کوئی رقم دی جاتی تو وہ فوراً کوئی پھل، مٹھائی یا کوئی دوسری چیز منگواتیں اور محلے کے غریب اور حاجت مند گھروں کو بھجواتیں۔ اس کے بعد باقی رقم اپنے کام میں لاتیں۔ گھر میں خوشحالی کا دور دورہ بھی رہا اور عسرت کے دن بھی آئے مگر ملازمین کے ساتھ ان کا سلوک ہمیشہ نہایت مشفقانہ رہا۔ کھانا پہلے ان کو دیتیں پھر خود کھاتیں۔ بعض اوقات سالن ختم ہو جاتا مگر وہ پتیلی پونچھ کر ہی گزارہ کر لیتیں۔ روٹی وغیرہ تو خادمہ پکا لیتی لیکن سالن وہ ہمیشہ خود پکاتی تھیں اس میں میاں کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھتی تھیں۔

سلیقہ شعاری میں وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ ایک رات کو چند مہمان آگئے گرم گرم

کھانا ان کے سامنے رکھا گیا اور پھر جب تک وہ کھاتے رہے گرم گرم روٹیاں برابر اندر سے آتی رہیں۔ اس وقت گھر میں خادمہ بھی موجود نہیں تھی۔ سید ابوالاعلیٰؒ کو حیرت ہوئی کہ اتنی ڈھیر ساری گرم روٹیاں کیسے آرہی ہیں۔ اندر جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اماں بی نے ایک بڑے گھڑے کو توڑ کر اس کا پیندا چولھے پر رکھا ہوا ہے اور اسے توا بنا کر بیک وقت تین چار روٹیاں اس پر ڈال کر پکاتی جارہی ہیں۔

ایک اور موقع پر اچانک رات کو مہمان آگئے اور آتے ہی انہوں نے چائے کی فرمائش کی۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں چائے کی پتی موجود نہ تھی۔ سید ابوالاعلیٰ نے والدہ سے چائے کے لیے کہا تو معلوم ہوا کہ پتی بالکل ختم ہے تاہم والدہ نے ان سے کہا کہ تم فکر نہ کرو چائے مہمانوں کو مل جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے نہایت عمدہ چائے تیار کر کے بھیج دی۔ مہمان چائے پی کر خوش ہو گئے۔ بعد میں تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ اماں بی نے صحن میں موجود سرکنڈوں کے چھپر (جس کے نیچے کھانا پکایا جاتا تھا) کی دھواں دھار چھال اتار کر ململ کے کپڑے کی پوٹلی بنائی اور دار چینی ملا کر دودھ اور پانی کے آمیزے میں ڈال دی۔ اس طرح بسکٹی رنگ کی لذیذ چائے تیار ہو گئی۔

اماں بی کی زندگی کا ایک تابناک پہلو ان کا ذوقِ عبادت تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر پہلے نماز پڑھتیں اور پھر کم از کم ایک پارے کی تلاوت بلند آواز سے کرتیں۔ چرخہ کاتنے کی بھی عادت تھی۔ بعض دفعہ کسی بزرگ کے مزار پر جا کر دیر دیر تک قرآن خوانی کرتی رہتیں۔ اولیاء اللہ سے ان کو بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ نماز روزے کی اخیر دم تک سخت پابند رہیں اوراد و وظائف کو بھی کبھی ترک نہ ہونے دیا۔ راتوں کو بھی اٹھ اٹھ کر عبادت کیا کرتی تھیں۔

سید احمد حسنؒ سنہ ۱۹۲۰ء میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے بیوگی کے ۳۷ سال نہایت صبر و استقامت اور مومنانہ ضبط و وقار کے ساتھ اپنے بیٹوں کے پاس گزارے۔ فیاضی یا دریا دلی، خدمتِ خلق، سادگی، قناعت، درس و تدریس، تبلیغِ دین، صبر، حوصلہ اور شگفتہ مزاجی ان کی کتابِ سیرت کے نمایاں ابواب ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک بار یہ واقعہ بیان کیا کہ جب ہم حیدرآباد میں تھے ایک دفعہ ہمارے مکان کے سامنے سے چھ سات گدھے گزرے جن پر خربوزے لدے ہوئے تھے۔ والدہ صاحبہ نے گدھوں کے مالک سے معاملہ طے کرکے تمام خربوزے خرید لیے اور گھر میں ڈھیر لگوا کر تمام محلے میں بانٹنے شروع کر دیئے یہاں تک کہ محلے کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں اس دن خربوزے نہ پہنچ گئے ہوں۔ اسی طرح ان کے ہاں کوئی خاص چیز پکتی تو جب تک اڑوس پڑوس کے گھروں کو اس میں سے بھیج نہ لیتیں، خود نہ کھاتیں۔

ایک مرتبہ اپنے کسی ملنے والے کے بارے میں انہیں معلوم ہوا کہ وہ مقروض ہیں مگر تنگدستی کی وجہ سے قرض واپس نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف قرضخواہ قرض کی واپسی کا شدید تقاضا کر رہا ہے۔ اماں بی فوراً ان کے پاس گئیں اور چپکے سے ان کو اتنی رقم دے دی جس سے وہ قرض ادا کر سکتے تھے۔

وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد پر ہر وقت کمربستہ رہتی تھیں۔ ان لوگوں کی خدمت کرکے ان کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ اگر کبھی وہ خالی ہاتھ ہوتیں اور کوئی حاجتمند ان کے پاس پہنچ جاتا تو کسی سے قرض لے کر بھی اس کی ضرورت پوری کر دیتیں۔ سید احمد حسنؒ کی زندگی میں ان کے پاس محلے اور دور و نزدیک کی حاجت مند خواتین کا میلہ لگا رہتا تھا۔ وہ ہر ایک کی حاجت پوری کرتیں اور کسی کو خالی ہاتھ واپس نہ بھیجتیں۔

سادگی کا یہ عالم تھا کہ فاخرہ لباس سے ہمیشہ نفور رہیں۔ زندگی کے آخری دس پندرہ سالوں میں تو وہ نئے کپڑوں سے بالکل اجتناب کرنے لگی تھیں۔ فرماتی تھیں، مجھے نئے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے میں تو چند دن کی مہمان ہوں آج گئی کہ کل گئی۔

طبیعت پر قناعت کا اس قدر غلبہ تھا کہ تھوڑی سے تھوڑی اور معمولی سے معمولی چیز سے مطمئن اور راضی ہو جاتی تھیں۔ کبھی کسی عمدہ یا زیادہ چیز کی خواہش نہ کرتی تھیں اگر کبھی ان کے لیے بطورِ خاص کوئی اچھی چیز مہیا کی جاتی تو خوش ہونے کے بجائے آزردہ ہو جاتی تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ جب سب لوگ کھانا کھا چکتے تو وہ ہنڈیا سے بچا کھچا سالن لے کر روٹی کھا لیتیں۔ پرتکلف غذاؤں سے مطلق کوئی رغبت نہ تھی۔

۱۹۴۴ء میں اماں بی مستقل طور پر مولانا سید ابوالاعلیٰؒ کے پاس دارالاسلام میں آگئیں تو ان کی خواہش پر ایک الگ مکان مولانا کے مکان کے سامنے ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ انہوں نے ایک تو اس میں گھر بارٹی کا اچھا خاصا انتظام کر لیا اور دوسرے اسے قرآنِ حکیم کی تعلیم کا مکتب بنا دیا۔ اس مکتب میں دارالاسلام کی بچیوں کے علاوہ سرنا، جمال پور اور دوسری نواحی بستیوں کی بچیاں بھی پڑھنے کے لیے آتی تھیں۔ اماں بی ان بستیوں میں وقتاً فوقتاً خود بھی نکل جاتیں اور لوگوں کے گھروں پر جا کر خواتین کو دین کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتیں اور بچیوں کو پیار اور محبت سے جمع کر کے اپنے مکتب کا شاگرد بناتیں۔ قرآنِ کریم کی تعلیم دینے کا شوق انہیں عمر بھر رہا۔ حیدر آباد، دارالاسلام، پٹھان کوٹ، لاہور جہاں بھی رہیں، ہمسایوں کی بچیوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتی رہیں اور ساتھ ہی ان کی تربیت و تادیب کا خیال بھی رکھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ اہلِ خاندان کے ساتھ لاہور آگئیں، یہاں وہ اکثر و بیشتر بڑے بیٹے سید ابوالخیر کے مکان میں رہیں۔ اس مکان کے آس پاس کے مکانات کی خواتین اور بچیوں کے لیے اماں بی کی ذات نعمتِ عظیم ثابت ہوئی کیونکہ ان کی بدولت وہ قرآنِ پاک کی نعمت سے مالا مال ہو گئیں۔ کبھی کبھی وہ حیدر آباد کا خاص پکوان "کرپا پاتھ" پکواتیں اور اس میں سے پڑوسیوں کو التزام کے ساتھ حصہ بھجواتیں۔ ہر سال ایک مرتبہ "شب دیگ" پکوانے کا بھی معمول تھا۔ اس میں بھی جب تک پڑوسیوں اور بیٹوں کے احباب اور رفقاء کو شریک نہ کر لیتیں انہیں کھانے میں مزہ نہ آتا۔

۱۹۵۳ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو قادیانی مسئلے کے سلسلہ میں فوجی عدالت نے موت کی سزا سنائی تو اماں بی نے کمال صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ جناب اخلاق احمد دہلوی راوی ہیں کہ ـــــ "اس زمانے میں اماں بی، سید ابوالخیر اور ان کے ایک خالہ زاد بھائی ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔ اماں بی کے یہ بھانجے اپنی خالہ اماں سے بہت ہلے گلے رہتے تھے۔ انہوں نے باہر سے آ کر یہ خبر بڑی بے دردی سے اماں بی کو ان الفاظ میں سنائی "خالہ اماں! منے کو سزائے موت سنا دی گئی"

اماں بی اس وقت دستر خوان پر بیٹھی میری بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ یہ کہہ کر برابر کھانے میں مشغول رہیں کہ اللہ کا مال ہے جس طرح چاہے لے لے — جب وہ صاحب اٹھ کر چلے گئے تو میں نے کہا، آپ اس خبر وحشت اثر کے بعد کھانا کیسے کھاتی رہیں — انہوں نے فرمایا، یہی تو وہ بدبخت چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ جائے۔"

اماں بی کو ان کے پوتوں پوتیوں بلکہ ان کے دوسرے اہل خاندان نے بھی ان کی کبرسنی کی وجہ سے دادی اماں کے خطاب سے معروف کر رکھا تھا۔ جب کسی کے منہ سے دادی اماں کا لفظ نکلتا تو سننے والوں کے ذہن میں انہی کی شخصیت جھلک جاتی تھی۔ اڑوس پڑوس کی خواتین بھی انہیں دادی اماں کے لقب سے یاد کرتی تھیں۔

اماں بی کی زندگی کا ایک خاص پہلو ان کی شگفتہ مزاجی تھی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ایک قریبی رفیق مولانا خلیل حامدی بیان کرتے ہیں کہ "دادی اماں بہت ملنسار اور خوش مزاج تھیں ان کا دائرۂ تعلقات بہت وسیع تھا اور جو بھی ان سے ملتا تھا وہ بہت جلدی ان سے مانوس ہو جاتا تھا ان کے منہ بولے بیٹوں، بیٹیوں، بہنوں، بھانجیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ خود بھی وہ ان کا شمار نہ بتا سکتی تھیں۔ بچے ہمیشہ ان کے ساتھ لگے رہتے تھے اور وہ طرح طرح کی دلچسپ باتوں سے ان کا دل بھی خوش کرتی تھیں اور اپنا بھی۔ آخری زمانے میں ضعیفی اور بیماری کے باوجود ان کے مزاج میں کسی قسم کا چڑچڑاپن پیدا نہ ہوا۔ غفلت میں پڑے پڑے جب ذرا ہوش آجاتا تو کوئی نہ کوئی ہنسنے ہنسانے کی بات کر دیتی تھیں۔ رنجیدہ ہونا اور رنجیدہ کرنا ان کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے والا اپنے اندر ایک عجیب انبساط محسوس کرتا تھا جو عورتیں دیر کے بعد ان سے ملتیں، ان سے وہ شاکی رہتی تھیں۔" (روزنامہ تسنیم لاہور ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بیٹے جناب محمد فاروق مودودی اپنی دادی

جان کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"وہ بہت ہی درویش صفت خاتون تھیں۔ ایک ایسی خاتون جن کو دنیا کی کسی بھی چیز سے ہم نے تو کوئی دلچسپی نہ دیکھی۔ وظیفوں اور نماز میں مصروف رہتیں۔ بڑی شاکر اور خوش خلق تھیں۔ ایک چیز جو ہم نے ہمیشہ محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان کا حافظہ بڑا زبردست تھا، دوسری بات یہ تھی کہ اگر آپ ان سے خود بات کریں تو بہت اچھی طرح جواب دیتی تھیں البتہ انہیں باتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔ عام خواتین کی مانند وہ باتونی نہ تھیں لیکن اگر کوئی بات کرتا تو ان کے جواب میں ایک خاص قسم کا وزن ہوتا۔ ان کی گفتگو کے طریقے اور باوزن گفتگو کے باعث چاہے وہ کسی بھی مجلس میں ہوتیں، میر مجلس وہی ہوا کرتی تھیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ بڑی رحم دل اور بہت ہی مخیر خدا ترس خاتون تھیں۔ ہر شخص کی اپنی استعداد سے بڑھ کر مدد کیا کرتیں۔ جب بھی کوئی آتا، دادی اماں کے پاس جانا اس کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ دادی اماں اس سے مل کر بڑی خوش ہوا کرتی تھیں۔ وہ اپنے کونے میں بیٹھی ہوتیں تو ان کی شخصیت کا وزن ہر جگہ محسوس ہوتا تھا۔ ہم نے اپنی والدہ کو بھی ان کا انتہائی احترام اور انتہائی عزت اور ان سے انتہائی محبت کرتے دیکھا۔ خود ابا جان کو ان کے معاملے میں بے حد تعظیم اور بے حد عزت و محبت کا سلوک کرتے دیکھا۔ جب وہ کہیں دور سے واپس آتے تو سب سے پہلے دادی اماں کے پاس جاتے، جیل سے آتے تو بھی سب سے پہلے دادی اماں کے پاس جاتے۔" (قومی ڈائجسٹ۔ جنوری ۱۹۸۰ء)

مولانا خلیل حامدی لکھتے ہیں کہ:

"مولانا (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کے گھر میں ساس بہو کی کشمکش کبھی نہیں پائی گئی۔ سوتیلی اور سگی سب بہوؤں سے دادی اماں کا برتاؤ اپنی بیٹیوں کا سا رہا۔

مولانا کے والد مرحوم کے بعد دادی اماں نے اپنے آپ کو گھر کے انتظام سے بالکل بے تعلق کر لیا تھا۔ ان کی بہوئیں ان کے بیٹوں کے گھر کی مختار رہیں۔ اس وجہ سے کبھی ساس اور بہوؤں کے درمیان کشمکش پیدا نہیں ہوئی۔" (روزنامہ تسنیم لاہور۔ ۷ دسمبر ۱۹۵۶ء)

اماں بی کی صحت بالعموم اچھی رہتی تھی۔ چھوٹے موٹے عوارض کو بڑھاپے کے زمانے میں بھی خاطر میں نہ لاتی تھیں اور معمول کے مطابق چلتی پھرتی رہتی تھیں۔ پرہیزی غذاؤں سے انہیں زندگی بھر نفور رہا۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں اماں بی کو اسہال کی شکایت ہو گئی۔ اس تکلیف نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ وہ صاحبِ فراش ہو گئیں۔ علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی مگر چنداں افاقہ نہ ہوا۔ شدتِ علالت میں ایک دن مولانا ابوالاعلیٰ حکیم محمد شریف صاحب کو لے کر آئے اور انہیں بتایا کہ حکیم شریف صاحب آئے ہیں۔ برجستہ جواب دیا، نہ بیٹا نہ، اب نہ کسی شریف کی ضرورت ہے نہ کسی بدمعاش کی، اب تو دم رخصت ہے۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۶ء کی صبح سے بی اماں کی تکلیف بہت بڑھ گئی اور نظامِ ہضم نے بالکل جواب دے دیا۔ ۵ اور ۶ دسمبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب کو دو بجے اس عظیم خاتون نے ۸۵ برس کی عمر میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وفات کے وقت وہ اپنے بڑے فرزند مولانا ابوالخیر مودودیؒ کے مکان پر تھیں۔ مولانا خلیل حامدی کا بیان ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیوں میں دادی اماں کے حلق سے کراہنے کی جو آوازیں نکلتی رہیں ان میں سے ہر آواز اللہ اللہ کا نغمہ الاپتی رہی اور جب زندگی کا آخری سانس نکلا تو اللہ کے ذکر سے معمور ہو کر نکلا —— رہے نام اللہ کا ——

(روزنامہ "تسنیم" ۱۱ دسمبر ۱۹۵۶ء)

(ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور۔ جنوری ۱۹۸۰ء)

محترمہ فاطمہ جناحؒ (مادرِ ملت)

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی سب سے چھوٹی بہن تھیں۔ اصل نام فاطمہ بائی تھا لیکن انہوں نے فاطمہ جناح کے نام سے شہرت پائی۔ والد کا نام جناح پونجا اور والدہ کا سکینہ میٹھی بائی[1] تھا۔ قائدِ اعظمؒ کے علاوہ محترمہ فاطمہ جناح کے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کے نام یہ تھے:۔

بندے علی، احمد علی، رحمت بائی، مریم بائی اور شیریں بائی۔

ان کا ایک اور بھائی بھی تھا جو سب بہن بھائیوں سے چھوٹا تھا اسے پیار سے "بچوں بھائی" کہا جاتا تھا وہ بہت ہی چھوٹی عمر میں فوت ہوگیا۔

محترمہ فاطمہ جناح ابھی بہت کم سن تھیں کہ ۱۸۹۳ء میں ان کی والدہ فوت ہوگئیں۔ چند سال بعد ۱۹۰۱ء میں والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً نو دس سال کی تھی۔ بڑے بھائی قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے چھوٹی بہن کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور ان کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ پہلے انہوں نے ان کو باندرہ کانوینٹ میں داخل کرایا۔ چند سال بعد وہ میٹرک کی تعلیم کے لیے کھنڈالا ہائی اسکول میں داخل ہوئیں۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہوکر پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے سینیئر کیمبرج کا امتحان دیا۔ پھر کلکتہ جاکر انہوں نے ڈاکٹر احمد ڈینٹل کالج میں داخلہ لیا اور بیچلر آف ڈینٹل سرجری (بی ڈی ایس)

---

[1] جنابِ ضوان احمد نے اپنی کتاب "قائدِ اعظم۔ ابتدائی تیس سال" میں قائدِ اعظم کی والدہ کا نام شیریں بائی عرف میٹھی بائی لکھا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی تصنیف "میرا بھائی" میں اپنی والدہ کا نام میٹھی بائی لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک نام ان کے والدین نے رکھا ہو اور دوسرا سسرال والوں نے۔

کی ڈگری حاصل کی اور بمبئی آکر ایک ڈینٹل کلینک کھولا لیکن چند سال بعد جب قائدِ اعظمؒ کی اہلیہ رتن بائی انتقال کر گئیں تو محترمہ فاطمہ جناح نے اپنا کلینک بند کر دیا اور اپنے آپ کو بھائی کی خدمت اور مدد کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ قائدِ اعظمؒ نے ایک مرتبہ فرمایا "میری سیاست کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے ایک میرا ٹائپ رائٹر اور دوسری فاطمہ (جناح)"۔ قائدِ اعظمؒ کو اپنی یہ بہن بہت عزیز تھیں اور وہ سفر و حضر میں ہمیشہ ان کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس قائدِ اعظمؒ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تو محترمہ فاطمہ جناح پہلی مرتبہ اس میں شریک ہوئیں۔ اس کے بعد وہ جدوجہدِ آزادی کے نہایت کٹھن اور نازک دور میں اپنے مشفق بھائی کی ہر طرح دیکھ بھال کرتی رہیں۔ انہوں نے مسلم خواتین کی تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی ترقی کے لیے بے انتہا کام کیا وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے شعبۂ خواتین کی سرپرست تھیں۔ قائدِ اعظمؒ نے اگست ۱۹۴۷ء میں کراچی کلب میں تقریر کرتے ہوئے محترمہ فاطمہ جناح کی خدمات کا یوں اعتراف کیا:

> "مس فاطمہ جناح میرے لیے حوصلہ افزائی اور تقویت کا مستقل ذریعہ ہیں۔ جن دنوں اس بات کا خطرہ تھا کہ انگریز حکومت مجھے گرفتار کر لے گی یہ میری بہن ہی تھی جس نے میرا حوصلہ بلند رکھا اور اس وقت جب انقلاب رونما ہونے کو تھا، انہوں نے امید افزا باتیں کیں اور میری صحت کا ہمیشہ بہت خیال رکھا۔"

محترمہ فاطمہ جناح نے بے پناہ خلوص، لگن اور اعتماد کے ساتھ تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا اور اپنے آپ کو اپنے عظیم بھائی کا دست و بازو ثابت کیا۔ جس صوبے میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوتا اس کے ساتھ خواتین کا اجتماع بھی منعقد ہوتا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح ان جلسوں سے خطاب فرماتیں اور خواتین کو تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لینے کی تلقین کرتیں۔ ان کو اپنے نصب العین

کی صداقت پر پختہ یقین تھا۔ ان کے عزم اور حوصلے نے مسلمان خواتین کو ولولۂ تازہ عطا کیا اور انہوں نے بھی مردوں کے شانہ بشانہ پاکستان کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ چنانچہ ایک دفعہ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ پاکستان بنانے میں جن عناصر نے میرا ساتھ دیا ان میں فاطمہ جناح سرِ فہرست ہیں۔ شب و روز کی لگاتار محنت کی وجہ سے قائدِ اعظمؒ میں علالت کے آثار نمودار ہوئے تو محترمہ فاطمہ جناح نے ہر گھڑی ان کے آرام اور علاج کا خیال رکھا اور ان کے آخری لمحات تک برابر ان کی نگہداشت کرتی رہیں۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائدِ اعظمؒ نے پیکِ اجل کو لبیک کہا تو محترمہ فاطمہ جناح کی زندگی کا نہایت تلخ اور پُر آشوب دَور شروع ہوا۔ وہ فطرتاً بڑی نڈر، دلیر، حق گو اور جمہوریت پسند واقع ہوئی تھیں۔ اگر انہیں جاہ و منصب کی حرص ہوتی تو اربابِ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملا کر سب کچھ حاصل کر سکتی تھیں لیکن جب انہوں نے لوگوں کو قائدِ اعظمؒ کے اصولوں سے انحراف کرتے دیکھا تو پوری قوت سے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی آواز کو دبانے کی پوری کوشش کی گئی اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہونے پر مجبور ہو گئیں لیکن جب قوم کو ایک آمر[1] کی قاہری کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کی ضرورت پڑی تو وہ پیرانہ سالی کے باوجود جرأت اور ہمت کی علامت بن کر ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کے لیے میدانِ سیاست میں آ گئیں۔ انہوں نے پورے ملک (مغربی اور مشرقی پاکستان) کا طوفانی دورہ کیا۔ بیسیوں جگہ بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا اور سارے ملک میں جمہوریت کی روح پھونک دی۔ صدارتی انتخاب میں فریقِ مخالف کو کس طرح کامیابی حاصل ہوئی، یہ ایک الگ داستان ہے۔ اس

---

[1] فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم

انتخاب کے بعد وہ ایک بار پھر سیاسی طور پر گوشہ نشین ہو گئیں البتہ سماجی اور فلاحی کاموں کی سرپرستی جاری رکھی۔ آخر وہ وقت آپہنچا جس کا ہر ذی روح کو ایک دن سامنا کرنا ہے۔ ۹ جولائی ۱۹۶۷ء کی صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر ابدی نیند سوئی پڑی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ نے ساری زندگی تجرد کی حالت میں گزاری۔ ان کی ملی خدمات کی بناء پر قوم نے انہیں خاتونِ پاکستان اور مادرِ ملت کے خطاب دیئے تھے۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد انہیں جو ہر دلعزیزی نصیب ہوئی اس سے پہلے شاید ہی کسی خاتون کے حصے میں آئی ہو۔ اصول پسندی، حب الوطنی، غیرت مندی، دیانت داری، وقار، متانت، حق گوئی اور بے باکی محترمہ فاطمہ جناحؒ کی کتابِ سیرت کے نمایاں ابواب ہیں۔ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنے مبنی برحق موقف سے دست بردار ہونا گوارا نہ کیا اور قوم کی صحیح سمت میں رہنمائی کرتی رہیں۔ ایسی بلند ہمت خواتین صدیوں کے بعد کسی قوم میں پیدا ہوتی ہیں۔

(قائدِ اعظمؒ کے آخری تیس سال، محترمہ فاطمہ جناح مادرِ ملت، قائدِ اعظم جناح وغیرہ)

حافظہ حمیدہ بیگمؒ

محترمہ حافظہ حمیدہ بیگمؒ ۱۹۲۵ء میں رسول نگر ضلع گوجرانوالہ کے ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد حکیم محمد نذیرؒ حافظِ قرآن، اونچے درجے کے عالمِ دین اور ایک قابل طبیب تھے۔ وہ بیٹی کی پیدائش سے تین ماہ بعد فوت ہو گئے اور محترمہ حمیدہ بیگم نے اپنے چچا کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ نو سال کی عمر میں ان کی شادی موضع کیلیانوالہ کے ایک دینی گھرانے کے ہونہار نوجوان (مولانا) عبدالرحمٰن کیلانی سے ہو گئی۔ تحصیلِ علم کا شوق محترمہ حمیدہ بیگم کی گھٹی میں پڑا تھا۔ سسرال میں آکر اس شوق نے اور جلا پائی اور انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے سسرال کے اہلِ علم بزرگوں سے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ تین بچے ہوتے ہوئے بھی قرآن پاک حفظ کیا اور پھر اس کا ترجمہ پڑھا۔ تبلیغ دین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا۔ ۱۹۵۵ء میں اپنے شوہر کے ساتھ کیلیانوالہ سے لاہور منتقل ہوئیں تو وہاں (محلہ وسن پورہ میں) قوم کی بچیوں کے لیے ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی جو اُن کی قربانیوں اور کوششوں کی بدولت ایک مثالی مدرسہ بن گیا۔ محترمہ حمیدہ بیگم نہایت عابدہ زاہدہ اور خوفِ خدا رکھنے والی خاتون تھیں۔ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے الٰہی کے حصول میں گزارنے والی اس مثالی خاتون نے ۹ فروری ۱۹۸۶ء کو وفات پائی۔ (روایت محترمہ نزہت بتول بنت حافظہ حمیدہ بیگم)

آپا فاطمۃ الکبریٰ [۱]

برِ کوچک پاک و ہند کے نامور خوشنویس منشی محمد الدین مرحوم [۱] کی صاحبزادی تھیں۔ ۱۳۰۱ھ (۸۴-۱۸۸۳ء) میں پیدا ہوئیں۔ قدرت نے ان کو خطاطی کے فنِ شریفہ سے نوازا اور وہ خطِ نسخ و نستعلیق کے یکتائے روزگار خوشنویسوں میں شمار ہوئیں۔ اس فن میں وہ اپنے باکمال والد کی شاگرد تھیں۔ ان کی شادی میترانوالی ضلع سیالکوٹ کے ایک شریف گھرانے میں ہوئی۔ شوہر سردار محمد سعید ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں وفات پا گئے۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بیوگی کا سارا طویل زمانہ انہوں نے اپنے والدین اور بھائیوں بھتیجیوں کے ساتھ بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب دلی اُجڑی تو وہ اپنے چھوٹے بھائی خطاط العصر منشی محمد یوسف دہلوی (مرحوم) کے ساتھ ہجرت کر کے کراچی آ گئیں۔ نہایت پاکباز، عبادت گزار، خدا ترس، مخیّر، ہمدردِ خلائق

---

[۱] منشی محمد الدین مرحوم جنڈیالہ ڈھاب والا (ضلع گوجرانوالہ) کے رہنے والے تھے تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں جب ان کا عہدِ شباب تھا دلّی چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اولاد اپنے آپ کو دہلوی کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگی۔ منشی صاحب نے فنِ خطاطی (نسخ اور نستعلیق دونوں) میں بڑا نام پیدا کیا اور اپنے دَور کے یگانۂ روزگار خطاطوں میں شمار ہوئے۔ وہ عالم اور صحافی بھی تھے اور بہت نیک سیرت بزرگ تھے۔ ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں جب خانۂ کعبہ کا غلاف پہلی مرتبہ ہندوستان میں تیار ہوا تو اس پر آیاتِ کریمہ کی خطاطی کا شرف منشی محمد الدینؒ ہی کو حاصل ہوا۔ دلّی کے نامور عالمِ دین مفتی کفایت اللہؒ اور اردو کے نامور شاعر نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ مرحوم (جانشین داغؔ دہلوی) بھی بہت اچھے خطاط تھے۔ انہوں نے یہ فن منشی صاحب موصوف ہی سے سیکھا تھا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور باپردہ خاتون تھیں۔ اپنے اعزہ و اقارب کو دل و جان سے عزیز رکھتی تھیں اور ان کے دُکھ سُکھ میں برابر شریک رہتی تھیں۔ انہوں نے اپنی ایک بھتیجی میمونہ اختر (بنتِ منشی عبدالقدیر مرحوم) کو ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں گود لے لیا تھا۔ ان کی پرورش اور تربیت بڑی محبت اور شفقت سے کی۔ جب وہ بڑی ہوئیں تو ان کی شادی بڑے اہتمام سے سیالکوٹ کے ایک شریف گھرانے کے ایک لائق رکن حکیم غلام حسن قریشی (مرحوم) متسند طبیہ کالج دہلی سے کر دی۔ محترمہ میمونہ اختر کا بیان ہے کہ :۔

"جب میں تقریباً ایک سال کی تھی کہ میری والدہ فوت ہو گئیں۔ پھوپھی صاحبہ نے جنہیں سب بڑی آپا کہتے تھے، مجھے تو پہلے ہی گود لے لیا تھا۔ اب میرے (بِن ماں کے) بھائیوں کے ساتھ بھی ان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

منشی صاحب کی شادی سمبڑیال (ضلع سیالکوٹ) کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کے خُسر ایک صاحبِ طریقت بزرگ تھے اور بیسیوں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ اہلیہ محترمہ حسن بیگم بہت دیندار اور پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ منشی صاحبؒ نے قیامِ پاکستان سے چند سال پہلے دِلّی میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے پیچھے تین بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں ان کے نام یہ ہیں :
منشی عبدالقدیرؒ، جناب ضیاء الدین احمد (برنیؒ)، منشی محمد یوسف دہلویؒ، (آپا) فاطمۃ الکبریٰؒ، (آپا) آمنہ بیگمؒ۔

منشی عبدالقدیر نے بھی اپنے والدِ ماجد سے کتابت سیکھی تھی مگر انہوں نے سیاست اور صحافت میں نام پایا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۷ء تک تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور کانگریس میں شامل رہے اور سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں متعدد بار جیل کاٹی۔ زندگی میں کئی اخبار جاری کیے اور کئی پریس قائم کیے۔ ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۲ء میں انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ "میسرز عبدالقدیر والاخوان" کے نام سے قائم کیا تھا اس کی نسبت سے "والاخوان" ان کے نام کا لاحقہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شفقت و رافت میں پہلے سے اضافہ ہوگیا ۔ بڑی آپا کتابت کے علاوہ کپڑے پر کڑھائی کے فن میں بھی یدِ طولیٰ رکھتی تھیں —— نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ نے (جو خود بھی کڑھائی کے فن میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے) بڑی آپا کی کڑھائی کے بے حد مداح تھے ۔ بڑی آپا نے مجھے بھی کتابت اور کڑھائی کے فن سکھائے ۔ نواب سائلؔ نے ایک مرتبہ میری کڑھائی دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور اس کی بہت تعریف و تحسین کی ۔ بڑی آپا بہت پرہیز گار اور دردمند خاتون تھیں اور مخلوقِ خدا کی خدمت کرنے میں روحانی مسرّت محسوس کرتی تھیں ۔ اپنے غریب

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بن گیا ۔ انھوں نے ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء میں دلی میں بعمر ۹۲ سال وفات پائی ۔ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں ۔

جناب ضیاء الدین احمد برنیؔ مشہور صحافی ، ادیب ، مترجم اور مصنف تھے ۔ بڑے بھائی منشی عبدالقدیر کی وفات کے چند ماہ بعد ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء ہی میں کراچی میں وفات پائی ۔ بہت سی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں ان میں "عظمتِ رفتہ" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے ۔

منشی محمد یوسف (بقول مولانا ماہر القادریؒ) پاکستان اور ہندوستان کے سب سے بڑے خطاط تھے ، اپنے وقت کے میر پنجہ کش — منشی محمد یوسف کے اندازِ کتابت کو دہلوی کہیں یا کچھ اور بہر صورت وہ اس میں منفرد تھے ۔ ان کی کتابت کا بانکپن اور نفاست دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں ۔ نہایت سادہ مزاج بے نیاز اور درویش صفت انسان تھے حقیقی معنوں میں اپنی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے ۔ غالباً ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء میں ایک تیز رفتار گاڑی کی چپیٹ میں آگئے اور اسی صدمہ سے وفات پائی ۔ محترمہ فاطمۃ الکبریٰ اس مضمون کا موضوع ہیں ۔ محترمہ آمنہ بیگم کی شادی ایک معزز گھرانے میں ہوئی ۔ شوہر کا نام محمد فاضل تھا جو فوج سے متعلق ایک سویلین افسر تھے ۔ محترمہ آمنہ بیگم نے غالباً ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء میں وفات پائی ۔

رشتہ داروں اور دوسرے حاجت مندوں کی اس طریقے سے مدد کیا کرتی تھیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔"

محترمہ فاطمۃ الکبریٰ کا خط انتہائی پختہ، پاکیزہ اور کمالِ فن کا آئینہ دار تھا۔ وہ برصغیر پاک و ہند کی پہلی خاتون ہیں جن کو پورے قرآنِ پاک کی کتابت کا شرف حاصل ہوا۔ وہ قرآنِ کریم کی کتابت ہمیشہ باوضو ہو کر بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسِ علی گڑھ (سنہ ۱۹۰۷ء) اجلاسِ سورت (سنہ ۱۹۱۸ء) میں اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ سنہ ۱۹۲۶ء میں ان کی کتابت کے نمونوں کو گرانقدر انعامات کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ متعدد دوسرے اسلامی اداروں نے بھی نقرئی اور طلائی تمغوں کی صورت میں ان کے کمالِ فن کا اعتراف کیا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں نظام دکن نے تاعمر وظیفہ مقرر کر دیا۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی ازراہِ قدردانی مرصع پہنچیاں عطا کیں اور وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ محترمہ فاطمۃ الکبریٰ نے ایک پنج سورہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا جو اُن کو بے حد پسند آیا تھا۔ ریاستہائے ٹونک، دتیا، مانادور، مانگرول جوناگڑھ وغیرہ نے بھی مختلف موقعوں پر انعامات سے نوازا۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمدؒ اور خان بہادر منشی ذکاء اللہ مرحوم ان کے کمالِ فن کے بے حد مداح اور قدردان تھے۔ مولوی فتح محمد جالندھری مرحوم کے ترجمہ والی حمائل شریف جو "فتح الحمید" کے نام سے مشہور ہے، اس کی کتابت محترمہ فاطمۃ الکبریٰ ہی نے کی۔ سنہ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے اردو ترجمہ اور موضح القرآن کے ساتھ انہوں نے ایک حمائل شریف لکھ کر خود ہی شائع کی۔

محترمہ فاطمۃ الکبریٰ کے بھتیجے جناب علاؤالدین خالد (ابنِ منشی عبدالقدیر مرحوم) کا بیان ہے کہ :-

"موصوفہ کی تمنا تھی کہ وہ معریٰ کلام پاک جلی حروف میں اس طرح لکھیں کہ وہ روایتی اسلوبِ نگارش کا بھی حامل ہو اور ساتھ ساتھ قاری

کے پڑھنے میں بھی آسانی کا موجب ہو سکتی اور جلی قلم میں یہ کلامِ پاک مع آٹھ پاروں کے ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے۔"

ظہورِ پاکستان کے موقع پر جب دلی میں مسلم کش فسادات پھوٹے تو محترمہ فاطمۃ الکبریٰ وہاں سے ہجرت کر کے کراچی آ گئیں۔ خوش قسمتی سے ان کے کتابت کردہ مذکورہ آٹھ پاروں کی کاپیاں اور پلیٹیں دلی پرنٹنگ پریس میں محفوظ رہ گئیں۔ بعد میں وہ پاکستان ہائی کمیشن کے ذریعے کراچی پہنچ گئیں اور اب جناب علاؤالدین خالد کی تحویل میں ہیں۔

جناب علاؤالدین خالد نے محترمہ فاطمۃ الکبریٰ کی وفات کے موقع پر ان کی عمومی زندگی کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا :-

"فاطمۃ الکبریٰ صاحبہ کو ابتدائی عمر ہی سے سماجی اور انسانی بہبود کے کاموں سے دلچسپی رہی ہے، اور فلاحی کاموں اور تحریکوں میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا ہے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والی خواتین میں مرحومہ لیڈی سر عبدالقادر اور بیگم اکرام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں پچھلے تیس سال سے موصوفہ کا دائرۂ عمل تبلیغی ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے زندگی وقف کر رکھی تھی۔ وہ انگریزی سامراج کی شدید مخالف تھیں۔ وہ اسرائیلی جارحیت کو امنِ عالم کے لیے ایک چیلنج تصور کرتی تھیں۔ کسی کام میں بھی سچائی کے خلاف مصلحت بینی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔"

محترمہ فاطمۃ الکبریٰ نے ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ (مطابق ۱۹ دسمبر ۱۹۶۷ء) کو منگل کے دن کراچی میں وفات پائی۔

(کتابی دنیا کراچی اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء،
مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

سیدہ خیر النساءؒ بہتر

برصغیر پاک و ہند کے نامور عالم دین اور مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی والدہ تھیں۔ والد کا اسم گرامی سید شاہ ضیاء النبیؒ تھا، جو ایک مرفہ الحال بڑے زمیندار ہونے کے باوجود اپنے وقت کے شیخ کامل تھے۔ ان سے بیسیوں انسانوں کو ایمان و احسان کی دولت، عمل بالشریعت اور اتباعِ سُنت کی توفیق حاصل ہوئی۔

سیدہ خیر النساءؒ کی ولادت تیرھویں صدی ہجری کے آخری عشرے میں رائے بریلی کے قریب "دائرہ شاہ علم اللہ" کی بستی میں ہوئی۔ والدین نے ان کی دینی تعلیم کا خاص اہتمام کیا۔ قرآن کریم حفظ کرایا گیا اور اس کے ساتھ ہی انہیں عربی فارسی اور اردو زبان کی تعلیم بھی بقدرِ ضرورت دی گئی۔ خاندان کے دستور کے مطابق ان کی تمام تعلیم گھر ہی میں ہوئی۔ ان کی شادی اپنے خاندان کی ایک دوسری شاخ کے ایک جوانِ صالح مولانا سید حکیم عبدالحئیؒ (فرزند مولوی حکیم سید فخر الدینؒ[1]) سے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں ہوئی۔ یہ حکیم سید عبدالحئیؒ کا عقدِ ثانی تھا۔ تین سال قبل ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء میں ان کی پہلی اہلیہ آٹھ سال کا ایک بیٹا (ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) چھوڑ کر فوت ہو گئی تھیں۔ سیدہ خیر النساءؒ کا پہلا پیام ان کے چچازاد بھائی کی طرف سے جو ضلع کے چھوٹے موٹے تعلقہ دار تھے، آچکا تھا، ان کی والدہ کا رجحان بھی اسی طرف تھا مگر سید شاہ ضیاء النبیؒ نے حکیم سید عبدالحئیؒ کو ترجیح دی حالانکہ دنیوی اعتبار سے

---

[1] مولوی حکیم سید فخر الدینؒ ایک فاضلِ یگانہ بزرگ تھے بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "وہ شعر و سخن، تاریخ و سیر کے ماہر اور داستانِ کہن کی بولتی زبان تھے"۔ انہوں نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں "سیرۃ السادات"، "سیرت علمیہ" اور "مہر جہانتاب"

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ بالکل غریب تھے۔ البتہ دولتِ علم و صالحیت سے مالا مال تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اہلیہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ:۔

"سید (عبدالحیؒ) جوانِ صالح، عالم اور ہونہار ہیں۔ میں ان پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ میرے نزدیک عزت اور امارت کی کوئی اہمیت نہیں، اصل دیکھنے کی چیز صلاحیت اور علم ہے۔"

بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "سیدہ خیر النساء نے شادی کے بعد شوہر کی دو بہنوں سیدہ شمس النساء اور سیدہ فاطمہ اور سوتیلے فرزند سید عبدالعلی کو اس طرح اپنی تربیت اور شفقت میں لیا کہ وہ اپنی حقیقی ماں کو بھول گئے۔"

سیدہ خیر النساء کو شروع شروع میں بہت عسرت کے دن گزارنے پڑے مگر بعد میں حالات بدل گئے اور گھر میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگیا۔ ان کے شوہر ایک کامیاب طبیب اور ندوۃ العلماء کے ناظم بھی تھے۔ ان سے سیدہ خیر النساء کی تین اولادیں ہوئیں۔ سیدہ امۃ العزیز، سیدہ امۃ اللہ (عائشہ تسنیم) اور سید (ابوالحسن علی)

افسوس کہ سیدہ خیر النساء اور حکیم سید عبدالحیؒ کا زمانۂ رفاقت بہت مختصر رہا۔ ۱۸ جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ مطابق ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو حکیم صاحب وفات پا گئے۔ اس کے بعد سیدہ خیر النساء ۴۵ برس زندہ رہیں۔ بیوگی کا یہ طویل زمانہ انہوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کا شمار بھی سرآمدِ روزگار علماء و مصنفین میں ہوتا ہے۔ وہ عرصہ تک ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم رہے۔ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔ انہوں نے بہت سی معرکہ آرا تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں "تذکرۃ الابرار" "نزہۃ الخواطر" "گلِ رعنا" اور "یادِ ایام" (تاریخ گجرات) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ حکیم سید عبدالحیؒ کو حقیقی معنوں میں ایک فنا فی العلم انسان کہا جا سکتا ہے۔ نہایت نیک سیرت، متدین اور متقی آدمی تھے۔ ان کے مہتم بالشان علمی کارناموں پر پاک و ہند کے مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ گزارا۔ حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد سعادت مند عطا کی تھی۔ وہ ہمیشہ اطاعت گزار رہی اور ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ عمر کے آخری برسوں میں ان کی بصارت بالکل جاتی رہی مگر وہ ہمیشہ صابر و شاکر رہیں اور اللہ سے لو لگائے رکھی۔ ٦ جمادی الآخرہ ١٣٨٨ھ مطابق ٢١ اگست ١٩٦٨ء کو ان کا وقتِ آخر آپہنچا اور انہوں نے ٩٣ برس سے کچھ اوپر عمر پا کر پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے دن تدفین دائرہ شاہ علم اللہؒ کے خاندانی قبرستان میں ہوئی۔ سعادت مند فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ان کے مفصل سوانح حیات قلمبند کیے ہیں جو "ذکرِ خیر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ خیر النساءؒ ہر اعتبار سے ایک مثالی خاتون تھیں۔ دین سے محبت، توکل علی اللہ، خشیتِ الٰہی، صبر و شکر، شفقت و رأفت اور علم سے شغف ان کی کتابِ سیرت کے نمایاں ابواب ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک خاص پہلو تربیتِ اولاد ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس انداز سے کیا کہ وہ پکے اور سچے مسلمان بنیں اور مومنین و مومنات کی تمام خوبیوں کے حامل ہوں۔ لڑکیوں کو انہوں نے خود تعلیم دی اور لڑکوں کی اعلیٰ تعلیم کے دوران میں برابر ان کی نگرانی کرتی رہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:۔

"گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں۔ مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انہوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں۔ باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن دو باتوں میں وہ بہت سخت تھیں ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہل نہ برتتی تھیں۔ میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر کبھی سو گیا، خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو، اٹھا کر نماز پڑھوائیں اور نماز پڑھے

بغیر ہرگز نہ سونے دیتیں۔ اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بٹھا دیتیں۔

دوسری بات جس کا انہوں نے بڑا خیال رکھا یہ تھی کہ میں کسی پر ظلم نہ کرنے پاؤں اور کسی کا دل نہ دکھاؤں اور اگر کبھی کسی کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی کروں یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آؤں تو اس سے معافی مانگوں۔ اگر گھر میں کھانا پکانے والی لڑکے کو مارتا یا کسی کی توہین کرتا یا کسی کو ذلیل سمجھ کر کوئی سلوک کرتا تو وہ مجھے سزا بھی دیتیں اور مجھے اس سے معافی مانگنے پر مجبور کرتیں۔ اکثر یہ سزا صرف معافی مانگنے ہی کی صورت میں ہوتی۔ بچہ کی انانیت پر یہ بڑی ضرب ہے اور اس کے لیے بڑی گوشمالی۔ مجھے یاد نہیں کہ ایک واقعہ بھی ایسا گزرا ہو کہ والدہ صاحبہ کے علم میں میری کوئی زیادتی آئی ہو یا توہین اور دل دکھانے کا کوئی واقعہ پیش آیا ہو اور انہوں نے مجھے سزا نہ دی ہو اور مجھے "فریقِ ثانی" کو راضی کرنے اور معاف کرانے پر اصرار نہ کیا ہو۔

تیسری چیز جو مجھے خاص طور پر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مجھے اپنے خاندان کے بعض بزرگوں اور جلیل القدر ہستیوں کے نام اور کام سے واقف کراتی رہتیں۔ ان کے نام بڑے عظمت سے لیتیں، اور ان کے حالات سناتیں۔ یہ شخصیتیں ہمارے خاندان کی وہ دینی شخصیتیں ہوتیں جن کو دنیاوی جاہ و جلال اور کوئی خاص دولت و ثروت حاصل نہ تھی مگر دینی اور علمی حیثیت سے ان کا نام اور کام بہت روشن تھا۔ وہ اس پر زور دیتیں کہ اصل عزت اور باقی رہنے والی دولت یہی دین و علم کی دولت ہے۔

والدہ صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے دعا و مناجات کا وہ ذوق عطا فرمایا تھا جو اس زمانہ کے خاص بزرگوں ہی میں دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ اپنی اولاد کو بھی دعا کی تعلیم دیتیں اور دعا کا شوق دلاتیں۔ چنانچہ ہم بھائی

بہنوں کو انہوں نے بعض مختصر دعائیں یاد کرا رکھی تھیں۔"

(کاروانِ زندگی، خواتین اور دین کی خدمت)

جس زمانے میں مولانا ابوالحسن علی گھر سے دور تعلیم حاصل کر رہے تھے سیدہ خیر النساء ان کو وقتاً فوقتاً خط لکھتی رہتی تھیں جن میں بڑی قیمتیں نصیحتیں ہوتی تھیں۔ اسی لیے مولانا علی میاں نے ان خطوط کو "تربیتی خطوط" کا نام دیا ہے۔ ان خطوں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :۔

"علی! اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان سبھوں پر نظر کرو جنہوں نے علمِ دین حاصل کرنے میں زندگی گزار دی۔ ان کے مرتبے کیا تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب اور مولوی محمد امین صاحب مرحوم جن کی زندگی اور موت قابلِ رشک ہوئی کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی۔

یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ انگریزی مرتبے والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے مگر اس مرتبے کا کوئی نہیں، اس وقت بہت ضرورت ہے۔ ان کو انگریزی سے کوئی انس نہ تھا۔ یہ انگریزی میں جاہل تھے۔ یہ مرتبہ کیوں حاصل ہوا ——"

"قرض کبھی نہ لو، ہو تو خرچ کرو ورنہ صبر کرو۔ طالب علم یوں ہی علم حاصل کرتے ہیں۔ تمہارے بزرگوں نے بہت کچھ مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اس وقت کی تکلیف کو باعثِ فخر سمجھو — قرض کی عادت ہلاک کرنے والی ہے اگر وفائے وعدہ کرو تو کوئی حرج نہیں۔ صحابہ نے قرض لیا ہے مگر ادا کر دیا۔ ہم کون چیز ہیں علی، یہ بھی تمہاری سعادت مندی ہے کہ میری نصیحت پر عمل کرو۔"

"دیکھو ہمت سے زیادہ محنت نہ کرنا، اس موسم میں زیادہ محنت دماغ

قبول نہیں کر سکتا۔ دل و دماغ کی صحت ضروری ہے، اس کا زیادہ خیال رکھو جہاں تک ممکن ہو ایک ماہ کی محنت ایک دن میں نہ کرنا، اگر تم اس قدر محنت کرو گے تو پھر دنیا کیسے برتو گے۔ دنیا بھی برتنا عبادت ہے۔ ہمدردی اور حق پرستی یہ تمام باتیں خدا اور رسول کی خوشنودی کی ہیں۔"

سیدہ خیر النساء کو اللہ تعالیٰ نے نہایت موزوں طبیعت عطا کی تھی اور ان کے قلبِ خاشع میں سوز و گداز بھی ودیعت کیا تھا۔ اکثر حمدیہ اور دعائیہ اشعار کسی تردد کے بغیر موزوں کر لیتی تھیں۔ بہتر تخلص تھا۔ ان کے دعائیہ اشعار اور مناجاتوں کا جامع مجموعہ ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵) میں "بابِ رحمت" کے نام سے شائع ہوا بعد میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے اس کا انتخاب کلیدِ بابِ رحمت کے نام سے شائع کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

تیرا شیوہ کرم ہے اور مری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولیٰ تیرے در کے فقیر دل کی

ادھر بھی ابرِ رحمت آئے اور جھم جھم کے یوں برسے
کہ ہو سرسبز کھیتی ہم غریبوں بدنصیبوں کی

خزاں میں بھی شجر سرسبز ہو کر پھول پھل لائیں
ہو شہرت باغباں کی باغ کی غنچوں کی پھولوں کی

مناجات

سدا سے ترے مجھ پہ انعام ہیں
ہیں انعام بھی اور اکرام بھی

جو مانگا دیا، اور دیا بے طلب
پھری میں ترے در سے محروم کب

تھی جو کچھ مجھے فکر سب دور کی
میں لائی جو حاجت وہ منظور کی

ترے فضل کی کچھ نہیں انتہا
جو آیا ترے در پہ وہ خوش ہوا

تری شانِ رحمت سے ہے یہ بعید
پھرے در سے تیرے کوئی ناامید

کرم کر مرے حال پر بھی کریم!!
کہ ہے نام تیرا غفور و رحیم!!

مری سعی و کوشش نہ برباد کر
ترے در پہ آئی ہوں امداد کر

دعا جلد میری یہ ہو مستجاب
علیؒ ہو ترے فضل سے کامیاب

وہ ہو کامیابی جو ہو باسند
ہو ایسی سند جو کہ ہو مستند

نہ ہو فکر کوئی نہ رنج و تعب
تمنائیں بر آئیں میری یہ سب

خطاؤں پہ ان کے نہ کر تو نظر
یہ بندے ہیں تیرے تو ہی رحم کر

جہاں میں سداؒ دونوں پھولیں پھلیں
سدا یہ شریعت پہ قائم رہیں

یہ سب بہن بھائی رہیں شاد کام
جہاں میں ہو اقبال ان کا غلام

خزاں میں جو ہے آج فصلِ بہار
یہ سب فضل تیرا ہے پروردگار

یہ فصلِ بہاری رہے تا حیات
ہو بہتر کی بہتر حیات و ممات

"باب رحمت" کے علاوہ سیدہ خیر النساءؒ نے دو اور کتابیں بھی اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کے نام ہیں (۱) الدعا والقدر (۲) حسنِ معاشرت۔

قرآنِ کریم کی بہت اچھی حافظ تھیں اور بہت صحیح اور بڑی حد تک تجوید کے اصولوں کے مطابق پڑھتی تھیں۔ بعض علمائے فرنگی محلی کے فتوے کے مطابق ان کے خاندان میں خواتین بھی رمضان المبارک میں تراویح کی نماز با جماعت پڑھتی تھیں۔ حافظ خواتین ہی میں سے کوئی امام ہوتیں۔ کبھی کبھی یہ سعادت سیدہ خیر النساء کے حصے میں بھی آتی۔ (ان کی بہن، بھاوج، ایک نند اور ایک بھانجی بھی قرآنِ پاک کی حافظ تھیں) مولانا ابوالحسن علی لکھتے ہیں کہ: "والدہ صاحبہ کے قرآن مجید سنانے کا سلسلہ میرے شعور کے بہت بعد تک جاری رہا۔ میں کبھی دروازہ میں کھڑا ہو کر سنتا، ایسا معلوم ہوتا کہ پانی برس رہا ہے۔ صحتِ مخارج کے ساتھ روانی، پھر اس میں رقت و دردِ نسوانی، نورٌ علیٰ نور۔ (کاروانِ زندگی جلد اول و دوم۔ خواتین اور دین کی خدمت)

لہ مولانا ابوالحسن علی

لہ مولانا سید عبدالعلی اور مولانا ابوالحسن علی

سیدہ اَمۃُ اللہ تسنیمؒ

مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ (صاحب نزہتہ الخواطر و گلِ رعنا) اور سیدہ خیر النساءؒ کی صاحبزادی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔ ۲۰ جمادی الاول ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۸ جون ۱۹۰۸ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ خاندان میں ان کو سب عائشہ بی کی عرفیت سے جانتے اور پکارتے تھے۔ انہوں نے ساری تعلیم گھر ہی میں اپنی والدہ اور چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن ندوی سے حاصل کی جو قرآن پاک، اردو اور کسی قدر فارسی سے آگے نہ تھی۔ بعد میں انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی اور پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنیؒ کی مدد سے عربی میں اچھی خاصی استعداد بہم پہنچالی۔ مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ اس شوق نے ان کی علمی و ادبی معلومات میں بہت اضافہ کیا۔ ویسے بھی شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ گھر کے دینی علمی اور ادبی ماحول نے اس کو جلا بخشی، اور وہ ایک بہت اچھی ادیبہ اور نغز گو شاعرہ بن گئیں۔ انہوں نے اپنے والدِ گرامی کی مشہور تصنیف "گلِ رعنا" کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ وہ بڑی حد تک ان کو حفظ ہو گئی۔ اپنے والد کے پھوپھا منشی سید عبدالرزاق کلامی ٹونکی کی کتاب "صمصام الاسلام" ان کو بے حد عزیز تھی۔ یہ کتاب علامہ واقدیؒ کی عربی کتاب "فتوح الشام" کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اس میں تقریباً پچیس ہزار اشعار ہیں۔ ان کو پڑھ کر اسلامی حمیت بیدار ہوتی ہے اور خون میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ سیدہ امۃ اللہ مختلف تقریبات کے موقعوں پر یہ کتاب پڑھ کر دوسری خواتین کو سنایا کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور شعر گوئی میں اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب "سیرۃ عائشہؓ" بھی ان کو بہت پسند تھی اور انہوں نے اس کو حرزِ جان بنالیا تھا۔ کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ اپنا ایک چھوٹا سا کتب خانہ بنالیا تھا جس میں بہت اچھی اچھی دینی اور علمی و ادبی کتابیں جمع کی تھیں۔

علمی اور ادبی ذوق رکھنے کے علاوہ سیدہ امۃ اللہ امورِ خانہ داری، کشیدہ کاری، دست کاری اور سینے پرونے وغیرہ میں بھی بہت ماہر تھیں۔ یہ مہارت ان کی والدہ کی خاص توجہ کی مرہونِ منت تھی۔ گھر میں اکثر مہمان آتے رہتے۔ بعض اوقات وہ کافی تعداد میں ہوتے ان کے لیے کھانا تیار کرنا گھر کی اکیلی ملازمہ کے بس کا کام نہ تھا اس کا بوجھ سب سے زیادہ سیدہ امۃ اللہ پر پڑتا تھا۔ وہ یہ کام بڑی تندہی اور مستعدی سے انجام دیتی تھیں۔

گھر میں بیت بازی کا پرانا رواج تھا اس میں ان سے کوئی مشکل سے بازی لے جا سکتا تھا۔ بعد میں انہوں نے خاص اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جس میں اساتذہ کے منتخب اور پاکیزہ اشعار جمع کر دیئے۔

۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء میں ان کے سر سے والدِ ماجد کا سایۂ شفقت اٹھ گیا اس وقت ان کی عمر تقریباً پندرہ برس کی تھی تاہم والدہ، بڑے بھائی اور بڑی بہن کی بے پناہ شفقت نے ان کو سہارا دیئے رکھا۔

جمادی الاول ۱۳۴۵ھ (نومبر ۱۹۲۶ء) میں سیدہ امۃ اللہ کی شادی اپنے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہؒ کے فرزند مولانا سید ابوالخیر برقؒ سے ہوئی۔ ان سے تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ یہ تینوں بچے شیر خوارگی ہی میں فوت ہو گئے۔ بدقسمتی سے ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء میں میاں بیوی میں مستقل علیحدگی ہو گئی (اس کے حقیقی سبب کا علم خدائے علیم و خبیر ہی کو ہے بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سید ابوالخیر برق بہت گرم مزاج تھے اور ان کی طبیعت میں اپنی بات کے اونچا رہنے کا شدید داعیہ تھا) سیدہ

امۃ اللہؒ کے لیے یہ ایک جان لیوا صدمہ تھا مگر انہوں نے اسے اپنی قُوّتِ ایمانی، علمی مشاغل اور ذکرِ الٰہی کی مدد سے برداشت کیا اور باقی زندگی (جو ۳۳ برسوں پر محیط ہے) اپنی والدہ اور بھائیوں کے پاس بڑے صبر اور حوصلے سے گزاری۔

اس سانحہ کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ نے (ان کے ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے) مشورہ دیا کہ وہ امام نوویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "ریاض الصالحین" کا عربی سے اردو میں ترجمہ کر دیں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا مگر اللہ تعالیٰ نے سیدہ امۃ اللہؒ کو ہمت دی اور انہوں نے دن رات ایک کر کے تقریباً دو سال میں اس ضخیم کتاب کا اردو ترجمہ ذیلی عنوانات اور تشریحی عبارتوں کے ساتھ مکمل کر لیا۔ یہ ترجمہ ۸۷۲ صفحات پر مشتمل دو حصوں میں "زادِ سفر" کے نام سے شائع ہوا[1]۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد سیدہ امۃ اللہؒ کو اپنے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی اور والدہؒ کے ہمراہ ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء میں حجِ بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ حج سے واپس آنے کے بعد ان کا بیشتر وقت اپنی والدہ سیدہ خیر النساءؒ کی خدمت اور مدد

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے اپنی کتاب پرانے چراغ (حصہ دوم) کے صفحہ ۳۵۲ پر لکھا ہے کہ "اس وقت تک اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ یہ لکھتے وقت مولانا کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ "ریاض الصالحین" کو ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں عربی سے اردو میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ اس کے مترجم موضع کوم ضلع لدھیانہ (بھارت) کے رہنے والے ایک عالمِ دین مولوی احمد الدینؒ ابن شرف الدینؒ تھے۔ یہ ترجمہ انہوں نے بھی دو حصوں میں کیا اور اس کا نام "ریاحین العابدین" رکھا۔ جلد اوّل کی ضخامت ۴۴۰ صفحات اور جلد دوم کی ۴۰۰ صفحات ہے (کُل ۸۴۰ صفحات۔ بڑا سائز، ہر صفحے میں ۲۵ سطریں)، ہر حدیث کے ساتھ اس کی تشریح بھی دی گئی ہے۔ "ریاحین العابدین" کے ناشر مولانا ابوادریس عبدالغفورؒ ابن مولوی محمدؒ ابن مولانا عبداللہ الغزنوی (امرتسر) تھے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ راقم الحروف کے کتب خانے میں موجود ہے۔ (طالب ہاشمی)

میں گزرا جو بہت ضعیف ہو چکی تھیں اور عمر کے آخری دس برسوں میں بصارت سے بھی محروم ہو چکی تھیں۔ یہ مشکل اور نازک کام انہوں نے والدہ ماجدہ کی وفات (سنہ ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء) تک بڑی ہمت اور دلی لگن کے ساتھ انجام دیا۔

سنہ ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے رائے بریلی تشریف لے گئے تھے تو سیدہ امۃ اللہ نے اپنی والدہ اور خاندان کی دوسری خواتین کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت اور توبہ کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد انہوں نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی تجدید کی اور آخر وقت تک ان سے محبت اور عقیدت کا تعلق قائم رکھا۔ ان کو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری سے بھی بہت عقیدت تھی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کا بیان ہے کہ:

"ہمشیرہ مرحومہ نے اس زمانہ میں متعدد دینی مضامین اور رسالے لکھے۔ مجھے جب خدا نے عربی میں بچوں کی زبان میں مدارس کے ابتدائی نصاب کے لیے تین حصوں میں انبیاء علیہم السلام کے قصے لکھنے کی توفیق عطا فرمائی جو "قصص النبیین للاطفال" کے نام سے شائع ہوئے تو انہوں نے اس کا آزاد ترجمہ کیا جو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اور بچوں کی "قصص الانبیاء" کے نام سے شائع اور مقبول ہو چکا ہے۔ بھائی کو تو اس وقت تین ہی حصے لکھنے کی توفیق ہوئی لیکن بلند ہمت بہن نے چوتھا اور پانچواں حصہ لکھ کر اس سلسلے کو مکمل کر لیا۔ چوتھے حصے میں حضرت شعیبؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت داؤد و سلیمان علیہم السلام وغیرہ کے قصے ہیں اور پانچواں حصہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مشتمل ہے جو "ہمارے حضورؐ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔"

(پرانے چراغ حصہ دوم صفحہ ۳۶۲)

والدہ کی زندگی میں ان کا ایک بڑا مشغلہ ان مناجاتوں اور اشعار کا نقل کرنا تھا۔

جو والدہ موزوں کرتیں اور ان کو لکھا تیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی بڑی بہن (سیدہ امۃ العزیز) کے گھر کا انتظام بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اپنا دل بہلانے اور پاس پڑوس کے لوگوں کی خدمت کے جذبہ سے روزمرہ کی ضروریات کا سامان بھی رکھ لیا تھا جو اکثر قرض پر جاتا تھا۔

سنہ ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۶ء میں ان کے بھانجے سید محمد ثانی نے مسلمان بچیوں اور خواتین کے لیے ایک دینی رسالہ "رضوان" جاری کیا۔ وہ اپنی وفات تک اس کے لیے برابر مضامین اور نظمیں لکھتی رہیں۔ خاندان میں ایک دعائیہ نظم بہت مقبول اور مروج تھی جو ہاتف تخلص کے ایک غیر معروف شاعر کی لکھی ہوئی تھی۔ اس میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ایک نام لے کر اس سے دعا کی گئی ہے۔ سیدہ امۃ اللہ کو یہ نظم بہت پسند تھی۔ انہوں نے افادۂ عام کے لیے اسے "مناجاتِ ہاتف" کے نام سے شائع کرایا۔

محرم سنہ ۱۳۹۶ھ (جنوری سنہ ۱۹۷۶ء) کے آغاز میں سیدہ امۃ اللہ بہت علیل ہو گئیں۔ چند دن کے بعد انہیں علاج کے لیے لکھنؤ لے جایا گیا مگر ان کا وقتِ آخر آ چکا تھا۔ وہیں ۲۶ محرم سنہ ۱۳۹۶ھ (مطابق ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۷۶ء) کو انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ میت رائے بریلی لائی گئی اور دائرہ شاہ علم اللہ کے خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک کی گئی۔

سیدہ امۃ اللہ کا کلام سوز و گداز سے لبریز اور اس قدر پُرتاثیر ہوتا تھا کہ پڑھنے والے کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ ان کے اشعار کا مجموعہ "بابِ کرم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

کب سے کھڑی ہوں یا رب امید کے سہارے	یہ دن نہ جانے میں نے کس طرح سے گزارے
بے چین و مضطرب دل جا کر کسے پکارے	وہ کون ہے جو حالت بگڑی ہوئی سنوارے

ہے بابِ کرم کا یہ خالی نہ پھیر یا رب
دینا اگر تجھے ہے پھر کیوں ہے دیر یا رب

کنجِ قفس سے بدتر اپنا ہے آشیانہ | اس قیدِ بے کسی میں گزرا ہے اک زمانہ
مغموم دل پہ یارب لازم ہے رحم کھانا | کرتی ہوں میں شکایت تجھ سے یہ عاجزانہ

بارِ الم ہے دل پہ طاقت نہیں ہے دل میں
کیونکر ہو صبر مجھ سے ہمت نہیں ہے دل میں

کب سے لیے کھڑی ہوں میں کاسۂ گدائی | اب تک ملا نہ مجھ کو اور شام ہونے آئی

بندہ نواز! میری منت کی لاج رکھ لے | میری نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے

ان کے چھوٹے بھائی سید ابوالحسن علی ندوی صاحب اپنی کتاب "کاروانِ زندگی" (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں :-

وہ ہمشیرہ صاحبہ صالحہ، عابدہ تھیں۔ صاحبِ تصنیف اہلِ قلم تھیں، شریف گھرانوں میں خواتین کی جو خوبیاں اور کمالات سمجھے جاتے ہیں، سب میں ان کو تفوق و امتیاز حاصل تھا وہ "زادِ سفر" جیسی مقبول کتاب کی مصنفہ ہیں جس کو حجاج کے بیڈیو اسٹیشن سے کئی بار نشر کیا گیا اور غالباً اس شرف میں کوئی ہندوستانی خاتون ان کی شریک نہیں۔ ہمارے حضور بچوں کی قصص الانبیاء اور کئی مفید رسالوں اور کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ ہمارے خاندان میں عورتوں میں تبلیغی اجتماعات و دعوت کی بنیاد انہوں نے ڈالی ---- اُن کی کتابِ زندگی کا سب سے قیمتی ورق اور سب سے نورانی عنوان ان کا دردِ دل، ذوقِ دعا، ان کے دل کی بے تابی اور ان کی آنکھوں کی اشکباری اور ان کے دن رات کی آہ و زاری تھی جو ظاہراً تو ان کی خصوصی زندگی کا نتیجہ تھی لیکن حقیقتاً ان کے اظہارِ بندگی کے لیے سامانِ غیبی اور ان کی ترقی اور رفعِ درجات کا بہانہ تھا۔" (پرانے چراغ حصہ دوم۔ کاروانِ زندگی حصہ اوّل و دوم)

آپا جی حمیدہ بیگمؒ

آپا جی حمیدہ بیگمؒ چودھویں صدی ہجری کی ایک ایسی جامع کمالات وصفات ہستی تھیں جن کو بلا تردد ملّتِ اسلامیہ کی ایک مثالی خاتون کہا جا سکتا ہے۔ وہ آیۂ قرآنی اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے) کی زندہ تصویر تھیں۔ انہوں نے اپنے اخلاص فی الدین، جوشِ ایمان، حسنِ عمل اور سیرت و کردار کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ ساز گار اور ناساز گار ہر قسم کے حالات میں ہر حق شناس کو ولولۂ تازہ عطا کرتے رہیں گے۔

آپا جی حمیدہ بیگم ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء میں گوجرانوالہ کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام چودھری محمد عالم اور والدہ کا نام احمدہ بیگم تھا۔ یہ لوگ جنجوعہ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے (اس خاندان کے اکثر افراد "راجہ" کہلاتے ہیں) پہلے ان کی سکونت جہلم میں تھی مگر بعد میں گوجرانوالہ سے چار یا پانچ میل کے فاصلے پر موضوع منڈھیالہ وڑائچ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپا جی کا ننھیال نندی پور (ضلع گوجرانوالہ) کے قریب ایک گاؤں "بلے والا" تھا۔ آپا جی کے والد چوہدری محمد عالم محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ وہ اپنی محنت اور دیانت داری کی وجہ سے بہت نیک نام تھے۔ آپا جیؒ کا بیان ہے کہ وہ موت کا اس طرح انتظار کیا کرتے تھے جیسے کوئی دوست کا انتظار کرتا ہے۔ قرآنِ پاک کے چار یا پانچ پاروں کی تلاوت روزانہ کا معمول تھا۔ ہر روز دو میل سیر کرتے تھے۔ پودوں کی دیکھ بھال کرنا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بہت کم گو تھے اور جو بات کرتے بڑی پُر مغز ہوتی۔ اپنے اعزہ و اقارب سے ان کے تعلقات عمر بھر خوشگوار رہے۔

آپا جی نے مڈل تک تعلیم صالحہ بی بی گرلز اسکول گوجرانوالہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول گوجرانوالہ میں داخل ہوگئیں۔ ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ پاس ہونے والی تمام طالبات میں وہ اوّل رہیں اور مجموعی طور پر یونیورسٹی بھر میں دوسرے درجہ پر رہیں۔

آپا جی بچپن ہی سے بہت متین، باحیا، بُردبار، نیک طبیعت، ذہین اور طبّاع تھیں۔ مطالعے کا بے حد شوق تھا اور کھیل کود کی طرف کوئی رغبت نہ تھی۔ بدقسمتی سے وہ گیارہ سال کی عمر میں ہنجیروں (خنازیر) کے مرض میں مبتلا ہوگئیں جو سالہا سال تک ان کے لیے تکلیف کا باعث بنا رہا۔ ایک دفعہ تپ محرقہ (ٹائیفائڈ) کا سخت حملہ ہوا جس کی وجہ سے سر کے بال گر گئے اور جسم میں امراض کے خلاف قوت مدافعت کم ہوگئی۔ ان مصیبتوں کے باوجود ان کے ذوق مطالعہ میں مطلق کوئی کمی نہ آئی۔ اس زمانے کی ایک مشہور کتاب "بُک آف نالج" کو انہوں نے قریب قریب حفظ کر لیا تھا۔ اسی دور میں انہوں نے اپنے والد کے چچا خان بہادر منشی امام الدین سے قرآن مجید پڑھا اور اپنے ماموں زاد بھائی مولانا عبدالعزیزؒ سے قرآن و حدیث کی تعلیم تشریح و تفسیر کے ساتھ حاصل کی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد آپا جی صالحہ گرلز ہائی اسکول میں پڑھانے لگیں۔ یہ سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں عام مطالعے کے علاوہ انہوں نے اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ چنانچہ ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء میں انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایف اے بھی کر لیا اور پھر بی اے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انہیں ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء میں چند ہفتے اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ لاہور کے ہوسٹل میں بھی رہنا پڑا۔ بی اے کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد وہ واپس گوجرانوالہ چلی گئیں۔ اللہ نے انہیں امتحان میں کامیاب کر دیا۔ اس کے بعد وہ ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء میں بی ٹی کرنے

کے لیے دوبارہ لاہور آئیں۔ اس زمانے میں وہ شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی تحریک احیائے دین سے وابستہ تھیں اور اکثر نماز جمعہ شیرانوالہ کی مسجد میں پڑھتی تھیں۔ بی ٹی پاس کرنے کے بعد وہ واپس گوجرانوالہ گئیں تو انہیں صالحہ بی بی گرلز ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹریس بنا دیا گیا۔ ان کی کوشش سے اسکول میں میٹرک کی کلاسیں شروع ہو گئیں۔ اسکول کی انتظامیہ نے جب محکمہ تعلیم سے باقاعدہ منظوری حاصل کر لی اور اسکول کو سرکاری گرانٹ ملنے لگی تو قواعد کے مطابق تربیت یافتہ استانیوں کا تقرر کیا گیا۔ اس طرح اسکول کو ایک عجیب صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ قواعد کی رو سے انتظامیہ تربیت یافتہ (ٹرینڈ) استانیوں کو زیادہ تنخواہیں دینے کی پابند تھی لیکن اس کے مالی حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ کاغذات میں تو ہر استانی کے نام کے سامنے وہی تنخواہ درج کی جاتی تھی جس کی وہ قواعد کے مطابق حقدار تھی لیکن حقیقتاً اسے اسکول کے وسائل کے مطابق کم تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جب بھی انسپکٹرس آف سکولز معائنے کے لیے آتیں تو فرنیچر کرائے پر لایا جاتا اور اسے بتایا جاتا کہ یہ فرنیچر اسکول کی ملکیت ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ دیانت داری کے خلاف تھا اس لیے آپا جی اس صورتِ حال سے نباہ نہ کر سکیں اور ایک سال کی چھٹی لے کر اپنے بھائی راجہ محمود خان (ریلوے گارڈ) کے پاس خانیوال چلی گئیں۔ اس ایک سال میں انہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ انہیں جماعتِ اسلامی میں شامل ہو کر اپنی زندگی اسلام کی سربلندی کے لیے وقف کر دینی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اسکول کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء کے اوائل میں جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہو کر اپنے آپ کو ہمہ تن اصلاح و تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ جلد ہی انہیں شعبۂ خواتین کی قیمہ بنا دیا گیا۔ اس ذمہ داری کو انہوں نے نہایت حسن و خوبی سے نباہا۔

رجب ۱۳۶۷ھ (جون ۱۹۴۸ء) میں ان کی شادی قاضی حمید اللہ مرحوم

امیر جماعتِ اسلامی شہر سیالکوٹ شہر سے ہو گئی۔ آپا جی کی عمر اس وقت ۲۳ سال کی تھی اور قاضی صاحب ۴۹ سال کے پیٹے میں تھے۔ قاضی صاحب کی پہلی اہلیہ فوت ہو گئی تھیں اور یہ ان کا عقدِ ثانی تھا۔ آپا جی نہایت سادہ لباس میں خانیوال سے رخصت ہو کر شوہر کے گھر سیالکوٹ گئیں۔ انہوں نے وہاں جاتے ہی سسرال کی خواتین کو درسِ قرآن دینا شروع کر دیا اور پھر جب تک وہاں رہیں اصلاح و تبلیغ اور درس و تدریس کا کام بڑی تندہی سے کرتی رہیں۔ اپنے حسنِ اخلاق اور صبر و حکمت سے انہوں نے سسرال کی سب خواتین کو اپنا والہ و شیفتہ بنا لیا اور پہلی اہلیہ سے قاضی صاحب کے بچوں کو اپنا بنا لیا۔ وہ گھر پر بھی بچیوں کو قرآن پڑھاتیں اور دوسرے گھروں میں بھی جا کر درس دیتیں۔ خواتین کو ترجمے سے نماز سکھاتیں، ان میں دین کا صحیح فہم پیدا کرتیں، اور ان کو دینی شعائر کا پابند بنانے کی کوشش کرتیں۔ ان کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیالکوٹ کی بے شمار خواتین میں دین سے گہری محبت پیدا ہو گئی اور وہ ان کے درس میں جوق در جوق شرکت کرنے لگیں۔ آپا جی کی ازدواجی زندگی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ قاضی صاحب ۲ صفر ۱۳۷۰ھ (۱۳ نومبر ۱۹۵۰ء) کو طویل علالت کے بعد وفات پا گئے۔ آپا جی عدت کا زمانہ سیالکوٹ میں گزارنے کے بعد اپنے والدین کے پاس خانیوال چلی گئیں جو اپنے فرزند محمود احمد خاں صاحب کے پاس مقیم تھے۔

آپا جی نے اگرچہ ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء ہی سے تبلیغی اور اصلاحی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا مگر شوہر کی وفات کے بعد تو ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اصلاحِ معاشرہ اور تبلیغِ دین کا فریضہ ادا کرنے میں صرف ہونے لگا۔ انہوں نے ایک طرف تو اپنی ذات کو قرنِ اول کی مومنات کا نمونہ بنایا اور دامے درمے قدمے سخنے ہر طریقے سے دین کی خدمت کی اور دوسری طرف قلم کے ذریعے تشکیک و انکار، عریانی فحاشی اور اخلاق باختگی کے خلاف جہاد میں مصروف ہو گئیں۔ ان کی نگرانی میں پہلے ماہنامہ "عفت" کا اجراء ہوا، اس کے بعد انہوں نے

ماہنامہ "بتول" جاری کیا اور اسے ملک میں خواتین کا سب سے بامقصد اور پسندیدہ رسالہ بنا دیا۔ بعد میں ادارہ بتول کی طرف سے بچوں کے لیے ایک پاکیزہ پرچہ "نور" بھی جاری کیا گیا۔ بتول میں سب سے مؤثر اور دل نشیں تحریریں اکثر آپا جی ہی کی ہوتیں۔ ان کے دل میں یہی تڑپ تھی کہ اپنی مسلمان بہنوں میں دینی بیداری پیدا کریں اور ان میں قرآن و سنت کا سچا شعور اجاگر کریں تاکہ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں وہ مردوں کے دوش بدوش کام کر سکیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے خواتین کے لیے آسان زبان میں نہایت عمدہ لٹریچر تیار کیا اور خواتین کو قرآنِ حکیم کا ترجمہ اور تفسیر پڑھانے کی کلاسیں بھی جاری کیں۔ شہر شہر اور قصبے قصبے میں خواتین کے حلقے قائم کر دیئے جن کے ہفتہ وار اجتماعات میں قرآن و حدیث کا درس دیا جاتا تھا۔ ان کاموں میں ان کو جانگسل محنت کرنا پڑی مگر انہوں نے کبھی ہمت نہ ہاری کیونکہ وہ جسم و جان کی تمام توانائیاں دینِ حق کو سربلند کرنے کے لیے وقف کر چکی تھیں۔

آپا جی بچپن ہی سے اکثر بیمار رہتی تھیں۔ ان کے جسم میں قوتِ مدافعت کم ہو گئی تھی، اسی وجہ سے وہ آئے دن زکام نزلہ بخار اور نقاہت کے حملوں کا شکار بنی رہتی تھیں تاہم وہ اپنی تبلیغی سرگرمیاں برابر جاری رکھتی تھیں۔ جمادی الآخر ۱۳۷۹ھ (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں ان پر دل کا دورہ پڑا جس سے کئی ماہ تک صاحبِ فراش رہیں۔ طبیعت ذرا بحال ہوئی تو ان کو استسقاء (پیٹ میں پانی پڑنے) کا مرض لاحق ہو گیا۔ ہسپتال میں داخل ہو کر پانی نکلوایا لیکن اس کے بعد یہ تکلیف مستقل صورت اختیار کر گئی۔ ہر تین چار ماہ (اور کبھی پانچ چھ ماہ) بعد پانی نکلوانا پڑتا۔ رجب ۱۳۸۲ھ (دسمبر ۱۹۶۲ء) میں اسی پانی کی وجہ سے ان پر دوبارہ دل کا دورہ پڑا۔ عملِ جراحی ہوا جس سے دل کی تکلیف تو دور ہو گئی مگر ان کے سینے پر زخم بن گیا جو ۱۳۹۲ھ ۱۹۷۲ء تک مندمل نہ ہوا۔ استسقاء کی تکلیف ان کو پورے تیرہ برس تک رہی یہاں تک کہ اسی تکلیف میں وہ جان ہار گئیں۔ اس تکلیف کی وجہ سے ان کے پاؤں سوجے رہتے۔ پیٹ پھولا رہتا معمولی نقل و حرکت

سے سانس پھول جاتا ۔ پانی نکلوانے کے لیے بار بار ہسپتال میں داخل ہونا پڑتا
مگر اس کربناک طویل علالت میں وہ ایک لمحہ کے لیے بھی تبلیغِ دین سے غافل نہ ہوئیں
بلکہ مرض کی شدت میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا ان کے جوشِ ایمان میں بھی اضافہ
ہوتا گیا کوئی حال پوچھتا تو پُرسکون لہجے میں الحمدللہ کہہ دیتیں ۔ اپنی بیماری کے بارے
میں گفتگو کرنا پسند نہ کرتیں ، کوئی دوسرا کرتا تو اسے بھی روک دیتیں اور باتوں کا
رُخ دوسری طرف موڑ دیتیں ۔ مشہور ادیبہ محترمہ سلمیٰ یاسمین نجمی ان کی اذیت ناک
علالت کے بارے میں لکھتی ہیں : ——————

"وہ خود چاہے کچھ نہ کہتیں مگر دیکھنے والوں کو تو اندازہ تھا کہ ان کا
ایک ایک لمحہ کس اذیت اور کس کرب میں گزر رہا ہے ۔ بے حد کمزور
جسم ، بہت سے پانی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ، اتنا بوجھ کہ سانس لینا
بھی دشوار تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بارہ سال سے مسلسل دن رات کے چوبیس
گھنٹے کا بوجھ تھا جس سے نجات کی کوئی امید نہ تھی مگر انہوں نے اپنی
زبان سے کبھی تنگی یا پریشانی کا اظہار نہ کیا ۔ زیادہ دل گھبرایا تو نفل
اور تسبیح سے سکون حاصل کیا ۔ ہر وقت باوضو رہتی تھیں حالانکہ غسلخانے
جانا اور وضو کرنا ان کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا جب غسل خانے
سے آتیں تو ہونٹ اور چہرہ سانس کی کمی کی وجہ سے نیلے ہو جاتے تھے ۔
اکھڑا ہوا سانس درست کرنے میں کافی دیر لگتی تھی مگر ان کی یہی کوشش
رہتی کہ زیادہ سے زیادہ وضو کریں اور جب ٹھیک ہو جاتیں تو سب کچھ
فراموش کر کے اپنے کام میں لگ جاتیں ۔"

(بتول " آپا حمیدہ بیگم نمبر)

ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ (مئی ۱۹۷۳ء) میں ان کی علالت سخت تشویشناک صورت
اختیار کر گئی اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد پیٹ سے پانی نکالنے کی ضرورت
پڑنے لگی ۔ رجب ۱۳۹۳ھ (اگست ۷۳ء) میں ان کی بڑی بہن انور بیگم

وفات پاگئیں۔ اگرچہ اس صدمے کو انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کیا پھر بھی طبیعت پر اس کا گہرا اثر ہوا اور ان کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی مگر اس حالت میں بھی خدمت دین کا اس قدر خیال تھا کہ اپنی ڈائری میں شعبان اور رمضان المبارک کا تبلیغی پروگرام اس طرح رقم کیا :۔

(۱) عبادت اور روزہ کے پمفلٹ زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلانا۔

(۲) درسِ قرآن کا زیادہ سے زیادہ مقامات پر انتظام۔

(۳) اپنے بچوں اور اہلِ خانہ پر تعلیم دین کے سلسلہ میں بہت زیادہ توجہ دینا۔

مگر اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی ۱۵ شعبان ۱۳۹۳ھ (۱۴ ستمبر ۱۹۷۳ء) جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب کو وہ خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آپا جی حمیدہ بیگم مرحومہ کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو لیں وہ اتنا درخشاں نظر آتا ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے یہاں ہم اختصاً کے ساتھ اتنا ہی کہیں گے کہ ان کا جوشِ ایمان اور شوقِ تبلیغ جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی کمزور صحت اور اذیت ناک بیماری کے باوجود جس تندہی سے دین کی خدمت کی اس کی بنا پر وہ برِّ کوچک پاک و ہند کی عظیم دخترانِ اسلام میں شمار ہونے کی مستحق ہیں۔ ان کی شخصی خوبیاں بھی قابلِ رشک تھیں۔ قرآن و سُنّت کی تعلیمات پر سختی سے عمل کرتی تھیں۔ پردے کی نہ صرف خود سختی سے پابند تھیں بلکہ دوسری خواتین کو بھی اس کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ ان کے قول و فعل میں مکمل یکسانیت تھی۔ جو بات دل میں ہوتی وہی زبان پر آتی تھی۔ بے حد مستغنی المزاج تھیں۔ دنیاوی مال و منال اور ظاہری زیب و زینت سے کوئی رغبت نہ تھی۔ قناعت پسندی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ایک وقت میں ان کے پاس کپڑوں کے دو تین جوڑوں سے زیادہ کبھی نہیں ہوئے۔ یہ جوڑے بھی سفید، سوتی اور معمولی کپڑے کے ہوتے تھے۔ انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ بہت زیادہ

تھا۔ کسی سائل کو کبھی خالی ہاتھ واپس نہ بھیجتی تھیں۔ لوگوں کے قرضے اتارنا، تحائف
کے ذریعے مدد کرنا اور حاجت مندوں کی کسی نہ کسی طریقے سے حاجتیں پوری کرنا ان
کی عادت تھی۔ اپنی ذات پر برائے نام خرچ کرتی تھیں باقی سب کچھ راہِ خدا میں
دے دیتی تھیں۔ بیواؤں یتیموں اور محتاج خواتین کی اپنی استطاعت کے مطابق
مدد کرتی رہتی تھیں۔ غریب نادار اور بے سہارا لوگوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کی
طبیعت میں عجز و انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنوں اور بیگانوں کے بچے ان
کے پاس آتے تو ان سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتیں اور انھیں کھانے
کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور دیتیں۔ سخت سے سخت تکلیف اور مصیبت میں بھی کبھی
حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتیں اور ہمیشہ اللہ کی رضا پر صابر و شاکر رہتیں۔ اس
اعتبار سے وہ استقامت و عزیمت کا کوہِ گراں تھیں۔ آخرت کی فکر ہر وقت
دامنگیر رہتی تھی اور خوفِ خدا سے لرزتی رہتی تھیں۔ سرورِ کائنات رحمتِ عالم
صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ آپ کا اسمِ گرامی سن کر
اشکبار ہو جاتی تھیں۔ درود شریف بڑی کثرت سے پڑھتی رہتی تھیں اور حضورؐ
کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی تھیں۔ غرض ہر اعتبار
سے وہ ایک سچی مسلمان اور مثالی خاتون تھیں۔

(اوصافِ حمیدہ۔ آپا حمیدہ بیگم۔ "بتول" آپا حمیدہ بیگم نمبر)



نورالصباح بیگم

۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو رامپور (یوپی۔ بھارت) کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام تحمل شاہ خاں تھا، جو نواب دولھا خاں کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ اپنے وقت کے ایک باوقار اور وضعدار رئیس تھے۔ والدہ قدوس بیگم ریاست جے پور کے دیوان حمید اللہ خاں کی بیٹی تھیں جو بڑے علم دوست انسان تھے خاندان میں پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اس لیے اسکولوں اور کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرسکیں البتہ گھر پر عربی فارسی اردو اور انگریزی کی بہت اچھی تعلیم پائی۔ بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھیں اور فطری طور پر شعر و ادب کی طرف میلان رکھتی تھیں۔ ان کی شادی تیرہ برس کی عمر میں روہیلکھنڈ کے ایک قصبے شیر پور کے رئیس خان بہادر بالا خاں کے بیٹے ظہیر الدین خاں سے ہوئی۔ شوہر کو سیاست سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ تحریکِ خلافت سے وابستہ تھے۔ نورالصباح بیگم نے بھی ان کے دیکھا دیکھی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور علی برادران اور بی اماں کے ساتھ دامے درمے قدمے سخنے بھرپور تعاون کیا۔ بدقسمتی سے وہ ۱۹۳۴ء میں بیوہ ہوگئیں اور جائداد کے انتظام کے علاوہ دوسرے خانگی معاملات کی ذمہ داریاں بھی ان کے کندھوں پر آپڑیں۔ انہوں نے بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ ان کو نبایا۔

۱۹۳۷ء میں نورالصباح بیگم نے آل انڈیا مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی اور مردوں کے دوش بدوش تحریکِ آزادی / پاکستان میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۲ء میں دہلی مسلم لیگ سے وابستہ ہوئیں۔ ۱۹۴۳ء میں بیگم مولانا محمد علی جوہر کی رفیقِ سیاست رہیں اور دہلی خواتین مسلم لیگ کی سب کمیٹی کی رکن بنیں۔ ۱۹۴۷ء میں خضر حیات ٹوانہ کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے

اس میں پُرجوش حصہ لیا، اور لاہور آکر اپنی گرفتاری پیش کی۔

۱۹۳۷ء سے قیامِ پاکستان تک انہوں نے بڑے بڑے سیاست دانوں ادیبوں اور شاعروں کو بہت قریب سے دیکھا۔ مسلم لیگ کی نامور خواتین محترمہ فاطمہ جناح، بیگم مولانا محمد علی جوہرؒ، بیگم جہاں آرا شاہنواز، لیڈی عبداللہ ہارون، بیگم غلام حسین ہدایت اللہ، بیگم رعنا لیاقت علی، بیگم نواب محمد اسمٰعیل خان وغیرہ سے ان کی ذاتی مراسم بھی رہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان آکر انہوں نے کراچی میں مستقل اقامت اختیار کی اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔ کچھ سرمایہ تجارت میں لگا دیا جس میں اللہ نے برکت دی اور انہوں نے آرام و آسائش سے زندگی گزاری۔ اللہ نے سعادت مند اولاد سے بھی نوازا تھا جس کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ کراچی میں انہوں نے سیاسی سماجی اور علمی میدان میں بڑا کام کیا۔ علم و ادب سے گہرا شغف تھا۔ اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے ایک طرف تصنیف و تالیف میں مصروف رہیں اور دوسری طرف ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" سے وابستہ ہوگئیں جس میں باقاعدگی سے لکھا کرتی تھیں۔ زندگی کے آخری دور میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں کی معاشرت کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا۔ پاکستان واپس آکر انہوں نے ماہنامہ "جامِ نو" کراچی میں بہت دلچسپ اور معلوماتی سفر نامہ لکھا جو کئی اقساط میں شائع ہوا۔

نورالصباح بیگم نے ۱۶ جولائی ۱۹۷۸ء کو ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ وہ ایک بہترین نثر نگار (ادیبہ) ہونے کے علاوہ ایک نغز گو شاعرہ بھی تھیں۔ نور تخلص کرتی تھیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "صبحِ غزل" کے نام سے شائع ہوا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

جلوہ ہائے نو بہ نو، تازہ بہ تازہ نکہتیں | کس قدر رنگینیاں ہیں پھر بھی گھبراتا ہے دل

تاریکیوں میں کہیں غم کی روشنی تو ہے | پلکوں پہ کچھ چراغ فروزاں کیسے تو ہیں

ہے یہ بزمِ حسنِ خوباں کہ حدیثِ کہکشاں ہے | وہی روحِ انجمن کی وہی ان کی سب ادائیں

جہاں کہ آج بھی انسانیت کی قدر نہیں | وہاں یہ آج بھی انساں تلاش کرتی ہوں

(قوم سے خطاب)

قسم ہے عزتِ عرفاں کی تجھے اے قوم | قسم ہے عظمتِ ایماں کی تجھے اے قوم
قسم حفاظتِ قرآں کی تجھے اے قوم | قسم ہے احمدِ ذیشانؐ کی تجھے اے قوم

کہ عزمِ مستقل کو ہمسار پیدا کر

ان کی نثری تالیفات کی تعداد گیارہ ہے ان میں "تحریکِ پاکستان اور خواتین" "آپ بیتی" "کمال اتاترک" اور "پاکستان کی مشہور شخصیتیں" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ کتابیں نامکمل بھی رہ گئیں۔

نور الصباح بیگم کا شمار تحریکِ پاکستان کی رہنما خواتین میں ہوتا ہے وہ بڑی خوش اخلاق، ملنسار، وضعدار اور سگھڑ خاتون تھیں۔ مشرقی تہذیب اور اقدار کی دلدادہ تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ عورت کا صحیح مقام اس کا گھر اس کے بچے اور اس کا شوہر ہیں۔ عورت خواہ کتنا ہی پڑھ لکھ جائے ان چیزوں سے فرار حاصل نہیں کر سکتی۔ دراصل ان ہی چیزوں میں اس کی ساری خوشیاں پنہاں ہیں۔ آج کل بعض پڑھی لکھی لڑکیاں عورت کے ان بنیادی فرائض کو فرسودہ سمجھتی ہیں اور یہ ان کی بہت بڑی زیادتی ہے۔ کیونکہ اس سے معاشرے میں بہت الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔

("سب رس" کراچی یادِ رفتگاں نمبر جلد دوم)

سیّدہ آماں بی (عزیز النّساء بیگمؒ)

سیدہ آماں بی برصغیر کے یگانۂ روزگار عالم دین اور طبیب مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکیؒ[1] کی اہلیہ تھیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ، دیندار، مخیّر اور نیک دل خاتون تھیں۔ ان کا اصل نام تو عزیز النّساء بیگم تھا مگر وہ "آماں" اور "بی" کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کے پوتے پوتیاں اور خاندان کے دوسرے بچے ان کو "آماں" کہہ کر پکارتے تھے البتہ ان کے شوہر کے قائم کیے ہوئے مدرسہ میں تعلیم پانے والے طلبہ، جن کی وہ مربی تھیں، ان کو "بی" کہا کرتے تھے۔ آماں بی، مولوی سید عبدالرحمٰن مونگیریؒ کی صاحبزادی اور مولانا علی احمد محدث عظیم آبادیؒ کی نواسی تھیں۔ سنہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئیں۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے نانا مولانا سید علی احمد محدثؒ سے (جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے) حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم بھی گھر ہی میں ہوئی جیسا کہ اس زمانے میں شریف گھرانوں میں دستور تھا۔ عربی میں اتنی استعداد

---

[1] مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکیؒ کا شمار چودھویں صدی ہجری کے سرآمد روزگار علماء و اطباء میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق سادات کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ والد مولانا حکیم سید دائم علیؒ نے حصولِ علم کے شوق میں اپنے آبائی وطن میر نگر ضلع پٹنہ صوبہ بہار (بھارت) کو خیرباد کہا اور سالہا سال تک اس دور کے نامور اساتذۂ علم و فن سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ ان میں مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ، مولانا احسن گیلانیؒ، مولانا عالم علی نگینویؒ اور حکیم احسن اللہ خان دہلویؒ جیسے یگانۂ روزگار علماء اور اہلِ فن شامل تھے۔ جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ٹونک میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ نواب صاحب ٹونک کو ان کے فضل و کمال کا علم ہوا تو انہوں نے سید دائم علیؒ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاصل ہو گئی تھی کہ قرآنِ حکیم کی آیات کا ترجمہ بخوبی کر لیتی تھیں۔ مطالعہ کا فطری ذوق تھا۔ تفسیر حدیث طب وغیرہ کی کتابیں اکثر زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ شادی میں انہیں جو جہیز ملا ان میں بہت سی دینی اور اخلاقی کتابیں بھی تھیں۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں :—

تفسیرِ عزیزی، تفسیر المحمد سید احمد شہیدؒ، مشارق الانوار، موضع القرآن، نصیحۃ المسلمین، راہِ نجات، سر الشہادتین، گلزارِ جنت، آثارِ محشر، طبِ نبوی، علاج الغرباء۔

ان کا یہ ذخیرۂ کتب جزدانوں میں بندھا رہتا تھا۔ ان کا معمول تھا کہ ہر روز تلاوتِ قرآن کے بعد ان میں سے ایک دو کتابوں کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کو اپنا طبیبِ خاص اور دیوانِ خزانہ مقرر کیا۔ وہ مدت تک اپنے فرائضِ منصبی نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہو گئے اور راہِ سلوک و تصوف میں اتنا کمال حاصل کیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا۔

مولانا حکیم سید دائم علیؒ کی شادی شیخ ولی محمد صاحبؒ کی صاحبزادی سے ہوئی (شیخ صاحبؒ اپنے دور کے ولیِ کامل تھے اور رشتے میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ کے بھتیجے ہوتے تھے۔) انہی صاحبزادی کے بطن سے مولانا حکیم سید برکات احمد ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک کے شاہی مدرسہ میں حاصل کی۔ درسِ نظامی کی متوسط کتابوں کی تعلیم ان کو والدِ گرامی نے خود دی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مولانا لطف اللہ بہاریؒ اور مولانا محمد حسنؒ کے خرمنِ فیض سے بھی خوشہ چینی کی اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے رامپور جا کر علامہ عبدالحق خیرآبادیؒ (خلف الرشید علامہ فضلِ حق خیرآبادیؒ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور مسلسل پندرہ برس ان کی خدمت میں رہ کر تحصیلِ علم کرتے رہے یہاں تک کہ خود بھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فجر کی نماز کے بعد تقریباً دو گھنٹے تلاوت اور مطالعۂ کتب کے لیے وقف تھے۔ تلاوتِ قرآن کے ساتھ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن (موضح القرآن) کا مطالعہ بھی پابندی سے کرتی تھیں۔ ان کے پوتے حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب کا بیان ہے کہ "وہ کئی تفاسیر بھی مسلسل "اماں" کے مطالعے میں رہتیں اور اپنے ذخیرۂ کتب کی کتابوں کا بیشتر مواد (کثرتِ مطالعہ کی بناء پر) ان کو زبانی یاد ہو گیا تھا۔ "نصیحۃ المسلمین" پوری یاد تھی، "مثنوی جہادیہ" بھی مکمل ازبر تھی اور ہمیں بھی یاد کراتی تھیں۔ کبھی امنگ اٹھتی تو مثنوی جہادیہ کے اشعار بلند آواز سے پڑھتیں یا ہم لوگ سنانے کی فرمائش کرتے تو خوش ہوتیں اور سناتیں۔ قرآنِ کریم کی تلاوت بالجہر نہیں کرتی تھیں کوئی اور کرتا تو منع کرتیں کہ دوسرے گناہ گار ہوں گے۔ مطلب یہ تھا کہ حکم ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو سنو مگر دوسرے مصروفیت یا بے توجہی کی بناء پر سن نہیں سکیں گے اور گناہ گار ہوں گے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تفسیر، اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث، فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، بدیعات، طبیعیات، الٰہیات وغیرہ میں درجۂ تبحر حاصل کر لیا۔ پھر علمِ طب کے حصول کی طرف توجہ کی۔ پہلے لکھنؤ جا کر وہاں کے نامور اطباء سے کسبِ فیض کیا پھر دہلی جا کر حکیم غلام نجف خان (برادرِ خُرد حکیم احسن اللہ خاں طبیبِ خاص و وزیرِ دربار بہادر شاہ ظفر) کے شاگرد بنے۔ انہوں نے بڑی شفقت اور توجہ سے تعلیم دی اور ان کو رموز و اسرارِ طب میں طاق کر دیا یہاں تک کہ دورانِ تعلیم ہی میں اپنے پوتے (شفاء الملک) حکیم ضیاء الدین خاں کو ان کا شاگرد بنا دیا۔ وہ جب تک دہلی میں رہے، ایک طرف تو خود حکیم غلام نجف خان سے کسبِ فیض کرتے رہے اور دوسری طرف ان کے پوتے کو طب کی تعلیم دیتے رہے۔ علمِ طب کی تحصیل و تکمیل کے بعد بھوپال گئے اور قاضی محمد ایوبؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر علومِ دینیہ اور حدیث کی مزید تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے فارغ ہو کر ٹونک واپس آئے۔ اس وقت ان کے والدِ ماجد مولانا حکیم سید دائم علی بوجہ ضعفِ پیری دیوانِ خزانہ اور طبیبِ خاص نواب صاحب ٹونک کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مغرب کی نماز کے بعد اماں بی کے پاس محلے اور شہر کی بہت سی خواتین آجاتیں۔ کچھ دینی مسائل دریافت کرنے کے لیے، کچھ خانگی معاملات میں مشورہ کے لیے اور کچھ علاج کے لیے۔ اماں بی ہر ایک کو مطمئن کرکے بھیجتیں۔ بچوں کے اکثر امراض کے لیے دوائیں تیار کرکے پاس رکھتی تھیں۔ خمیرہ مروارید ہمیشہ تیار رہتا۔ یہ خمیرہ اور دوائیں وغیرہ ضرورت مندوں میں تقسیم ہوتی رہتی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

منصب سے دست کش ہو چکے تھے۔ نواب صاحب نے حکیم سید برکات احمدؒ صاحب کی بھی پوری قدر افزائی کی اور ان کو اپنا طبیب خاص مقرر کر دیا۔ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں حکیم صاحبؒ کے والدِ ماجد حکیم سید دائم علیؒ فوت ہو گئے۔ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء میں حکیم سید برکات احمدؒ نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی پھر مختلف ممالکِ اسلامیہ مصر شام فلسطین وغیرہ کے متعدد مشہور مزارات پر حاضری دے کر وطن کو مراجعت کی۔ حکیم صاحبؒ کو تعلیم و تعلم سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو علم عطا کیا تھا وہ اس کو دوسروں کے سینوں میں بھی اتارنے کی بے پناہ تڑپ رکھتے تھے۔ فرائض ملازمت اور مطب کے علاوہ جو وقت بچتا وہ اس کو درس و تدریس میں صرف کرتے۔ بعض دفعہ انہوں نے مسلسل پندرہ پندرہ گھنٹوں تک درس دیا۔ جلد ہی ان کے علم و فضل اور شانِ درس کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل گئی اور طالبانِ علم دُور دُور سے آکر ان کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے۔ عرصہ تک حکیم صاحبؒ نے اپنے مکان کا ایک وسیع حصہ طلبہ کے قیام کے لیے وقف کیے رکھا۔ ان کے خورد و نوش وغیرہ کے اخراجات بھی وہی برداشت کرتے تھے جب طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تو معززین شہر کے اصرار پر حکیم صاحبؒ کی اس ذاتی درسگاہ کو ایک مدرسہ (مدرسۂ خلیلیہ) کی شکل دے دی گئی۔ اس مدرسے سے جو لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ان میں سے متعدد علم و فضل کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے۔ ان میں سے مولانا حکیم سید محمد احمدؒ (خلف الرشید حکیم سید برکات احمدؒ)،

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اماں بی کو اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن کے لوگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ جب بھی کوئی عرب ٹونک آتا تو عام طور پر اس کا قیام اس سرائے (رباط الحکیم) میں ہوتا جو مولانا حکیم سید برکات احمدؒ نے ٹونک میں مہمانوں (بالخصوص عربوں) کے لیے بنوائی تھی۔ اس کے طعام و آرام کا تمام انتظام اماں بی اپنے ذمے لیتیں جب وہ رخصت ہونے لگتا تو اس کی خدمت میں نذرانہ بھی پیش کرتیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

شفاء الملک حکیم رضی الدین خاں دہلویؒ، علامہ معین الدین اجمیریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عبد القدیر بدایونیؒ، مولانا محمد شریف اعظم گڑھیؒ۔

حکیم صاحبؒ بڑے سادہ مزاج اور درویش صفت بزرگ تھے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔ اسی نسبت سے حجازِ مقدس بالخصوص مدینہ طیبہ سے آنے والے عربوں کی بڑی تکریم کرتے تھے اور ان کی خدمت کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ انہوں نے ٹونک میں ایک رباط (مہمان نواز سرائے) تعمیر کرائی تاکہ عام مسافروں اور خصوصاً عربوں کو قیام میں سہولت ہو۔ یہ سرائے "رباط الحکیم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ حکیم صاحبؒ رامپور کے ایک صاحب دل بزرگ شاہ رکنِ عالمؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ان سے مقدور بھر روحانی استفاضہ کیا۔ اخیر میں حیدرآباد دکن کے ایک مشہور بزرگ مچھلی والے شاہ صاحبؒ سے بھی کسب فیض کیا۔ استاذِ گرامی کا اس قدر احترام ملحوظ تھا کہ دورانِ تعلیم میں جب معلوم ہوا کہ علامہ عبد الحق خیر آبادیؒ کو سیتاپور کی ایک خاص دکان کے کباب بہت پسند ہیں تو روزانہ ریل کے ذریعے خیر آباد سے سیتاپور جاتے اور علامہ کے لیے کباب لے کر آتے۔ چند دن کے بعد علامہ نے سعادت مند شاگرد کو یہ زحمت اٹھانے سے منع کر دیا۔ قناعت اور استغنا کی یہ کیفیت تھی کہ ریاست حیدر آباد دکن اور ریاست اندور کی طرف سے ان کو ٹونک کے مشاہرے سے کہیں زیادہ مشاہرے پر بلایا گیا لیکن انہوں نے ٹونک چھوڑنے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آماں بی کی کتاب سیرت کا سب سے درخشاں باب ان کی علم دوستی اور طالبانِ علم کی خدمت اور سرپرستی ہے۔ جب تک ان کے شوہر نامدار حکیم سید برکات احمدؒ نے مدرسۂ خلیلیہ قائم نہیں کیا تھا اس وقت تک انہوں نے اپنے مکان کا بڑا حصہ طلبہ کے قیام کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ خود اپنے متعلقین کے ساتھ مکان کے چھوٹے حصے میں رہتے تھے۔ یہ طلبہ تحصیل علم کے لیے دور دور سے مولانا حکیم سید برکات احمدؒ کی خدمت میں ٹونک آتے تھے۔ بالعموم ایک وقت میں ان کی تعداد ساٹھ ستر کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ ان سب کو کھانا حکیم صاحبؒ کی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

سے انکار کر دیا اور پوری زندگی اسی چھوٹی سی ریاست میں گزار دی۔ طب میں بھی وہ بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ ان کے کئی معرکہ آرا علاج آج تک مشہور ہیں۔ اس فاضلِ زمانہ ہستی نے یکم ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۹۲۸ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ کسی نے تاریخِ وفات نکالی "رحمۃ اللہ و برکاتہ" ۱۳۴۷

حکیم صاحبؒ نے متعدد بلند پایہ تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:۔۔۔ الاتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان (علامہ اقبالؒ نے یہ کتاب علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ذریعے بطورِ خاص منگوائی تھی اور پھر اس کو سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ اقبالنامہ خطوط بنام سید سلیمان ندویؒ) امام الکلام فی تحقیق الاجسام، العقول الضابط فی تحقیق الوجود الرابط، انہار اربعہ، حاشیہ بر جامع ترمذی، حاشیہ بر حاشیہ خیر آبادی، تنویر المنار، المعارف الذہبیہ، عشرۂ کاملہ، حقیقت الاسلام۔

علامہ حکیم سید برکات احمدؒ نے صرف ایک صاحبزادے علامہ حکیم سید محمد احمد صاحب اپنے پیچھے چھوڑے۔ وہ علم و عمل کے اعتبار سے ان کے حقیقی جانشین تھے۔ انہوں نے والدِ گرامی کی وفات کے صرف چار سال بعد ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں صرف ۳۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ انہوں نے بھی کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طرف سے دیا جاتا تھا۔ اس کھانے کی تیاری کا اہتمام اور طلبہ کی خاطر مدارات اماں بی نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ وہ ان طلبہ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھیں اور ان کے ناز نخرے خوش دلی سے برداشت کرتی تھیں۔ بعض اوقات طلبہ کی نازک مزاجی کی یہ کیفیت ہوتی کہ کھانا آنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی یا سالن میں نمک کی کمی بیشی ہو جاتی تو کھانا اٹھا کر پھینک دیتے تھے۔ اماں بی کو علم ہوتا تو وہ غصے میں آنے کی بجائے طلبہ کو منانے کی کوشش کرتیں۔ کبھی کوئی ملازم کسی طالب علم کی شکایت کرتا تو اس کو سمجھاتیں: "—— او نیک بخت! تجھے یہ خیال نہیں کہ یہ لڑکے کتنی دور سے، دوسرے ملکوں سے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں ان میں سے ہر ایک اپنے ماں باپ کا لاڈلا ہوگا۔ آج یہ پردیس میں ہیں، تمہارے بس میں ہیں چار دن کی چڑیں (چڑیاں) ہیں۔ کل اپنے گھر سدھاریں گے، کیا یاد کریں گے۔"

مشہور عالم دین اور مصنف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اپنے آٹھ سالہ قیام ٹونک کا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے اماں بی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت (مولانا سید برکات احمدؒ) کی یہ بیوی صاحبہ ان گرامی قدر خواتین میں سے ہیں جنہوں نے علم و دین کی خدمت میں اپنے کو اپنے شوہر کا دست راست ثابت کیا۔ بیوی صاحبہ نے حضرت کے تمام علمی مہمانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

علامہ حکیم سید محمد احمدؒ کی چار اولادوں میں سے ایک صاحبزادی فاطمۃ الزہرا صاحبہ اور دو صاحبزادے مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب اور حکیم سید مسعود احمد برکاتی صاحب بفضلہ تعالیٰ تا دم تحریر بقید حیات ہیں (اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے) حکیم سید محمود احمد صاحب کراچی میں مطب کرتے ہیں اور پاکستان کے ممتاز اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ حکیم سید مسعود احمد صاحب پاکستان کے سب سے بڑے دوا ساز ادارے "ہمدرد" سے وابستہ ہیں۔ وہ بھی اونچے درجے کے ادیب ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

کی خاطر مدارات کی۔ نہ صرف ان کے قیام و طعام کا تیس پینتیس برس تک انتظام کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے ان بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا۔ یہ مبالغہ نہیں ہے کہ بعض بعض دفعہ ان غریب الدیار طلبہ کے مصارف کے لیے بیوی صاحبہ کو اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کر دینے پڑے۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو برکاتی سلسلے کو علمی آبادیوں میں ہم نہ پا سکتے۔"

(ماہنامہ معارف "اعظم گڑھ" مئی ۱۹۶۹ء)

طلبہ بیگم مولانا برکات احمدؒ کو اپنی ماں ہی سمجھتے تھے اور ان کو "بی" کہا کرتے تھے۔ وہ اچھی طرح جان گئے تھے کہ "بی" ان کی خدمت کو نہ صرف باعثِ اجر سمجھتی ہیں، بلکہ حقیقی ماں کی طرح ان سے پیار کرتی ہیں اور ان کے ناز اٹھاتی ہیں چنانچہ وہ دل کی گہرائیوں سے ان کا احترام کرتے تھے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ افغانستان اور وسطِ ایشیا سے آنے والے طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ٹونک ہی میں مستقل اقامت اختیار کر لیتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی شادی کی خواہش ظاہر کرتا تو اماں بی اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتیں۔ جب مناسب رشتہ مل جاتا تو شادی کا انتظام بھی خود ہی کرتیں یہاں تک کہ شادی شدہ جوڑے کے لیے مکان تک تلاش کر کے دیتیں پھر ہمیشہ ان سے مشفقانہ اور مخلصانہ تعلق قائم رکھتیں ان کو وقتاً فوقتاً اپنا مہمان بناتیں اور ہر طرح کی اعانت اور سرپرستی کرتیں، اگر میاں بیوی میں کبھی شکر رنجی ہو جاتی تو دونوں کو سمجھا بجھا کر صلح کرا دیتیں۔

حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب کا بیان ہے کہ اماں اگر ہم بھائیوں میں سے کسی کو سرائے (رباط الحکیم) کے مسافروں کی خدمت کرتے دیکھتیں تو بہت خوش ہوتیں اور ہمیں بہت دعائیں دیتیں۔ حاجت مند مسافروں کی مالی مدد بھی کرتیں۔

اماں بی بڑی حق گو تھیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملے میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی پروا نہ کرتی تھیں۔ حکمران خاندان کی بیگمات ان کو مختلف

تقریبات میں بالالتزام مدعو کرتی رہتی تھیں۔ اوّل تو وہ جانے سے معذرت کر دیتی تھیں اور اگر کبھی تشریف لے جاتیں تو کوئی خلافِ شرع کام ہوتے دیکھ کر برملا ٹوک دیتیں۔ ایک دفعہ بھری محفل میں ایک رئیسہ وقت سے کہہ دیا کہ "رکابی صاف کر کے اٹھو، برتن میں کھانا چھوڑنا منع ہے"۔ کسی تقریب میں گانا بجانا ہوتا تو اس میں ان کے شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہاں گانا موقوف ہو جاتا اور دوسری طرف سے بہت اصرار ہوتا تو کچھ وقت کے لیے شریک ہو جاتی تھیں۔

صبر و ضبط بھی امّاں بی کی زندگی کا ایک قابلِ تقلید پہلو تھا۔ ان کے ۹ بچے بچپن میں داغِ مفارقت دے گئے تھے مگر انہوں نے صبر و ضبط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ہر حال میں رضائے الٰہی پر شاکر رہیں۔ صرف ایک فرزند سید محمد احمد ۹ بچوں کے بعد بچے تھے۔ گویا یہ ان کے اکلوتے فرزند تھے بڑے لائق، عالم فاضل اور سعادت مند۔ اُن سے اُن کو جو محبت ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے مگر افسوس کہ ان کے یہ لختِ جگر بھی عین عالمِ شباب میں ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ چار سال پہلے (۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء میں) شوہر نامدار کی وفات کا جانکاہ صدمہ جھیلنا پڑا تھا۔ اب (۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں) اکلوتے جوان فرزند کو اپنے سامنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوتے دیکھا۔ اس موقع پر انہوں نے صبر و رضا کا جو نمونہ پیش کیا اس زمانے میں اس کی مثال ملنا محال ہے۔ دل اور دماغ پر جو بیت رہی تھی بیت رہی تھی زبان سے اگر کچھ نکلا تو یہی نکلا کہ —— "اللہ کی امانت تھی اس نے جب چاہا واپس لے لی۔" احکامِ شریعت کا اس قدر پاس تھا کہ بار بار کہتی تھیں، جلدی کرو، تدفین میں دیر کرنے کا حکم نہیں ہے۔

اس کے بعد مرحوم فرزند کی اولاد کو سینے سے لگا کر دس گیارہ برس بڑے صبر اور حوصلے سے گزارے۔ آخر وہ وقت آ پہنچا جس کا ہر ذی روح کو ایک دن لازماً سامنا کرنا ہے۔ رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ ہجری / ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہ عظیم خاتون خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔

(مقالہ "امّاں" از مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب و مکاتیب جناب حکیم سید مسعود احمد برکاتی صاحب بنام طالب ہاشمی)

بنتُ الاِسلام

چودھویں صدی ہجری میں برِ صغیر پاک و ہند کی جن مسلم خواتین کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی کمالات و اوصاف سے نوازا، بنت الاسلام کو اُن میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ انہیں نہ صرف علم و فضل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے بلکہ شبانہ روز تبلیغی و اصلاحی مساعی کے لحاظ سے بھی بلا تامل ایک مثالی خاتون کہا جا سکتا ہے۔ وہ زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف ناموں سے پکاری گئیں، مثلاً محمدی بیگم، رفعت اقبال، رفعت حنیف،[۱] نسیم آراء مگر زیادہ شہرت انہوں نے اپنے قلمی نام "بنت الاسلام" سے پائی۔ ان کا تعلق سیالکوٹ کے ایک علمی اور دینی گھرانے سے تھا۔ والدِ گرامی مولوی ظفر اقبال ؒ ایم اے سالہا سال تک پنجاب یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ وہ بڑے بلند کردار اور صاحبِ بصیرت مردِ مومن تھے۔ انہی کی جانگسل عرق ریزی تھی جس کا نتیجہ انجمن حمایتِ اسلام کی طرف سے اغلاط سے مبرا قرآن پاک کی اشاعت کی صورت میں نکلا۔ بنت الاسلام نے اپنے والدِ گرامی کی آغوشِ تربیت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر بطورِ معلمہ/لیکچرار محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئیں۔ طویل ملازمت کے بعد وہ صدر شعبۂ اسلامیات لاہور کالج برائے خواتین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ عمر کے آخری دَور میں بنت الاسلام سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ بیماری کا تمام زمانہ انہوں نے بڑے صبر و شکر اور حوصلے سے گزارا۔ آخر ۹ جون ۱۹۸۹ء کو وقتِ آخر آ پہنچا اور انہوں نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ستر برس کی تھی۔ بنت الاسلام نے عورتوں، بچوں اور مردوں کے لیے مختلف موضوعات پر کثیر تحریری سرمایہ چھوڑا۔ ان کی تالیفات میں سے "زندگی بے بندگی شرمندگی" اور "اُسوۂ حسنہ" کو بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی اور انہیں صدارتی ایوارڈ بھی ملا۔ انہوں نے قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کی تعمیرِ سیرت اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے جو عظیم الشان کام کیا وہ ان کا نام اَبدُالآباد تک زندہ رکھے گا۔

(ماہنامہ "بتول" لاہور بنت الاسلام نمبر)

---

[۱] بنت الاسلام کی شادی ایک نیک سیرت سرکاری افسر جناب محمد حنیف سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک بیٹی انہوں نے اپنی یادگار چھوڑی۔

کتابیات

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جن کتابوں سے خاص طور پر براہِ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں:

۱۔ طبقات — ابنِ سعدؒ
۲۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ — حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ
۳۔ تہذیب التہذیب — حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ
۴۔ اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ — علامہ ابنِ اثیرؒ
۵۔ تذکرۃ الحفاظ — حافظ ذہبیؒ
۶۔ وفیات الاعیان — ابنِ خلکانؒ
۷۔ صفتہ الصفوۃ — علامہ ابن جوزیؒ
۸۔ الاکمال فی اسماء الرجال — شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب عمریؒ
۹۔ عقد الفرید — ابنِ عبد ربہؒ
۱۰۔ نفح الطیب — علامہ المقری التلمسانیؒ
۱۱۔ کتاب الاغانی — ابو الفرج اصفہانیؒ
۱۲۔ نفحات الانس — مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ
۱۳۔ روضۃ الصفا — میر خواند
۱۴۔ اخبار الاخیار — شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
۱۵۔ مدارج النبوۃ — شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
۱۶۔ عملِ صالح — محمد صالح کنبوہ
۱۷۔ مآثر الامراء — شاہنواز خاں
۱۸۔ عالمگیر نامہ — عاقل خاں رازی
۱۹۔ مآثرِ عالمگیری — محمد ساقی مستعد خاں
اردو ترجمہ محمد فدا علی طالب
۲۰۔ سیر المتاخرین — غلام حسین خاں طباطبائی
۲۱۔ بادشاہ نامہ — عبدالحمید لاہوری
۲۲۔ ہمایوں نامہ۔ گلبدن بیگم اردو ترجمہ رشید اختر ندوی
۲۳۔ طبقاتِ ناصری — منہاج سراج
۲۴۔ سفینۃ الاولیاء — داراشکوہ
۲۵۔ سکینۃ الاولیاء — دارا شکوہ
۲۶۔ منتخب التواریخ — مُلا عبدالقادر بدایونیؒ
۲۷۔ تاریخِ فرشتہ — محمد قاسم فرشتہ
۲۸۔ مفتاح التواریخ — ٹامس بیل
۲۹۔ تذکرہ اولیائے ہند — جناب محمد اختر
۳۰۔ مجمع النفائس — سراج الدین علی خاں آرزو
۳۱۔ تذکرہ اولیائے پاک و ہند — ڈاکٹر ظہور الحسن شارب
۳۲۔ یدِ بیضا — غلام علی آزاد بلگرامی
۳۳۔ بہارستانِ ناز — حکیم فصیح الدین رنج
۳۴۔ تذکرہ نسوانِ ہند — فصیح الدین بلخی
۳۵۔ مشاہیر نسواں — مولوی محمد عباس ایم اے
۳۶۔ تذکرۃ النساء نادری — منشی درگا پرشاد نادر کھتری
۳۷۔ اخترِ تاباں — ابو القاسم محتشم
۳۸۔ تذکرۃ الخواتین — عبدالباری آسی

۳۹۔ مشاہیر النساء .... ذہنی آفندی

۴۰۔ خزینۃ الاصفیاء .... مفتی غلام سرور لاہوری

۴۱۔ ظفر نامہ شاہجہاں .... منشی ذکاء اللہ

۴۲۔ حیاتِ نور الدین محمود حکیم احمد حسین الہ آبادی

۴۳۔ گنجِ شہیداں .... سید محمد رفیع رضوی عالی

۴۴۔ مآثر صدیقی .... نواب علی حسن خاں

۴۵۔ تمدنِ عرب .... ڈاکٹر سید علی بلگرامی

۴۶۔ تاریخ اسلام (مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب)

.... سید امیر علی

۴۷۔ تاریخ لودی .... عبد الحکیم خاں

۴۸۔ مقالاتِ شبلی .... علامہ شبلی نعمانیؒ

۴۹۔ بزرگانِ لاہور .... پیر غلام دستگیر نامی

۵۰۔ تاریخ اسلام .. شاہ معین الدین احمد ندویؒ

۵۱۔ المامون .... شبلی نعمانیؒ

۵۲۔ تاریخ صقلیہ جلد ۲ .... مولانا ریاست علی ندوی

۵۳۔ تاریخ ملت ...... قاضی زین العابدین میرٹھی

۵۴۔ بیگماتِ اودھ .... تصدق حسین

۵۵۔ بیگمات شاہانِ اودھ

.... خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی (مرحوم)

۵۶۔ جذباتِ فطرت .... الیاس برنیؒ

۵۷۔ یادِ ایام .... منشی عبد الرزاق کانپوری

۵۸۔ البرامکہ .... منشی عبد الرزاق کانپوری

۵۹۔ نظام الملک طوسی. منشی عبد الرزاق کانپوری

۶۰۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد .... مولانا غلام رسول مہرؒ

۶۱۔ خالدہ ادیب خانم .... حکیم عبد المجید [illegible]

۶۲۔ مشاہیر اسلام .... نواب علی خان برناوی

۶۳۔ تاریخ بہمنی .... خواجہ حسن نظامی دہلویؒ

۶۴۔ بزم تیموریہ .. مولانا صباح الدین عبد الرحمٰنؒ

۶۵۔ تاریخ خوارج ...... مولانا رئیس احمد جعفریؒ

۶۶۔ تاریخ اسلام ... مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکشؒ

۶۷۔ خلافت اندلس .... نواب ذوالقدر جنگ

۶۸۔ دربار اکبری .... مولوی محمد حسین آزادؒ

۶۹۔ سیرۃ عائشہؓ .... مولانا سید سلیمان ندویؒ

۷۰۔ خواتین اسلام کی بہادری. مولانا سید سلیمان ندویؒ

۷۱۔ تابعین .... شاہ معین الدین احمد ندویؒ

۷۲۔ اہل کتاب صحابہ و تابعین مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی

۷۳۔ تبع تابعین ..... مولانا حافظ مجیب اللہ ندویؒ

۷۴۔ غلامانِ اسلام..... مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

۷۵۔ خلافت عباسیہ اور ہندوستان

.... قاضی اطہر مبارکپوری

۷۶۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں

.... قاضی اطہر مبارکپوری

۷۷۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

.... مولانا ابوالحسنات ندویؒ

۷۸۔ صلاح الدین .... محمد فرید ابو حدید

.... ترجمہ محمد عبد القدوس ہاشمیؒ

۷۹۔ یادِ رفتگاں ...... مولانا سید سلیمان ندویؒ

۸۰۔ یادِ رفتگاں .... مولانا ماہر القادریؒ

۸۱۔ خواتین اسلام اور دین کی خدمت

.... مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۸۲۔ کاروانِ زندگی جلد اول و دوم

.... مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۸۳۔ پرانے چراغ جلد دوم

.... مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۸۴۔ تاریخ اوچ .... مسعود حسن شہاب

۸۵۔ مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات

.... سید محمد سلیم

۸۶۔ رئیس الاحرار .... جناب اشتیاق اظہر

۸۷۔ تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ

.... مولانا محمد یونس نگرامی

۸۸۔ باکمال مسلمان خواتین ..... مولانا عبدالقیوم ندوی

۸۹۔ نیک بیبیاں .. ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ سہروردی

۹۰۔ خواتین کشمیر .... منشی محمد الدین فوق کاشمیری

۹۱۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

.... مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن

۹۲۔ بارہ امام .... مولوی علی محمد

۹۳۔ تقویم تاریخی .... مولانا عبدالقدوس ہاشمی

۹۴۔ مسلمان اور سائنس کی تحقیق

.... جناب حبیب احمد صدیقی

۹۵۔ حواشی غبار خاطر (مولانا آزادؒ)..از مالک رام

۹۶۔ تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ

.... جناب ثروت صولت

۹۷۔ نگار لکھنؤ (جنوری فروری ۱۹۵۴ء)

.... فرمانروایانِ اسلام نمبر مرتبہ نیاز فتح پوری

۹۸۔ نگار لکھنؤ (جنوری فروری ۱۹۵۵ء)

علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر مرتبہ نیاز فتح پوری

۹۹۔ شرف النساء جلد دوم۔ جناب عنایت عارف

۱۰۰۔ اوصاف حمیدہ .... پروفیسر عبدالغنی فاروق

۱۰۱۔ نقوش لاہور نمبر.... مرتبہ جناب محمد طفیل مرحوم

۱۰۲۔ ارباب طریقت۔ مفتی محمد اویس بھوجیانی

۱۰۳۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی)

.... مختلف جلدیں

ان کے علاوہ بہت سے اخبارات و رسائل سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

اخبار زمیندار لاہور، اخبار انقلاب لاہور، اخبار تسنیم لاہور، اخبار کوہستان لاہور
ماہنامہ ادیب دہلی، ماہنامہ المعارف لاہور، ماہنامہ آجکل دہلی، ماہنامہ پہچان کراچی،
ماہنامہ کتابی دنیا کراچی، ماہنامہ فاران کراچی، ہفت روزہ چٹان لاہور،
ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، ماہنامہ الرشید لاہور، سہ ماہی العلم کراچی،
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور، ماہنامہ ہمدرد صحت ڈائجسٹ کراچی

("نگار" اور "نقوش" کے خاص نمبروں کو ہم نے کتابوں میں شمار کیا ہے)